معارف القرآن
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب
مفتی اعظم پاکستان
مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)
Karachi - Pakistan.
معارف القرآن

ا

معارف القرآن

جلد

۳

مائدہ ، انعام ، اعراف

پارہ ۶ ، رکوع ۵ تا پارہ ۹ ، رکوع ۱

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کراچی

[illegible]

باہتمام : سید جمیل اشرف
طبع جدید : ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ - اپریل ۲۰۰۸ء
مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی
ناشر : مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴
فون : 5031565 - 5031566
ای میل : i_maarif@cyber.net.pk

ملنے کے پتے:

- مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴
فون: 5031565 - 5031566
- ادارۃ المعارف کراچی ۱۴
فون: 5049733 - 5032020

فہرست مضامین معارف القرآن جلد سوم

مضامین	صفحہ
سُورَۃُ مَائِدَۃ	۹
شانِ نزول اور خلاصہ مضامین سورۃ	۹
اسلام میں عقود و معاملات کی اہمیت	۱۱
بہیمۃ الانعام کی تفصیل اور اس سے مستثنیٰ جانور	۱۳
شعائر اللہ کا مفہوم اور ان کا احترام	۱۵
باہمی تعاون و تناصر کا قرآنی اصول	۲۰
قومیتوں کی تقسیم	۲۲
قومیت اور اجتماعیت کیلئے قرآنی تعلیم	۲۳
حلال و حرام جانوروں کی تفصیل	۲۶
عید اور تہوار منانے کے اسلامی اصول	۳۲
اکمالِ دین اور اتمامِ نعمت کا بیان	۳۶
بقیہ حلال و حرام جانوروں کا بیان	۳۹
طیبات اور خبائث کی شرعی حقیقت	۴۲
صرف نام کے یہودی و نصرانی جو حقیقۃً کسی مذہب کے قائل نہیں وہ ہرگز وہ اہلِ کتاب میں داخل نہیں	۴۸
طعام اہلِ کتاب سے کیا مراد ہے؟	۴۹
اہلِ کتاب کا ذبیحہ حلال ہونے کی حکمت اور وجہ	۵۱
خلاصۂ کلام	۵۶
کن عورتوں سے نکاح حلال ہے؟ اور محصنت کی تفصیل	۶۰
احکامِ شرعیہ متعلقہ عبادات	۶۵
سچی گواہی کا بیان اور شہادت کی تفصیل	۶۸
امتحانات کے نمبر، سند اور سرٹیفکٹ اور انتخابات کے ووٹ سب شہادت کے حکم میں داخل ہیں	۷۰
امتِ محمدیہ پر حق تعالیٰ کے خصوصی انعامات	۷۴
وہ عہد و میثاق جو بنی اسرائیل سے لیا گیا اسکی تفصیل	۷۸
بنی اسرائیل کا نقضِ عہد اور اس بنا پر حق تعالیٰ کا غضب	۸۱
عیسائی فرقوں میں باہمی عداوت	۸۴
تردید قولِ نصاریٰ	۸۷

مضامین	صفحہ
زمانۂ فترت کی تحقیق	۹۰
زمانۂ فترت کے احکام	۹۱
ایک سوال اور جواب	״
خاتم الانبیاءؐ کے مخصوص کمالا کی طرف اشارہ	״
قوم موسیٰؑ پر خصوصی انعامات	۹۴
ارضِ مقدسہ سے کونسی زمین مراد ہے	۹۸
قوم کی انتہائی بے وفائی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتہائی عزم و استقلال	۱۰۳
وادیٔ تیہ	۱۰۵
قصہ ہابیل و قابیل	۱۱۰
تاریخی روایات کی نقل میں احتیاط اور سچائی واجب ہے	۱۱۱
قبولیت عمل کا مدار اخلاص و تقویٰ پر ہے	۱۱۳
جرم و سزا کے چند قرآنی ضابطے	۱۱۴
قرآنی قوانین کا عجیب غریب انقلابی اسلوب	۱۱۵
شرعی سزاؤں کی تین قسمیں اور اُن کی تفصیل	۱۱۶
وسیلہ کی تفسیر	۱۲۶
سرقہ کی تعریف اور اس کی تفصیل	۱۲۹
اسلامی سزاؤں پر اعتراضات کا جواب	۱۳۳
رسوم جاہلیت کا مٹانا اور اسلامی مساوات کا قیام	۱۳۷
اس پر کفار کے جلنے اور ان کا جواب از آیت ۴۱ تا ۴۳	״
اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے مقدمات کا ضابطہ	۱۴۶
یہود کی ایک بُری خصلت	۱۴۸
عوام کیلئے علماء کے اتباع کا ضابطہ	״
یہود کی ایک دوسری بُری خصلت	۱۵۰
تیسری بُری خصلت، کتاب اللہ کی تحریف	״
چوتھی بُری خصلت، رشوت خوری	۱۵۱
تورات کے کتاب الٰہی ہونے کا بیان	۱۵۲
قرآن تورات و انجیل کا بھی محافظ ہے	۱۶۲
شرائع انبیاء میں جزوی اختلاف اور اس کی حکمت	۱۶۳
چند احکام	۱۶۴

مضمون	صفحہ
آیت ۵۱ تا ۵۸ مع خلاصۂ تفسیر	۱۶۵
شانِ نزول کا واقعہ یہود کی عہد شکنی اور ایک سازش	۱۷۰
وفاتِ نبوی کے بعد فتنۂ ارتداد، صدیق اکبر کا جہاد،	۱۷۵
مسیلمۂ کذاب اور اسود عنسی کا خاتمہ	〃
آیت ۵۹ تا ۶۱ مع خلاصۂ تفسیر	۱۸۱
تبلیغ و دعوت میں مخاطب کے نفسیات کی رعایت	۱۸۳
آیت ۶۲، ۶۳ مع خلاصۂ تفسیر	〃
یہود کی اخلاقی تباہ حالی	۱۸۴
اصلاحِ اعمال کا طریقہ	〃
علماء پر عوام کے اعمال کی ذمہ داری	۱۸۵
علماء و مشائخ کے لئے تنبیہ	〃
اصلاح امت کا طریقہ	۱۸۷
گناہوں پر اظہارِ نفرت نہ کرنے پر وعید	۱۸۸
آیت ۶۴ تا ۶۷ مع خلاصۂ تفسیر	۱۸۹
یہود کی ایک گستاخی کا جواب	۱۹۱
احکامِ الٰہیہ پر پورا عمل دنیا میں برکات کا سبب ہے	۱۹۲
احکامِ الٰہیہ پر پورا عمل کس طرح ہوتا ہے	〃
ایک شبہ کا جواب	۱۹۳
تبلیغ دعوت کی تاکید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی	۱۹۴
حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرتؐ کی ایک نصیحت	〃
آیت ۶۸، ۶۹ مع خلاصہ تفسیر	۱۹۵
اہلِ کتاب کو شریعتِ الٰہیہ کے اتباع کی ہدایت	۱۹۷
حدیثِ رسولؐ بھی قرآن کیطرح واجب الاتباع ہے	〃
احکامِ شرعیہ کی تین قسمیں	۱۹۸
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تسلی	۱۹۹
چار اقوام کو ایمان کی دعوت اور عمل صالح کی ترغیب اور نجاتِ آخرت کا قاعدہ	〃
اللہ کے نزدیک اعزاز و امتیاز کا مدار عمل صالح پر ہے	۲۰۰
ایمان باللہ ایمان بالیوم الآخر اور ایمان بالرسولؐ کے بغیر کسی کی نجات (ایک شبہ کا جواب)	〃
آیت ۷۰، ۷۱ مع خلاصہ تفسیر	۲۰۳
بنی اسرائیل کی عہد شکنی	۲۰۴
آیت ۷۲ تا ۷۶ مع خلاصۂ تفسیر	۲۰۵

مضمون	صفحہ
حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کی تردید	۲۰۷
حضرت مریمؑ نبی تھیں یا ولی	۲۰۸
آیت ۷۷ تا ۸۱ مع خلاصۂ تفسیر	〃
بنی اسرائیل کی کجروی کا ایک دوسرا پہلو	۲۱۰
بنی اسرائیل کی افراط و تفریط	۲۱۱
اللہ تعالیٰ تک رسائی کا طریقہ	۲۱۱
غلو ممنوع ہے اگر علمی تحقیق و تدقیق اس میں داخل نہیں	۲۱۲
بنی اسرائیل کو معتدل راہ کی ہدایت	〃
بنی اسرائیل کے غلو کا انجام بد	۳۱۲
آیت ۸۲ تا ۸۶، ابتداء پارہ ہفتم مع خلاصہ تفسیر	〃
بعض اہلِ کتاب کی حق پرستی	۲۱۶
شاہ حبشہ کے دربار میں حضرت جعفرؓ کی تقریر اور دربار شاہِ حبشہ پر اس کا اثر	۲۱۷
شاہِ حبشہ کا وفد بارگاہِ رسالتؐ میں،	۲۱۷
قوم و ملت کی اصلی روح حق پرست علماء و مشائخ ہیں	۲۱۸
آیت ۸۷، ۸۸ مع خلاصۂ تفسیر	۲۱۹
ترکِ دنیا حدودِ شرعیہ کے اندر ہو تو محمود ورنہ حرام ہے	۲۲۰
کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کے تین درجات	〃
آیت ۸۹ مع خلاصۂ تفسیر	۲۲۱
قسم کھانے کی چند صورتیں اور انکے متعلق احکام	۲۲۲
قسم ٹوٹنے سے پہلے کفارہ کی ادائیگی معتبر نہیں	۲۲۴
آیت ۹۰ تا ۹۲ مع خلاصۂ تفسیر	۲۲۵
تمام کائنات کی تخلیق انسان کے نفع کے لئے ہے،	۲۲۶
ازلام کی تشریح	〃
قرعہ اندازی کی جائز صورت	۲۲۷
شراب اور جوئے کے جسمانی اور روحانی مفاسد	۲۲۷
آیت ۹۳ تا ۹۶ مع خلاصۂ تفسیر	۲۳۰
حرم میں شکار کی ممانعت اور متعلقہ مسائل	۲۳۴
آیت ۹۷ تا ۱۰۰ مع خلاصۂ تفسیر	۲۳۵
امن و اطمینان کے چار ذرائع	۲۳۷
بیت اللہ پورے عالم کا عمود ہے	〃
امن عالم بیت اللہ کے وجود سے وابستہ ہے	۲۳۸
خبیث اور طیب کی تشریح	۲۴۱
آیت کا شانِ نزول	۲۴۲
آیت ۱۰۱ تا ۱۰۳ مع خلاصہ تفسیر	۲۴۳
بے ضرورت سوال کرنے کی ممانعت	۲۴۵
شانِ نزول	〃
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت ختم ہے	〃
بحیرہ، سائبہ وغیرہ کی تشریح	۲۴۶

مضمون	صفحہ
آیت ۱۰۴، ۱۰۵ مع خلاصۂ تفسیر	۲۴۷
آیات کا شانِ نزول	۲۴۸
نااہل کو مقتدا بنانا ہلاکت کو دعوت دینا ہے	۲۴۹
اقتدار کا معیار	۲۵۰
کسی پر تنقید کرنے کا مؤثر طریقہ	״
اصلاحِ خلق کی فکر کرنیوالوں کو ایک تسلّی	״
گناہوں کی روک تھام کے بارے میں صدیق اکبرؓ کا خطبہ	۲۵۱
معروف اور منکر کے معنے	״
ائمہ مجتہدین کے مختلف اقوال میں سے کوئی بھی منکرِ شرعی نہیں ہوتا	۲۵۲
آیات ۱۰۶ تا ۱۰۸ مع خلاصۂ تفسیر	۲۵۳
آیات کا شانِ نزول	۲۵۴
وصیت اور وصی کے بعض احکام	۲۵۷
کافر کے مقابلہ میں کافر کی گواہی مقبول ہے	۲۵۸
جس شخص کے ذمہ کسی کا حق ہو وہ اس کو قید کرا سکتا ہے	״
آیت ۱۰۹، ۱۱۰ مع خلاصۂ تفسیر	۲۵۹
قیامت میں سب سے پہلے سوال انبیاء علیہم السلام سے ہوگا	۲۶۱
ایک شبہ کا جواب	״
انبیاء کی انتہائی شفقت، ایک سوال و جواب	۲۶۳
محشر میں پانچ چیزوں کا سوال	״
حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے خصوصی سوال و جواب	۲۶۴
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب	۲۶۵
حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر چند خصوصی انعامات	״
آیت ۱۱۱ تا ۱۱۵ مع خلاصۂ تفسیر	۲۶۶
مومن کو نبی سے معجزہ کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے	۲۶۸
جب نعمت غیر معمولی بڑی ہو تو ناشکری کا وبال بھی بڑا ہوتا ہے	״
آیت ۱۱۶ تا ۱۱۸ مع خلاصۂ تفسیر	۲۶۹
فوائد مہمہ	۲۷۱
آیت ۱۱۹، ۱۲۰ مع خلاصۂ تفسیر	۲۷۳
ختم سورۂ مائدہ	۲۷۴

سُورَةُ الأَنعَام

مضمون	صفحہ
آیت ۱ تا ۵ مع خلاصۂ تفسیر و معارف	۲۷۶
آیت ۶ تا ۱۱ مع خلاصۂ تفسیر و معارف	۲۸۲
ایک عبرت کا سبق	۲۸۵
آیت ۱۲ تا ۱۴ مع خلاصۂ تفسیر و معارف	۲۸۸
آیت ۱۵ تا ۲۱ مع خلاصۂ تفسیر	۲۹۰
اسلام کا انقلابی عقیدہ۔ نفع و ضرر کا مالک صرف ایک اللہ ہے	۲۹۳
آیت ۲۲ تا ۲۶ مع خلاصۂ تفسیر	۲۹۷
کیفیت عدم فلاح مشرکین	۲۹۸
معارف و مسائل	۲۹۹
آیت ۲۷ تا ۳۲ مع خلاصۂ تفسیر	۳۰۵
معارف و مسائل۔ اسلام کے تین بنیادی اصول	۳۰۷
آیت ۳۳ تا ۴۱ مع خلاصۂ تفسیر	۳۱۱
کفار کے بیہودہ کلمات پر رسولؐ کی تسلی	۳۱۳
معارف و مسائل	۳۱۵
حقوق خلق کی انتہائی اہمیت	۳۱۶
آیت ۴۲ تا ۴۵ مع خلاصۂ تفسیر	۳۱۷
معارف و مسائل	۳۱۸
آیت ۴۶ تا ۴۹ مع خلاصۂ تفسیر	۳۲۲
آیت ۵۰ تا ۵۱ مع خلاصۂ تفسیر	۳۲۳
معارف و مسائل	۳۲۴
کفار عرب کی طرف سے فرمائشی معجزات کا معاندانہ مطالبہ	״
آیت ۵۲ تا ۵۵ مع خلاصۂ تفسیر	۳۲۹
معارف و مسائل	۳۳۱
عزت و ذلت کا اسلامی معیار، امیر غریب میں کوئی امتیاز نہیں	״
چند احکام و ہدایات	۳۳۶
توبہ سے ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے	۳۳۹
آیت ۵۶ تا ۵۸ مع خلاصۂ تفسیر	۳۴۱
آیت ۵۹ تا ۶۲ مع خلاصۂ تفسیر	۳۴۲
معارف و مسائل	۳۴۴
گناہوں سے بچنے کا نسخۂ اکسیر	״
قرآنی اصطلاح میں علم غیب اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے جس میں کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں	۳۴۵

مضمون	صفحہ
غیب کی خبر دینے کو علم غیب کہنا عوامی اصطلاح ہے	۳۴۶
آیت ۶۳، ۶۴ مع خلاصۂ تفسیر	۳۵۲
معارف و مسائل، علم و قدرت الٰہیہ کے بعض مظاہر	//
عبرت	۳۵۴
حوادث و مصائب کا علاج	//
آیت ۶۵ تا ۶۷ مع خلاصۂ تفسیر	۳۵۷
معارف و مسائل	۳۵۸
عذابِ الٰہی کی تین قسمیں	//
اختلافِ امت کے رحمت ہونے کا مطلب	۳۶۴
آیت ۶۸ تا ۷۳ مع خلاصۂ تفسیر	۳۶۶
معارف و مسائل	۳۷۰
اہل باطل کی مجلسوں سے پرہیز	//
آیت ۷۴ تا ۸۱ مع خلاصۂ تفسیر	۳۷۵
اصلاح عقائد و اعمال کی دعوت اپنے گھر اور خاندان سے شروع کرنی چاہئے	۳۷۹
دو قومی نظریہ مسلمان ایک قوم اور کافر دوسری قوم	۳۷۹
تبلیغ و دعوت میں حکمت و تدبیر سے کام لینا سنتِ انبیاء ہے	۳۸۱
مبلغینِ اسلام کیلئے چند ہدایات	۳۸۲
آیت ۸۲ تا ۸۹ مع خلاصۂ تفسیر	۳۸۳
معارف و مسائل	۳۸۶
آیت ۹۰ تا ۹۴ مع خلاصۂ تفسیر	۳۸۹
معارف و مسائل	۳۹۴
آیت ۹۵ تا ۹۸ مع خلاصۂ تفسیر	۳۹۸
معارف و مسائل	۳۹۹
مخلوقات کے آرام کیلئے رات کی قدرتی اور جبری تعیین ایک عظیم نعمت ہے،	۴۰۰
شمسی اور قمری حساب	۴۰۲
آیت ۹۹ تا ۱۰۲ مع خلاصۂ تفسیر	۴۰۴
معارف و مسائل	۴۰۷
آیت ۱۰۳ تا ۱۰۷ مع خلاصۂ تفسیر	//
معارف و مسائل	۴۰۹
رویتِ باری تعالیٰ کا مسئلہ	۴۱۱
آیت ۱۰۸ تا ۱۱۳ مع خلاصۂ تفسیر	۴۱۴
معارف و مسائل	۴۱۷
کسی گناہ کا سبب بننا بھی گناہ ہے	۴۲۱
اگر کسی جائز کام سے مفاسد لازم آتے ہوں تو اس کا ترک لازم ہے	۴۲۳
آیت ۱۱۴ تا ۱۱۷ مع خلاصۂ تفسیر	۴۲۵
معارف و مسائل	۴۲۷
آیت ۱۱۸ تا ۱۲۱ مع خلاصۂ تفسیر	۴۳۱
معارف و مسائل	۴۳۴
آیت ۱۲۲ مع خلاصۂ تفسیر	//
معارف و مسائل	۴۳۵
مومن زندہ ہے اور کافر مردہ	//
انسان کا مقصدِ حیات	۴۳۶
ایمان نور ہے اور کفر ظلمت	۴۳۸
نورِ ایمان کا فائدہ دوسروں کو بھی پہنچتا ہے	۴۳۹
آیت ۱۲۳ تا ۱۲۵ مع خلاصۂ تفسیر	۴۴۰
معارف و مسائل	۴۴۱
نبوت اور رسالت کسبی اور اختیاری نہیں بلکہ ایک عہدہ ہے جس کے عطا کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے	۴۴۳
دین میں شرح صدر اور اس کی علامات	۴۴۴
صحابۂ کرام کو دین میں شرح صدر حاصل تھا اس لئے شکوک و شبہات بہت کم پیش آئے	//
شکوک و شبہات دور کرنے کا اصلی طریقہ بحث و مباحثہ نہیں	۴۴۵
آیت ۱۲۶ تا ۱۲۸ مع خلاصۂ تفسیر	//
معارف و مسائل	۴۴۷
آیت ۱۲۹ تا ۱۳۲ مع خلاصۂ تفسیر	۴۵۰
معارف و مسائل	۴۵۲
محشر میں دو گونہ جماعتیں اعمال و اخلاق کی بنیاد پر ہونگی دنیوی تعلقات کی بنیاد پر نہیں	//
دنیا میں بھی اعمال و اخلاق کا اجتماعی معاملات میں اثر	۴۵۳
ایک ظالم کو دوسرے ظالم کے ہاتھ سے سزا ملتی ہے	//

مضمون	صفحہ
کیا جنات میں بھی رسول ہوتے ہیں؟	۴۵۵
ہندوؤں کے اوتار بھی عموماً جنات ہوتے ہیں انہیں کسی رسول نبی ہونے کا احتمال۔	״
آیت ۱۳۳ تا ۱۳۶ مع خلاصۂ تفسیر	۴۵۷
معارف و مسائل	۴۵۸
اللہ تعالیٰ سب سے بے نیاز ہے اور تخلیق کائنات صرف اس کی رحمت کا نتیجہ ہے،	۴۵۹
انسان اللہ سے بے نیاز نہیں، اور اس کی حکمت	۴۵۹
کافروں پر تنبیہ اور اس میں مسلمانوں کے لئے عبرت	۴۶۲
آیت ۱۳۷ تا ۱۴۰	״
رسوم جاہلیت	۴۶۳
خلاصۂ تفسیر	۴۶۴
آیت ۱۴۱، ۱۴۲ مع خلاصۂ تفسیر	۴۶۵
معارف و مسائل	۴۶۷
زمین کا عشر	۴۶۹
آیت ۱۴۳ تا ۱۴۴ مع خلاصۂ تفسیر	۴۷۱
آیت ۱۴۵ تا ۱۴۷ مع خلاصۂ تفسیر	۴۷۳
آیت ۱۴۸ تا ۱۵۰ مع خلاصۂ تفسیر	۴۷۴
آیت ۱۵۱ تا ۱۵۳ مع خلاصۂ تفسیر	۴۷۶
معارف و مسائل، آیات مذکورہ کی اہم خصوصیات	۴۷۹
آیات مذکورہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصیت نامہ ہیں	۴۸۰
سب سے پہلا گناہ عظیم شرک ہے	۴۸۱
شرک کی تعریف اور قسمیں	״
دوسرا گناہ والدین سے بدسلوکی ہے	۴۸۲
تیسرا حرام قتل اولاد ہے	۴۸۳
اولاد کی تعلیمی، اخلاقی تربیت نہ کرنا اور بے دینی کیلئے آزاد	۴۸۴
چھوڑ دینا بھی ایک طرح سے قتل اولاد ہے	״
چوتھا حرام بے حیائی کے کام ہیں	״
پانچواں حرام قتل ناحق ہے	۴۸۶
چھٹا حرام یتیم کا مال ناجائز طور پر کھانا	۴۸۷
ساتواں حرام ناپ تول میں کمی	۴۸۸
افسروں، ملازموں اور مزدوروں کا اپنی مقررہ ڈیوٹی اور خدمت میں کوتاہی کرنا ناپ تول کی کمی کے حکم میں ہے	״
آٹھواں حکم عدل و انصاف ہے اس کے خلاف کرنا حرام ہے،	۴۸۹
نواں حکم اللہ کے عہد کو پورا کرنا عہد شکنی کا حرام ہونا	۴۹۰

مضمون	صفحہ
آیت ۱۵۴ تا ۱۵۷ مع خلاصۂ تفسیر	۴۹۳
معارف و مسائل	۴۹۵
آیت ۱۵۸ مع خلاصۂ تفسیر	״
معارف و مسائل	۴۹۶
قیامت اور اس کی نشانیاں	۴۹۷
آیت ۱۵۹، ۱۶۰ مع خلاصۂ تفسیر و معارف و مسائل	۵۰۱
دین میں بدعت ایجاد کرنے پر وعید شدید	۵۰۲
آیت ۱۶۱ تا ۱۶۵ مع خلاصۂ تفسیر	۵۰۶
معارف و مسائل	۵۰۸
کسی کے گناہ کا بار دوسرا نہیں اٹھا سکتا	۵۱۰
ختم سورۂ انعام	۵۱۲

سُورۃ الاعراف

مضمون	صفحہ
آیت ۱ تا ۷	۵۱۴
خلاصہ مضامین سورۃ، خلاصۂ تفسیر	۵۱۵
معارف و مسائل	۵۱۶
آیت ۸ تا ۱۰، مع خلاصۂ تفسیر	۵۱۷
معارف و مسائل	۵۱۸
وزن اعمال کے متعلق ایک شبہ اور جواب	۵۲۰
وزن اعمال کس طرح ہوگا؟	۵۲۲
آیت ۱۱ تا ۱۸ مع خلاصۂ تفسیر	۵۲۴
معارف و مسائل	۵۲۷
ابلیس کی دعا کے متعلق دو آیتوں میں متعارض الفاظ کی تطبیق	״
کیا کافر کی دعا بھی قبول ہو سکتی ہے؟	۵۲۸
واقعۂ آدم و ابلیس کے مختلف الفاظ	״
بارگاہ خداوندی میں ابلیس کو بیباکانہ گفتگو کی جرأت کیسے ہوئی؟	״
شیطان کا حملہ انسان پر چار طرف میں محدود نہیں عام ہے	۵۲۹
آیت ۱۹ تا ۲۵ مع خلاصۂ تفسیر	״
معارف و مسائل	۵۳۱
آیت ۲۶ تا ۲۷ مع خلاصۂ تفسیر	״

مضمون	صفحہ
معارف ومسائل	۵۳۳
لباس کے دو فائدے	۵۳۳
انسان پر شیطان کا پہلا حملہ اور آجکل کی نئی تہذیب	"
ایمان کے بعد سب سے پہلا فرض ستر پوشی ہے	"
نیا لباس پہننے کے وقت پرانے لباس کو صدقہ کرنے کا ثواب	۵۳۵
ستر پوشی ابتدائے آفرینش سے انسان کا فطری عمل ہے	"
لباس کی ایک تیسری قسم	"
ظاہری لباس کا بھی اصل مقصد تقویٰ حاصل کرنا ہے	۵۳۶
آیت ۲۸ تا ۳۱ مع خلاصۂ تفسیر	۵۳۷
معارف ومسائل	۵۳۸
نماز میں ستر پوشی فرض ہے	۵۴۳
نماز کے لئے اچھا لباس	"
نماز کے لباس کے متعلق چند مسائل	"
کھانا پینا بقدر ضرورت فرض ہے	۵۴۴
اشیاء عالم میں اصل اباحت ہے جب تک کسی دلیل سے حرمت ثابت نہ ہو	۵۴۵
کھانے پینے میں اسراف جائز نہیں	"
کھانے پینے میں اعتدال ہی نافع دین و دنیا ہے	"
ایک آیت سے آٹھ مسائل شرعیہ	۵۴۶
آیت ۳۲ تا ۳۴ مع خلاصۂ تفسیر	۵۴۷
معارف ومسائل	۵۴۹
عمدہ لباس اور لذیذ کھانے سے پرہیز اسلام کی تعلیم نہیں	"
خوراک و پوشاک میں سنت نبوی	۵۵۰
آیت ۳۵ تا ۳۹ مع خلاصۂ تفسیر	۵۵۳
آیت ۴۰ تا ۴۳ مع خلاصۂ تفسیر	۵۵۶
معارف ومسائل	۵۵۷
احکام شریعت میں سہولت کی رعایت	۵۶۰
اہل جنت کے دل سے باہمی کدورتیں نکال لی جائیں گی	۵۶۱
ہدایت کے مختلف درجات ہیں جس کا آخری درجہ دخول جنت ہے	۵۶۲

مضمون	صفحہ
آیت ۴۴ تا ۴۹ مع خلاصۂ تفسیر	۵۶۳
معارف ومسائل	۳۶۵
اہل اعراف کون لوگ ہیں؟	۵۶۶
سلام کا مسنون لفظ	۵۶۸
آیت ۵۰ تا ۵۳ مع خلاصۂ تفسیر	۵۶۹
آیت ۵۴، مع خلاصۂ تفسیر	۵۷۱
معارف ومسائل	"
آسمان و زمین کی تخلیق میں چھ روز کی مدت کیوں لگی	۵۷۳
تخلیق زمین و آسمان و سیارات سے پہلے دن رات کیسے پہچانے گئے؟	"
آیت ۵۵، ۵۶ مع خلاصۂ تفسیر	۵۷۵
معارف ومسائل	۵۷۷
احکام دعاء اور اس کے آداب	"
زمین کی درستی اور خرابی کیا ہے؟	۵۸۰
دعاء کے مزید دو آداب	۵۸۴
آیت ۵۷، ۵۸ مع خلاصۂ تفسیر	۵۸۵
معارف ومسائل	۵۸۶
آیت ۵۹ تا ۶۴ مع خلاصۂ تفسیر	۵۹۰
معارف ومسائل، واقعہ قوم نوح	۵۹۱
آیت ۶۵ تا ۷۲ مع خلاصۂ تفسیر	۵۹۶
معارف ومسائل، عاد اور ثمود کی مختصر تاریخ	۵۹۹
حضرت ہود علیہ السلام کا نسب نامہ اور بعض حالات	۶۰۰
آیت ۷۳ تا ۷۶ مع خلاصۂ تفسیر	۶۰۳
معارف ومسائل، واقعہ ثمود	۶۰۵
چند احکام و مسائل	۶۰۸
آیت ۷۷ تا ۷۹ مع خلاصۂ تفسیر	۶۰۹
معارف ومسائل	۶۱۰
آیت ۸۰ تا ۸۴ مع خلاصۂ تفسیر	۶۱۳
معارف ومسائل، واقعہ قوم لوط	۶۱۵
آیت ۸۵ تا ۸۷ مع خلاصۂ تفسیر	۶۱۹
معارف ومسائل، واقعہ اہل مدین	۶۲۱
آیت ۸۸ تا ۹۳ مع خلاصۂ تفسیر	۶۲۵
معارف ومسائل	۶۲۸

سُورَۃُ المَائِدَہ

(یہ سورت مدنی ہے، اس میں ایک سو بیس ۱۲۰ آیات اور سولہ ۱۶ رکوع ہیں)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ۬ؕ اُحِلَّتۡ لَکُمۡ
اے ایمان والو پورا کرو عہدوں کو حلال ہوئے تمہارے لئے

بَہِیۡمَۃُ الۡاَنۡعَامِ اِلَّا مَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ غَیۡرَ مُحِلِّی
چوپائے مویشی سوائے ان کے جو تم کو آگے سنائے جاویں گے

الصَّیۡدِ وَ اَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدُ ﴿۱﴾
مگر حلال نہ جانو شکار کو احرام کی حالت میں اللہ حکم کرتا ہے جو چاہے

سُورت کا شانِ نزول اور خلاصۂ مضامین

یہ سورۂ مائدہ کی ابتدائی آیت ہے۔ سورۂ مائدہ بالاتفاق مدنی سُورۃ ہے اور مدنی سورتوں میں بھی آخر کی سُورت ہے یہاں تک کہ بعض حضرات نے اس کو قرآن کی آخری سُورت بھی کہا ہے۔ مسند احمد میں بروایت حضرت عبد اللہ بن عمرؓ و اسماء بنت یزید منقول ہے کہ سُورۂ مائدہ رسُولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر اُس وقت نازل ہوئی جبکہ آپ سفر میں عضبا نامی اونٹنی پر سوار تھے۔ نزولِ وحی کے وقت جو غیر معمولی ثقل اور بوجھ ہوا کرتا تھا حسبِ دستور اُس وقت بھی ہوا۔ یہاں تک کہ اونٹنی عاجز ہو گئی۔ تو آپؐ اس سے نیچے اُتر آئے۔ یہ سفر بظاہر حجۃ الوداع

جو حکم ہے وہ بعینہ ایمان کا تقاضا ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ۔ لفظ عقود عقد کی جمع ہے، جس کے لفظی معنی باندھنے کے ہیں۔ اور جو معاہدہ دو شخصوں یا دو جماعتوں میں بندھ جائے اس کو بھی عقد کہا جاتا ہے۔ اس لئے یہ معنی عہد ہو گیا۔

امام تفسیر ابن جریر نے مفسرین صحابہ و تابعین کا اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ امام جصاص نے فرمایا کہ عقد کہا جاتا ہے یا عہد و معاہدہ اس کا اطلاق ایسے معاملہ پر ہوتا ہے جس میں دو فریق نے آئندہ زمانے میں کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کی پابندی ایک دوسرے پر ڈالی ہو۔ اور دونوں متفق ہو کر اس کے پابند ہوگئے ہوں۔ ہمارے عرف میں اسی کا نام معاہدہ ہے، اس لئے خلاصہ مضمون اس جملہ کا یہ ہو گیا کہ باہمی معاہدات کا پورا کرنا لازم و ضروری سمجھو۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ ان معاہدات سے کون سے معاہدات مراد ہیں۔ اس میں حضرات مفسرین کے اقوال بظاہر مختلف نظر آتے ہیں، کسی نے کہا ہے اس سے مراد وہ معاہدات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے ایمان و اطاعت کے متعلق لئے ہیں۔ یا وہ معاہدات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نازل شدہ احکام حلال و حرام سے متعلق اپنے بندوں سے لئے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی منقول ہے۔ اور بعض نے فرمایا کہ معاہدات سے اس جگہ وہ معاہدات مراد ہیں جو لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کیا کرتے ہیں۔ جیسے معاہدہ نکاح، معاہدہ بیع و شراء وغیرہ۔ مفسرین میں سے ابن زید اور زید بن اسلم اس طرف گئے ہیں۔ اور بعض نے فرمایا کہ معاہدات سے وہ حلف و معاہدے مراد ہیں جو زمانہ جاہلیت میں ایک دوسرے سے باہمی امداد کے لئے لیا کرتے تھے۔ مجاہد، ربیع، قتادہ وغیرہ مفسرین نے یہی فرمایا ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ان میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں۔ مذکورہ سب قسم کے معاہدات لفظ عقود کے تحت میں داخل ہیں اور سبھی پورے کرنے کے لئے قرآن کریم نے ہدایت دی ہے۔

اسی لئے امام راغب اصفہانی نے فرمایا کہ معاہدات کی جتنی قسمیں ہیں سب اس لفظ کے حکم میں داخل ہیں اور پھر فرمایا کہ اس کی ابتدائی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ معاہدہ جو انسان کا رب العالمین کے ساتھ ہے۔ مثلاً ایمان، طاعت کا عہد یا حلال و حرام کی پابندی کا عہد۔ دوسرے وہ معاہدہ جو ایک انسان کا خود اپنے نفس کے ساتھ ہے، جیسے کسی چیز کی نذر اپنے ذمہ مان لے یا حلف کرکے کوئی چیز اپنے ذمہ لازم کرلے۔ تیسرے وہ معاہدہ جو ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ ہے۔ اور اسی تیسری قسم میں وہ تمام معاہدات شامل ہیں جو دو شخصوں یا دو **جماعتوں یا دو حکومتوں کے درمیان ہوتے ہیں۔**

حکومتوں کے بین العالمی معاہدات یا باہمی سمجھوتے، جماعتوں کے باہمی عہد و پیمان

سزا دینے والے ہیں۔

معارف و مسائل

آیت کے پہلے جملہ میں ارشاد ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ یعنی اے ایمان والو اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو۔ اس میں لفظ شعائر جس کا ترجمہ نشانیوں سے کیا گیا ہے شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں علامت، اسی لئے شعائر و شعیرہ اس محسوس چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کی علامت ہو۔ شعائر اسلام ان اعمال و افعال کو کہا جائیگا جو عرفاً مسلمان ہونے کی علامت سمجھے جاتے ہیں اور محسوس و مشاہد ہیں جیسے نماز، اذان، حج، ختنہ اور سنت کے موافق ڈاڑھی وغیرہ۔ شعائر اللہ کی تفسیر اس آیت میں مختلف الفاظ سے منقول ہے مگر صاف بات وہ ہے جو بحر محیط اور روح المعانی میں حضرت حسن بصری اور عطاء رحمہ اللہ سے منقول ہے اور امام جصاص نے اس کو تمام اقوال کے لئے جامع فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ شعائر اللہ سے مراد تمام شرائع دین اور دین کے مقرر کردہ واجبات و فرائض اور ان کی حدود ہیں۔ اس آیت میں لَا تُحِلُّوْا شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ کے ارشاد کا یہی حاصل ہے کہ اللہ کے شعائر کی بے حرمتی نہ کرو۔ اور شعائر اللہ کی بے حرمتی ایک تو یہ ہے کہ سرے سے ان احکام کو نظر انداز کر دیا جائے، دوسرے یہ ہے کہ ان پر عمل تو کریں مگر ادھورا کریں، پورا نہ کریں، تیسرے یہ کہ مقرر کردہ حدود سے تجاوز کر کے آگے بڑھنے لگیں۔ لَا تُحِلُّوْا شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ میں ان تینوں صورتوں سے منع فرمایا گیا ہے۔

یہی ہدایت قرآن کریم نے دوسرے عنوان سے اس طرح ارشاد فرمائی ہے وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ یعنی جو شخص اللہ کی حرمات کی تعظیم کرے تو وہ دلوں کے تقویٰ کا ثمرہ ہے۔ آیت کے دوسرے جملہ میں شعائر اللہ کی ایک خاص قسم یعنی شعائر حج کی کچھ تفصیلات بتلائی گئی ہیں۔

ارشاد ہے وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَاۗىِٕدَ وَلَآ اٰۗمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا یعنی شہر حرام میں قتل و قتال کر کے اس کی بے حرمتی نہ کرو۔ اشہر حرم وہ چار مہینے ہیں جن میں باہمی جنگ کرنا شرعاً حرام تھا، ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب۔ بعد میں یہ حکم جمہور علماء کے نزدیک منسوخ ہو گیا۔ ہدی حرم مکہ میں قربان ہونے والے جانور، اور خصوصاً وہ جن کے گلے میں قربانی کی علامت کے طور پر قلادہ ڈالا گیا، ان کی بے حرمتی نہ کرو۔ ان جانوروں کی بے حرمتی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ان کو حرم تک پہنچنے سے

کہ صرف چند پیسے دے کر آپ ان سب سے خدمت لے لیں۔ ان لوگوں کو کسی حکومت نے مجبور کیا ہے یا کسی نے پابند کیا ہے کہ یہ ساری چیزیں آپ کے لئے مہیا کر دیں، بجز اس قانونِ قدرت کے جو قلوب کے مالک نے تکوینی طور پر ہر ایک کے دل پر جاری فرما دیا ہے۔

آج کل سوشلسٹ ممالک نے اس قدرتی نظام کو بدل کر ان چیزوں کو حکومت کی ذمہ داری بنا دیا کہ کون انسان کیا کام کرے۔ اس کے لئے ان کو سب سے پہلے جبر و ظلم کے ذریعہ انسانی آزادی سلب کرنا پڑی جس کے نتیجہ میں ہزاروں انسانوں کو قتل کیا گیا۔ ہزاروں کو قید کیا گیا۔ باقی ماندہ انسانوں کو شدید جبر و ظلم کے ذریعہ مشین کے پرزوں کی طرح استعمال کیا۔ جس کے نتیجہ میں اگر کسی جگہ کچھ اشیاء کی پیداوار بڑھ بھی گئی تو انسانوں کی انسانیت ختم ہو کر رہ گئی۔ تو یہ سودا مہنگا نہیں پڑا۔ قدرتی نظام میں ہر انسان آزاد بھی ہے اور قدرتی تقسیم طبائع کی بنا پر خاص خاص کاموں کے لئے مجبور بھی اور وہ مجبوری کسی دوسرے کی نہیں اپنی طبیعت سے ہے۔ اس لئے اس کو کوئی بھی جبر محسوس نہیں کرتا۔ سخت سے سخت محنت اور ذلیل سے ذلیل کام کے لئے خود آگے بڑھنے والے اور کوشش کر کے حاصل کرنے والے ہر شہر ہر زمانے میں ملتے ہیں۔ اور اگر کوئی حکومت ان کو اس کام کے لئے مجبور کرنے لگے تو یہ سب اس سے بھاگنے لگیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ساری دنیا کا نظام باہمی تعاون پر قائم ہے لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے کہ یہ جرائم، چوری، ڈاکہ، قتل و غارتگری وغیرہ کے لئے یہ باہمی تعاون ہونے لگے۔ چور اور ڈاکوؤں کی بڑی بڑی اور منظم فوجی جماعتیں بن جائیں تو یہی تعاون و تناصر اس عالم کے سارے نظام کو درہم برہم بھی کر سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ باہمی تعاون ایک دو دھاری تلوار ہے جو الٹی بھی چل سکتی ہے۔ اور نظام عالم کو برباد بھی کر سکتی ہے۔ اور یہ عالم چونکہ خیر و شر اور اچھے برے، نیک و بد کا ایک مرکب معجون ہے اس لئے اس میں ایسا ہونا کچھ بعید بھی نہ تھا کہ جرائم اور قتل و غارت یا نقصان رسانی کے لئے باہمی تعاون کی قوت استعمال کرنے لگیں۔ اور یہ صرف احتمال نہیں بلکہ واقعہ بن کر دنیا کے سامنے آ گیا۔ تو اس کے ردعمل کے طور پر عقلائے دنیا نے اپنے تحفظ کے لئے مختلف نظریوں پر خاص خاص جماعتوں یا قوموں کی بنیاد ڈالی۔ کہ ایک جماعت یا ایک قوم کے خلاف جب کوئی دوسری جماعت یا قوم حملہ آور ہو تو یہ سب ان کے مقابلہ میں باہمی تعاون کی قوت کو استعمال کر کے مدافعت کر سکیں۔

قومیتوں کی تقسیم عبد الکریم شہرستانی کی ملل و نحل میں ہے کہ شروع میں جب تک انسانی

آبادی زیادہ نہیں تھی تو دنیا کے چار سمتوں کے اعتبار سے چار قومیں بن گئیں۔ مشرقی، مغربی، جنوبی، شمالی۔ ان چاروں میں ہر ایک سمت کے لوگ اپنے آپ کو ایک قوم اور دوسروں کو دوسری قوم سمجھنے لگے۔ اور اسی بنیاد پر تعاون و تناصر قائم کر لیا۔ اس کے بعد جب آبادی زیادہ پھیلی تو ہر سمت کے لوگوں میں نسبی و خاندانی بنیادوں پر قومیت و اجتماعیت کا تصور ایک اصول بن گیا۔ عرب کا سارا نظام اسی نسبی و قبائلی بنیاد پر تھا۔ اسی پر جنگیں لڑی جاتی تھیں۔ بنو ہاشم ایک قوم، بنو تمیم دوسری قوم، بنو خزاعہ تیسری قوم۔ ہندوستان کے ہندوؤں میں تو آج تک اونچی ذات اور نیچی ذات کی تفریق اسی طرح چل رہی ہے۔

یورپین اقوام نے دورِ جدید میں کوئی پیمانہ نسب باقی نہ رکھا۔ نہ دنیا کے انساب کو کچھ سمجھا، جب دنیا میں ان کا عروج ہوا تو نسبی و قبائلی قومیتیں اور تقسیمیں ختم کر کے جدید وطنی اور جغرافیائی، وطنی و لسانی بنیادوں پر انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے الگ الگ قومیں کھڑی کر دی گئیں۔ اور آج یہی سب سے بڑا بت ساری دنیا میں پل رہا ہے۔ یہاں تک کہ یہ جادو مسلمانوں پر بھی چل گیا۔ عربی، عجمی، عراقی، سندھی کی تقسیمیں ہی نہیں بلکہ ان میں بھی تقسیم در تقسیم ہو کر مصری، شامی، حجازی، نجدی اور پنجابی، بنگالی، سندھی، ہندی وغیرہ الگ الگ قومیں بن گئیں۔ حکومت کے سب کاروبار انہیں بنیادوں پر چلنے لگے۔ یہاں تک کہ یہ جغرافیائی عصبیت ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اور ہر قوم کے لوگوں کا تعاون و تناصر اسی بنیاد پر ہونے لگا۔

قومیت اور اجتماعیت کے لئے قرآنی تعلیم

قرآن کریم نے انسان کو پھر بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ سورۂ نساء کی پہلی آیت میں یہ واضح کر دیا کہ تم سب ایک انسان یعنی ماں باپ کی اولاد ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح کرتے ہوئے حجۃ الوداع کے خطبہ میں اعلان کر دیا کہ کسی عربی کو عجمی پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ فضیلت کا مدار صرف تقویٰ اور اطاعت خدائے تعالیٰ پر ہے۔ اسی قرآنی تعلیم نے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ کا اعلان کر کے حبشہ کے کالے بلال کو، سرخ ترکی و رومی کو، اور عجم کی نچلی ذات کے انسانوں کو عرب کے قریشی اور ہاشمی کا بھائی بنا دیا۔ قومیت و اجتماعیت کی اسی بنیاد پر تقسیم کی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو ماننے والے ایک قوم۔ اور نہ ماننے والے دوسری قوم ہیں۔ یہی وہ بنیاد تھی جس نے ابوجہل اور ابولہب کے خاندانی رشتوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے توڑ دیا۔ اور بلال حبشی اور صہیب رومی کا رشتہ جوڑ دیا۔

عُدْوَان کو سخت جرم قرار دیا۔ اس پر تعاون کرنے سے روکا۔ بِرّ و تقویٰ کے دو لفظ اختیار فرمائے۔ جمہور مفسرین نے بِرّ کے معنی اس جگہ فعل الخیرات یعنی نیک عمل قرار دئے ہیں اور تقویٰ کے معنی ترک المنکرات یعنی برائیوں کا ترک بتلائے ہیں۔ اور لفظ اثم مطلق گناہ اور معصیت کے معنی میں ہے۔ خواہ وہ حقوق سے متعلق ہو یا عبادات سے اور عُدوان کے لفظی معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ مراد اس سے ظلم و جور ہے۔

بِرّ و تقویٰ پر تعاون اور امداد کرنے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ الدال علی الخیر کفاعلہ۔ یعنی جو شخص کسی نیکی کا راستہ بتادے تو اس کا ثواب ایسا ہی ہے جیسے اس نیکی کو اس نے خود کیا ہو۔ یہ حدیث ابن کثیر نے بحوالہ بزار نقل فرمائی ہے۔ اور صحیح بخاری میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص لوگوں کو ہدایت اور نیکی کی طرف دعوت دے تو جتنے آدمی اس کی دعوت پر نیک عمل کریں گے، ان سب کی برابر اس کو بھی ثواب ملے گا، بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے ثواب میں سے کچھ کم کیا جائے۔ اور جس شخص نے لوگوں کو کسی گمراہی یا گناہ کی طرف بلایا۔ تو جتنے لوگ اس کے بلانے سے گناہ میں مبتلا ہوں گے ان سب کے گناہوں کی برابر اس کو بھی گناہ ہوگا۔ بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں کچھ کمی کی جائے۔

اور ابن کثیر نے بروایت طبرانی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی ظالم کے ساتھ اس کی مدد کرنے کے لئے چلا وہ اسلام سے نکل گیا۔ اسی لئے سلف صالحین نے ظالم بادشاہوں کی ملازمت اور کوئی عہدہ قبول کرنے سے سخت احتراز کیا ہے کہ اس میں ان کے ظلم کی امداد و اعانت ہے۔ تفسیر روح المعانی میں آیت کریمہ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز آواز دی جائے گی کہ کہاں ہیں ظالم لوگ اور ان کے مددگار یہاں تک کہ وہ لوگ جنہوں نے ظالموں کے دوات قلم کو درست کیا ہے۔ وہ بھی سب ایک لوہے کے تابوت میں جمع کرکے جہنم میں پھینک دئے جائیں گے۔

یہ ہے قرآن و سنت کی وہ تعلیم جس نے دنیا میں نیکی۔ انصاف۔ ہمدردی۔ اور خوش خلقی پھیلانے کے لئے ملت کے ہر فرد کو ایک داعی بنا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اور جرائم و ظلم و جور کے انسداد کے لئے ہر فرد ملت کو ایک ایسا سپاہی بنا دیا تھا جو خفیہ اور علانیہ اپنی ڈیوٹی بجا لانے پر خوف خدا تعالیٰ کی وجہ سے مجبور تھا۔ اسی حکیمانہ تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا جو دنیا نے صحابہ و تابعین کے قرن میں دیکھا۔ آج بھی جب کسی ملک میں

جنگ کا خطرہ لاحق ہوتا ہے تو شہری دفاع کے محکمے قائم کرکے ہر فرد قوم کو کچھ فنون کی تعلیم کا تو اہتمام کیا جاتا ہے مگر جرائم کے انسداد کے لئے اس کا کہیں اہتمام نہیں ہے کہ لوگوں کو لوٹ، مار، دغا اور شر کو روکنے والا سپاہی بنانے کی کوشش کریں۔ اور ظاہر ہے کہ اسکی مشق نہ فوجی پریڈ سے ہوتی ہے نہ شہری دفاع کے طریقوں سے۔ یہ ہنر تو تعلیم گاہوں میں سیکھنے سکھانے کا ہے جو آجکل بدقسمتی سے ان چیزوں کے نام سے ناآشنا ہے۔ بِرّ و تقویٰ اور ان کی تعلیمات کا داخلہ آجکل کی عام تعلیم گاہوں میں ممنوع ہے۔ اور اِثم و عدوان کا ہر راستہ کھلا ہوا ہے۔ پھر یہ بیچاری پولیس کہاں تک جرائم کی روک تھام کرے۔ جب ساری قوم حلال و حرام اور حق و ناحق سے بیگانہ ہو کر جرائم پیشہ بن جائے۔ آج جو جرائم کی کثرت چوری، ڈاکہ، فواحش، قتل و غارت گری کی فراوانی ہر جگہ اور ہر ملک میں روز بروز زیادہ تر ہوتی جاتی ہے اور قانونی مشینری ان کے انسداد سے عاجز ہے۔

اس کے یہی دو سبب ہیں کہ ایک طرف تو حکومتیں اس قرآنی نظام سے دُور ہیں۔ اُن کے ارباب اقتدار اپنی زندگی کو برّ و تقویٰ کے اصول پر ڈالتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ اگرچہ اسکے نتیجہ میں ہزاروں تلخیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔ کاش وہ اس تلخ گھونٹ کو ایک دفعہ تجربہ کے لئے ہی پی جائیں، اور خدا تعالیٰ کی قدرت کا تماشہ دیکھیں کہ کس طرح ان کو اور عوام کو امن و سکون اور چین و راحت کی حیات طیبہ عطا ہوتی ہے۔

دوسری طرف عوام نے یہ سمجھ لیا کہ انسداد جرائم صرف حکومت کا کام ہے۔ وہ ہر جرائم پیشہ کے جرائم پر پردہ ڈالنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ محض احقاقِ حق اور انسدادِ جرائم کے لئے سچی شہادت دینے کا رواج ہی ان میں نہ رہا۔ ان کو یہ سمجھنا چاہئے کہ مجرم کے جرم پر پردہ ڈالنا اور شہادت سے گریز کرنا جرم کی اعانت ہے جو از روئے قرآن کریم حرام اور سخت گناہ ہے۔ اور وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ کے حکم سے بغاوت ہے۔

❊

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ

حرام ہوا تم پر مردہ جانور اور لہو اور گوشت سور کا اور جس

اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ

جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا اور جو مر گیا ہو گلا گھونٹنے سے یا چوٹ سے یا اونچے سے گر کر

وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۣ وَمَا ذُبِحَ

یا سینگ مارنے سے اور جس کو کھایا ہو درندہ نے مگر جس کو تم نے ذبح کرلیا اور حرام ہے جو ذبح

عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ۭ ذٰلِكُمْ

جو کسی تھان پر اور یہ کہ تقسیم کرو جوئے کے تیروں سے یہ گناہ کا کام ہے

فِسْقٌ ۭ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا

آج ناامید ہوگئے کافر تمہارے دین سے سو ان سے

تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۭ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ

مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو آج میں پورا کرچکا تمہارے لئے دین تمہارا اور

اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ

پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین

فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ

پھر جو کوئی لاچار ہو جاوے بھوک میں لیکن گناہ پر مائل نہ ہو

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۳)

تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصہ تفسیر

تم پر یہ جانور وغیرہ حرام کئے گئے ہیں مردار (جانور جو کہ باوجود واجب الذبح ہونے کے بدون ذبح شرعی مر جاوے) اور خون (جو بہتا ہو) اور خنزیر کا گوشت (اسی طرح اس کے سب اجزاء) اور جو جانور کہ (بقصد تقرب) غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو اور جو گلا گھٹنے سے مر جاوے اور جو کسی ضرب سے مر جاوے اور جو اونچے سے گر کر مر جاوے (مثلاً پہاڑ سے یا کنوئیں میں) اور جو کسی کی ٹکر سے مر جاوے اور جس کو کوئی درندہ (پکڑ کر) کھانے لگے اور اس کے صدمہ سے مر جاوے، لیکن منخنقہ سے ما اکل السبع تک جن کا ذکر ہے ان میں سے جس کو تم (دم نکلنے سے پہلے قاعدہ شرعیہ کے مطابق) ذبح کر ڈالو وہ اس حرمت سے مستثنیٰ ہے، اور (نیز) جو جانور (غیر اللہ کی) پرستش گاہوں پر ذبح کیا جاوے (حرام ہے گو زبان سے غیر اللہ کے نامزد نہ کرے، کیونکہ مدار حرمت کا نیت تعظیم پر ہے، اس کا ظہور کبھی قول سے ہوتا ہے کہ نامزد کرے کبھی فعل سے ہوتا ہے کہ ایسے مقامات پر ذبح کرے) اور یہ (بھی حرام ہے) کہ (گوشت وغیرہ) تقسیم کرو بذریعہ قرعہ کے تیروں کے یہ سب گناہ (اور حرام) ہیں، آج کے دن (یعنی اب) ناامید ہوگئے کافر لوگ تمہارے دین (کے مغلوب و کالعدم ہوجانے) سے (کیونکہ ماشاء اللہ اسلام کا خوب شیوع ہوگیا) سو ان (کفار) سے مت ڈرنا (کہ تمہارے دین کو کالعدم کرسکیں) اور مجھ سے ڈرتے رہنا (یعنی میرے احکام کی مخالفت مت کرنا) آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے ہر طرح کامل کر دیا (قوت میں بھی جس سے کفار کو

مایوسی ہوئی اور احکام و قواعد دین بھی، اور اس کمال سے، میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا (دینی انعام بھی کہ احکام کی تکمیل ہوئی اور دنیوی انعام بھی کہ قوت حاصل ہوئی، دونوں کمال دین میں دونوں آگئے) اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے ہمیشہ کو پسند کر لیا (یعنی قیامت تک تمہارا یہی دین رہے گا، اس کو منسوخ کرکے دوسرا دین تجویز نہ کیا جاوے گا، پس تم کو چاہیے کہ میری نعمت کا شکر کرتے اس دین پر پورے پورے قائم رہو) پھر (اشیاء مذکورہ بالا کی حرمت دریافت کر لینے کے بعد یہ بھی معلوم کر لو کہ) جو شخص شدت کی بھوک میں بیتاب ہو جاوے (اور اس وجہ سے اشیاء بالا کو کھالے) بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو (یعنی نہ قدر ضرورت سے زیادہ کھاوے اور نہ لذت مقصود ہو جس کو سورۂ بقرہ میں غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ سے تعبیر فرمایا ہے) تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں (اگر قدر ضرورت کا پورا اندازہ نہ ہوا اور ایک آدھ لقمہ زیادہ بھی کھا گیا) اور رحمت والے ہیں (کہ ایسی حالت میں اجازت دے دی)۔

معارف ومسائل

یہ سورۂ مائدہ کی تیسری آیت ہے، جس میں بہت سے اصولی اور فروعی احکام و مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ پہلا مسئلہ حلال و حرام جانوروں کا ہے۔ جن جانوروں کا گوشت انسان کے لئے مضر ہے، خواہ جسمانی طور پر کہ اس سے انسان کے بدن میں بیماری کا خطرہ ہے، یا روحانی طور پر کہ اس سے انسان کے اخلاق اور قلبی کیفیات خراب ہونے کا خطرہ ہے، ان کو قرآن نے خبائث قرار دیا اور حرام کر دیا، اور جن جانوروں میں کوئی جسمانی یا روحانی مضرت نہیں ہے، ان کو طیب اور حلال قرار دیا۔

اس آیت میں فرمایا ہے کہ حرام کئے گئے تم پر مردار جانور۔ مردار سے مراد وہ جانور ہیں جو بغیر ذبح کے کسی بیماری کے سبب یا طبعی موت سے مر جائیں۔ ایسے مردار جانور کا گوشت "طبی" طور پر بھی انسان کے لئے سخت مضر ہے اور روحانی طور پر بھی۔

البتہ حدیث شریف میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چیزوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے، ایک "مچھلی" دوسرے ٹڈی۔ یہ حدیث مسند احمد، ابن ماجہ، دارقطنی، بیہقی وغیرہ نے روایت کی ہے۔

دوسری چیز جس کو اس آیت نے حرام قرار دیا ہے وہ خون ہے، اور قرآن کریم کی دوسری آیت میں اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا فرما کر یہ بتلا دیا گیا کہ خون سے مراد بہنے والا خون ہے

عمارت یا کنویں وغیرہ میں گر کر مر جائے وہ بھی حرام ہے۔ اسی لئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اگر کوئی شکار پہاڑ پر کھڑا ہے، اور تم نے تیر بسم اللہ پڑھ کر اس پر پھینکا اور وہ تیر کی زد سے نیچے گر کر مر گیا تو اس کو نہ کھاؤ۔

کیونکہ اس میں بھی احتمال ہے کہ اس کی موت تیر کی زد سے نہ ہو گرنے کے صدمہ سے ہو تو وہ متردیہ میں داخل ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی پرندہ پر تیر پھینکا، وہ پانی میں گر گیا تو اس کے کھانے کو بھی اسی بنا پر منع فرمایا ہے کہ یہاں بھی احتمال ہے کہ اس کی موت ڈوبنے سے واقع ہوئی ہو (جصاص)۔

اور حضرت عدی بن حاتمؓ نے بھی یہی مضمون رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی روایت فرمایا ہے۔ (جصاص)۔

آٹھویں۔ نطیحہ۔ یعنی وہ جانور جو کسی ٹکر اور تصادم سے ہلاک ہو گیا ہو۔ جیسے ریل، موٹر وغیرہ کی زد میں آکر مر جائے یا کسی دوسرے جانور کی ٹکر سے مر جائے۔

نویں۔ وہ جانور جس کو کسی درندہ جانور نے پھاڑ دیا ہو اس سے مر گیا ہو۔

ان نو اقسام کی حرمت بیان فرمانے کے بعد ایک استثناء ذکر کیا گیا۔ فرمایا۔۔

اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ۔ یعنی اگر ان جانوروں میں سے تم نے کسی کو زندہ پالیا اور ذبح کر لیا تو وہ حلال ہو گیا۔ اس کا کھانا جائز ہے۔

یہ استثناء شروع کی چار قسموں سے متعلق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میتہ اور دم میں تو اس کا امکان ہی نہیں۔ اور خنزیر اور مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ۔ یعنی ذات سے حرام ہیں، ذبح کرنا نہ کرنا ان میں برابر ہے۔ اسی لئے حضرت علیؓ۔ ابن عباسؓ۔ حسن بصری۔ قتادہ۔ وغیرہ سلف صالحین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ استثناء ابتدائی چار کے بعد یعنی منخنقہ اور اس کے مابعد سے متعلق ہے۔ اس لئے مطلب اس کا یہ ہو گیا کہ ان تمام صورتوں میں اگر جانور زندہ پایا گیا، زندگی کی علامتیں محسوس کی گئیں اور اسی حالت میں اس کو اللہ کے نام پر ذبح کر دیا گیا تو وہ حلال ہے۔ خواہ وہ منخنقہ ہو، یا موقوذہ یا متردیہ اور نطیحہ یا جسکو درندے نے پھاڑ ڈالا ہے۔ ان میں سے جس کو بھی آثار زندگی محسوس کرتے ہوئے ذبح کر لیا وہ حلال ہو گیا۔

دسویں۔ وہ جانور حرام ہے جو نُصُب پر ذبح کیا گیا ہو۔ نُصُب وہ پتھر ہیں جو کعبہ کے گرد کھڑے کئے ہوئے تھے۔ اور اہل جاہلیت ان کی پرستش کرتے اور ان کے پاس لا کر جانوروں کی قربانی ان کے لئے کرتے تھے۔ اور اس کو عبادت سمجھتے تھے۔

اہل جاہلیت ان سب قسم کے جانوروں کو کھانے کے عادی تھے جو خبائث میں داخل ہیں۔ قرآن کریم نے ان سب کو حرام قرار دیا۔

گیارھویں چیز جس کو اس آیت میں حرام قرار دیا ہے۔ وہ استقسام بالازلام ہے۔ ازلام، زلم کی جمع ہے۔ زلم اس تیر کو کہتے ہیں جو جاہلیت عرب میں اس کام کے لئے مقرر تھا کہ اس کے ذریعہ قسمت آزمائی کی جاتی تھی اور یہ سات تیر تھے۔ جن میں سے ایک پر نعم ایک پر لا۔ اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ لکھے ہوتے تھے۔ اور یہ تیر بیت اللہ کے خادم کے پاس رہتے تھے۔

جب کسی شخص کو اپنی قسمت یا آئندہ کسی کام کا مفید ہونا یا مضر ہونا معلوم کرنا ہوتا، تو خادم کعبہ کے پاس جاتے اور سو روپے اس کو نذرانہ دیتے وہ ان تیروں کو ترکش سے ایک ایک کرکے نکالتا۔ اگر اس پر لفظ نعم نکل آیا تو سمجھتے تھے کہ یہ کام مفید ہے، اور اگر لا نکل آیا تو سمجھتے تھے کہ یہ کام نہ کرنا چاہئے۔ حرام جانوروں کے سلسلہ میں اس کا ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عرب کی یہ بھی عادت تھی کہ چند آدمی شریک ہو کر کوئی اونٹ وغیرہ ذبح کرتے مگر گوشت کی تقسیم ہر ایک کے حصہ شرکت کے مطابق کرنے کے بجائے ان جوئے کے تیروں سے کرتے تھے جس میں کوئی بالکل محروم رہتا، کسی کو بہت زیادہ، کسی کو حق سے کم ملتا تھا اس لئے جانوروں کی حرمت کے ساتھ اس طریقۂ کار کی حرمت کا بیان کر دیا گیا۔

علماء نے فرمایا کہ آئندہ کے حالات اور غیب کی چیزیں معلوم کرنے کے جتنے طریقے رائج ہیں، خواہ اہل جفر کے ذریعہ یا ہاتھ کے نقوش دیکھ کر یا فال وغیرہ نکال کر یہ سب طریقے استقسام بالازلام کے حکم میں ہیں۔

اور استقسام بالازلام کا لفظ کبھی قمار یعنی جوئے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ جس میں قرعہ اندازی یا لاٹری کے طریقوں سے حقوق کی تعیین کی جائے۔ یہ بھی بنص قرآن حرام ہے۔ جس کو قرآن کریم نے میسر کے نام سے ممنوع قرار دیا ہے۔ اسی لئے حضرت سعید بن جبیر، مجاہد، اور شعبی نے فرمایا کہ جس طرح عرب ازلام کے ذریعہ حصے نکالتے اسی طرح فارس و روم میں شطرنج، چوسر وغیرہ کے مہروں سے یہ کام لیا جاتا ہے۔ وہ ازلام کے حکم میں ہیں۔ (مظہری)

استقسام بالازلام کی حرمت کے ساتھ ارشاد فرمایا:-

ذٰلِكُمْ فِسْقٌ، یعنی یہ طریقہ قسمت معلوم کرنے یا حصہ مقرر کرنے کا فسق اور

گمراہی ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا:۔

الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ

آج کے دن کافر تمہارے دین پر غالب آنے سے مایوس ہو چکے ہیں، اس لئے اب تم ان سے کوئی خوف نہ رکھو البتہ مجھ سے ڈرتے رہو۔

یہ آیت ہجرت کے دسویں سال حجۃ الوداع کے یوم عرفہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، جبکہ مکہ اور تقریباً سارا عرب فتح ہو چکا تھا۔ پورے جزیرۃ العرب پر اسلامی قانون جاری تھا، اس پر فرمایا کہ اب سے پہلے جو کافر یہ منصوبے بنایا کرتے تھے کہ مسلمانوں کی جماعت ہمارے مقابلہ میں کم بھی ہے اور کمزور بھی، ان کو ختم کر دیا جائے، اب نہ ان کے یہ حوصلے باقی رہے، نہ ان کی وہ طاقت رہی، اس لئے مسلمان ان سے مطمئن ہو کر اپنے رب کی اطاعت وعبادت میں لگ جائیں۔

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا

اس آیت کے نزول کی خاص شان ہے، عرفہ کا دن ہے جو تمام سال کے دنوں میں سید الایام ہے اور اتفاق سے یہ عرفہ جمعہ کے دن واقع ہوا جس کے فضائل معروف ہیں۔ مقام میدان عرفات کا جبل رحمت کے قریب ہے جو عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزول رحمت کا خاص مقام ہے۔ وقت عصر کے بعد کا ہے، جو عام دنوں میں بھی مبارک وقت ہے اور خصوصاً یوم جمعہ میں کہ قبولیت دعا کی گھڑی بہت سی روایات کے مطابق اسی وقت آتی ہے، اور عرفہ کے روز اور زیادہ خصوصیت کے ساتھ دعائیں قبول ہونے کا خاص وقت ہے۔

حج کے لئے مسلمانوں کا سب سے بڑا عظیم اجتماع ہے جس میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شریک ہیں، رحمۃ للعالمین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ جبل رحمت کے نیچے اپنی ناقہ "عضباء" پر سوار ہیں، اور حج کے سب سے بڑے رکن یعنی وقوف عرفات میں مشغول ہیں۔

ان فضائل وبرکات اور رحمتوں کے سایہ میں یہ آیت کریمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی ہے۔ صحابہ کرام کا بیان ہے کہ جب آپ پر یہ آیت بذریعہ وحی نازل ہوئی تو حسب دستور وحی کا ثقل اور بوجھ اتنا محسوس ہوا کہ اونٹنی اس سے دبی جا رہی تھی یہاں تک کہ مجبور ہو کر بیٹھ گئی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت تقریباً قرآن کی آخری آیت

قوموں کے لئے نہیں ہوگا، بلکہ اس کو منسوخ کرکے دوسرا دین وشریعت نافذ کی جائے گی۔ بخلاف شریعت اسلام کے جو سب سے آخر میں نازل کی گئی ہے، وہ ہر جہت اور ہر لحاظ سے کامل و مکمل ہے، نہ وہ کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ کسی خاص خطہ، ملک یا قوم کے ساتھ، بلکہ قیامت تک ہر زمانہ اور ہر خطہ اور ہر قوم کے لئے یہ شریعت کامل و مکمل ہے۔

تیسرا انعام جو اس امت محمدیہ کے لئے اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس امت کے لئے اللہ جل شانہ نے اپنی طرف سے ذریعہ دین اسلام کو منتخب فرمایا جو ہر حیثیت سے کامل و مکمل ہے، اور جس پر نجات کا انحصار ہے۔

خلاصہ مضمون یہ ہے کہ اس آیت نے یہ بتلادیا کہ امت محمدیہ کے لئے دین اسلام ایک بڑی نعمت ہے جو ان کو بخشی گئی ہے، اور یہی دین ہے جو ہر حیثیت اور ہر جہت سے کامل و مکمل ہے، نہ اس کے بعد کوئی نیا دین آئے گا اور نہ اس میں کوئی کمی بیشی کی جائے گی۔

یہی وجہ تھی کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو عام مسلمان اس کو سن کر خوش ہو رہے تھے مگر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر گریہ طاری تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے رونے کی وجہ پوچھی تو عرض کیا کہ اس آیت سے اس کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کا قیام اس دنیا میں بہت کم ہے، کیونکہ تکمیل کے ساتھ ارسال رسول کی ضرورت بھی پوری ہوگئی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق فرمائی۔ (تفسیر ابن کثیر و بحر محیط وغیرہ) چنانچہ آنے والے وقت نے بتلادیا کہ اس کے صرف اکیاسی روز بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

آخر آیت میں فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَةٍ کا تعلق اُن جانوروں سے ہے، جن کی حرمت کا بیان شروع آیت میں آیا ہے، اور اس جملہ کا مطلب ایک خاص حالت کو عام قاعدہ سے مستثنیٰ کرنا ہے، کہ اگر کوئی شخص بھوک کی شدت سے بیتاب ہو جائے اور خطرہ موت کا لاحق ہو جائے، ایسی حالت میں اگر وہ مذکورہ بالا حرام جانوروں میں سے کچھ کھالے تو اس کے لئے گناہ نہیں، مگر شرط یہ ہے کہ پیٹ بھرنا اور لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو، بلکہ صرف اتنا کھالے جس سے اضطرار کی کیفیت رفع ہو جائے۔

آیت میں غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ کا یہی مطلب ہے کہ اس کھانے میں اُس کا میلان گناہ کی طرف نہ ہو بلکہ صرف اضطرار کو رفع کرنا ہو ——— آخر میں فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ محرمات اس وقت بھی اپنی جگہ حرام

بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ⑤ ع ۵

ایمان سے تو ضائع ہوئی محنت اس کی اور آخرت میں وہ ٹوٹے والوں میں ہے

خلاصۂ تفسیر

آج (تم پر) جیسے دینی ابدی انعام ہوا کہ اکمال دین سے مشرف کئے گئے۔ اسی طرح ایک معتدبہ دنیوی ابدی انعام یہ ہوا کہ تمہارے لئے حلال چیزیں (کہ اس سے پہلے حلال کر دی گئی تھیں ہمیشہ کے لئے) حلال رکھی گئیں (کہ کبھی منسوخ نہ ہوں گی)، اور جو لوگ (تم سے پہلے آسمانی) کتاب دیئے گئے ہیں (یعنی یہود و نصاریٰ، ان کا ذبیحہ بھی، تم کو حلال ہے اور (اس کا حلال ہونا ایسا ہی یقینی ہے جیسا)، تمہارا ذبیحہ ان کو حلال ہے اور پارسا عورتیں بھی جو مسلمان ہوں (تم کو حلال ہیں)، اور (جیسا مسلمان عورتوں کا حلال ہونا یقینی ہے اسی طرح) پارسا عورتیں اُن لوگوں میں سے بھی جو تم سے پہلے کتاب (آسمانی) دیئے گئے ہیں تم کو حلال ہیں، جب تم ان کو ان کا معاوضہ دے دو (یعنی مہر دینا کچھ شرط نہیں مگر واجب ہے اور عورتیں مذکورہ جو حلال کی گئی ہیں تو) اس طرح سے کہ تم (ان کو) بیوی بناؤ (یعنی نکاح میں لاؤ جن کی شرطیں شرع میں معلوم ہیں)، نہ تو علانیہ بدکاری کرو اور نہ خفیہ آشنائی کرو (یہ سب احکام شرعیہ ہیں جن پر ایمان لانا فرض ہے) اور جو شخص ایمان (لانے کی چیزوں) کے ساتھ کفر کرے گا (مثلاً حلال قطعی کی حلت کا یا حرام قطعی کی حرمت کا انکار کرے گا)، تو اس شخص کا (ہر نیک) عمل غارت (اور اکارت) ہو جاوے گا اور وہ شخص آخرت میں بالکل زیاں کار ہوگا۔ (پس حلال کو حلال سمجھو اور حرام کو حرام سمجھو)۔

معارف و مسائل

سورۂ مائدہ کی پہلی آیت میں بہیمۃ الانعام یعنی پالتو جانور، بکری، گائے، بھینس وغیرہ کا حلال ہونا بیان فرمایا گیا ہے اور تیسری آیت میں نو قسم کے حرام جانوروں کی تفصیل ہے مگر اس تفصیل سے پہلے اس کے ابتدائی جملہ میں اس پورے باب کا ضابطہ اس طرح بیان فرما دیا ہے کہ اس میں جانوروں کی حلت و حرمت کا ضابطہ بھی معلوم ہو گیا۔ اور اس کا ایک معیار و اصول بھی۔

ارشاد ہے، اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ یعنی آج تمہارے لئے حلال ہوئیں

سب صاف ستھری چیزیں حلال کی گئیں" دوسرا وہ دن ہے جس میں یہ آیت اور اس سے پہلی آیات نازل ہوئی ہیں یعنی حجۃ الوداع کا عرفہ کا دن، مطلب یہ ہے کہ جیسے آج تمہارے لئے دین کامل مکمل کر دیا گیا، اور اللہ تعالیٰ کی نعمت تم پر مکمل ہوگئی، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ چیزیں جو پہلے بھی تمہارے لئے حلال تھیں دائمی طور پر حلال رہیں گی، اور ان کے منسوخ ہونے کا احتمال ختم ہوا، کیونکہ سلسلہ وحی ختم ہونے والا ہے۔

اس جملہ میں طیبات حلال ہونے کا بیان ہے اور ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے: یُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰۗىِٕثَ۔ یعنی حلال کرتا ہے ان کے لئے طیبات اور حرام کرتا ہے ان پر خبائث۔ اس میں طیبات کے بالمقابل خبائث ذکر کر کے ان دونوں لفظوں کی حقیقت واضح کر دی گئی۔

لغت میں طیبات صاف ستھری اور مرغوب چیزوں کو کہا جاتا ہے۔ اور خبائث اس کے بالمقابل گندی اور قابل نفرت چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس لئے آیت نے اس طرف بتلادیا کہ جتنی چیزیں صاف ستھری مفید اور پاکیزہ ہیں وہ انسان کے لئے حلال کی گئیں، اور جو گندی قابل نفرت اور مضر ہیں وہ حرام کی گئی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انسان دوسرے جانوروں کی طرح نہیں ہے۔ اس کا مقصد زندگی دنیا میں کھانے پینے، سونے جاگنے اور جینے مرنے تک محدود ہو۔ اس کو قدرت نے ایک خاص مقصد کے لئے بنایا ہے اور وہ مقصد اعلیٰ پاکیزہ اخلاق کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے بد اخلاق انسان درحقیقت انسان کہلانے کے قابل نہیں۔

اسی لئے قرآن کریم نے ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ یعنی وہ چوپاؤں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ اور جب انسان کی انسانیت کا معیار صحیح اخلاق پر ہوا تو ضروری ہے کہ جتنی چیزیں انسانی اخلاق کو گندہ اور خراب کرنے والی ہیں ان سے اس کا مکمل پرہیز کرایا جائے۔ انسان کے اخلاق پر اس کے گرد و پیش کی چیزوں اور اس کی صحبت کا اثر پڑنا بدیہی طور پر محسوس و مشاہد ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب گرد و پیش کی چیزوں سے انسانی اخلاق متاثر ہوتے ہیں تو جو چیزیں انسان کے بدن کا جزو بنتی ہیں ان سے اخلاق کس قدر متاثر ہوں گے۔ اس لئے کھانے پینے کی ساری چیزوں میں اس کی احتیاط لازمی ہوگی۔ چوری، ڈاکہ، رشوت، سود، قمار وغیرہ کی حرام آمدنی جس کے بدن کا جزو بنے گی، وہ لازمی طور پر اس کو انسانیت سے دور اور شیطنت سے قریب کرے گی۔

اسی لئے قرآن کریم کا ارشاد ہے: یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ

وَاعْمَلُوْا صَالِحًا عمل صالح کے ساتھ اکل حلال کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ اکل حلال کے بغیر عمل صالح متصور نہیں۔
بالخصوص گوشت جو انسان کے بدن کا جزو اہم بنتا ہے اس میں اس کی احتیاط سب سے زیادہ
ضروری ہے کہ کوئی ایسا گوشت اس کی غذا میں داخل نہ ہو جو اس کے خلق کو خراب کرے
اسی طرح وہ گوشت جو جسمانی طور پر انسان کے لئے مضر ہے کہ بیماری اور ہلاکت کے ذرائع اس
میں ہیں۔ اس سے انسان کا پرہیز ضروری ہونا تو سبھی جانتے ہیں جتنی چیزیں شریعت نے
خبائث قرار دی ہیں۔ وہ یقینی طور پر انسان کے جسم یا روح یا دونوں کو خراب کرنے والی
اور انسانی جان یا اخلاق کو تباہ کرنے والی ہیں۔ اس لئے ان کو حرام کر دیا گیا۔ اس کے بالمقابل
طیبات سے انسان کے جسم و روح کی تربیت اور اخلاق فاضلہ کا نشو و نما ہوتا ہے ان کو
حلال قرار دیا گیا۔ غرض قرآن پاک کے جملہ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ نے حلت و حرمت کا فلسفہ
بھی بتلا دیا اور اصول بھی۔

اب یہ بات کہ کونسی چیزیں طیبات یعنی صاف ستھری مفید اور مرغوب ہیں اور کونسی
خبائث یعنی گندی، مضر اور قابل نفرت ہیں۔ اس کا اصل فیصلہ طبائع سلیمہ کی رغبت و نفرت
پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن جانوروں کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے، ہر زمانہ کے سلیم الطبع
انسان ان کو گندہ اور قابل نفرت سمجھتے رہے ہیں، جیسے مردار جانور، خون۔ البتہ بعض اوقات
جاہلانہ رسوم طبیعت پر غالب آجاتی ہیں تو اچھے اور برے کی تمیز ختم ہو جاتی ہے یا بعض چیزوں کا
خبث مخفی ہوتا ہے۔ ایسے معاملات میں انبیاء علیہم السلام کا فیصلہ سب کے لئے حجت ہے
کیونکہ افراد انسانی میں سب سے زیادہ سلیم الطبع انسان انبیاء علیہم السلام ہیں جنکو حق تعالیٰ نے
مخصوص طور پر فطرت سلیمہ سے نوازا اور ان کی تربیت کا خود تکفل فرمایا۔ ان کے گرد و
پیش اپنے فرشتوں کا پہرہ لگایا جس سے ان کے قلب و دماغ اور اخلاق کسی غلط ماحول
سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے جن چیزوں کو خبائث قرار دیا وہ حقیقۃً خبائث ہیں
اور جن کو طیبات سمجھا وہ حقیقۃً طیبات ہیں۔

چنانچہ نوح علیہ السلام کے زمانہ سے خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک
تک ہر پیغمبر نے مردار جانور اور خنزیر وغیرہ کو حرام کرنے کا اپنے اپنے وقت میں اعلان
فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ چیزیں ایسی خبائث ہیں کہ ہر زمانے کے سلیم الطبع حضرات
نے ان کو گندی اور مضر چیز سمجھا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں بیان فرمایا ہے کہ جتنے
جانور شریعت اسلام نے حرام قرار دئے ہیں، ان سب پر غور کیا جائے تو سمٹ کر یہ سب

دو اصولوں کے تحت آجاتے ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی جانور اپنی فطرت و طبیعت کے اعتبار سے خبیث ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کے ذبح کا طریقہ غلط ہو، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ذبیحہ کے بجائے میتۃ یعنی مُردار قرار دیا جائے گا۔

سورۂ مائدہ کی تیسری آیت میں نو چیزوں کو حرام بتلایا ہے۔ ان میں خنزیر قسم اول میں داخل ہے۔ باقی آٹھ قسم دوم میں۔ قرآن کریم نے وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ فرما کر اجمالی طور پر تمام خبیث جانوروں کے حرام ہونے کا حکم دیا۔ اور اس کی تفصیل میں سے چند چیزیں قرآن نے صراحۃً بیان فرما دیں۔ جیسے لحم خنزیر اور دم مسفوح وغیرہ۔ باقی چیزوں کا بیان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جانور کے خبیث ہونے کی ایک علامت یہ بتلائی کہ کسی قوم کو بطور عذاب کے جس جانور کی شکل میں مسخ و تبدیل کیا گیا ہو تو یہ علامت اس کی ہے کہ یہ جانور بھی خبیث ہے کہ جن لوگوں پر حق تعالیٰ کا غضب نازل ہوا ان کو اس جانور کی شکل دی گئی۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے: وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ یعنی بعض قوموں کو خنزیر اور بندر کی شکل میں بطور عذاب کے مسخ کیا گیا ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ جانوروں کی یہ دونوں قسمیں بالطبع خباثت میں داخل ہیں۔ ان کو باقاعدہ ذبح بھی کر دیا جائے تو بھی حلال نہیں ہو سکتے۔ دوسرے بہت سے جانور ایسے بھی ہیں کہ افعال و آثار سے ان کا خبیث ہونا عام طبائع خود بھی محسوس کر لیتی ہیں۔ مثلاً درندے جانور، جن کا کام ہی دوسرے جانوروں کو زخمی کرنا، پھاڑنا کھانا ہے اور سخت دلی ہے۔

اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھیڑیئے کے متعلق کسی نے دریافت کیا تو فرمایا کہ کیا کوئی انسان اس کو کھا سکتا ہے۔ اسی طرح بہت سے ایسے جانور ہیں جن کی خصلت ایذا رسانی۔ چیزوں کو اچک لینا ہے۔ جیسے سانپ۔ بچھو۔ چھپکلی۔ مکھی۔ یا چیل اور باز وغیرہ۔

اسی سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ضابطے کے طور پر بیان فرمایا کہ ہر درندہ جانور جو دانتوں سے پھاڑ کر کھاتا ہے، جیسے شیر، چیتا، بھیڑیا وغیرہ۔ اور پرندوں میں وہ جانور جو پنجے سے شکار کرتے ہیں، جیسے باز، شکرہ وغیرہ یہ سب حرام ہیں۔ یا ایسے جانور جن کی عادت میں نجاست و رذالت پائی جاتی ہے، یا غلاظت ہوتی ہے، جیسے چوہا یا مردار خور جانور یا گدھا وغیرہ، یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ان جانوروں سے طبعی نفرت اور ان کا مضر ہونا ہر انسان، جو معمولی سلامت طبع رکھتا ہو محسوس کرتا ہے۔

حِلٌّ لَّکُمْ یعنی اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے۔ اور تمہارا کھانا اہل کتاب کے لئے حلال۔

اس جگہ جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک کھانے سے مراد ذبیحہ جانور ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس، ابوالدرداءؓ، ابراہیم، قتادہ، سدی، ضحاک، مجاہد رضی اللہ عنہم اجمعین سے یہی منقول ہے (روح المعانی وغیرہ) کیونکہ دوسری قسم کے کھانوں میں اہل کتاب اور بُت پرست مشرکین سب برابر ہیں، گیہوں، چاول، دال، پھل وغیرہ جن میں ذبح کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی کی بھی ملک میں ہوں جائز طریقہ پر حاصل ہو تو مسلمان کو اس کا کھانا جائز ہے۔ اور مسلمانوں سے اُن کو ملے تو اُن کو بھی حلال ہے۔ اس لئے خلاصہ مضمون اس جملہ کا یہ ہوا کہ اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمان کے لئے اور مسلمان کا ذبیحہ اہل کتاب کے لئے حلال ہے۔

اب اس جگہ چند مسائل قابل غور ہیں: اول یہ کہ اہل کتاب قرآن و سنت کی اصطلاح میں کون لوگ ہیں، کتاب سے کیا مراد ہے؟ اور کیا اہل کتاب ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لوگ اپنی کتاب پر صحیح طور سے ایمان و عمل رکھتے ہوں۔ جس میں یہ تو ظاہر ہے کہ کتاب کے لغوی معنی یعنی ہر لکھا ہوا ورق تو مراد ہو نہیں سکتا۔ وہی کتاب مراد ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف سے آئی ہو۔ اس سے باتفاق امت کتاب سے مراد وہ آسمانی کتاب ہے جس کا کتاب اللہ ہونا بتصدیق قرآن یقینی ہو، جیسے تورات، انجیل، زبور، صحف موسیٰ و ابراہیم وغیرہ۔ اس سے وہ قومیں جو کسی ایسی کتاب پر ایمان رکھتی اور اس کو وحی الٰہی قرار دیتی ہوں جس کا کتاب اللہ ہونا قرآن و سنت کے یقینی ذریعہ سے ثابت نہیں۔ وہ قومیں اہل کتاب میں داخل نہیں ہوں گی۔ جیسے مشرکین مکہ، مجوس، بُت پرست ہندو، بدھ، آریہ، سکھ وغیرہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ جو تورات و انجیل پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ باصطلاح قرآن اہل کتاب میں داخل ہیں۔ تیسری ایک قوم جس کو صابئین کہتے ہیں ان کے حالات مشتبہ ہیں۔ جن حضرات کے نزدیک یہ لوگ زبور داؤد علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں وہ ان کو بھی اہل کتاب میں شامل قرار دیتے ہیں۔ اور جن کو یہ تحقیق ہوا کہ زبور سے ان کا کوئی تعلق نہیں، یہ نجوم پرست قوم ہیں۔ وہ ان کو بُت پرستوں اور مجوس کے ساتھ شریک قرار دیتے ہیں۔ بہرحال یقینی طور پر جن کو باتفاق اہل کتاب کہا جاتا ہے وہ یہود و نصاریٰ ہیں۔ تو قرآن حکیم کے اس حکم کا حاصل یہ ہوا کہ یہود و نصاریٰ کا ذبیحہ مسلمانوں

کے نام پر ذبح کرتے ہیں، تو ان کا ذبیحہ کھانا جائز
نہیں اور اس میں شک نہیں کہ آجکل کے نصاریٰ
تو ذبح ہی نہیں کرتے بلکہ عام طور پر چوٹ مار کر
ہلاک کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا ذبیحہ حلال
نہیں ہے۔

تنبیہ: یہ بات یہاں اس لئے نقل کی گئی کہ اس مقام پر مصر کے مشہور عالم مفتی عبدہ سے ایک سخت لغزش ہوگئی ہے جس کے غلط اور کتاب و سنت اور جمہور امت کے خلاف ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ موصوف سے تفسیر المنار میں اس جگہ دوہری غلطی ہوئی ہے۔

اوّل تو اہل کتاب کے مفہوم میں دنیا کے کفار مجوس، ہندو، سکھ وغیرہ سب کو داخل کرکے اس کو عام کردیا۔ پورے قرآن میں جو کفار اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کی تقسیم و تفریق کی گئی ہے وہ بالکل بے معنی اور بے حقیقت ہو جاتی ہے۔

اور دوسری غلطی اس سے بڑی یہ ہوئی کہ طعام اہل کتاب کے مفہوم میں اہل کتاب کے کھانے کو بلا کسی شرط کے حلال کردیا، خواہ وہ جانور کو ذبح کریں یا نہ کریں۔ اور اس پر اللہ کا نام لیں یا نہ لیں۔ ہر حال میں وہ جانور جس طرح کھاتے ہیں اس کو مسلمانوں کے لئے حلال کردیا۔

جس وقت ان کا یہ فتویٰ مصر میں شائع ہوا اس وقت خود مصر کے اور دنیا کے تمام اکابر علماء نے اس کو غلط قرار دیا۔ اس پر بہت سے مقالے اور رسالے لکھے گئے۔ مفتی عبدہ کو عہدہ فتوے سے معزول کرنے کے مطالبات ہر طرف سے ہوئے۔ ادھر مفتی صاحب موصوف کے تلامذہ اور کچھ مغرب زدہ یورپین معاشرے کے دلدادہ لوگوں نے بحثیں چلائیں۔ کیونکہ یہ فتویٰ اُن کی راہ کی تمام مشکلات کا حل تھا کہ یورپ کے یہود و نصاریٰ بلکہ دہریوں کا ہر کھانا ان کے لئے حلال ہوگیا۔

لیکن اسلام کا یہ بھی معجزہ ہے کہ خلاف شریعت کام خواہ کتنے ہی بڑے عالم سے کیوں نہ ہو جائے، عام مسلمانوں کے قلوب اس سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ اس معاملہ میں بھی یہی ہوا۔ اور پوری دنیا کے مسلمانوں نے اس کو گمراہی قرار دیا۔ اور اس وقت یہ معاملہ دب کر رہ گیا۔ مگر زمانہ حال کے ملحدین جن کا مقصد ہی یہ ہے کہ اسلام کا نیا ایڈیشن تیار کیا جائے کہ جس میں یورپ کی ہر لغویت کھپ سکے۔ اور نئے جوانوں کی نفسانی خواہشات کو پورا کرے انھوں نے پھر اس بحث کو اس انداز سے نکالا کہ گویا وہ خود کوئی اپنی تحقیق پیش کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ سب نقل مفتی عبدہ کے مذکورہ مقالہ کی ہے۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ اس

اسی طرح جو مسلمان ضروریات اور قطعیات اسلام میں سے کسی چیز کا انکار کرنے کی وجہ سے مرتد ہوگیا ہے، اگرچہ وہ قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے کا دعویٰ بھی کرے تو وہ بھی مرتد ہے۔ اس کا ذبیحہ حلال نہیں، بعض قرآن پڑھنے یا قرآن پر عمل کرنے کا دعویٰ کرنے سے وہ اہل کتاب میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ہاں کسی دوسرے مذہب وملت کا آدمی اگر اپنا مذہب چھوڑ کر یہودی و نصرانی بن جائے تو وہ اہل کتاب میں شمار ہوگا۔ اور اس کا ذبیحہ حلال قرار پائے گا۔

آیت کا تیسرا جملہ یہ ہے:۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ۭ یعنی تمہارے لئے مسلمان عفیف وپاکدامن عورتوں سے نکاح حلال ہے۔ اسی طرح اہل کتاب کی عفیف وپاکدامن عورتوں سے بھی نکاح حلال ہے۔

اس میں دونوں جگہ محصنٰت کا لفظ آیا ہے جس کے معنی عربی لغت و محاورہ کے اعتبار دو ہو سکتے ہیں۔ ایک آزاد جس کا مقابل کنیز ہیں۔ دوسرے عفیف وپاکدامن عورتیں ہیں لغت کے اعتبار سے اس جگہ بھی دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔

اسی لئے علماء تفسیر میں سے مجاہد نے اس جگہ محصنٰت کی تفسیر حرائر سے کی ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ اہل کتاب کی آزاد عورتیں مسلمانوں کے لئے حلال ہیں، کنیزیں حلال نہیں۔ (مظہری)

لیکن جمہور علماء صحابہ وتابعین کے نزدیک اس جگہ محصنٰت کے معنی عفیف وپاکدامن عورتوں کے ہیں اور مراد آیت کی یہ ہے کہ جس طرح عفیف وپاکدامن مسلمان عورتوں سے نکاح جائز ہے اسی طرح اہل کتاب کی عفیف وپاکدامن عورتوں سے بھی جائز ہے۔ (احکام القرآن جصاص ومظہری)

لیکن باتفاق جمہور اس جگہ عفیف وپاکدامن عورتوں کی قید کے یہ معنی نہیں کہ غیر عفیف عورتوں سے نکاح ہی حرام ہے۔ بلکہ اس قید کا فائدہ بہتر اور مناسب صورت کی ترغیب ہے کہ خواہ مسلمان عورت سے نکاح کرو یا اہل کتاب سے۔ بہرحال یہ بات پیش نظر رہنی چاہیئے کہ پاکدامن عفیف عورت سے نکاح ہو۔ بدکار فاسق عورتوں سے نکاح کا رشتہ جوڑنا کسی شریف مسلمان کا کام نہیں۔ (مظہری وغیرہ)

اس لئے خلاصہ مضمون اس جملہ کا یہ ہوا کہ مسلمان کے لئے حلال ہے کہ کسی مسلمان

عورت سے نکاح کرے یا اہل کتاب کی عورت سے۔ البتہ دونوں صورتوں میں اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ عفیف و پاکدامن عورت سے نکاح کرے۔ بدکار، ناقابل اعتبار عورت سے نکاح کا رشتہ جوڑنا دین و دنیا دونوں کی تباہی ہے، اس سے بچنا چاہئے۔ اس آیت میں اہل کتاب کی قید سے باجماع اُمت یہ ثابت ہوگیا کہ جو غیر مسلم اہل کتاب میں داخل نہیں اُن کی عورتوں سے نکاح حلال نہیں۔

سابقہ بیان میں یہ واضح ہو چکا کہ اس زمانہ میں جتنے فرقے اور جماعتیں غیر مسلموں کی موجود ہیں۔ ان میں صرف یہود و نصاریٰ ہی دو قومیں ہیں جو اہل کتاب میں شمار ہو سکتی ہیں۔ باقی موجودہ مذاہب میں سے کوئی بھی اہل کتاب میں داخل نہیں۔ آتش پرست، یا بت پرست ہندو، یا سکھ، آریہ، بدھ وغیرہ سب اسی مفہوم میں داخل ہیں۔ کیونکہ یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ اہل کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی ایسی کتاب کے ماننے والے اور اس کے اتباع کے دعویدار ہوں جس کا آسمانی کتاب اور وحی الٰہی ہونا قرآن و سنت کی نصوص سے ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ وہ تو تورات، انجیل ہی ہیں جن کی ماننے والی یہ دو قومیں اس وقت دنیا میں موجود ہیں، باقی زبور اور صحف ابراہیم علیہ السلام نہ کہیں محفوظ و موجود ہیں، نہ کوئی قوم ان کے اتباع کی دعویدار ہے اور وید اور گرنتھ، یا زردشت وغیرہ کی کتابیں جو دنیا میں مقدس کہی جاتی ہیں ان کے وحی الٰہی اور آسمانی کتاب ہونے کا کوئی ثبوت کسی شرعی دلیل سے نہیں ہے۔ اور صرف یہ امکان کہ شاید زبور، یا صحف ابراہیم ہی کی مسخ شدہ صورت ہو جس کو بدھ مت کی کتاب یا وید، یا گرنتھ وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ امکان محض اور احتمال محض ہے، جو ثبوت کے لئے کافی نہیں۔ اس سے باجماع اُمت ثابت ہوگیا کہ موجودہ زمانہ کے مختلف مذاہب میں سے صرف یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمانوں کا نکاح حلال ہے۔ اور کسی قوم کی عورت سے جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائے نکاح حرام ہے۔

آیت قرآن کریم وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ۔ اسی مضمون کے لئے آئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں۔ اور اہل کتاب کے سوا دوسری قومیں سب مشرکات میں داخل ہیں۔

غرض قرآن مجید کی دو آیتیں اس مسئلہ میں وارد ہوئی ہیں۔ ایک میں یہ ہے کہ مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح حلال نہیں جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں۔ دوسری یہ آیت سورہ مائدہ کی جس سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔

اس لئے جمہور امت نے صحابہ و تابعین نے دونوں آیتوں کا مدلول و مفہوم یہ قرار دیا کہ

کہ اصولی طور پر غیر مسلم عورت سے مسلمان کا نکاح نہ ہونا چاہئے۔ لیکن سورۂ مائدہ کی اس آیت نے اہل کتاب کی عورتوں کو اس عموم سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ اس لئے یہود و نصاریٰ کی عورتوں کے سوا کسی دوسری قوم کی عورت سے جو مسلمان نہ ہو کسی مسلمان کا نکاح نہیں ہو سکتا

رہا مسئلہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کی عورتوں کا تو بعض صحابہ کرام کے نزدیک یہ بھی جائز نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہی مذہب ہے۔ ان سے جب کوئی پوچھتا تو وہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد قرآن کریم میں واضح ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ یعنی مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں اور میں نہیں جانتا کہ اس سے بڑا اور کیا شرک ہوگا کہ وہ عیسیٰ بن مریم یا کسی دوسرے بندہ خدا کو اپنا رب اور خدا قرار دے۔ (احکام القرآن۔ جصاص)

ایک مرتبہ میمون بن مہرانؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سوال کیا کہ ہم ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں اہل کتاب زیادہ رہتے ہیں، تو کیا ہم ان کی عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں اور ان کا ذبیحہ کھا سکتے ہیں؟ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان کے جواب میں یہ دونوں آیتیں پڑھ کر سنا دیں، ایک وہ جس میں مشرکات کے نکاح کو حرام فرمایا ہے، دوسری آیت مائدہ جس میں اہل کتاب کی عورتوں کی حلت بیان کی ہے۔

میمون بن مہران نے کہا یہ دونوں آیتیں تو میں بھی قرآن میں پڑھتا ہوں اور جانتا ہوں، میرا سوال تو یہ ہے کہ ان دونوں کے پیش نظر ہمارے لئے کیا حکم شرعی ہے۔ اس کے جواب میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے پھر یہی دونوں آیتیں پڑھ کر سنا دیں۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں فرمایا جس کا مطلب علماء امت نے یہ قرار دیا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح حلال ہونے پر بھی اطمینان نہیں تھا۔

اور جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک اگرچہ از روئے قرآن اہل کتاب کی عورتوں سے فی نفسہٖ نکاح حلال ہے لیکن ان سے نکاح کرنے پر جو دوسرے مفاسد و خرابیاں پیش آتی ہیں اور اپنی اولاد کے لئے بلکہ پوری امت اسلامیہ کے لئے از روئے تجربہ لازمی طور سے پیدا ہوں گی ان کی بناء پر اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کو وہ بھی مکروہ سمجھتے تھے۔

جصاصؒ نے احکام القرآن میں شقیق بن سلمہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ جب مدائن پہنچے تو وہاں ایک یہودی عورت سے نکاح کر لیا۔ حضرت فاروق اعظمؓ کو اس کی اطلاع ملی تو ان کو خط لکھا کہ اس کو طلاق دیدو۔ حضرت حذیفہؓ نے

نے جواب میں لکھا کہ کیا وہ میرے لئے حرام ہے؟ تو امیر المؤمنین فاروق اعظمؓ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ میں حرام نہیں کہتا لیکن ان قوموں کی عورتوں میں عام طور پر عفت و پاکدامنی نہیں ہے۔ اس لئے مجھے خطرہ ہے کہ آپ لوگوں کے گھرانوں میں اس راہ سے فحش و بدکاری داخل نہ ہوجائے۔ اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں اس واقعہ کو بروایت امام ابوحنیفہ اس طرح نقل کیا ہے کہ دوسری مرتبہ فاروق اعظمؓ نے جب حضرت حذیفہؓ کو خط لکھا تو اس کے یہ الفاظ تھے:۔

اعزم علیک ان لا تضع کتابی حتی تخلی سبیلھا فانی اخاف ان یقتدیک المسلمون فیختاروا النساء اھل الذمۃ لجمالھن وکفی بذلک فتنۃ لنساء المسلمین۔

(کتاب الآثار)

یعنی میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ میرا یہ خط اپنے ہاتھ سے رکھنے سے پہلے ہی اس کو طلاق دے کر آزاد کردو کیونکہ مجھے یہ خطرہ ہے کہ دوسرے مسلمان بھی آپ کی اقتدا کریں اور اہل ذمہ اہل کتاب کی عورتوں کو اُن کے حسن و جمال کی وجہ سے مسلمان عورتوں پر ترجیح دینے لگیں تو مسلمان عورتوں کے لئے اس سے بڑی مصیبت کیا ہوگی۔

اس واقعہ کو نقل کرکے حضرت محمد بن حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ فقہائے حنفیہ اسی کو اختیار کرتے ہیں کہ اس نکاح کو حرام تو نہیں کہتے، لیکن دوسرے مفاسد اور خرابیوں کی وجہ سے مکروہ سمجھتے ہیں۔ اور علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں نقل کیا ہے کہ حضرت حذیفہؓ کے علاوہ طلحہ اور کعب بن مالکؓ کو بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا کہ انہوں نے آیت مائدہ کی بناء پر اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کرلیا تو جب فاروق اعظمؓ کو اس کی اطلاع ملی تو سخت ناراض ہوئے اور ان کو حکم دیا کہ طلاق دیدیں۔ (مظہری)

فاروق اعظمؓ کا زمانہ خیر القرون کا زمانہ ہے۔ جب اس کا کوئی احتمال نہ تھا کہ کوئی یہودی نصرانی عورت کسی مسلمان کی بیوی بن کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی سازش کرسکے۔ اس وقت تو صرف یہ خطرات سامنے تھے کہ کہیں اُن میں بدکاری ہو تو اُن کی وجہ سے ہمارے گھرانے گندے ہوجائیں۔ یا ان کے حسن و جمال کی وجہ سے لوگ ان کو ترجیح دینے لگیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ مسلمان عورتیں تکلیف میں پڑ جائیں۔ مگر فاروق اعظمؓ کی نظر دوربین اتنے ہی مفاسد کو سامنے رکھ کر ان حضرات کو طلاق پر مجبور کررہی ہے۔ اگر آج کا نقشہ ان حضرات کے سامنے ہوتا تو اندازہ کیجئے کہ اُن کا

اس کے متعلق کیا عمل ہو۔ اوّل تو وہ لوگ جو آج اپنے نام کے ساتھ مردم شماری کے رجسٹروں میں یہودی یا نصرانی لکھواتے ہیں۔ ان میں بہت سے وہ لوگ ہیں جو اپنے عقیدہ کی رُو سے یہودیت و نصرانیت کو ایک لعنت سمجھتے ہیں۔ نہ ان کا تورات و انجیل پر عقیدہ ہے نہ حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر۔ وہ عقیدہ کے اعتبار سے بالکل لامذہب اور دہریئے ہیں۔ محض قومی یا رسمی طور پر اپنے آپ کو یہودی و نصرانی کہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان لوگوں کی عورتیں مسلمان کے لئے کسی طرح حلال نہیں۔ اور بالفرض اگر وہ اپنے مذہب کے پابند بھی ہوں تو ان کو کسی مسلمان کا گھر میں جگہ دینا اپنے پورے خاندان کے لئے دینی اور دنیوی تباہی کو دعوت دینا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں اس راہ سے اس آخری دور میں ہوئیں اور ہوتی رہتی ہیں جن کے عبرتناک واقعات روز آنکھوں کے سامنے آتے ہیں کہ ایک لڑکی نے پوری مسلم قوم اور سلطنت کو تباہ کر دیا، یہ ایسی چیزیں ہیں کہ حلال و حرام سے قطع نظر بھی کوئی ذی ہوش انسان اس کے قریب جانے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔

الغرض قرآن و سنت اور اسوۂ صحابہ کی رُو سے مسلمانوں پر لازم ہے کہ آج کل کی کتابی عورتوں کو نکاح میں لانے سے قطعی پرہیز کریں۔ آخر آیت میں یہ ہدایت بھی کر دی گئی ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں کو اگر رکھنا ہی ہے تو باقاعدہ نکاح کر کے بیوی کی حیثیت سے رکھیں، اُن کے حقوق مہر وغیرہ ادا کریں۔ ان کو داشتہ کے طور پر رکھنا اور خفیہ طور پر بدکاری کرنا یہ سب چیزیں حرام ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا

اے ایمان والو جب تم اٹھو نماز کو تو دھو لو

وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ

اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک اور مل لو اپنے سر کو

وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا

اور پاؤں ٹخنوں تک اور اگر تم کو جنابت ہو تو خوب طرح پاک ہو

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ

اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں یا کوئی تم میں آیا ہے جائے ضرور سے

اور پھر ان ساری صورتوں میں، تم کو پانی (کے استعمال) کا موقع نہ ملے (خواہ بوجہ ضرر کے یا پانی نہ ملنے کے) تو ان سب حالتوں میں تم پاک زمین سے تیمم کرلیا کرو (یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو اس زمین (کی جنس) پر سے (ہاتھ مار کر) اللہ تعالیٰ کو ان احکام کے مقرر فرمانے سے یہ منظور نہیں کہ تم پر کوئی تنگی ڈالیں (یعنی یہ منظور ہے کہ تم پر کوئی تنگی نہ رہے، چنانچہ احکام مذکورہ میں خصوصاً اور جمیع احکام شرعیہ میں عموماً رعایت سہولت و مصلحت کی ظاہر ہے) لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ تم کو پاک صاف رکھے (اس لئے طہارت کے قواعد اور طریقے مقرر کئے اور کسی ایک طریقہ پر بس نہیں کیا گیا کہ اگر وہ نہ ہو تو طہارت ممکن ہی نہ ہو، مثلاً صرف پانی کو مطہر رکھا جاتا تو پانی نہ ہونے کے وقت طہارت حاصل نہ ہو سکتی، یہ طہارت ابدان تو خاص احکام طہارت ہی میں ہے، اور طہارت قلوب تمام طاعات میں عام ہے پس یہ تطہیر دونوں کو شامل ہے اور اگر یہ احکام نہ ہوتے تو کوئی طہارت حاصل نہ ہوتی، اور یہ منظور ہے) کہ تم پر اپنا انعام تام فرمادے۔

(اس لئے احکام کی تکمیل فرمادی تاکہ کمال میں طہارت بدنی و قلبی جس کا ثمرہ رضا و قرب ہے جو عظیم نعمت ہے حاصل کرسکو) تاکہ تم (اس عنایت کا) شکر ادا کرو (شکر میں امتثال بھی داخل ہے) اور تم لوگ اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو تم پر ہوا ہے یاد کرو (جس میں بڑا انعام یہ ہے کہ تمہاری فلاح کے طریقے تمہارے لئے مشروع کردئیے) اور اس کے اس عہد کو بھی (یاد کرو) جس کا تم سے معاہدہ کیا ہے جبکہ تم نے (اس کا التزام بھی کرلیا تھا کہ عہد لینے کے وقت تم نے) کہا تھا کہ ہم نے (ان احکام کو) سنا اور مانا (کیونکہ اسلام لانے کے وقت ہر شخص اسی مضمون کا عہد کرتا ہے) اور اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے ڈرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ دلوں کی باتوں کی پوری خبر رکھتے ہیں (اس لئے جو کام کرو اس میں اخلاص و اعتقاد بھی ہونا چاہئے صرف منہ سے امتثال کافی نہیں، مطلب یہ کہ ان احکام میں اوّل تو تمہارا ہی نفع پھر تم نے اپنے سر بھی رکھ لیا ہے، پھر مخالفت میں ضرر، ان وجوہ سے امتثال ہی ضروری ہوا اور وہ بھی دل سے ہونا چاہئے ورنہ مثل عدم امتثال ہی کے ہے)۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ

اے ایمان والو کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے کو

بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا

انصاف کی اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ

نساء میں بھی اسی طرح ہے، فرق یہ ہے کہ وہاں كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ ارشاد ہوا تھا اور یہاں كُونُوا قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ فرمایا گیا ہے۔ ان دونوں آیتوں میں الفاظ کے تقدم اور تاخر کی ایک لطیف وجہ ابوحیان نے تفسیر بحر محیط میں ذکر کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

انسان کو عدل و انصاف سے روکنے اور ظلم و جور میں مبتلا کرنے کے عادۃً دو سبب ہوا کرتے ہیں، ایک اپنے نفس یا اپنے دوستوں عزیزوں کی طرفداری، دوسرے کسی شخص کی دشمنی و عداوت۔ سورۂ نساء کی آیت کا روئے سخن پہلے مضمون کی طرف ہے، اور سورۂ مائدہ کی اس آیت کا روئے سخن دوسرے مضمون کی طرف۔

اسی لئے سورۂ نساء میں اس کے بعد ارشاد ہے وَلَوْ عَلٰى أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ، یعنی عدل و انصاف پر قائم رہو چاہے وہ عدل و انصاف کا حکم خود تمہارے نفس یا تمہارے والدین اور عزیزوں دوستوں کے خلاف پڑے۔ اور سورۂ مائدہ کی اس آیت میں جملۂ مذکورہ کے بعد ارشاد ہے وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى أَلَّا تَعْدِلُوا، یعنی کسی قوم کی عداوت و دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم انصاف کے خلاف کرنے لگو۔

اس لئے سورۂ نساء کی آیت کا حاصل یہ ہوا کہ عدل و انصاف کے معاملہ میں اپنے نفس اور والدین اور عزیزوں کی بھی پرواہ نہ کرو، اگر انصاف کا حکم ان کے خلاف ہے تو خلاف ہی پر قائم رہو۔ اور سورۂ مائدہ کی آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ عدل و انصاف کے معاملہ میں کسی دشمن کی دشمنی کی وجہ سے لغزش نہ ہونی چاہئے کہ اس کو نقصان پہنچانے کے لئے خلافِ انصاف کام کرنے لگو۔

یہی وجہ ہے کہ سورۂ نساء کی آیت میں قسط یعنی انصاف کو مقدم کرکے ارشاد فرمایا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ، اور سورۂ مائدہ کی آیت میں للہ کو مقدم کرکے ارشاد فرمایا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ۔ اگرچہ انجام اور نتیجہ کے اعتبار سے یہ دونوں عنوان ایک ہی مقصد کو ادا کرتے ہیں، کیونکہ جو شخص انصاف پر کھڑا ہوگا، وہ اللہ ہی کے لئے کھڑا ہوگا، اور جو شخص اللہ ہی کے لئے کھڑا ہوا ہے وہ ضرور انصاف ہی کرے گا، لیکن اپنے نفس اور دوستوں عزیزوں کی رعایت کے مقام میں یہ خیال گزر سکتا ہے کہ ان تعلقات کی رعایت بھی تو اللہ ہی کے لئے ہے، اس لئے وہاں لفظ قسط کو مقدم لاکر اس کی طرف ہدایت کردی کہ وہ رعایت اللہ کے لئے نہیں ہوسکتی جو عدل و انصاف

عدالتیں بھی مجبور ہیں، جیسی شہادتیں اُن کے پاس پہنچتی ہیں وہ انہی کے ذریعہ کوئی نتیجہ نکال سکتی ہیں اور انھیں کی بنیاد پر فیصلہ کرسکتی ہیں۔

مگر اس بنیادی غلطی کو کوئی نہیں دیکھ سکتا کہ گواہوں کے ساتھ شریفانہ معاملہ کیا جائے اور ان کو بار بار پریشان نہ کیا جائے تو آج بھی نیک اور سچے آدمی قرآنی تعلیمات کے پیش نظر گواہی میں آنے سے باز نہ رہیں گے۔ مگر جو کچھ ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ معاملہ کی ابتدائی تحقیق جو پولیس کرتی ہے وہی بار بار بلا کر گواہ کو اتنا پریشان کر دیتی ہے کہ وہ آئندہ اپنی اولاد کو کہہ جاتا ہے کہ کبھی کسی معاملہ کے گواہ نہ بننا۔ پھر اگر معاملہ عدالت میں پہنچتا ہے تو وہاں تاریخوں پر تاریخیں لگتی ہیں، ہر تاریخ پر اس ناکردہ گناہ کو گواہی کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ اس طولانی ضابطہ کارروائی نے جو انگریز اپنی یادگار چھوڑ گیا ہے، ہماری ساری عدالتوں اور محکموں کو گندہ کیا ہوا ہے۔ قدیم سادہ طرز پر جو آج بھی حجاز و بعض دوسرے ممالک میں رائج ہے نہ مقدمات کی اتنی کثرت ہوسکتی ہے نہ ان میں اتنا طول ہوسکتا ہے نہ گواہوں کو گواہی دینا مصیبت بن سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ضابطہ شہادت اور ضابطہ کارروائی اگر قرآنی تعلیمات کے مطابق بنایا جائے تو اس کی برکات آج بھی آنکھوں سے مشاہدہ ہونے لگیں۔ قرآن نے ایک طرف واقعہ سے باخبر لوگوں پر سچی شہادت ادا کرنے کو لازم و واجب قرار دے دیا ہے تو دوسری طرف لوگوں کو ایسی ہدایتیں دی ہیں کہ گواہوں کو بلاوجہ پریشان نہ کیا جائے، کم سے کم وقت میں ان کا بیان لیکر فارغ کردیا جائے۔

امتحانات کے نمبر، سند و سارٹیفکیٹ اور انتخابات کے ووٹ سب شہادت کے حکم میں داخل ہیں۔

آخر میں ایک اور اہم بات بھی یہاں جاننا ضروری ہے، وہ یہ کہ لفظ شہادت اور گواہی کا جو مفہوم آج کل عرف میں مشہور ہوگیا ہے وہ تو صرف مقدمات و خصومات میں کسی حاکم کے سامنے گواہی دینے کے لئے مخصوص سمجھا جاتا ہے، مگر قرآن و سنت کی اصطلاح میں لفظ شہادت اس سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے، مثلاً کسی بیمار کو ڈاکٹری سارٹیفکیٹ دینا کہ یہ ڈیوٹی ادا کرنے کے قابل نہیں یا نوکری کرنے کے قابل نہیں، یہ بھی ایک شہادت ہے، اگر اس میں واقعہ کے خلاف لکھا گیا تو وہ جھوٹی شہادت ہو کر گناہ کبیرہ ہوگیا۔

اسی طرح امتحانات میں طلباء کے پرچوں پر نمبر لگانا بھی ایک شہادت ہے، اگر جان

بوجھ کر یہ بے ایمانی سے نمبروں میں کمی بیشی کر دی تو وہ بھی جھوٹی شہادت ہے، اور حرام اور سخت گناہ ہے۔

کامیاب ہونے والے فارغ التحصیل طلبہ کو سند یا سرٹیفکیٹ دینا اس کی شہادت ہے کہ وہ متعلقہ کام کی اہلیت و صلاحیت رکھتا ہے، اگر وہ شخص واقع میں ایسا نہیں ہے تو اس سرٹیفکیٹ یا سند پر دستخط کرنے والے سب کے سب شہادت کاذبہ کے مجرم ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح اسمبلیوں اور کونسلوں وغیرہ کے انتخاب میں کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی ایک شہادت ہے، جس میں ووٹ دہندہ کی طرف سے اس کی گواہی ہے کہ ہمارے نزدیک یہ شخص اپنی استعداد اور قابلیت کے اعتبار سے بھی اور دیانت و امانت کے اعتبار سے بھی قومی نمائندہ بننے کے قابل ہے۔

اب غور کیجئے کہ ہمارے نمائندوں میں کتنے ایسے ہوتے ہیں جن کے حق میں یہ گواہی سچی اور صحیح ثابت ہو سکے، مگر ہمارے عوام ہیں کہ انہوں نے اس کو محض ہار جیت کا کھیل سمجھ رکھا ہے، اس لئے ووٹ کا حق کبھی پیسوں کے عوض میں فروخت ہوتا ہے، کبھی کسی دباؤ کے تحت استعمال کیا جاتا ہے، کبھی ناپائدار دوستیوں اور ذلیل وعدوں کے بھروسہ پر اسکو استعمال کیا جاتا ہے۔

اور تو اور لکھے پڑھے دیندار مسلمان بھی نااہل لوگوں کو ووٹ دیتے وقت کبھی یہ محسوس نہیں کرتے کہ ہم یہ جھوٹی گواہی دے کر مستحق لعنت و عذاب بن رہے ہیں۔

نمائندوں کے انتخاب کے لئے ووٹ دینے کی از روئے قرآن ایک دوسری حیثیت بھی ہے جس کو شفاعت یا سفارش کہا جاتا ہے کہ ووٹ دینے والا گویا یہ سفارش کرتا ہے کہ فلاں امیدوار کو نمائندگی دی جائے۔ اس کا حکم قرآن کریم کے الفاظ میں پہلے بیان ہو چکا ہے، ارشاد ہے:-

وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا۔

یعنی جو شخص اچھی اور سچی سفارش کرے گا تو جس کے حق میں سفارش کی ہے اس کے نیک عمل کا حصہ اس کو بھی ملے گا، اور جو شخص بری سفارش کرتا ہے، یعنی کسی نااہل اور برے شخص کو کامیاب بنانے کی سعی کرتا ہے، اس کو اس کے برے اعمال کا حصہ ملے گا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ امیدوار اپنی کارکردگی کے پنج سالہ دور میں غلط اور ناجائز

کام کرے گا ان سب کا وبال ووٹ دینے والے کو بھی پہونچے گا۔

ووٹ کی ایک تیسری شرعی حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹ دینے والا اس امیدوار کو اپنی نمائندگی کے لئے وکیل بناتا ہے، لیکن اگر یہ وکالت اس کے کسی شخصی حق کے متعلق ہوتی اور اس کا نفع نقصان صرف اس کی ذات کو پہونچتا تو اس کا یہ خود ذمہ دار ہوتا، مگر یہاں ایسا نہیں، کیونکہ یہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے جن میں اس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے، اس لئے اگر کسی نااہل کو اپنی نمائندگی کے لئے ووٹ دے کر کامیاب بنایا تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس کی گردن پر رہا۔

خلاصہ یہ کہ ہمارا ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے، ایک شہادت، دوسرے شفاعت اور تیسرے حقوق مشترکہ میں وکالت، تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک صالح قابل آدمی کو ووٹ دینا موجب ثواب عظیم ہے اور اس کے ثمرات اس کو ملنے والے ہیں، اسی طرح نااہل یا غیر متدین شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے اور بری شفاعت بھی اور ناجائز وکالت بھی، اور اس کے تباہ کن ثمرات بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے۔

اس لئے ہر مسلمان ووٹر پر فرض ہے کہ ووٹ دینے سے پہلے اس کی پوری تحقیق کر لے کہ جس کو ووٹ دے رہا ہے وہ کام کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں، اور دیانتدار ہے یا نہیں، محض غفلت و بے پروائی سے بلاوجہ اس گناہ عظیم کا مرتکب نہ ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

اے ایمان والو یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر

اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ

جب قصد کیا لوگوں نے کہ تم پر ہاتھ چلاویں پھر روک دیئے تم سے

اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

ان کے ہاتھ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور اللہ ہی پر چاہئے بھروسہ

الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١١﴾ وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ع

ایمان والوں کو اور لے چکا ہے اللہ عہد بنی اسرائیل سے

وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ

اور مقرر کئے ہم نے ان میں بارہ سردار اور کہا اللہ نے میں تمہارے ساتھ

مدد کرتے رہو گے اور علاوہ زکوٰۃ کے اور مصارف خیر میں بھی صرف کرکے اللہ تعالیٰ کو اچھے طور پر (یعنی اخلاص کے ساتھ) قرض دیتے رہو گے تو میں ضرور تمہارے گناہ تم سے دُور کر دوں گا اور ضرور تم کو (بہشت کے) ایسے باغوں میں داخل کر دوں گا جن کے (محلات کے) نیچے کو نہریں جاری ہوں گی اور جو شخص اس (عہد و پیمان لینے) کے بعد بھی کفر کرے گا تو وہ بے شک راہِ راست سے دُور جا پڑا۔

معارف و مسائل

سورۂ مائدہ کی ساتویں آیت جو پیچھے گزر چکی ہے، اس میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں سے ایک عہد و میثاق لینے اور ان کے ماننے اور تسلیم کر لینے کا ذکر فرمایا ہے۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ" یہ میثاق خدا و رسول کی اطاعت اور احکام شرعیہ کے اتباع کا میثاق ہے جس کا اصطلاحی عنوان کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہے، اور ہر کلمہ گو مسلمان اس میثاق کا پابند ہے۔ اس کے بعد کی آیت میں میثاق کی بعض اہم دفعات یعنی خاص خاص احکام شرعیہ کا بیان فرمایا ہے جس میں دوست دشمن سب کے لئے عدل و انصاف کے قیام کی اور اقتدار پانے کے بعد دشمنوں سے بدلہ انتقام کے بجائے انصاف اور رواداری کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ میثاق خود بھی اللہ تعالیٰ کا ایک بڑا انعام ہے، اسی لئے اُس کو اُذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ سے شروع کیا گیا ہے۔

آیت مذکورہ کو بھی اسی جملہ اُذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ سے شروع کر کے یہ بتلانا منظور ہے کہ مسلمانوں نے جب اس عہد و میثاق کی پابندی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا و آخرت میں قوت و بلندی اور درجات عالیہ عطا فرمائے اور دشمنوں کے ہر مقابلہ میں اُن کی امداد فرمائی، دشمنوں کا قابو ان پر نہ چلنے دیا۔

اس آیت میں خاص طور پر اس کا ذکر ہے کہ دشمنوں نے بار بار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے مٹا دینے اور قتل و غارت کر دینے کے منصوبے بنائے، اور تیاریاں کیں، مگر اللہ تعالیٰ نے سب کو خائب و خاسر کر دیا۔ ارشاد ہے کہ "ایک قوم اس فکر میں تھی کہ تم پر دست درازی کرے، مگر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اُن کے ہاتھ تم سے روک دیئے"

مجموعی حیثیت سے تو ایسے واقعات تاریخ اسلام میں بے شمار ہیں کہ کفار کے منصوبے فضل خداوندی سے خاک میں مل گئے، لیکن بعض خاص خاص اہم واقعات بھی ہیں جن کو حضرات مفسرین نے اس آیت کا مصداق قرار دیا ہے۔ مثلاً مسند عبد الرزاق میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

کسی جہاد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ایک منزل پر قیام پذیر ہوئے، صحابہ کرام مختلف حصوں میں اپنے اپنے ٹھکانوں پر آرام کرنے لگے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تن تنہا ایک درخت کے نیچے ٹھہر گئے، اور اپنے ہتھیار ایک درخت پر لٹکا دیئے۔ دشمنوں میں سے ایک گاؤں والا موقع غنیمت جان کر جھپٹا اور آتے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار پر قبضہ کر لیا، اور آپ پر وہ تلوار کھینچ کر بولا من یمنعک منی اب بتلایئے کہ آپ کو میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بے دھڑک فرمایا کہ "اللہ عزوجل" گاؤں والے نے پھر وہی کلمہ دہرایا، من یمنعک منی، آپ نے پھر اسی بے فکری کے ساتھ فرمایا "اللہ عزوجل" دو تین مرتبہ اسی طرح کی گفتگو ہوتی رہی، یہاں تک کہ غیبی قدرت کے رعب نے اس کو مجبور کر کے تلوار کو میان میں داخل کر کے رکھ دیا۔ اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو بلایا اور یہ واقعہ سنایا، یہ گاؤں والا ابھی تک آپ کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا، آپ نے اس کو کچھ نہیں کہا۔ (ابن کثیر)

اسی طرح بعض حضرات صحابہ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ کعب بن اشرف یہودی نے ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر میں بلا کر قتل کرنے کی سازش کی تھی، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کی اطلاع کر دی اور ان کی ساری سازش خاک میں مل گئی (ابن کثیر) اور حضرت مجاہد، عکرمہ وغیرہ سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی معاملہ کے لئے یہود بنی نضیر کے پاس تشریف لے گئے، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دیوار کے نیچے بٹھا کر باتوں میں مشغول کیا، اور دوسری طرف عمرو بن جحاش کو اس کام پر مقرر کر دیا کہ دیوار کے پیچھے سے اوپر چڑھ کر پتھر کی ایک چٹان آپ کے اوپر ڈال دے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ارادہ پر مطلع فرمایا اور آپ فوراً وہاں سے اٹھ گئے۔ (ابن کثیر)

ان واقعات میں کوئی تضاد نہیں، سب کے سب آیت مذکورہ کا مصداق ہو سکتے ہیں۔ آیت مذکورہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی غیبی حفاظت کا ذکر کرنے

کے بعد فرمایا: وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔

اس میں ایک طرف تو یہ بتلا دیا کہ یہ انعام خداوندی حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس نصرت و امداد اور غیبی حفاظت کا اصلی سبب تقویٰ اور توکل ہے جو قوم یا فرد جس زمانہ اور جس مکان میں ان دو صفتوں کو اختیار کرے گا اس کی بھی ایسی ہی حق تعالیٰ کی طرف سے حفاظت و حمایت ہوگی، کسی نے خوب کہا ہے ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جملہ کو آیات سابقہ کے مجموعہ کے ساتھ لگایا جائے، جن میں بدترین دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک اور عدل و انصاف کے احکام دیئے گئے ہیں تو پھر اس جملہ میں اس طرف اشارہ ہوگا کہ آیات مذکورہ میں دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک اور رواداری کی تعلیم بظاہر ایک سیاسی غلطی اور دشمنوں کو جرأت و ہمت دلانے کے مرادف ہے، اس لئے اس جملہ میں مسلمانوں کو اس پر متنبہ کیا گیا کہ اگر تقویٰ شعار اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے والے رہو تو یہ رواداری اور حسن سلوک تمہارے لئے قطعاً مضر نہیں ہوگا، اور دشمنوں کو مخالفت کی جرأت کے بجائے تمہارے زیادہ قریب اور اسلام سے قریب کرنے کا سبب بنے گا۔ نیز تقویٰ اور خوف خدا ہی وہ چیز ہے جو کسی انسان کو عہد و میثاق کی پابندی پر ظاہراً و باطناً مجبور کر سکتا ہے۔ جہاں یہ تقویٰ یعنی خوف خدا نہیں ہوتا وہاں عہد و میثاق کا وہی حشر ہوتا ہے جو آجکل عام لوگوں میں دیکھا جاتا ہے، اس لئے اوپر کی جس آیت میں میثاق کا ذکر ہے وہاں بھی آخر آیت میں وَاتَّقُوا اللّٰهَ فرما دیا گیا تھا۔ یہاں پھر اسی کا اعادہ کیا گیا، نیز اس پوری آیت میں اس طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے کہ مسلمانوں کی فتح و نصرت صرف ظاہری ساز و سامان کی مرہونِ منت نہیں ہے بلکہ ان کی اصل طاقت کا راز تقویٰ اور توکل میں مضمر ہے۔

اس آیت میں مسلمانوں سے عہد و میثاق لینے اور ان کے ایفاءِ عہد پر دنیا و آخرت میں اس کے بہترین نتائج کا ذکر کرنے کے بعد معاملہ کا دوسرا رخ سامنے لانے کے لئے دوسری آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ عہد و میثاق لینا صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ اُن سے پہلے دوسری امتوں سے بھی اسی قسم کے میثاق لئے گئے تھے۔ مگر وہ اپنے عہد و میثاق میں پورے نہ اترے۔ اس لئے ان پر طرح طرح کے عذاب مسلط کئے گئے۔ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے بھی ایک عہد لیا تھا۔ اور ان سے عہد لینے کی یہ صورت اختیار کی گئی تھی کہ پوری قوم بنی اسرائیل جو بارہ خاندانوں پر مشتمل تھی انھیں میں سے ہر خاندان سے

ایک سردار چنا گیا، وہ اپنے خاندان کی بات کے بھی سردار رہے ذمہ داری تھی کہ میں اور میرا پورا خاندان اس میثاق الٰہی کی پابندی کرے گا۔ اس طرح ان بارہ سرداروں نے پوری قوم بنی اسرائیل کی ذمہ داری لے لی۔ ان کے ذمہ یہ تھا کہ خود بھی اس میثاق کی پابندی کریں، اور اپنے خاندان سے بھی کرائیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عزت وفضیلت کے معاملہ میں اسلام کا اصل اصول تو یہ ہے کہ ؎

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں بن فلاں چیزے نیست

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے تاریخی خطبہ میں پوری وضاحت کے ساتھ اس کا اعلان فرما دیا ہے کہ اسلام میں عرب وعجم، کالے گورے اور اونچ نیچ ذات پات کا کوئی اعتبار نہیں، جو اسلام میں داخل ہوگیا وہ سارے مسلمانوں کا بھائی ہوگیا، حسب نسب رنگ، وطن، زبان کے امتیازات جو جاہلیت کے بت تھے ان سب کو اسلام نے توڑ ڈالا، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ انتظامی معاملات میں تنظیم قائم رکھنے کے لئے کبھی خاندانی خصوصیات کا لحاظ نہ کیا جائے۔

یہ فطری امر ہے کہ ایک خاندان کے لوگ اپنے خاندان کے بڑے آدمی پر بہ نسبت دوسروں کے زیادہ اعتماد کرسکتے ہیں، اور یہ شخص ان کی پوری نفسیات سے واقف ہونے کی بنا پر ان کے جذبات وخیالات کی زیادہ رعایت کرسکتا ہے۔ اسی حکمت عملی پر مبنی تھا بنی اسرائیل کے بارہ خاندانوں سے جب عہد لیا گیا تو ہر خاندان کے ایک ایک سردار کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔

اور اسی انتظامی مصلحت اور مکمل اطمینان وسکون کی رعایت اس وقت بھی کی گئی کہ جبکہ قوم بنی اسرائیل پانی نہ ہونے کی وجہ سے سخت اضطراب میں تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی اور بحکم خداوندی انھوں نے اپنا عصا ایک پتھر پر مارا، تو اللہ تعالیٰ نے اس پتھر سے بارہ چشمے بارہ خاندانوں کے لئے علیحدہ علیحدہ جاری کر دیئے۔

سورۂ اعراف میں قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم کا اس طرح ذکر فرمایا ہے:۔

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا۔ اور فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۔	ہم نے بانٹ دیئے ان کے بارہ خاندان بارہ جماعتوں میں، پھر پھوٹ نکلے پتھر سے بارہ چشمے ہر ایک خاندان کے لئے جدا جدا۔

اور یہ بارہ کا عدد بھی کچھ عجیب خصوصیت و مقبولیت رکھتا ہے۔

جس وقت انصار مدینہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کے لئے دعوت دینے حاضر ہوئے اور آپ نے ان سے بذریعہ بیعت معاہدہ لیا تو اس معاہدہ میں بھی انصار کے بارہ سرداروں نے ذمہ داری لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی تھی ان میں تین سردار قبیلہ اوس کے اور نو قبیلہ خزرج کے تھے۔ (ابن کثیر)

اور صحیحین میں حضرت جابر بن سمرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں کا کام اور نظم اس وقت تک چلتا رہے گا، جب تک کہ بارہ خلیفہ ان کی قیادت کریں گے۔ امام ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ اس حدیث سے کسی اقتضاء سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ بارہ امام یکے بعد دیگرے مسلسل ہوں گے۔ بلکہ ان کے درمیان فاصلہ بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ چار خلفاء، صدیق اکبر، فاروق اعظم، عثمان غنی، علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم مسلسل ہوئے اور درمیان کی کچھ مدت کے بعد پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز باجماع امت پانچویں خلیفہ برحق مانے گئے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے معاہدہ لینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارہ خاندانوں کے بارہ سرداروں کو ذمہ دار ٹھہرایا اور ان سے ارشاد فرمایا۔ اِنِّی مَعَکُمْ یعنی میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے میثاق کی پابندی کی اور دوسروں سے پابندی کرانے کا عزم کیا تو میری امداد و نصرت تمہارے ساتھ ہوگی۔ اس کے بعد آیت مذکورہ میں اس میثاق کی چند اہم دفعات اور بنی اسرائیل کی عہد شکنی اور ان پر عذاب الٰہی کا ذکر ہے۔

میثاق کی دفعات کا ذکر کرنے سے پہلے ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ اِنِّی مَعَکُمْ جس میں دو باتیں بتلا دی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اگر تم میثاق پر قائم رہے تو میری امداد تمہارے ساتھ رہے گی۔ اور تم ہر قدم پر اس کا مشاہدہ کرو گے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اور ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے، اور اس میثاق کی نگرانی فرما رہا ہے، تمہارا کوئی عزم و ارادہ، اور فکر و خیال یا حرکت و عمل اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔ وہ تمہاری خلوتوں کے رازوں کو بھی دیکھتا اور سنتا ہے، وہ تمہارے دلوں کی نیتوں اور ارادوں سے بھی واقف ہے۔ میثاق کی خلاف ورزی کر کے تم کسی طرح بھی اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ اس کے بعد میثاق کی دفعات میں سب سے پہلے اقامت صلوٰۃ کا ذکر ہے۔ اور پھر ادائے زکوٰۃ کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز اور زکوٰۃ کے فرائض اسلام سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر بھی عائد تھے۔ اور دوسرے قرآنی اشارات و روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ فرائض صرف بنی اسرائیل ہی کے ساتھ مخصوص نہیں

بلکہ ہر پیغمبر اور ہر شریعت میں ہمیشہ فرض رہی ہیں۔ تیسرا امر میثاق میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سب رسولوں پر ایمان لائیں اور ان کے مقصد رشد و ہدایت میں ان کی امداد کریں ـــ

بنی اسرائیل میں چونکہ بہت سے رسول آنے والے تھے، اس لئے ان کو خصوصیت سے اس کی تاکید فرمائی گئی۔ اور اگرچہ ایمانیات کا درجہ عملیات، نماز، زکوٰۃ سے رتبۃً مقدم ہے، مگر میثاق میں مقدم اس کو رکھا گیا جس پر بالفعل عمل کرنا تھا۔ آنے والے رسول تو بعد میں آئیں گے، ان پر ایمان لانے اور ان کی امداد کرنے کا وقوع بھی بعد میں ہونے والا تھا، اس لئے اس کو مؤخر بیان فرمایا گیا۔

چوتھا امر میثاق میں یہ ہے کہ: اَقْرَضْتُمُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا۔ (یعنی تم اللہ تعالیٰ کو قرض دو، اچھی طرح کا قرض)۔ اچھی طرح کے قرض کا مطلب یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ ہو، کوئی دنیوی غرض اس میں شامل نہ ہو، اور اللہ کی راہ میں اپنی محبوب چیز خرچ کرے، ردی اور بیکار چیزیں دے کر نہ ٹالے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کو قرض دینے سے اسلئے تعبیر کیا ہے کہ قرض کا بدلہ دینا اور لوٹانا ضروری و واجب سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ یقین کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں خرچ کریں کہ اس کا بدلہ ضرور ملے گا۔

اور زکوٰۃ فرض کا ذکر مستقل کرنے کے بعد اس جگہ قرض حسن کا ذکر یہ بتلا رہا ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقات و خیرات ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان صرف زکوٰۃ ادا کر کے ساری مالی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو جاتا۔ زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ اور مالی حقوق انسان کے ذمہ ہیں، کسی جگہ مسجد نہیں تو تعمیر مسجد، اور دینی تعلیم کے لئے حکومت متکفل نہیں ہے تو دینی تعلیم کا انتظام مسلمانوں ہی پر لازم ہے۔ فرق اتنا ہے کہ **زکوٰۃ فرض عین اور یہ فرض کفایہ ہیں۔**

فرض کفایہ کے معنی یہ ہیں کہ قوم کے چند افراد یا کسی جماعت نے ان ضرورتوں کو پورا کر دیا تو دوسرے مسلمان سبکدوش ہو جاتے ہیں اور اگر کسی نے بھی نہ کیا تو سب گنہگار ہوتے ہیں۔ آج کل دینی تعلیم اور اس کے مدارس جس کسمپرسی اور بے بسی کے عالم میں ہیں اُن کو وہی لوگ جانتے ہیں، جنہوں نے اس کو دین کی اہم خدمت سمجھ کر قائم کیا ہوا ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے کی حد تک مسلمان جانتے ہیں کہ ہمارے ذمہ فرض ہے۔ اور یہ جاننے کے باوجود بہت کم افراد ہیں جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور ادا کرنے والوں میں بھی بہت کم افراد ہیں جو پورا حساب کر کے پوری زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور جو حضرات پوری زکوٰۃ ادا کرنے والے بھی ہیں تو وہ بالکل یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اب ہمارے ذمہ اور کچھ نہیں۔ ان کے سامنے مسجد کی ضرورت آئے تو زکوٰۃ

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمۡ كَثِيۡرًا مِّمَّا كُنۡتُمۡ

تُخۡفُوۡنَ مِنَ الۡكِتٰبِ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ ۬ؕ قَدۡ جَآءَكُمۡ

مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ ۙ يَّهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ

اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ

اِلَى النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ وَيَهۡدِيۡهِمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۱۶﴾

اپنے حکم سے ... اور ان کو چلاتا ہے

لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ ؕ

قُلۡ فَمَنۡ يَّمۡلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيۡـئًا اِنۡ اَرَادَ اَنۡ يُّهۡلِكَ

الۡمَسِيۡحَ ابۡنَ مَرۡيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ؕ

وَلِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا ؕ يَخۡلُقُ

مَا يَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۷﴾ وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ

وَالنَّصٰرٰى نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلۡ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمۡ

بِذُنُوۡبِكُمۡ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ بَشَرٌ مِّمَّنۡ خَلَقَ ؕ يَغۡفِرُ لِمَنۡ يَّشَآءُ

وَيُعَذِّبُ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا

عذاب کرے جس کو چاہے ... اور اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ

بَيۡنَهُمَا وَاِلَيۡهِ الۡمَصِيۡرُ ﴿۱۸﴾

دونوں کے بیچ میں ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے

معارف ومسائل

عَلٰی فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ ۔ فترت کے لفظی معنی سست ہونے، ساکن ہونے اور کسی کام کو معطل اور بند کردینے کے آتے ہیں۔ اس آیت میں ائمہ تفسیر نے فترت کے یہی معنی بیان فرمائے ہیں۔ اور مراد اس سے کچھ مدت کے لئے سلسلہ نبوت وانبیاء بند رہنا ہے جو حضرت عیسیٰ کے بعد خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک کا زمانہ ہے۔

زمانۂ فترت کی تحقیق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار سات سو سال کا زمانہ ہے۔ اس تمام مدت میں انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس میں کبھی فترت نہیں ہوئی۔ صرف بنی اسرائیل میں سے ایک ہزار انبیاء اس عرصہ میں مبعوث ہوئے۔ اور غیر بنی اسرائیل میں سے جو انبیاء ہوئے وہ ان کے علاوہ ہیں۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے درمیان صرف پانچسو سال کا عرصہ ہے۔ اس میں سلسلہ انبیاء بند رہا، اسی لئے اس زمانہ کو زمانۂ فترت کہا جاتا ہے۔ اس سے پہلے کبھی اتنا زمانہ انبیاء کی بعثت سے خالی نہیں رہا۔ (قرطبی مع الیضاح)

حضرت موسیٰ علیہ السلام وعیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کی مدت، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کی مدت میں اور بھی مختلف روایات ہیں جن میں اس سے کم وبیش مدتیں بیان ہوئی ہیں مگر اصل مقصد پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔

امام بخاری نے حضرت سلمان فارسی سے روایت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ اور خاتم الانبیاء علیہما السلام کے درمیان کا زمانہ چھ سو سال کا تھا۔ اور اس پوری مدت میں کوئی نبی مبعوث نہیں ہوئے جیسا کہ صحیح بخاری ومسلم کے حوالہ سے مشکوٰۃ شریف میں حدیث آئی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اَنَا اَوْلَی النَّاسِ بِعِیْسٰی ۔ یعنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سب لوگوں سے زیادہ قریب ہوں۔ اور اس کا مطلب آخر حدیث میں یہ بیان فرمایا، لَیْسَ بَیْنَنَا نَبِیٌّ یعنی ہم دونوں کے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوئے۔

اور سورۂ یٰسٓ میں جو تین رسولوں کا ذکر ہے وہ درحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فرستادہ قاصد تھے۔ جن کو لغوی معنے کے اعتبار سے رسول کہا گیا ہے۔

تھا، اب تمہارے لئے پھر کھولا گیا ہے۔

دوسرا اشارہ اس طرف بھی ہے کہ آپ کا تشریف لانا ایسے زمانہ اور ایسے مقام میں ہوا ہے، جہاں علم اور دین کی کوئی روشنی موجود نہ تھی۔ مخلوق خدا خدا سے ناآشنا ہو کر بت پرستی میں لگ گئی تھی۔ ایسے زمانے میں کسی قوم کی اصلاح کوئی آسان کام نہ تھا۔ ایسے جاہلیت کے زمانے میں ایسی بگڑی ہوئی قوم آپ کے حوالہ ہوئی۔ آپ کے فیض صحبت اور توجہ نبوت سے تھوڑے ہی عرصہ میں یہ قوم ساری دنیا کے لئے علم و عمل، اخلاق، معاملات، معاشرت اور تمام زندگی کے شعبوں میں استاذ اور قابل تقلید قرار دی گئی۔ جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور آپ کی پیغمبرانہ تعلیم کا تمام انبیاء سابقین میں افضل و اعلیٰ ہونا بھی بدرجۂ اولیٰ ثابت ہوگیا۔ جو ڈاکٹر کسی مایوس العلاج مریض کا علاج کرے اور ایسی جگہ میں کرے جہاں طبی آلات اور دوائیں بھی مفقود ہوں۔ اور پھر وہ اس کے علاج میں اتنا کامیاب ہو کہ یہ لب دم مریض نہ صرف یہ کہ تندرست ہوگیا بلکہ ایک حاذق اور ماہر ڈاکٹر بھی بن گیا۔ تو اس ڈاکٹر کے کمال میں کسی کو کیا شبہ رہ سکتا ہے۔

اسی طرح طویل زمانہ فترت کے بعد جبکہ ہر طرف کفر و معصیت کی ظلمت ہی ظلمت چھائی ہوئی تھی، آپ کی تعلیمات اور تربیت نے ایسا اجالا کر دیا کہ جس کی نظیر کسی پچھلے دور میں نظر نہیں آتی تو سارے معجزات ایک طرف، تنہا یہ معجزہ انسان کو آپ پر ایمان لانے کے لئے مجبور کر سکتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر

اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ

جب پیدا کئے تم میں نبی اور کردیا تم کو بادشاہ اور دیا تم کو جو نہیں

يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۰﴾ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ

دیا تھا کسی کو جہان میں اے قوم داخل ہو زمین

الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى

پاک میں جو مقرر کردی ہے اللہ نے تمہارے واسطے اور نہ لوٹو اپنی پیٹھ کی طرف

اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۱﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ

پھر جا پڑوگے نقصان میں بولے اے موسیٰ وہاں

فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ ۖ وَإِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِن يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ ﴿٢٢﴾ قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غَالِبُونَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٣﴾ قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوا فِيهَا ۖ فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ﴿٢٤﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي ۖ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿٢٥﴾ قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ ۛ أَرْبَعِينَ سَنَةً ۛ يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾

ع ۴

خلاصۂ تفسیر

اور وہ وقت بھی ذکر کرنے کے قابل ہے جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم (یعنی بنی اسرائیل)
سے (ان کو ترغیب جہاد کی تمہید میں یہ) فرمایا کہ اے میری قوم تم اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو تم پر
ہوا ہے یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے (جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام
و حضرت یوسف علیہ السلام اور خود حضرت موسیٰ علیہ السلام و حضرت ہارون علیہ السلام وغیرہم

بدلہ ہر ایک کے لئے تجویز فرما دیجئے، ارشاد ہوا اچھا، تو ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ یہ ملک ان کے ہاتھ نہیں، چالیس برس تک نہ لگے گا اور وطن جانا بھی نصیب نہ ہوگا راستہ بھی نہ ملے گا، یوں ہی چالیس برس تک زمین میں سر مارتے پھریں گے (حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ فیصلہ سنا جس کا گمان نہ تھا خیال یہ تھا کہ کوئی معمولی تنبیہ ہو جاوے گی تو طبعی مغموم ہونے لگے۔ ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ جب ان سرکشوں کے لئے ہم نے یہ تجویز کی تو یہی مناسب ہے، سو آپ اس بے حکم قوم کی اس حالتِ زار پر (ذرا) غم نہ کیجئے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلی آیت میں اس میثاق کا ذکر تھا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کی اطاعت کے بارے میں بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا، اور اس کے ساتھ ان کی عام عہد شکنی، اور میثاق کی خلاف ورزی اور اس پر سزاؤں کا بیان تھا۔ ان آیات مذکورہ میں ان کی عہد شکنی کا ایک خاص واقعہ مذکور ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب فرعون اور اس کا لشکر غرق دریا ہوگئے اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے نجات پا کر حکومت مصر کے مالک بن گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنا مزید انعام اور ان کے آبائی وطن ملک شام کو بھی ان کے قبضہ میں دینے کا وعدہ کیا۔ اور اس کے لئے بذریعہ موسیٰ علیہ السلام ان کو حکم دیا کہ وہ جہاد کی نیت سے ارض مقدسہ یعنی ملک شام میں داخل ہوں۔ اور ساتھ ہی ان کو یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ اس جہاد میں فتح اُن کی ہی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اس مقدس زمین کو ان کے حصہ میں لکھ دیا ہے وہ ضرور ان کو مل کر رہے گی۔ مگر بنی اسرائیل ... اپنی طبعی خصوصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے انعامات، غرق فرعون اور فتح مصر وغیرہ کا آنکھوں سے مشاہدہ کرلینے کے باوجود یہاں بھی عہد میثاق پر پورے نہ اترے۔ اور جہاد سے ہٹ کر اس حکم الٰہی کے خلاف ضد کر کے بیٹھ گئے۔ جس کی سزا اُن کو قدرت کی طرف سے اس طرح ملی کہ چالیس سال تک ایک محدود علاقہ میں محصور و مقید ہو کر رہ گئے کہ نہ بظاہر ان کے گرد کوئی حصار تھا، نہ اُن کے ہاتھ پاؤں کسی قید میں جکڑے ہوئے تھے۔ بلکہ کھلے میدان میں تھے۔ اور اپنے وطن مصر کی طرف واپس چلے جانے کے لئے ہر روز صبح سے شام تک سفر کرتے تھے۔ مگر شام کو دیکھتے وہیں نظر آتے تھے جہاں سے صبح چلے تھے۔ اسی دوران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی

اُمَّةً وَّسَطًا۔ اس پر شاہد ہے اور حدیث نبوی کی بے شمار روایات اس کی تائید میں ہیں۔ جواب یہ کہ اس آیت میں دنیا کے ان لوگوں کا ذکر ہے جو بنی اسرائیل کے موسوی عہد میں موجود تھے، کہ اس وقت پورے عالم میں کسی کو وہ نعمتیں نہیں دی گئی تھیں جو بنی اسرائیل کو ملی تھیں۔ آئندہ زمانہ میں کسی امت کو ان سے بھی زیادہ نعمتیں مل جائیں یہ اس کے منافی نہیں۔

اس پہلی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ قول نقل فرمایا گیا ہے جو تمہید تھی اس حکم کے بیان کرنے کی جو دوسری آیت میں اس طرح ارشاد ہوا ہے۔ یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ، یعنی اے میری قوم تم اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے حصہ میں لکھ رکھی ہے۔

ارض مقدسہ سے کونسی زمین مراد ہے؟

ارض مقدسہ سے کونسی زمین مراد ہے؟ اس میں مفسرین کے اقوال بظاہر متعارض ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ بیت المقدس مراد ہے۔ بعض نے شہر قدس و ایلیا کو ارض مقدسہ کا مصداق بتلایا ہے۔ بعض نے شہر اریحا کو جو نہر اردن اور بیت المقدس کے درمیان دنیا کا قدیم ترین شہر تھا اور آج تک موجود ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اس کی عظمت و وسعت کے عجیب وغریب حالات نقل کئے جاتے ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ اس شہر کے ایک ہزار حصے اور ہر حصہ میں ایک ایک ہزار باغ تھے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ ارض مقدسہ سے مراد دمشق، فلسطین اور بعض کے نزدیک اردن ہے۔ اور حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ ملک شام پورا ارض مقدس ہے۔ کعب احبار نے فرمایا کہ میں نے اللہ کی کتاب (تورات) میں دیکھا ہے کہ ملک شام پوری زمین میں اللہ کا خاص خزانہ ہے، اور اس میں اللہ کے مخصوص مقبول بندے ہیں۔ اس زمین کو مقدس اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کا وطن اور مستقر رہا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک روز حضرت ابراہیم علیہ السلام لبنان کے پہاڑ پر چڑھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو فرمایا کہ اے ابراہیم یہاں سے آپ نظر ڈالو، جہاں تک آپ کی نظر پہونچے گی ہم نے اس کو ارض مقدس بنا دیا۔ یہ سب روایات تفسیر ابن کثیر اور تفسیر مظہری سے نقل کی گئی ہیں۔ اور صاف بات یہ ہے کہ ان اقوال میں تعارض کچھ نہیں۔ پورا ملک شام آخری روایات کے مطابق ارض مقدس ہے۔ بیان کرنے میں بعض حضرات نے ملک شام کے کسی حصہ کو بیان کر دیا، کسی نے پورے کو۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰی۔ اس سے پہلے آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بذریعہ موسیٰ علیہ السلام

مذکور ہیں نہ عقل ان کو قبول کرسکتی ہے اور نہ شرع میں اُن کا کوئی جواز ہے۔ بلکہ یہ سب کذب و افتراء ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ قوم عمالقہ کے لوگ چونکہ قوم عاد کے بقایا ہیں جن کے ہیبتناک قد و قامت کا خود قرآن کریم نے ذکر فرمایا ہے۔ اس قوم کا ڈیل ڈول اور قوت و طاقت ضرب المثل تھی۔ ان میں کا ایک آدمی قوم بنی اسرائیل کے بارہ آدمیوں کو گرفتار کرکے لے جانے پر قادر ہوگیا۔

بہرحال بنی اسرائیل کے بارہ سردار عمالقہ کی قید سے رہا ہوکر اپنی قوم کے پاس مقام اریحا پر پہونچے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس عجیب و غریب قوم اور اس کی ناقابل قیاس قوت و شوکت کا ذکر کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قلب پر تو ان سب باتوں کا ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی فتح و کامیابی کی بشارت سُنادی تھی۔ بقول اکبرؔ

مجھ کو بے دل کردے ایسا کون ہے
یاد مجھ کو اَنْـتُمُ الْاَعْلَوْنَ ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام تو عمالقہ کی قوت و شوکت کا حال سن کر اپنی جگہ کوہ استقامت بنے ہوئے اقدام جہاد کی فکر میں لگے رہے۔ مگر خطرہ یہ ہوگیا کہ بنی اسرائیل کو اگر حریف مقابل کی اس بے پناہ طاقت کا علم ہوگیا تو یہ لوگ پھسل جائیں گے۔ اس لئے ان بارہ سرداروں کو ہدایت فرمائی کہ قوم عمالقہ کے یہ حالات بنی اسرائیل کو ہرگز نہ بتائیں، بلکہ راز رکھیں۔ مگر ہوا یہ کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے دوستوں سے خفیہ طور پر اس کا تذکرہ کردیا۔ صرف دو آدمی جن میں سے ایک کا نام یوشع بن نون اور دوسرے کا کالب بن یوقنا تھا۔ انھوں نے موسوی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس راز کو کسی پر ظاہر نہیں کیا۔

اور ظاہر ہے کہ بارہ میں سے جب دس نے راز فاش کردیا تو اس کا پھیل جانا قدرتی امر تھا۔ بنی اسرائیل میں جب ان حالات کی خبریں شائع ہوگئیں تو لگے رونے پیٹنے اور کہنے لگے کہ اس سے تو اچھا یہی تھا کہ قوم فرعون کی طرح ہم بھی غرق دریا ہوجاتے۔ وہاں سے بچا کر ہمیں یہاں مروایا جارہا ہے۔ انہی حالات میں بنی اسرائیل نے یہ الفاظ کہے: یٰمُوْسٰی اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰی یَخْرُجُوْا مِنْهَا۔ یعنی اے موسیٰ اس شہر میں تو بڑی زبردست قوم آباد ہے جن کا مقابلہ ہم سے نہیں ہوسکتا۔ اس لئے جب تک وہ لوگ آباد ہیں اور موجود ہیں ہم وہاں جانے کا نام نہیں لیں گے۔ اگلی آیت میں ہے کہ دو

قوم کی مسلسل عہد شکنی اور وعدہ فراموشی سے عاجز آکر اپنے رب کے سامنے صرف اتنا عرض کرتے ہیں: اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِکُ اِلَّا نَفۡسِیۡ وَاَخِیۡ، یعنی مجھے تو بس اپنی جان اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر اختیار نہیں۔ قوم عمالقہ پر جہاد کی مہم کو کس طرح سر کیا جائے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے قوم بنی اسرائیل میں سے کم از کم دو سردار یوشع بن نون اور کالب بن یوقنا جنہوں نے پوری طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اتباع کا ثبوت دیا تھا اور قوم کو سمجھانے اور صحیح راستہ پر لانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مسلسل کوشش کی تھی، اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کا بھی ذکر نہیں کیا، بلکہ صرف اپنی اور حضرت ہارون علیہ السلام کا تذکرہ فرمایا۔ اس کا سبب وہی قوم بنی اسرائیل کی عہد شکنی اور نافرمانی تھی کہ صرف حضرت ہارون علیہ السلام تو چونکہ نبی و پیغمبر ہونے کے معصوم تھے۔ اور ان کا طریق حق پر قائم رہنا یقینی تھا۔ باقی یہ دونوں سردار معصوم نہیں تھے۔ اس انتہائی غم و غصہ کے عالم میں صرف اس کا ذکر کیا جس کا حق پر قائم رہنا یقینی تھا۔ اس اظہار کے ساتھ کہ مجھے اپنی جان اور اپنے بھائی **کے سوا کسی پر اختیار نہیں۔**

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی فَافۡرُقۡ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ یعنی ہم دونوں اور ہماری قوم کے درمیان آپ ہی فیصلہ فرما دیجئے۔ اس دعا کا حاصل حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے مطابق یہ تھا کہ یہ لوگ جس سزا کے مستحق ہیں ان کو وہ سزا دی جائے اور ہم دونوں جس صورت حال کے مستحق ہیں ہم کو وہ عطا فرمایا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو اس طرح قبول فرمایا، ارشاد ہوا کہ فَاِنَّہَا مُحَرَّمَۃٌ عَلَیۡہِمۡ اَرۡبَعِیۡنَ سَنَۃً ۚ یَتِیۡہُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ، یعنی ملک شام کی زمین ان پر چالیس سال کے لئے حرام قرار دے دی گئی، اب اگر وہ وہاں جانا بھی چاہیں تو نہ جا سکیں گے۔ اور یہی نہیں کہ ملک شام نہ جا سکیں گے، بلکہ وہ اگر اپنے وطن مصر کی طرف لوٹنا چاہیں گے تو وہاں بھی نہ جا سکیں گے بلکہ اسی میدان تیہ میں ان کو نظر بند کر دیا جائے گا۔

خدائے عزوجل کی سزاؤں کے لئے نہ پولیس اور نہ ان کی ہتھکڑیاں شرط ہیں اور نہ جیل خانے کی مضبوط دیواریں اور آہنی دروازے، بلکہ جب وہ کسی کو محصور و نظر بند کرنا چاہیں تو کھلے میدان میں بھی قید کر سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات اسی کی مخلوق اور محکوم ہے۔ جب کائنات کو کسی کی قید کا حکم ہو جاتا ہے تو ساری ہوا اور فضا اور زمین و **مکان اس کے لیے جیل بن جاتے ہیں** ؎

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند ٭ با من و تو مردہ با حق زندہ اند

چنانچہ یہ مختصر سا میدان جو مصر اور بیت المقدس کے درمیان تھا جس کی پیمائش حضرت مقاتل کی تفسیر کے مطابق تیس فرسخ لمبائی اور نو فرسخ چوڑائی ہے، ایک فرسخ اگر تین میل کا قرار دیا جائے تو نوّے میل کے طول اور ستائیس میل کے عرض کا کل رقبہ ہوجاتا ہے، اور بعض روایات کے مطابق صرف تیس میل ضرب اٹھارہ میل کا رقبہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس پوری قوم کو جس کی تعداد حضرت مقاتل کے بیان کے موافق چھ لاکھ نفوس تھی، اس مختصر سے کھلے میدانی رقبہ کے اندر اس طرح قید کر دیا کہ چالیس سال مسلسل اس تنگ دَور میں رہے کہ کسی طرح اس میدان سے نکل کر مصر واپس چلے جائیں، یا آگے بڑھ کر بیت المقدس پر پہونچ جائیں، مگر ہوتا یہ تھا کہ سارے دن کے سفر کے بعد جب شام ہوتی تو یہ معلوم ہوتا کہ پھر پھرا کر وہ اسی مقام پر پہونچ گئے ہیں جہاں سے صبح چلے تھے۔

علماء تفسیر نے فرمایا کہ اللہ جل شانہ کسی قوم کو جو سزا دیتے ہیں وہ ان کے اعمالِ بد کی مناسبت سے ہوتی ہے، اس نافرمان قوم نے چونکہ یہ کلمہ بولا تھا کہ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ یعنی ہم تو یہیں بیٹھے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی سزا میں چالیس سال تک کے لئے وہیں قید کر دیا، تاریخی روایات اس میں مختلف ہیں، کہ اس چالیس سال کے عرصہ میں بنی اسرائیل کی موجودہ نسل جس نے نافرمانی کی تھی سبھی فنا ہوگئے، اور ان کی اگلی نسل باقی رہ گئی، جو اس چالیس سالہ قید سے نجات پانے کے بعد بیت المقدس میں داخل ہوئی، یا ان میں سے بھی کچھ لوگ باقی تھے، بہرحال قرآن کریم نے ایک تو یہ وعدہ کیا تھا کہ کَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ یعنی ملکِ شام بنی اسرائیل کے حصہ میں لکھ دیا ہے، وہ وعدہ پورا ہونا ضرور تھا، کہ قوم بنی اسرائیل اس ملک پر قابض و مسلط ہو، مگر بنی اسرائیل کے موجودہ افراد نے نافرمانی کرکے اس انعام خداوندی سے اعراض کیا تو ان کو یہ سزا مل گئی کہ مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً یعنی چالیس سال تک وہ ارضِ مقدسہ فتح کرنے سے محروم کر دیئے گئے، پھر اُن کی نسل میں جو لوگ پیدا ہوئے ان کے ہاتھوں یہ ملک فتح ہوا، اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوا۔

اس وادیِ تیہ میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام بھی اپنی قوم کے ساتھ تھے مگر یہ وادی اُن کے لئے قید اور سزا تھی، اور ان دونوں حضرات کے لئے نعماتِ الٰہیہ کا مظہر۔

یہی وجہ ہے کہ چالیس سالہ دور جو بنی اسرائیل پر معتوب ہونے کا گذرا اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی برکت سے طرح طرح کی نعمتوں سے سرفراز فرمایا، کھلے میدان کی دھوپ سے عاجز آئے تو موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے اُن پر بادلوں کی چھتری لگا دی، جس طرف یہ لوگ چلتے تھے بادل ان کے ساتھ تھا سایہ فگن

ہو کر چلتے تھے، پیاس و پانی کی قلت کی شکایت پیش آئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ ؑ کو ایک ایسا پتھر عطا فرما دیا کہ وہ ہر جگہ اُن کے ساتھ ساتھ رہتا تھا، اور جب پانی کی ضرورت ہوتی تھی تو موسیٰ علیہ السلام اپنا عصا اُس پر مارتے تھے تو بارہ چشمے اس میں سے جاری ہو جاتے تھے، بھوک کی تکلیف پیش آئی تو آسمانی غذا من وسلویٰ اُن پر نازل کر دی گئی، رات کو اندھیری کی شکایت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے روشنی کا ایک مینار ان کے لئے کھڑا کر دیا جس کی روشنی میں یہ سب کام کاج کرتے تھے۔

غرض اس میدان تیہ میں صرف معتوب لوگ ہی نہ تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے دو محبوب پیغمبر اور ان کے ساتھ دو مقبول بزرگ یوشع بن نون اور کالب بن یوقنا بھی تھے، ان کے طفیل میں اس قید و سزا کے زمانے میں بھی یہ انعامات اُن پر ہوتے رہے، اور اللہ تعالیٰ رحیم و رحمان ہیں، ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کے ان افراد نے بھی ان حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد اپنے جرم سے توبہ کر لی ہو اس کے بدلہ میں یہ انعامات ان کو مل رہے ہوں۔

صحیح روایات کے مطابق اسی چالیس سالہ دور میں اول حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات ہو گئی، اور اس کے ایک سال یا چھ مہینہ بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو گئی، ان کے بعد حضرت یوشع بن نون کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنا کر بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے مامور فرمایا، اور چالیس سالہ قید ختم ہونے کے بعد بنی اسرائیل کی باقی ماندہ قوم حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں جہاد بیت المقدس کے لئے روانہ ہوئی، اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق ملک شام اُن کے ہاتھوں فتح ہوا، اور اس ملک کی ناقابلِ قیاس دولت ان کے ہاتھ آئی۔

آخر آیت میں جو ارشاد فرمایا کہ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ، یعنی اس نافرمان قوم پر آپ ترس نہ کھائیں، یہ اس بنا پر کہ انبیاء علیہم السلام اپنی طبیعت اور فطرت سے ایسے ہوتے ہیں کہ اپنی امت کی تکلیف و پریشانی کو برداشت نہیں کر سکتے، اگر ان کو سزا ملے تو یہ بھی اس سے مغموم و متأثر ہو کرتے ہیں، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ تسلی دی گئی کہ آپ ان کی سزا سے دل گیر نہ ہوں۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا

اور سُنا ان کو حال واقعی آدم کے دو بیٹوں کا جب نیاز کی دونوں نے کچھ

فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ

نیاز اور مقبول ہوئی ایک کی اور نہ مقبول ہوئی دوسرے کی کہا

وقف لازم

لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾ لَىِٕنْۢ

میں تجھ کو مار ڈالوں گا وہ بولا اللہ قبول کرتا ہے تو پرہیزگاروں سے اگر تو

بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ

ہاتھ چلاوے گا مجھ پر مارنے کو میں نہ ہاتھ چلاؤں گا تجھ پر

لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّىْٓ اُرِيْدُ

مارنے کو میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو پروردگار ہے سب جہان کا میں چاہتا ہوں کہ

اَنْ تَبُوْۗاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ

تو حاصل کرے میرا گناہ اور اپنا گناہ پھر ہو جاوے تو دوزخ والوں میں اور

ذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ

یہی ہے سزا ظالموں کی پھر اس کو راضی کیا اس کے نفس نے خون پر اپنے بھائی کے

فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ

پھر اس کو مار ڈالا سو ہو گیا نقصان اٹھانے والوں میں، پھر بھیجا اللہ نے ایک کوا جو کریدتا تھا

فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۭ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى

زمین کو تاکہ اس کو دکھلائے کس طرح چھپاتا ہے لاش اپنے بھائی کی بولا اے افسوس

اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ

مجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ ہوں برابر اس کوے کی کہ میں چھپاؤں لاش اپنے

اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ

بھائی کی پھر لگا پچھتانے، اسی سبب سے،

كَتَبْنَا عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ

لکھا ہم نے بنی اسرائیل پر کہ جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض جان کے

اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ

یا بغیر فساد کرنے کے ملک میں تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو اور جس نے

اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَقَدْ جَاۗءَتْهُمْ

زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا زندہ کر دیا سب لوگوں کو اور لا چکے ہیں ان کے پاس

النصف

معانقہ ۵

رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ

رسول ہمارے کھلے ہوئے حکم پھر بہت لوگ ان میں سے اس پر بھی ملک میں

لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾

دست درازی کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان اہل کتاب کو (حضرت) آدم (علیہ السلام) کے دو بیٹوں کا (یعنی ہابیل و قابیل کا) قصہ صحیح طور پر پڑھ کر سنا دیجئے (تاکہ ان کو انتساب بالصالحین کا گھمنڈ جاتا رہے جس کا نحن ابناء اللہ میں اظہار ہو رہا ہے، اور وہ قصہ اس وقت ہوا تھا) جبکہ دونوں نے (اللہ تعالیٰ کے نام کی) ایک ایک نیاز پیش کی اور ان میں سے ایک کی (یعنی ہابیل کی) تو مقبول ہوگئی اور دوسرے کی (یعنی قابیل کی) مقبول نہ ہوئی، (کیونکہ جس معاملہ کے فیصلہ کے لئے یہ نیاز چڑھائی گئی تھی اس میں ہابیل حق پر تھا، اس لئے اس کی نیاز قبول ہوگئی، اور قابیل حق پر نہ تھا اس کی قبول نہ ہوئی، ورنہ پھر فیصلہ نہ ہوتا، بلکہ اور غلط و اشتباہ ہو جاتا جب) وہ دوسرا (یعنی قابیل اس میں بھی ہارا تو جھلا کر) کہنے لگا کہ میں تجھ کو ضرور قتل کروں گا، اس ایک نے (یعنی ہابیل نے) جواب دیا (کہ تیرا ہارنا تو تیری ہی ناحق پرستی کی وجہ سے ہے میری کیا خطا، کیونکہ) خدا تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں (میں نے تو تقویٰ اختیار کیا اور خدا کے حکم پر رہا، خدا تعالیٰ نے میری نیاز قبول کی، تو نے تقویٰ چھوڑ دیا اور خدا کے حکم سے منہ موڑا تیری نیاز قبول نہیں کی سو اس میں تیری خطا ہے یا میری، انصاف کر، لیکن اگر پھر بھی تیرا یہی ارادہ ہے تو تو جان، میں نے تو پختہ قصد کر لیا ہے) اگر تو مجھ پر میرے قتل کرنے کے لئے دست درازی کرے گا تب بھی میں تجھ پر تیرے قتل کرنے کے لئے ہرگز دست درازی کرنے والا نہیں (کیونکہ) میں تو خدائے پروردگار عالم سے ڈرتا ہوں (کہ باوجودیکہ تیرے جواز قتل کا بظاہر ایک سبب موجود ہے یعنی یہ کہ تو مجھ کو قتل کرنا چاہتا ہے، مگر اس وجہ سے کہ یہ جواز اب تک کسی نص جزئی سے مجھ کو محقق نہیں ہوا، اس لئے اس کے ارتکاب کو احتیاط کے خلاف سمجھتا ہوں اور اس شبہ کی وجہ سے خدا سے ڈرتا ہوں اور یہ جرأت تجھی کو ہے کہ باوجودیکہ [illegible] قتل کا کوئی [illegible] لیکن پھر بھی خدا سے نہیں ڈرتا میں [illegible]

ظلم کیوں نہ کرے جس سے کہ تو میرے گناہ اور اپنے گناہ سب اپنے سر رکھ لے پھر تو دوزخیوں میں شامل ہو جاوے اور یہی سزا ہوتی ہے ظلم کرنے والوں کی سو (یوں تو پہلے ہی سے قتل کا ارادہ کر چکا تھا یہ جو سنا کہ مدافعت بھی نہ کرے گا، چاہئے تو تھا کہ گداختہ ہو جاتا مگر بے فکر ہو کر اور بھی) اس کے جی نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیا (پھر) آخر اس کو قتل ہی کر ڈالا جس سے (کمبخت) بڑے نقصان اٹھانے والوں میں شامل ہو گیا (دنیا میں تو یہ نقصان کہ اپنا قوت بازو اور راحت روح گم کر بیٹھا، اور آخرت میں یہ نقصان کہ سخت عذاب میں مبتلا ہوگا، اب جب قتل سے فارغ ہوا تو اب حیران ہے کہ لاش کو کیا کروں جس سے یہ راز پوشیدہ رہے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو) پھر (آخر) اللہ تعالیٰ نے ایک کوا (وہاں) بھیجا کہ وہ (چونچ اور پنجوں سے) زمین کو کھودتا تھا (اور کھود کر ایک دوسرے کوے کو کہ وہ مرا ہوا تھا اس گڑھے میں دھکیل کر اس پر مٹی ڈالتا تھا) تاکہ وہ (کوا) اس (قاتل) کو تعلیم دے کہ اپنے بھائی (ہابیل) کی لاش کو کس طریقہ سے چھپائے (قابیل یہ واقعہ دیکھ کر اپنے جی میں بڑا ذلیل ہوا کہ مجھ کو کوے کے برابر بھی فہم نہیں، اور غایت حسرت سے) کہنے لگا کہ افسوس میری حالت پر کیا میں اس سے بھی گیا گذرا کہ اس کوے ہی کے برابر ہوتا اور اپنے بھائی کی لاش کو چھپا دیتا (سو اس بدحالی پر) بڑا شرمندہ ہوا، اسی واقعہ کی) وجہ سے (جس سے قتل ناحق کے مفاسد ثابت ہوتے ہیں) ہم نے (تمام مکلفین پر عموماً اور بنی اسرائیل پر خصوصاً) یہ (حکم) لکھ دیا (یعنی مقرر کر دیا کہ قتل ناحق بڑا گناہ ہے کہ) جو شخص کسی شخص کو بلا معاوضہ دوسرے شخص کے (جو ناحق مقتول ہوا ہو) یا بدون کسی (شرعی) فساد کے جو زمین میں اس سے پھیلا ہو (خواہ مخواہ) قتل کر ڈالے تو (اس کو بعض اعتبار سے ایسا گناہ ہوگا کہ) گویا اس نے تمام آدمیوں کو قتل کر ڈالا، اور وہ بعض اعتبار یہ ہے کہ اس گناہ پر جرأت کی، خدائے تعالیٰ کی نافرمانی کی، خدائے تعالیٰ اس سے ناراض ہوئے دنیا میں مستحق قصاص ہوا، آخرت میں مستحق دوزخ ہوا، یہ امور ایک کے اور ہزار کے قتل کرنے میں مشترک ہیں، گو شدت و اشدیت کا تفاوت ہو، اور یہ دو قیدیں اس لئے لگائیں کہ قصاص میں قتل کرنا جائز ہے، اسی طرح دوسرے سبب جواز قتل سے بھی جن میں قطع طریق جو آگے مذکور ہے، اور کفر حربی جس کا ذکر احکام جہاد میں چکا ہے سب داخل ہیں، قتل کرنا جائز بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہے) اور (یہ بھی لکھ دیا تھا کہ جیسا ناحق قتل کرنا گناہ عظیم ہے، اسی طرح کسی کو قتل غیر واجب سے بچا لینا اس میں ثواب بھی ایسا ہی عظیم ہے کہ) جو شخص کسی شخص کو بچا لیوے تو (اس کو ایسا ثواب ملیگا کہ

گویا اس نے تمام آدمیوں کو بچا لیا، (غیرہ وجب کی قید اس لئے لگائی کہ جس شخص کا قتل شرعاً واجب ہو اس کی امداد یا سفارش حرام ہے، اور اس مضمون احیاء کے لکھنے سے بھی تشدید قتل کی ظاہر ہو گئی کہ جب احیاء ایسا محمود ہے تو ضرور قتل مذموم ہوگا اس لئے اس کا ترتب و تسبب بھی بواسطہ عطف کے مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ پر صحیح ہو گیا) اور بنی اسرائیل کے پاس (اس مضمون کے لکھ دینے کے بعد) ہمارے بہت سے پیغمبر بھی دلائل واضحہ (نبوت کے) لیکر آئے، اور وقتاً فوقتاً اس مضمون کی تاکید کرتے رہے) مگر پھر اس (تاکید و اہتمام) کے بعد بھی بہتیرے ان میں سے دنیا میں زیادتی کرنے والے ہی رہے (اور ان پر کچھ اثر نہ ہوا حتیٰ کہ بعض نے خود ان انبیاء ہی کو قتل کر دیا)۔

معارف و مسائل

قصہ ہابیل و قابیل

ان آیت میں حق تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ آپ اہل کتاب کو یہ پوری امت کو حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا قصہ صحیح صحیح سنا دیجئے۔

قرآن مجید پر نظر کرنے والے جانتے ہیں کہ قرآن کریم کوئی قصہ کہانی یا تاریخ کی کتاب نہیں جس کا مقصد کسی واقعہ کو اول سے آخر تک بیان کرنا ہو، لیکن واقعات ماضیہ اور گذشتہ اقوام کی سرگذشت اپنے دامن میں بہت سی عبرتیں اور نصیحتیں رکھتی ہے، وہی تاریخ کی اصلی روح ہے، اور ان میں بہت سے حالات و واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں، جن پر مختلف احکام شرعیہ کی بنیاد ہوتی ہے، انہی فوائد کے پیش نظر قرآن کریم کا اسلوب ہر جگہ یہ ہے کہ موقع بموقع کوئی واقعہ بیان کرتا ہے، اور کثر پورا واقعہ بھی ایک جگہ بیان نہیں کرتا، بلکہ اس کے جتنے حصہ سے اس جگہ کوئی مقصد متعلق ہوتا ہے اس کا وہی ٹکڑا یہاں بیان کر دیا جاتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا یہ قصہ بھی اسی اسلوب حکیم پر نقل کیا جا رہا ہے، اس میں موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے بہت سی عبرتیں اور مواعظ ہیں، اور اس کے ضمن میں بہت سے احکام شرعیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اب پہلے الفاظ قرآن کی تشریح اور اس کے تحت میں اصل قصہ دیکھئے، اس کے بعد اس کے متعلقہ احکام و مسائل کا بیان ہوگا۔

اس سے پہلی آیات میں بنی اسرائیل کو حکم جہاد اور اس میں ان کی کم ہمتی اور بزدلی

کا ذکر تھا، اس قصہ میں حسن کے بالمقابل قتل ناحق کی برائی اور اس کی تباہ کاری کا بیان کر کے قوم کو اس اعتدال پر لانا مقصود ہے کہ جس طرح حق کی حمایت اور باطل کو مٹانے میں قتل و قتال سے ڈرنا غلطی ہے، اسی طرح ناحق قتل و قتال پر اقدام دین و دنیا کی تباہی ہے۔

پہلی آیت میں اِبْنَیْ اٰدَمَ کا لفظ مذکور ہے، یوں تو ہر انسان آدمی اور آدم کی اولاد ہے، ہر ایک کو ابن آدم کہا جا سکتا ہے، لیکن جمہور علماء تفسیر کے نزدیک اس جگہ اِبْنَیْ اٰدَمَ سے حضرت آدم علیہ السلام کے دو صلبی اور حقیقی بیٹے مراد ہیں، یعنی ہابیل و قابیل، ان دونوں کا قصہ بیان کرنے کے لئے ارشاد ہوا:

> تاریخی روایات کی نقل میں احتیاط اور دیانت کی ضرورت

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ "یعنی ان لوگوں کو آدم کے دو بیٹوں کا قصہ صحیح صحیح واقعہ کے مطابق سنا دیجئے" اس میں بِالْحَقِّ کے لفظ سے تاریخی روایات کی نقل میں ایک اہم اصول کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ تاریخی روایات کی نقل میں بڑی احتیاط لازم ہے، جس میں نہ کوئی جھوٹ ہو نہ کوئی تلبیس اور دھوکہ اور نہ اصل واقعہ میں کسی قسم کی تبدیلی یا کمی زیادتی (ابن کثیر)۔

قرآن کریم نے صرف اسی جگہ نہیں بلکہ دوسرے مواقع میں بھی اس اصول پر قائم رہنے کی ہدایات دی ہیں، ایک جگہ ارشاد ہے اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ، دوسری جگہ ارشاد ہے نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ، تیسری جگہ ارشاد ہے ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ، ان تمام مواقع میں تاریخی واقعات کے ساتھ لفظ حق لا کر اس بات کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے کہ نقل واقعات میں حق و صدق کی رعایت لازمی ہے، روایات و حکایات کی بنا پر جس قدر مفاسد دنیا میں ہوتے ہیں ان سب کی بنیاد عام طور پر نقل واقعات میں بے احتیاطی ہوتی ہے، ذرا سا لفظ اور عنوان بدل دینے سے واقعہ کی حقیقت مسخ ہو جاتی ہے، پچھلی اقوام کے مذاہب و شرائع اسی بے احتیاطی کی راہ سے ضائع ہو گئے، اور ان کی مذہبی کتابیں چند بے سند بے تحقیق کہانیوں کا مجموعہ بن کر رہ گئیں، اس جگہ ایک لفظ بِالْحَقِّ کا اضافہ کر کے اس اہم مقصد کی طرف اشارہ فرما دیا گیا۔

اس کے علاوہ اسی لفظ میں قرآن کریم کے مخاطبین کو اس طرف بھی رہنمائی کرنا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو امی محض ہیں اور ہزاروں سال پہلے کے واقعات بالکل سچے اور صحیح بیان فرما رہے ہیں تو اس کا سبب بجز وحی الٰہی اور نبوت کے کیا ہو سکتا ہے۔

اس تمہید کے بعد ان دونوں بیٹوں کا واقعہ قرآن کریم نے یہ بیان فرمایا: اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ، یعنی ان دونوں نے اللہ تعالیٰ

کے لئے اپنی اپنی قربانی پیش کی، مگر ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی۔

لفظ قربان عربی لغت کے اعتبار سے اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کو کسی کے قُرب کا ذریعہ بنایا جائے، اور اصطلاح شرع میں اس ذبیحہ وغیرہ کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے کیا جائے۔

اس قربانی کے پیش کرنے کا واقعہ جو صحیح اور قوی سندوں کے ساتھ منقول ہے اور ابن کثیر نے اس کو علماء سلف وخلف کا متفقہ قول قرار دیا ہے یہ ہے کہ جب حضرت آدم و حوا علیہما السلام دنیا میں آئے اور توالد و تناسل کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر ایک حمل سے ان کے دو بچے توام پیدا ہوتے، ایک لڑکا اور دوسری لڑکی، اس وقت جبکہ آدم علیہ السلام کی اولاد میں بجز بہن بھائیوں کے کوئی اور نہ تھا، اور بھائی بہن کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا تو اللہ جل شانہ نے اس وقت کی ضرورت کے لحاظ سے شریعت آدم علیہ السلام میں یہ خصوصی حکم جاری فرما دیا تھا کہ ایک حمل سے جو لڑکا اور لڑکی پیدا ہوں وہ تو آپس میں حقیقی بہن بھائی سمجھے جائیں، اور ان کے درمیان نکاح حرام قرار پائے، لیکن دوسرے حمل سے پیدا ہونے والے لڑکے کے لئے پہلے حمل سے پیدا ہونے والی لڑکی حقیقی بہن کے حکم میں نہیں ہوگی، بلکہ ان کے درمیان رشتہ ازدواج ومناکحت جائز ہوگا۔

لیکن ہوا یہ کہ پہلے لڑکے قابیل کے ساتھ جو لڑکی پیدا ہوئی وہ حسین و جمیل تھی اور دوسرے لڑکے ہابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی بدشکل تھی، جب نکاح کا وقت آیا تو حسب ضابطہ ہابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی بدشکل لڑکی قابیل کے حصہ میں آئی، اس پر قابیل ناراض ہوکر ہابیل کا دشمن ہوگیا، اور اس پر اصرار کرنے لگا کہ میرے ساتھ جو لڑکی پیدا ہوئی ہے وہی میرے نکاح میں دی جائے، حضرت آدم علیہ السلام نے شرعی قاعدہ کے موافق اس کو قبول نہ فرمایا، اور ہابیل و قابیل کے درمیان رفع اختلاف کے لئے یہ صورت تجویز فرمائی کہ تم دونوں اپنی اپنی قربانی اللہ کے لئے پیش کرو جس کی قربانی قبول ہوجائے گی یہ لڑکی اس کو دی جائے گی، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو یقین تھا کہ قربانی اسی کی قبول ہوگی جس کا حق ہے، یعنی ہابیل کی۔

اس زمانہ میں قربانی قبول ہونے کی ایک واضح اور کھلی ہوئی علامت یہ تھی کہ آسمان سے ایک آگ آتی اور قربانی کو کھا جاتی تھی، اور جس قربانی کو آگ نہ کھائے تو یہ علامت اس کے نامقبول ہونے کی ہوتی تھی۔

اب صورت یہ پیش آئی کہ ہابیل کے پاس بھیڑ بکریاں تھیں، اس نے ایک

میری ایک نماز اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول ہوگئی تو میرے لئے وہ ساری دنیا اور اس کی نعمتوں سے زیادہ ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک شخص کو خط میں یہ نصائح لکھیں کہ:

"میں تجھے تقویٰ کی تاکید کرتا ہوں جس کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، اور اہل تقویٰ کے سوا کسی پر رحم نہیں کیا جاتا، اور اس کے بغیر کسی چیز پر ثواب نہیں ملتا، اس بات کا وعظ کہنے والے تو بہت ہیں مگر عمل کرنے والے بہت کم ہیں"

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تقویٰ کے ساتھ کوئی چھوٹا سا عمل بھی چھوٹا نہیں ہے، اور جو عمل مقبول ہو جائے وہ چھوٹا کیسے ہو سکتا ہے۔ (ابن کثیر)

جرم وسزا کے چند قرآنی ضابطے

إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسْعَوْنَ
یہی سزا ہے ان کی جو لڑائی کرتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور دوڑتے ہیں
فِى ٱلْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓا۟ أَوْ يُصَلَّبُوٓا۟ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ
ملک میں فساد کرنے کو ان کو قتل کیا جائے یا سولی چڑھائے جاویں یا کاٹے جاویں ان کے
وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَٰفٍ أَوْ يُنفَوْا۟ مِنَ ٱلْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ
ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے یا دور کر دیئے جاویں اس جگہ سے یہ
لَهُمْ خِزْىٌ فِى ٱلدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٣٣﴾
ان کی رسوائی ہے دنیا میں اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے
إِلَّا ٱلَّذِينَ تَابُوا۟ مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا۟ عَلَيْهِمْ ۖ فَٱعْلَمُوٓا۟
مگر جنہوں نے توبہ کی تمہارے قابو پانے سے پہلے تو جان لو کہ
أَنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣٤﴾
اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

ع ۵

خلاصۂ تفسیر جو لوگ اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑتے ہیں اور (اس لڑنے کا مطلب یہ کہ) ملک میں فساد (یعنی بدامنی) پھیلاتے

اسلامی حکومت شرعی قواعد کو ملحوظ رکھتے ہوئے قاضیوں کے اختیارات پر کوئی پابندی لگا دے اور جرائم کی سزاؤں کا کوئی خاص پیمانہ دے کر اس کا پابند کر دے، جیسا کہ قرون متاخرہ میں ایسا ہوتا رہا ہے، اور اس وقت تمام ممالک میں تقریباً یہی صورت رائج ہے۔

اب سمجھئے کہ جن جرائم کی کوئی سزا قرآن و سنت نے متعین نہیں کی بلکہ حکام کی صوابدید پر رکھی ہے ان سزاؤں کو شرعی اصطلاح میں تعزیرات کہا جاتا ہے، اور جن جرائم کی سزائیں قرآن و سنت نے متعین کر دی ہیں وہ دو قسم پر ہیں، ایک وہ جن میں حق اللہ کو غالب قرار دیا گیا ہے ان کی سزا کو "حد" کہا جاتا ہے جس کی جمع "حدود" ہے، دوسرے وہ جن میں حق العبد کو ازروئے شرع غالب مانا گیا ہے اس کی سزا کو قصاص کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے حدود و قصاص کا بیان پوری تفصیل و تشریح کے ساتھ خود کر دیا اور باقی تعزیری جرائم کی تفصیلات کو بیان رسول اور حکام وقت کی صوابدید پر چھوڑ دیا[1]۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے جن جرائم کی سزا کو بطور حق اللہ متعین کر کے جاری کیا ہے ان کو حدود کہتے ہیں، اور جن کو بطور حق العبد جاری فرمایا ہے ان کو قصاص کہتے ہیں، اور جن جرائم کی سزا کا تعین نہیں فرمایا اس کو تعزیر کہتے ہیں۔ سزا کی ان تینوں قسموں کے احکام بہت سی چیزوں میں مختلف ہیں، جو لوگ اپنے عرف عام کی بناء پر ہر جرم کی سزا کو تعزیر کہتے ہیں اور شرعی اصطلاحات کے فرق پر نظر نہیں کرتے ان کو شرعی احکام میں بکثرت مغالطے پیش آتے ہیں۔

تعزیری سزائیں حالات کے ماتحت ہلکی سے ہلکی بھی کی جا سکتی ہیں، سخت سے سخت بھی، اور معاف بھی کی جا سکتی ہیں، ان میں حکام کے اختیارات وسیع ہیں، لیکن حدود میں کسی حکومت یا کسی حاکم و امیر کو ذرا تغیر و تبدل یا کمی بیشی کی اجازت نہیں ہے، اور نہ زمان و مکان کے بدلنے کا ان پر کوئی اثر پڑتا ہے، نہ کسی امیر و حاکم کو اس کے معاف کرنے کا حق ہے، شریعت اسلام میں حدود صرف پانچ ہیں، ڈاکہ، چوری، زنا، تہمت زنا کی سزائیں، یہ چار سزائیں قرآن کریم میں منصوص ہیں، پانچویں شراب خوری کی حد ہے، جو اجماع صحابہ کرام سے ثابت ہوئی ہے، اس طرح کل پانچ جرائم کی سزائیں متعین ہو گئیں جن کو "حدود" کہا جاتا ہے، یہ سزائیں جس طرح کوئی حکومت یا امیر کم یا معاف نہیں کر سکتا، اسی طرح توبہ کر لینے سے بھی دنیوی سزا کے حق میں معافی نہیں ہوتی، ہاں آخرت کا گناہ خالص توبہ سے معاف ہو کر وہاں کا کھاتہ بیباق ہو جاتا ہے، ان میں سے صرف ڈاکہ کی سزا میں

لہ [illegible] حدود کی تعداد [illegible] ۳۲۳

ساقط نہ ہوگی، شرط جس کا مال چوری کیا ہے وہ معاف بھی کردے تو چوری کی شرعی سزا معاف نہ ہوگی، بخلاف قصاص کے، کہ اس میں حق عبد کی حیثیت کو قرآن و سنت نے غالب قرار دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ قاتل پر جرم قتل ثابت ہوجانے کے بعد اس کو ولی مقتول کے حوالہ کردیا جاتا ہے وہ چاہے تو قصاص لے لے اور اس کو قتل کرادے اور چاہے معاف کردے۔

اسی طرح زخموں کے قصاص کا بھی یہی حال ہے، یہ بات آپ پہلے معلوم کرچکے ہیں کہ حدود یا قصاص کے ساقط ہوجانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مجرم کو کھلی چھٹی مل جائے بلکہ حاکم وقت تعزیری سزا جتنی اور جیسی مناسب سمجھے دے سکتا ہے، اس لئے یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ اگر خون کے مجرم کو ولی مقتول نے معاف کرکے چھوڑ دیا ہے تو قاتلوں کی جرأت بڑھ جائے گی اور قتل کی وارداتیں عام ہوجائیں گی، کیونکہ اس شخص کی جان لینا تو ولی مقتول کا حق تھا وہ اس نے معاف کردیا، لیکن دوسرے لوگوں کی جانوں کی حفاظت حکومت کا حق ہے، وہ اس حق کے تحفظ کے لئے اس کو عمر قید یا دوسری قسم کی سزائیں دے کر اس خطرہ کا انسداد کرسکتی ہے۔

یہاں تک شرعی قانون حدود، قصاص اور تعزیرات کی اصطلاحات شرعیہ اور ان کے متعلق ضروری معلومات کا بیان ہوا، اب ان کے متعلق آیات کی تفسیر اور حدود کی تفصیل دیکھئے، پہلی آیت میں ان لوگوں کی سزا کا بیان ہے جو اللہ اور رسول کے ساتھ مقابلہ اور محاربہ کرتے ہیں، اور زمین میں فساد مچاتے ہیں۔

یہاں پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ اللہ و رسول کے ساتھ محاربہ اور زمین میں فساد کا کیا مطلب ہے، اور کون لوگ اس کے مصداق ہیں، لفظ محاربہ حرب سے ماخوذ ہے، اور اس کے اصلی معنی سلب کرنے اور چھین لینے کے ہیں، اور محاورات میں یہ لفظ سلم کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے جس کے معنی امن و سلامتی کے ہیں، تو معلوم ہوا کہ حرب کا مفہوم بدامنی پھیلانا ہے، اور ظاہر ہے کہ اکا دکا چوری یا قتل و غارت گری سے امن عامہ سلب نہیں ہوتا، بلکہ یہ صورت جبھی ہوتی ہے جبکہ کوئی طاقتور جماعت رہزنی اور قتل و غارت گری پر کھڑی ہوجائے، اسی لئے حضرات فقہاء نے اس سزا کا مستحق صرف اس جماعت یا فرد کو قرار دیا ہے جو مسلح ہوکر عوام پر ڈاکے ڈالے اور حکومت کے قانون کو قوت کے ساتھ توڑنا چاہے جس کو دوسرے لفظوں میں ڈاکو یا باغی کہا جاسکتا ہے، عام انفرادی جرائم کرنیوالے چور گرہ کٹ وغیرہ اس میں داخل نہیں ہیں (تفسیر مظہری)

دوسری بات یہاں یہ قابل غور ہے کہ اس آیت میں محاربہ کو اللہ اور رسول کی طرف

یہ دونوں حکم بصیغہ تفصیل ذکر کرنے سے مستفاد ہوتے ہیں (تفسیر مظہری وغیرہ)

رہزنی کی یہ چار سزائیں حرف اَوْ کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں جو چند چیزوں میں اختیار دینے کے لئے بھی مستعمل کیا جاتا ہے اور تقسیم کار کے لئے بھی، اسی لئے فقہاء امت صحابہ و تابعین کی ایک جماعت حرف اَوْ کو تخییر کے لئے قرار دے کر اس طرف گئی ہے کہ ان چار سزاؤں میں امام و امیر کو شرعاً اختیار دیا گیا ہے کہ ڈاکوؤں کی قوت و شوکت اور جرم کی شدت و خفت پر نظر کر کے ان کے سب جرائم میں یہ چاروں سزائیں یا ان میں سے کوئی ایک جاری کرے۔

سعید بن مسیبؒ، عطاءؒ، داؤدؒ، حسن بصریؒ، ضحاکؒ، نخعیؒ، مجاہدؒ اور ائمہ اربعہ میں سے امام مالکؒ کا یہی مذہب ہے اور امام ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور ایک جماعت صحابہؓ و تابعینؒ نے حرف اَوْ کو اس جگہ تقسیم کار کے معنے میں لے کر آیت کا مفہوم یہ قرار دیا کہ رہزنوں اور رہزنی کے مختلف حالات پر مختلف سزائیں مقرر ہیں، اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں بروایت ابن عباسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بردہ اسلمی سے معاہدہ صلح کا فرمایا تھا، مگر اس نے عہد شکنی کی اور کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لئے مدینہ طیبہ آرہے تھے ان پر ڈاکہ ڈالا، اس واقعہ میں جبرئیل امین یہ حکم سزا لیکر نازل ہوئے کہ جس شخص نے کسی کو قتل بھی کیا اور مال بھی لوٹا اس کو سولی چڑھایا جائے، اور جس نے صرف قتل کیا مال نہیں لوٹا اس کو قتل کیا جائے، اور جس نے کوئی قتل نہیں کیا صرف مال لوٹا ہے اس کے ہاتھ پاؤں مختلف جانبوں سے کاٹ دیئے جائیں، اور جو ان میں سے مسلمان ہو جائے اُس کا جرم معاف کر دیا جائے، اور جس نے قتل و غارت گری کچھ نہیں کیا صرف لوگوں کو ڈرایا جس سے امن عامہ مختل ہو گیا، اس کو جلا وطن کیا جائے، اگر ان لوگوں نے دار الاسلام کے کسی مسلم یا غیر مسلم شہری کو قتل کیا ہے مگر مال نہیں لوٹا تو ان کی سزا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا یعنی ان سب کو قتل کر دیا جائے اگرچہ فعل قتل براہ راست صرف بعض افراد سے صادر ہوا ہو، اور اگر کسی کو قتل بھی کیا مال بھی لوٹا تو ان کی سزا يُصَلَّبُوْٓا ہے، یعنی ان کو سولی چڑھایا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ ان کو زندہ سولی پر لٹکایا جائے، پھر نیزہ وغیرہ سے پیٹ چاک کیا جائے، اور اگر ان لوگوں نے صرف مال لوٹا ہے کسی کو قتل نہیں کیا تو ان کی سزا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ ہے، یعنی اُن کے داہنے ہاتھ گٹوں پر سے اور بائیں پاؤں ٹخنوں پر سے کاٹ دیئے جائیں، اور اس میں بھی یہ مال لوٹنے کا عمل بلا واسطہ اگرچہ بعض سے صادر ہوا ہو، مگر سزا سب کے لئے یہی ہوگی، کیونکہ کرنے والوں نے جو کچھ کیا ہے اپنے ساتھیوں کے تعاون و امداد کے بھروسہ پر کیا ہے، اس لئے

سب شریکِ جرم ہیں، اور اگر ابھی تک قتل وغارت گری کا کوئی جرم اُن سے صادر نہیں ہوا تھا کہ پہلے ہی گرفتار کر لئے گئے تو ان کی سزا اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ہے، یعنی ان کو زمین سے نکال دیا جائے۔

زمین سے نکالنے کا مفہوم ایک جماعتِ فقہاء کے نزدیک یہ ہے کہ ان کو دارالاسلام سے نکال دیا جائے، اور بعض کے نزدیک یہ ہے کہ جس مقام پر ڈاکہ ڈالا ہے وہاں سے نکال دیا جائے، حضرت فاروق اعظمؓ نے اس قسم کے معاملات میں یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر مجرم کو یہاں سے نکال کر دوسرے شہروں میں آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہاں کے لوگوں کو ستائے گا اس لئے ایسے مجرم کو قید خانہ میں بند کر دیا جائے، یہی اس کا زمین سے نکالنا ہے کہ زمین میں کہیں چل پھر نہیں سکتا، امام اعظم ابو حنیفہؒ نے بھی یہی اختیار فرمایا ہے۔

رہا یہ سوال کہ اس طرح کے مسلح حملوں میں آجکل عام طور پر صرف مال کی لوٹ کھسوٹ یا قتل وخوں ریزی ہی پر اکتفا نہیں ہوتا، بلکہ اکثر عورتوں کی عصمت دری اور اغواء وغیرہ کے واقعات بھی پیش آتے ہیں اور قرآن مجید کا جملہ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا، اس قسم کے تمام جرائم کو شامل بھی ہے تو وہ کس سزا کے مستحق ہوں گے، اس میں ظاہر یہی ہے کہ امام وامیر کو اختیار ہوگا کہ ان چاروں سزاؤں میں سے جو اُن کے مناسبِ حال دیکھے وہ جاری کرے اور بدکاری کا شرعی ثبوت بہم پہونچے تو حدِ زنا جاری کرے۔

اسی طرح اگر صورت یہ ہو کہ نہ کسی کو قتل کیا نہ مال لوٹا، مگر کچھ لوگوں کو زخمی کر دیا، تو زخموں کے قصاص کا قانون نافذ کیا جائے گا (تفسیر مظہری)

آخر آیت میں فرمایا ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي ...... الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ یعنی یہ سزائے شرعی جو دنیا میں اُن پر جاری کی گئی ہے، یہ تو دنیا کی رسوائی ہے اور سزا کا ایک نمونہ ہے، اور آخرت کی سزا اس سے بھی سخت اور دیرپا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دنیاوی سزاؤں حدود وقصاص یا تعزیرات سے بغیر توبہ کے آخرت کی سزا معاف نہیں ہوتی، ہاں سزا یافتہ شخص دل سے توبہ کر لے تو آخرت کی سزا معاف ہو جائے گی۔

دوسری آیت اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ج میں ایک استثناء ذکر کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ڈاکو اور باغی اگر حکومت کے گھیرے میں آنے اور اُن پر قابو پانے سے پہلے پہلے جب کہ ان کی قوت وطاقت بحال ہے، اس حالت میں اگر توبہ کر کے رہزنی سے خود ہی باز آجائیں تو ڈاکہ کی یہ حد شرعی اُن سے ساقط ہو جائے گی، یہ استثناء عام قانون حدود سے مختلف ہے، کیونکہ دوسرے جرائم چوری زنا وغیرہ میں جرم کرنے اور قاضی کی عدالت

میں جرم ثابت ہو جانے کے بعد اگر مجرم سچے دل سے توبہ بھی کرے تو گو اس توبہ سے آخرت کی سزا معاف ہو جائے گی، مگر دنیا میں حد شرعی معاف نہ ہوگی، جیسا کہ چند آیتوں کے بعد چوری کی سزا کے تحت میں اس کا تفصیلی بیان آئے گا۔

حکمت اس استثناء کی یہ ہے کہ ایک طرف ڈاکوؤں کی سزا میں یہ شدت اختیار کی گئی کہ پوری جماعت میں کسی ایک سے بھی جرم کا صدور ہو تو سزا پوری جماعت کو دی جاتی ہے، اس لئے دوسری طرف اس استثناء کے ذریعہ معاملہ کو ہلکا کر دیا گیا، کہ توبہ کریں تو سزائے دنیا بھی معاف ہو جائے، اس کے علاوہ اس میں ایک سیاسی مصلحت بھی ہے .... کہ ایک طاقتور جماعت پر ہر وقت قابو پانا آسان نہیں ہوتا، اس لئے ان کے واسطے ترغیب کا دروازہ کھلا رکھا گیا، کہ وہ توبہ کی طرف مائل ہو جائیں۔

نیز اس میں یہ بھی مصلحت ہے کہ قتل نفس ایک انتہائی سزا ہے، اس میں قانون اسلام کا منشاء یہ ہے کہ اس کا وقوع کم سے کم ہو، ڈاکہ کی صورت میں ایک جماعت کا قتل لازم آتا ہے، اس لئے ترغیبی پہلو سے ان کو اصلاح کی دعوت بھی ساتھ ساتھ جاری رکھی گئی، اسی کا یہ اثر تھا کہ علی اسدی جو مدینہ طیبہ کے قرب میں ایک جتھہ جمع کر کے آنے جانے والوں پر ڈاکہ ڈالتا تھا، ایک روز قافلہ میں کسی قاری کی زبان سے یہ آیت اس کے کان میں پڑ گئی، يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ قاری کے پاس پہونچے، اور دوبارہ پڑھنے کی درخواست کی، دوسری مرتبہ آیت سنتے ہی اپنی تلوار میان میں داخل کی، اور رہزنی سے توبہ کر کے مدینہ طیبہ پہونچے، اس وقت مدینہ پر مروان بن حکم حاکم تھے، حضرت ابوہریرہؓ ان کا ہاتھ پکڑ کر امیر مدینہ کے پاس لے گئے، اور قرآن کی آیت مذکورہ پڑھ کر فرمایا کہ آپ اس کو کوئی سزا نہیں دے سکتے۔

حکومت بھی ان کے فساد و رہزنی سے عاجز ہو رہی تھی سب کو خوشی ہوئی۔

اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں حارثہ بن بدر بغاوت کر کے نکل گیا، اور قتل و غارت گری کو پیشہ بنا لیا، مگر پھر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اور توبہ کر کے واپس آیا، تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس پر حد شرعی جاری نہیں فرمائی۔

یہاں یہ بات قابل یادداشت ہے کہ حد شرعی کے معاف ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حقوق العباد جن کو اس نے ضائع کیا ہے وہ بھی معاف ہو جائیں، بلکہ اگر کسی کا مال لیا ہے اور وہ موجود ہے تو اس کا واپس کرنا ضروری ہے، اور کسی کو قتل کیا ہے یا زخمی کیا ہے تو اس کا قصاص اس پر لازم ہے، البتہ چونکہ قصاص حق العبد ہے تو اولیاء مقتول یا صاحب حق کے معاف کرنے

سے معاف ہو جائے گا، اور جو کوئی مالی نقصان کسی کو پہونچایا ہے اس کا ضمان ادا کرنا یا اس سے معاف کرانا لازم ہے، امام اعظم ابوحنیفہ اور جمہور فقہاء کا یہی مسلک ہے، اور اگر غور کیا جائے تو یہ بات یوں بھی ظاہر ہے کہ حقوق العباد سے خلاصی حاصل کرنا خود توبہ کا ایک جزء ہے، بدون اس کے توبہ ہی مکمل نہیں ہوتی، اس لئے کسی ڈاکو کو تائب اسی وقت مانا جائے گا جب وہ حقوق العباد کو ادا یا معاف کرالے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَ

اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور ڈھونڈو اس تک وسیلہ اور

جَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٣٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ

جہاد کرو اس کی راہ میں تاکہ تمہارا بھلا ہو جو لوگ کافر ہیں اگر

أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ

ان کے پاس ہو جو کچھ زمین میں ہے سارا اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہو تاکہ بدلہ میں دیں

عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ

اپنے قیامت کے دن عذاب سے تو ان سے قبول نہ ہوگا اور ان کے واسطے عذاب

أَلِيمٌ ﴿٣٦﴾ يُرِيدُونَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ

دردناک ہے چاہیں گے کہ نکل جاویں آگ سے اور وہ اس سے

بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُقِيمٌ ﴿٣٧﴾ وَالسَّارِقُ وَ

نکلنے والے نہیں اور ان کے لئے عذاب دائمی ہے اور چوری کرنیوالا مرد اور

السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا

چوری کرنیوالی عورت کاٹ ڈالو ان کے ہاتھ سزا میں ان کی کمائی کی، تنبیہ ہے

مِنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٣٨﴾ فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ

اللہ کی طرف سے اور اللہ غالب ہے حکمت والا پھر جس نے توبہ کی اپنے ظلم کے

ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ

پیچھے اور اصلاح کی تو اللہ قبول کرتا ہے اس کی توبہ بے شک اللہ بخشنے والا

رَحِيمٌ ﴿٣٩﴾ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ

مہربان ہے تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے واسطے ہے سلطنت آسمان اور زمین کی

کے قریب کرنے کی، اسی لئے سلف صالحین صحابہ و تابعین نے اس آیت میں وسیلہ کی تفسیر طاعت و قربت اور ایمان و عمل صالح سے کی ہے، بروایت حاکم حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ وسیلہ سے مراد قربت و اطاعت ہے، اور ابن جریرؒ نے حضرت عطاءؒ اور مجاہدؒ اور حسن بصریؒ وغیرہ سے بھی یہی نقل کیا ہے۔

اور ابن جریرؒ وغیرہ نے حضرت قتادہؒ سے اس آیت کی تفسیر یہ نقل کی ہے: تَقَرَّبُوْا اِلَيْهِ بِطَاعَتِهٖ وَالْعَمَلِ بِمَا يُرْضِيْهِ، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف تقرب حاصل کرو، اس کی فرمانبرداری اور رضامندی کے کام کرکے۔ اس لئے آیت کی تفسیر کا خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا قرب تلاش کرو، بذریعہ ایمان اور عمل صالح کے۔

اور مسند احمد کی ایک صحیح حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وسیلہ ایک اعلیٰ درجہ ہے جنت کا، جس کے اوپر کوئی درجہ نہیں ہے، تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ درجہ مجھے عطا فرمادے۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مؤذن اذان کہے تو تم بھی وہی کلمات کہتے رہو جو مؤذن کہتا ہے، اس کے بعد مجھ پر درود پڑھو اور میرے لئے وسیلہ کی دعا کرو۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ وسیلہ ایک خاص درجہ ہے جنت کا، جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے، اور آیت مذکورہ میں ہر مومن کو وسیلہ طلب کرنے اور ڈھونڈنے کا حکم بظاہر اس خصوصیت کے منافی ہے، مگر جواب واضح ہے کہ جس طرح ہدایت کا اعلیٰ مقام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے اور آپ ہمیشہ اس کے لئے دعا کیا کرتے تھے، مگر اس کے ابتدائی اور متوسط درجات تمام مومنین کے لئے عام ہیں، اسی طرح وسیلہ کا اعلیٰ درجہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے، اور اس کے نیچے کے درجات سب مومنین کے لئے، آپ ہی کے واسطہ اور ذریعہ سے عام ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں اور قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ لفظ وسیلہ میں محبت و رغبت کا مفہوم شامل ہونے سے اس طرف اشارہ ہے کہ وسیلہ کے درجات میں ترقی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پر موقوف ہے، اور محبت پیدا ہوتی ہے اتباع سنت سے، کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ، اس لئے جتنا کوئی اپنی عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت اور زندگی کے تمام شعبوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرے گا اتنی ہی اللہ تعالیٰ کی محبت اس کو حاصل ہوگی، اور وہ خود اللہ تعالیٰ کے نزدیک

محبوب بن جائے گا، اور جتنی زیادہ محبت بڑھے گی اتنا ہی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا۔

لفظ وسیلہ کی لغوی تشریح اور صحابہ و تابعین کی تفسیر سے جب یہ معلوم ہوگیا کہ ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کی رضا و قرب کا ذریعہ بنے وہ انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا وسیلہ ہے، اس میں جس طرح ایمان اور عمل صالح داخل ہیں اسی طرح انبیاء و صالحین کی صحبت و محبت بھی داخل ہے کہ وہ بھی رضائے الٰہی کے اسباب میں سے ہے، اور اسی لئے ان کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا درست ہوا، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانہ میں حضرت عباسؓ کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا مانگی، اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔

اور ایک روایت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک نابینا صحابی کو اس طرح دعا مانگنے کی تلقین فرمائی، اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ نَّبِيِّ الرَّحْمَةِ (منار)

آیت مذکورہ میں اول تقویٰ کی ہدایت فرمائی گئی، پھر اللہ تعالیٰ سے ایمان اور اعمال صالحہ کے ذریعہ قرب حاصل کرنے کی، آخر میں ارشاد فرمایا، وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ یعنی جہاد کرو اللہ کی راہ میں، اگرچہ عمل صالح میں جہاد بھی داخل تھا، لیکن اعمال صالحہ میں جہاد کا اعلیٰ مقام بتلانے کے لئے اس کو علیحدہ کرکے بیان فرما دیا گیا، جیسا کہ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ یعنی اسلام کا اعلیٰ مقام جہاد ہے۔

دوسرے اس جگہ جہاد کو اہمیت کے ساتھ ذکر کرنے کی یہ حکمت بھی ہے کہ پچھلی آیتوں میں فساد فی الارض کا حرام و ناجائز ہونا اور اس کی دنیوی اخروی سزاؤں کا بیان آیا تھا، جہاد بھی ظاہر کے اعتبار سے فساد فی الارض کی صورت معلوم ہوتی ہے، اس لئے ممکن تھا کہ کوئی ناواقف جہاد اور فساد میں فرق نہ سمجھے، اس لئے فساد فی الارض کی ممانعت کے بعد جہاد کا حکم اہمیت کے ساتھ ذکر کرکے دونوں کے فرق کی طرف لفظ فِيْ سَبِيْلِهٖ سے اشارہ فرما دیا، کیونکہ ڈاکہ، بغاوت وغیرہ میں جو قتل و قتال ہوتا ہے وہ محض اپنی ذاتی اغراض و خواہشات اور ذلیل مقاصد کے لئے ہوتا ہے، اور جہاد میں اگر اس کی نوبت آئے بھی تو محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور ظلم و جبر کو مٹانے کے لئے ہے، جن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

دوسری آیت میں کفر و شرک اور معصیت کا وبال عظیم ایسے انداز میں بتلایا گیا ہے کہ اس پر ذرا بھی غور کیا جائے تو وہ انسان کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم پیدا کردے، اور کفر و شرک اور معصیت سب کو چھوڑنے پر مجبور کردے

وہ یہ ہے کہ عام طور پر انسان جس گناہ میں مبتلا ہوتا ہے وہ اپنی خواہشات

قاموس میں ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا مال کسی محفوظ جگہ سے بغیر اس کی اجازت کے چھپ کر لے لے، اس کو سرقہ کہتے ہیں، یہی سرقہ کی شرعی تعریف ہے، اور اس تعریف کی رُو سے سرقہ ثابت ہونے کے لئے چند چیزیں ضروری ہوئیں:

اوّل یہ کہ وہ مال کسی فرد یا جماعت کی ذاتی ملکیت ہو، چرانے والے کی اس میں نہ ملکیت ہو نہ ملکیت کا شبہ ہو، اور نہ ایسی چیزیں ہوں جن میں عوام کے حقوق مساوی ہیں، جیسے رفاہ عام کے ادارے اور ان کی اشیاء، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے کوئی ایسی چیز لے لی، جس میں اس کی ملکیت یا ملکیت کا شبہ ہو، یا جس میں عوام کے حقوق مساوی ہیں تو حد سرقہ اس پر جاری نہ کی جائے گی، حاکم اپنی صوابدید کے موافق تعزیری سزا جاری کرسکتا ہے۔

دوسری چیز تعریف سرقہ میں مال محفوظ ہونا ہے، یعنی مقفل مکان کے ذریعہ یا کسی نگراں چوکیدار کے ذریعہ محفوظ ہو، جو مال کسی محفوظ جگہ میں نہ ہو اس کو کوئی شخص اٹھالے تو وہ بھی حد سرقہ کا مستوجب نہیں ہوگا، اور مال کے محفوظ ہونے میں شبہ بھی ہو جائے تو بھی حد ساقط ہو جائے گی، گناہ اور تعزیری سزا کا معاملہ جدا ہے۔

تیسری شرط بلا اجازت ہونا ہے، جس مال کے لینے یا اٹھا کر استعمال کرنے کی کسی کو اجازت دے رکھی ہو وہ اس کو بالکل لے جائے تو حد سرقہ عائد نہیں ہوگی، اور اجازت کا شبہ بھی پیدا ہو جائے تو حد ساقط ہو جائے گی۔

چوتھی شرط چھپ کر لینا ہے، کیونکہ دوسرے کا مال علانیہ لوٹا جائے تو وہ سرقہ نہیں بلکہ ڈاکہ ہے، جس کی سزا پہلے بیان ہو چکی ہے، غرض خفیہ نہ ہو تو حد سرقہ اس پر جاری نہ ہوگی۔

ان تمام شرائط کی تفصیل سننے سے آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ عام عرف میں جس کو چوری کہا جاتا ہے وہ ایک عام اور وسیع مفہوم ہے، اس کے تمام افراد پر حد سرقہ یعنی ہاتھ کاٹنے کی سزا شرعاً عائد نہیں ہے، بلکہ چوری کی صرف اس صورت پر یہ حد شرعی جاری ہوگی جس میں یہ تمام شرائط موجود ہوں۔

اس کے ساتھ یہ بھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ جن صورتوں میں چوری کی حد شرعی ساقط ہو جاتی ہے، تو یہ لازم نہیں ہے کہ مجرم کو کھلی چھٹی مل جائے، بلکہ حاکم وقت اپنی صوابدید کے مطابق اس کو تعزیری سزا دے سکتا ہے جو جسمانی کوڑوں کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔

اسی طرح یہ بھی نہ سمجھا جائے کہ جن صورتوں میں سرقہ کی کوئی شرط مفقود ہونے کی وجہ سے حد شرعی جاری نہ ہو تو وہ شرعاً جائز و حلال ہے، کیونکہ اوپر بتلایا جا چکا ہے کہ یہاں گناہ

کی ہے اس کے معاف کرنے سے بھی سزا ساقط نہیں ہوگی۔

اس زمانے کے مشورے سے مقرر کرکے قاضی یا جج کو اس کا پابند کر دیا جائے، جیسا کہ آجکل عموماً اسمبلیوں کے ذریعہ تعزیری قوانین متعین کئے جاتے ہیں اور قاضی یا جج شرعیت انہیں حدود کے اندر سزا جاری کرتے ہیں، بخلاف ان پانچ جرائم میں جن کی سزائیں قرآن یا اجماع سے متعین کر دی گئی ہیں اور ان میں کسی فرد یا جماعت یا اسمبلی کو تغیر و تبدل کا کوئی اختیار نہیں، ہاں مگر ان میں بھی اگر جرم کا ثبوت شریعت کے مقرر کردہ ضابطۂ شہادت سے نہ ہوسکے، یا جرم کا ثبوت تو ہے مگر اس جرم پر جن شرائط کے ساتھ یہ سزا جاری کی جاتی ہے وہ شرائط مکمل نہ ہوں اور نفس جرم قاضی یا جج کے نزدیک ثابت ہو تو اس صورت میں بھی حد شرعی جاری نہ ہوگی بلکہ تعزیری سزا دی جائے گی، اسی کے ساتھ یہ شرعی ضابطہ بھی متواتر اور مسلم ہے کہ شبہ کا فائدہ مجرم کو پہونچتا ہے، ثبوت جرم یا جرم کی شرائط میں سے کسی چیز میں شبہ پڑ جائے تو حد شرعی ساقط ہو جاتی ہے، مگر نفس جرم کا ثبوت ہو جانے تو تعزیری سزا دی جائے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان پانچ جرائم میں بہت سی صورتیں ایسی نکلیں گی کہ ان میں سزائے شرعیہ کا نفاذ نہیں ہوگا، بلکہ تعزیری سزائیں حسب صوابدید حاکم کے مطابق دی جائیں گی، تعزیری سزائیں چونکہ شریعت اسلام نے متعین نہیں کیں بلکہ ہر زمانہ اور ہر ماحول کے مطابق عام قوانین ممالک کی طرح ان میں تغیر و تبدل اور کمی بیشی کی جاسکتی ہے، اس لئے ان پر کسی کو کسی اعتراض کی گنجائش نہیں، اب بحث صرف پانچ جرائم کی سزاؤں میں اور ان کی بھی مخصوص صورتوں میں رہ گئی، مثال کے طور پر چوری کو لے لیجئے، اور دیکھئے کہ شریعت اسلام میں ہاتھ کاٹنے کی سزا مطلقاً ہر چوری پر مقرر نہیں جس کو عرف عام میں چوری کہا جاتا ہے، بلکہ سرقہ جس پر سارق کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اس کی ایک مخصوص تعریف ہے، جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، کہ کسی کا مال محفوظ جگہ سے سامان حفاظت توڑ کر ناجائز طور پر خفیہ طریقہ سے نکال لیا جائے اس تعریف کی رُو سے بہت سی صورتیں جن کو عرفاً چوری کہا جاتا ہے، حد سرقہ کی تعریف سے نکل جاتی ہیں، مثلاً محفوظ مکان کی شرط سے معلوم ہوا کہ عام پبلک مقامات مثلاً مسجد، عیدگاہ، پارک، کلب، اسٹیشن، ویٹنگ روم، ریل، جہاز وغیرہ میں عام جگہوں پر رکھے ہوئے مال کی کوئی چوری کرے، یا درختوں پر لگے ہوئے پھل چرالے، یا شہد کی چوری کرے تو اس پر حد سرقہ جاری نہیں ہوگی بلکہ عام ممالک کے قوانین کی طرح تعزیری سزا دی جائیگی اسی طرح وہ آدمی جس کو آپ نے اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے رکھی ہے خواہ وہ آپ کا نوکر ہو یا مزدور و معمار ہو، یا کوئی دوست عزیز ہو وہ اگر آپ کے مکان سے کوئی چیز لے جائے تو وہ اگرچہ عرفی چوری میں داخل اور تعزیری سزا کا مستحق ہے، مگر ہاتھ کاٹنے کی

شرعی سزا ہاتھ کاٹنے کی جاری نہیں ہوگی، کیونکہ وہ آپ کے گھر میں آپ کی اجازت سے داخل ہوا، اس کے حق میں حفاظت مکمل نہیں۔

اسی طرح اگر کسی نے کسی کے ہاتھ میں سے زیور یا نقد چھین لیا، یا دھوکہ دے کر کچھ وصول کرلیا، یا امانت لے کر مکر گیا، یہ سب چیزیں حرام و ناجائز اور عرفی چوری میں ضرور داخل ہیں، مگر ان سب کی سزا تعزیری ہے، جو حاکم کی صوابدید پر موقوف ہے، شرعی سرقہ کی تعریف میں داخل نہیں، اس لئے ان پر ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔

اسی طرح کفن کی چوری کرنے والے کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا، کیونکہ اول تو وہ محفوظ جگہ نہیں، دوسرے کفن میت کی ملکیت نہیں، البتہ اس کا یہ فعل سخت حرام ہے، اس پر "تعزیری سزا" حسب صوابدید حاکم جاری کی جائے گی۔ اسی طرح اگر کسی نے ایک مشترک مال میں چوری کرلی جس میں اس کا بھی کچھ حصہ ہے، خواہ میراث کا مشترک مال تھا، یا شرکت تجارت کا مال تھا، تو اس صورت میں چونکہ لینے والے کی ملکیت کا بھی کچھ حصہ اس میں شامل ہے اس ملکیت کے شبہ کی وجہ سے حد شرعی ساقط ہوجائے گی، تعزیری سزا دی جائے گی۔

یہ سب شرائط تو تعریف جرم کے تحت میں ہیں، جن کا اجمالی خاکہ آپ نے دیکھ لیا، اب دوسری چیز تکمیل ثبوت ہے، حدود کے نفاذ میں شریعت اسلام نے ضابطہ شہادت بھی عام معاملات سے ممتاز اور بہت محتاط بنایا ہے، زنا کی سزا میں تو دو گواہوں کے بجائے چار گواہوں کو شرط قرار دیا، اور وہ بھی جبکہ وہ ایسی عینی گواہی دیں جس میں کوئی لفظ مشتبہ نہ رہے، چوری وغیرہ کے معاملہ میں اگرچہ دو ہی گواہ کافی ہیں مگر ان دو کے لئے عام شرائط شہادت کے علاوہ کچھ مزید شرطیں عائد کی گئی ہیں، مثلاً دوسرے معاملات میں مواقع ضرورت میں قاضی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ کسی فاسق آدمی کے بارے میں اگر قاضی کو یہ اطمینان ہوجائے کہ عملی فاسق ہونے کے باوجود یہ جھوٹ نہیں بولتا تو قاضی اس کی گواہی کو قبول کرسکتا ہے، لیکن حدود میں قاضی کو اس کی گواہی قبول کرنے کا اختیار نہیں، عام معاملات میں ایک مرد دو عورتوں کی گواہی پر فیصلہ کیا جاسکتا ہے، مگر حدود میں دو مردوں کی گواہی ضروری ہے، عام معاملات میں شریعت اسلام نے شہادت کو کسی مدت دراز گذر جانے کی وجہ سے کوئی عذر نہیں قرار دیا، واقعہ کے کتنے ہی عرصہ کے بعد کوئی گواہی دے تو قبول کی جاسکتی ہے، لیکن حدود میں اگر فوری گواہی نہ دی بلکہ ایک مہینہ یا اس سے زائد دیر کرکے گواہی دی تو وہ قابل قبول نہیں۔

حد سرقہ کے نفاذ کی شرائط کا اجمالی خاکہ اس وقت بیان کیا گیا ہے، یہ سب فقہ حنفی کی نہایت مستند کتاب بدائع الصنائع سے ماخوذ ہے۔

آخَرِينَ لَمْ يَأْتُوكَ ۖ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِن بَعْدِ مَوَاضِعِهِ ۖ

جماعت کے جو تجھ تک نہیں آئی بدل ڈالتے ہیں بات کو اس کا ٹھکانا چھوڑ کر

يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هَٰذَا فَخُذُوهُ وَإِن لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوا ۚ

کہتے ہیں اگر تم کو یہ حکم ملے تو قبول کر لینا اور اگر یہ حکم نہ ملے تو بچتے رہنا

وَمَن يُرِدِ اللَّهُ فِتْنَتَهُ فَلَن تَمْلِكَ لَهُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۚ أُولَٰئِكَ

اور جس کو اللہ نے گمراہ کرنا چاہا سو تو اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا اللہ کے ہاں یہ وہی

الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَن يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا

لوگ ہیں جن کو اللہ نے نہ چاہا کہ دل پاک کرے ان کے ان کو دنیا میں

خِزْيٌ ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٤١﴾ سَمَّاعُونَ

ذلت ہے اور ان کو آخرت میں بڑا عذاب ہے جاسوسی کرنے والے

لِلْكَذِبِ أَكَّالُونَ لِلسُّحْتِ ۚ فَإِن جَاءُوكَ فَاحْكُم بَيْنَهُم

جھوٹ بولنے کے لئے اور بڑے حرام کھانے والے سو اگر آویں وہ تیرے پاس تو فیصلہ کر دے ان میں

أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ ۖ وَإِن تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَن يَضُرُّوكَ

یا منہ پھیر لے ان سے اور اگر تو منہ پھیر لے گا ان سے تو وہ تیرا کچھ نہ بگاڑ

شَيْئًا ۖ وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ ۚ إِنَّ اللَّهَ

سکیں گے، اور اگر تو فیصلہ کرے تو فیصلہ کر ان میں انصاف سے بے شک اللہ

يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴿٤٢﴾ وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِندَهُمُ

دوست رکھتا ہے انصاف کرنے والوں کو اور وہ تجھ کو کس طرح منصف بناویں گے اور ان کے پاس

التَّوْرَاةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ ۚ

تو توریت ہے جس میں حکم ہے اللہ کا پھر اس کے پیچھے پھرے جاتے ہیں،

وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ﴿٤٣﴾

اور وہ ہرگز ماننے والے نہیں ہیں

ع ۹ / ۱۰

ربطِ آیات سورۂ مائدہ کے تیسرے رکوع سے اہل کتاب کا ذکر چلا آرہا تھا، درمیان میں قدرِ قلیل اور بعض مضامین خاص خاص مناسبات سے آگئے تھے، اب

آگے پھر اہلِ کتاب ہی کا ذکر دوسرے رنگ میں چل گیا ہے، جن میں یہود و نصاریٰ کے دو فرقے تو تھے ہی، ایک تیسرا فرقہ اور شامل ہو گیا تھا جو حقیقت میں یہودی تھے، مگر منافقانہ طور پر مسلمان ہو گئے تھے، مسلمانوں کے سامنے اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرتے تھے اور اپنے ہم مذہب یہودیوں میں بیٹھتے تو رسول اور مسلمانوں کا استہزاء کرتے تھے، مذکورہ آیتیں انہی تینوں فرقوں کے ایسے اعمال سے اور حالات سے متعلق ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام اور ہدایات کے مقابلہ میں اپنی خواہشات اور رایوں کو مقدم رکھتے ہیں، اور احکام و ہدایات میں بھی ایسی تحریف کر کے اپنی خواہشات کے مطابق بنانے کی فکر میں رہتے ہیں، آیات مذکورہ میں ایسے لوگوں کی دنیا و آخرت میں رسوائی اور عذاب کا بیان ہے، اس کے ضمن میں مسلمانوں کے لئے چند اصولی ہدایات اور احکام شرعیہ کا بیان ہے۔

شانِ نزول

آیات مذکورہ کے نزول کا سبب دو واقعات ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مدینہ کے قرب و جوار میں رہنے والے یہودی قبائل میں پیش آئے، ایک واقعہ قتل و قصاص کا اور دوسرا واقعہ زنا اور اس کی سزا کا۔

یہ بات تو کسی تاریخ عالم کے جاننے والے پر مخفی نہیں کہ اسلام سے پہلے ہر جگہ، ہر خطہ، اور ہر طبقہ میں ظلم و جور کی حکومت تھی، قوی ضعیف کو، عزت والا بے عزت کو غلام بنائے رکھتا تھا، قوی اور عزت والے کے لئے قانون اور تھا، کمزور اور بے عزت کے لئے قانون دوسرا تھا، جیسے آج بھی اپنے آپ کو مہذب اور متمدن کہنے والے بہت سے ممالک میں کالے اور گورے کا قانون الگ الگ ہے، محسن انسانیت رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی آکر اس تفریق کو مٹایا اور اولاد آدم کے حقوق کی مساوات کا اعلان کیا، اور انسان کو انسانیت اور آدمیت کا سبق دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ تشریف لانے سے پہلے حوالی مدینہ میں یہود کے دو قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر آباد تھے، ان میں سے بنو نضیر قوت و شوکت اور دولت و عزت میں بنو قریظہ سے زیادہ تھے، یہ لوگ آئے دن بنو قریظہ پر ظلم کرتے رہتے تھے اور وہ چار و ناچار اس کو سہتے تھے، یہاں تک کہ بنو نضیر نے بنو قریظہ کو اس ذلت آمیز معاہدہ پر مجبور کیا کہ اگر بنو نضیر کا کوئی آدمی بنو قریظہ کے کسی شخص کو قتل کر دے تو اس کا قصاص یعنی جان کے بدلے میں جان لینے کا اُن کو حق نہ ہوگا، بلکہ صرف ستر وسق کھجوریں اس کے خون بہا کے طور پر ادا کی جائیں گی، (وسق عربی اوزان کا ایک پیمانہ ہے جو ہمارے وزن کے اعتبار سے تقریباً پانچ من دس سیر کا ہوتا ہے) اور اگر معاملہ برعکس ہو کہ بنو قریظہ کا کوئی آدمی بنو نضیر کے کسی شخص کو قتل کرے تو قانون یہ

ہوگا کہ اس کے قاتل کو قتل بھی کیا جائے گا، اور ساتھ خون بہا بھی لیا جائے گا، اور وہ بھی بنونضیر کے خون بہا سے دوگنا یعنی ایک سو چالیس وسق کھجوریں، اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی کہ ان کا مقتول اگر عورت ہوگی تو اس کے بدلے میں بنو قریظہ کے ایک مرد کو قتل کیا جائے گا، اور اگر مقتول مرد ہے تو اس کے معاوضہ میں بنو قریظہ کے دو مردوں کو قتل کیا جائے گا، اور اگر بنونضیر کے غلام کو قتل کیا ہے تو اس کے بدلے میں بنو قریظہ کے آزاد کو قتل کیا جائے گا، اور اگر بنونضیر کے آدمی کا کسی نے ایک ہاتھ کاٹا ہے تو بنو قریظہ کے آدمی کے دو ہاتھ کاٹے جائیں گے، ایک کان کاٹا ہے تو اُن کے دو کان کاٹے جائیں گے، یہ قانون تھا جو اسلام سے پہلے ان دونوں قبیلوں کے درمیان رائج تھا، بنو قریظہ اپنی کمزوری کی بناء پر اس کے ماننے پر مجبور تھے۔

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے اور مدینہ ایک دار الاسلام بن گیا، یہ دونوں قبائل ابھی نہ اسلام میں داخل ہوئے تھے نہ کسی معاہدہ کی رُو سے اسلامی احکام کے پابند تھے، مگر اسلامی قانون کی عدل گستری کو دور سے دیکھ رہے تھے، اس عرصہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بنو قریظہ کے ایک آدمی نے بنونضیر کے کسی آدمی کو مار ڈالا، تو بنونضیر نے معاہدہ مذکور کے مطابق بنو قریظہ سے دوگنی دیت یعنی خون بہا کا مطالبہ کیا، بنو قریظہ اگرچہ نہ اسلام میں داخل تھے، نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت کا کوئی معاہدہ تھا، لیکن یہ لوگ یہودی تھے، ان میں بہت سے لکھے پڑھے لوگ بھی تھے جو تورات کی پیشینگوئیوں کے مطابق جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نبی آخر الزمان ہیں جن کے آنے کی خوشخبری تورات نے دی ہے، مگر تعصب مذہبی یا دنیوی لالچ کی وجہ سے ایمان نہ لائے تھے، اور یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ آپ کا مذہب مساوات انسانی اور عدل و انصاف کا علمبردار ہے، اس لئے بنونضیر کے ظلم سے بچنے کے لئے ان کو ایک سہارا ملا اور انہوں نے دوگنی دیت دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم تم ایک ہی خاندان سے ہیں، ایک ہی وطن کے باشندے ہیں، اور ہم دونوں کا مذہب بھی ایک یعنی یہودیت ہے، یہ غیر منصفانہ معاملہ جو آج تک تمہاری زبردستی اور ہماری کمزوری کے سبب ہوتا رہا، اب ہم اس کو گوارا نہ کریں گے۔

اس جواب پر بنونضیر میں اشتعال پیدا ہوا، اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جاتی، مگر پھر کچھ بڑے بوڑھوں کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ اس معاملہ کا فیصلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کرایا جائے، بنو قریظہ کی تو یہ عین مراد تھی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنونضیر کے ظلم کو برقرار نہ رکھیں گے، بنونضیر بھی باہمی گفت و شنید اور صلح کی

[illegible] اس کے لئے تیار ہو گئے، مگر اس میں یہ سازش کی کہ آپ کے پاس مقدمہ لے جانے سے پہلے کچھ ایسے لوگوں کو آگے بھیجا جو حقیقت میں تو ان کے ہم مذہب یہودی تھے، مگر منافقانہ طور پر اسلام کا اظہار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے جاتے تھے، اور مطلب ان کا یہ تھا کہ یہ لوگ کسی طرح مقدمہ دائر کرنے سے پہلے اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عندیہ معلوم کر لیں، اور یہ تاکید ان لوگوں کو کر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ہماری بات کے مطابق فیصلہ فرما دیں تو اس کو قبول کر لینا اور اس کے **خلاف کوئی حکم آیا تو ماننے کا وعدہ نہ کرنا۔**

یہ سبب نزول کا یہ واقعہ تفسیر کے ساتھ بغوی نے نقل کیا ہے، اور مسند احمد ابو داؤد میں حضرت عبداللہ بن عباس سے اس کا خلاصہ منقول ہے۔ (مظہری)

اور ایک دوسرا واقعہ زنا کا ہے جس کی تفسیر بغوی نے اس طرح نقل کی ہے کہ خیبر کے یہودیوں میں یہ واقعہ پیش آیا اور تورات کی مقرر کردہ سزا کے موافق ان دونوں کو سنگسار کرنا لازم تھا، مگر یہ دونوں کسی بڑے خاندان کے آدمی تھے، یہودیوں نے اپنی قدیم عادت کے موافق یہ چاہا کہ ان کے لئے سزا میں نرمی کی جائے، اور ان کو یہ معلوم تھا کہ مذہب اسلام میں بڑی سہولتیں دی گئی ہیں، اس بنا پر اپنے نزدیک یہ سمجھا کہ اسلام میں اس سزا میں تخفیف ہوگی، خیبر کے لوگوں نے اپنی برادری بنی قریظہ کے لوگوں کے پاس پیغام بھیجا کہ اس معاملہ کا فیصلہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کرا دیں، اور دونوں مجرموں کو بھی ساتھ بھیج دیا، منشا ان کا یہی تھا کہ اگر آپ کوئی ہلکی سزا جاری کر دیں تو مان لیں گے ورنہ انکار کر دیں گے، بنو قریظہ کو پہلے تو تردد ہوا کہ معلوم نہیں آپ کیسا فیصلہ کریں اور وہاں جانے کے بعد نہیں ماننا پڑے، مگر کچھ دیر گفتگو کے بعد یہی فیصلہ رہا کہ ان کے چند سردار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان مجرموں کو لے جائیں اور آپ ہی سے اس کا فیصلہ کرائیں۔

چنانچہ کعب بن اشرف وغیرہ کا ایک وفد ان کو ساتھ لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور سوال کیا کہ شادی شدہ مرد و عورت اگر بدکاری میں مبتلا ہوں تو ان کی کیا سزا ہے؟ آپ نے فرمایا کیا تم میرے فیصلہ پر راضی ہوگے؟ انہوں نے اقرار کیا، اس وقت جبرئیل امین اللہ تعالیٰ کا یہ حکم لے کر نازل ہوئے، کہ ان کی سزا سنگسار کر کے قتل کر دینا ہے، ان لوگوں نے جب یہ فیصلہ سنا تو بوکھلا گئے، اور ماننے سے انکار کر دیا۔ جبرئیل امین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیا کہ آپ ان لوگوں سے

یہ کہیں کہ میرے اس فیصلہ کو ماننے یا نہ ماننے کے لئے ابن صوریا کو حَکَم بنا دو، اور ابن صوریا کے حالات وصفات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دیئے، آپ نے آنے والے وفد سے کہا کہ کیا تم اس نوجوان کو پہچانتے ہو جو سفید رنگ مگر یک آنکھ سے معذور ہے، فدک میں رہتا ہے؟ جس کو ابن صوریا کہا جاتا ہے سب نے اقرار کیا، آپ نے دریافت کیا کہ آپ لوگ اس کو کیسا سمجھتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ علماء یہود میں روئے زمین پر اس سے بڑا کوئی عالم نہیں

آپ نے فرمایا، اس کو بلاؤ۔

چنانچہ وہ آگیا، آپ نے اس کو قسم دے کر پوچھا کہ اس صورت میں تورات کا حکم کیا ہے؟ وہ بولا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کی قسم آپ نے مجھ کو دی ہے، اگر آپ قسم نہ دیتے اور مجھے یہ خطرہ نہ ہوتا کہ غلط بات کہنے کی صورت میں تورات مجھے جلا ڈالے گی، تو میں یہ حقیقت ظاہر نہ کرتا، حقیقت یہ ہے کہ حکم اسلام کی طرح تورات میں بھی یہی حکم ہے کہ ان دونوں **کو سنگسار کرکے قتل کرایا جائے۔**

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تم پر کیا آفت آئی کہ تم تورات کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہو، ابن صوریا نے بتلایا کہ اصل بات یہ ہے کہ زنا کی سزا شرعی تو ہمارے مذہب میں یہی ہے، مگر ہمارا ایک شہزادہ اس جرم میں مبتلا ہوگیا، ہم نے اس کی رعایت کرکے چھوڑ دیا، سنگسار نہیں کیا، پھر یہی جرم ایک معمولی آدمی سے سرزد ہوا، اور ذمہ داروں نے اس کو سنگسار کرنا چاہا تو مجرم کے جتھہ کے لوگوں نے احتجاج کیا کہ اگر شرعی سزا اس کو دینی ہے تو اس سے پہلے شہزادے کو دو، ورنہ ہم اس پر یہ سزا جاری نہ ہونے دیں گے، یہ بات بڑھی تو سب نے مل کر صلح کرلی کہ سب کے لئے ایک ہی ہلکی سزا تجویز کردی جائے، اور تورات کا حکم چھوڑ دیا جائے، چنانچہ ہم نے کچھ مار پیٹ اور منہ کالا کرکے جلوس نکالنے کی سزا تجویز کردی، اور اب یہی سب میں رائج ہوگیا۔

خلاصۂ تفسیر

اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جو لوگ کفر (کی باتوں) میں دوڑ دوڑ کر گرتے ہیں (یعنی بڑی رغبت سے ان باتوں کو کرتے ہیں) آپ کو وہ مغموم نہ کریں (یعنی آپ اُن کے کفریات سے مغموم و رنجیدہ نہ ہوں) خواہ وہ ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنے منہ سے تو (جھوٹ موٹ) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کے دل یقین (یعنی ایمان) نہیں لائے (مراد منافقین ہیں جو کہ ایک واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے)

کی بعثت کے بعد تمام پہلی شریعتیں اور ان کے قوانین منسوخ ہوچکے ہیں، بجز اُن کے جن کو قرآن کریم یا ارشادات محمدیہ میں باقی رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد کی آیت میں قانونِ الٰہی کے خلاف کسی دوسرے قانون یا رسم و رواج پر فیصلہ صادر کرنے کو ظلم اور فسق و کفر قرار دیا گیا ہے۔

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں سے متعلق یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ یہودی جنھوں نے کے اختلافات کا فیصلہ لینے کے لئے اپنے مقدمات کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں بھیجا، نہ ان کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت پر ایمان تھا، نہ یہ کہ مسلمانوں کے زیر حکم ذمی تھے، البتہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا معاہدہ ترک جنگ کا ہوگیا تھا، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا گیا کہ چاہیں ٹال دیں اور چاہیں فیصلہ اپنی شریعت کے مطابق فرما دیں، کیونکہ ان لوگوں کی کوئی ذمہ داری اسلامی حکومت پر نہیں ہے، اور اگر یہ ذمی ہوتے اور اسلامی حکومت کی طرف رجوع کرتے تو حکام مسلم پر فیصلہ کرنا فرض ہوتا، ٹال دینا جائز نہ ہوتا، کیونکہ ان کے حقوق کی نگرانی اور ان کو ظلم سے بچانا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے، جیسے مسلمانوں کے حقوق اور ان سے ظلم کا دفع کرنا حکومت اسلامیہ کا فرض ہے، اسی لئے آئندہ آنے والی ایک آیت میں یہ بھی ارشاد ہے: وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ۔ یعنی اگر یہ لوگ اپنا معاملہ آپ کے پاس لائیں تو آپ اس کا فیصلہ اپنی شریعت کے مطابق فرما دیں۔

اس آیت میں اختیار دینے کے بجائے متعین فیصلہ حکم کرنے کا ارشاد ہے، امام ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں ان دونوں کی تطبیق اسی طرح کی ہے کہ پہلی آیت جس میں اختیار دیا گیا ہے وہ ان غیر مسلموں سے متعلق ہے جو اسلامی حکومت کے باشندے یا ذمی نہیں بلکہ اپنی جگہ رہتے ہوئے ان سے کوئی معاہدہ ہوگیا ہے جیسے بنو قریظہ و بنو نضیر کا حال تھا، کہ اسلامی حکومت سے ان کا اس کے سوا کوئی تعلق نہ تھا، کہ ایک معاہدہ کے ذریعہ وہ جنگ نہ کرنے کے پابند ہوگئے تھے۔

اور دوسری آیت ان غیر مسلموں کے متعلق ہے جو مسلمانوں کے ذمی اسلامی مملکت کے شہری اور زیر حکومت رہتے ہیں۔

اب یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ پہلی آیت مختار اور دوسری آیت دونوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت یہ ہے کہ جب ان غیر مسلموں کے معاملہ میں فیصلہ کریں تو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم یعنی اپنی شریعت کے مطابق کریں، ان غیر مسلموں کی خواہشات

کو حکم تسلیم کرکے آپ ہی سے فیصلہ کرانے کے لئے آئے تو بہتر ہے کہ آپ کا فیصلہ وہی ہونا چاہئے جس پر آپ کا ایمان ہے اور آپ کی شریعت کا حکم ہے۔

بہرحال آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں اوّل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی، اس کے بعد یہودیوں کی سازش سے آپ کو باخبر کیا گیا، يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ سے آخر تک اسی کا بیان ہے جس سے یہ انکشاف کرایا گیا کہ آپ کی خدمت میں آنے والا وفد منافقین کا ہے جن کا خفیہ گٹھ جوڑ یہودیوں کے ساتھ ہے اور انہی کا بھیجا ہوا آرہا ہے، اس کے بعد آنے والے وفد کی چند بُری خصلتوں کا بیان فرما کر مسلمانوں کو اس کی بُرائی پر متنبہ فرمایا اور ضمنی طور پر یہ ہدایت فرمادی کہ یہ خصلتیں کافرانہ ہیں، ان سے بچنے اور دور رہنے کا اہتمام کیا جائے۔

یہود کی ایک بُری خصلت پہلی خصلت یہ بتلائی سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ یعنی یہ لوگ جھوٹی اور غلط باتیں سننے کے عادی ہیں، اپنے کو عالم کہنے والے غدار یہودیوں کے ایسے اندھے متبع ہیں کہ احکام تورات کی کھلی خلاف ورزی دیکھنے کے باوجود ان کی پیروی کرتے رہتے ہیں اور ان کی غلط سلط بیان کی ہوئی کہانیاں سنتے رہتے ہیں۔

عوام کے لئے علماء کی تقلید کا ضابطہ اس میں جس طرح تحریف کرنے والوں اور احکام خدا و رسول میں غلط باتیں شامل کرنے والوں کے لئے وعیدیں ہیں اسی طرح ان لوگوں کو بھی سخت مجرم قرار دیا ہے جو ایسے لوگوں کو امام بنا کر وضع اور غلط روایات سننے کے عادی ہوگئے ہیں، اس میں مسلمانوں کے لئے ایک اصولی ہدایت یہ ہے کہ اگرچہ جاہل عوام کے لئے دین پر عمل کرنے کا راستہ صرف یہی ہے کہ علماء کے فتوے اور تعلیم پر عمل کریں لیکن اس ذمہ داری سے عوام بھی بری نہیں کہ فتویٰ لینے اور عمل کرنے سے پہلے اپنے مقتداؤں کے متعلق اتنی تحقیق تو کریں جتنی کوئی بیمار کسی ڈاکٹر یا حکیم سے رجوع کرنے سے پہلے کیا کرتا ہے، کہ جاننے والوں سے تحقیق کرتا ہے کہ اس مرض کے لئے کونسا ڈاکٹر ماہر ہے، کونسا حکیم اچھا ہے، اس کی ڈگریاں کیا کیا ہیں، اس کے مطب میں جانے والے زیر علاج لوگوں پر کیا گذرتی ہے، ایسی معقول تحقیق کے بعد بھی اگر وہ کسی غلط ڈاکٹر یا حکیم کے جال میں پھنس گیا یا اس نے کوئی غلطی کردی تو عقلاء کے نزدیک وہ قابل ملامت نہیں ہوتا، لیکن جو شخص بلا تحقیق کسی عطائی کے جال میں جا پھنسا، اور پھر کسی مصیبت میں گرفتار ہوا تو وہ عقلاء کے نزدیک خود اپنی خودکشی کا ذمہ دار ہے۔

یہی حال عوام کے لئے دینی امور کے بارے میں ہے کہ اگر انہوں نے اپنی بستی کے

اہل علم و فن اور تجربہ کار بزرگوں سے تحقیق حال کرنے کے بعد کسی عالم کو اپنا مقتدیٰ بنایا اور اس کے فتوے پر عمل کیا تو وہ عند اللہ بھی معذور سمجھا جائے گا، ورنہ عند اللہ بھی۔ ایسے ہی مواقع کے متعلق حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فَاِنَّ اِثْمَہٗ عَلٰی مَنْ اَفْتٰی، یعنی ایسی صورت میں اگر عالم و مفتی نے غلطی کرلی اور کسی مسلمان نے اس کے غلط فتوے پر عمل کرلیا تو اس کا گناہ اس پر نہیں بلکہ اس عالم و مفتی پر ہے۔ ورنہ بھی اس وقت جبکہ اس عالم نے جان بوجھ کر ایسی غلطی کی ہو یا احکام میں غور و فکر میں کمی کی ہو یا یہ کہ وہ عالم ہی نہ تھا اور لوگوں **کو فریب دے کر اس منصب پر مسلط ہوگیا۔**

لیکن اگر کوئی شخص بے تحقیق محض اپنے خیال سے کسی کو عالم و مفتی قرار دے کر اس کے قول پر عمل کرے، اور وہ فی الواقع اس کا اہل نہیں تو اس کا وبال تنہا اس مفتی و عالم پر نہیں، بلکہ یہ شخص بھی برابر کا مجرم ہے، جس نے تحقیق کے بغیر اپنے ایمان کی باگ ڈور کسی ایسے شخص کے حوالہ کردی، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ ارشاد قرآنی آیا ہے سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ، یعنی یہ لوگ جھوٹی باتیں سننے کے عادی ہیں، اپنے مقتداؤں کے علم و امانت و دیانت کی تحقیق کئے بغیر ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں، اور ان سے موضوع **اور غلط روایات سننے اور ماننے کے عادی ہوگئے ہیں۔**

قرآن کریم نے یہ حال یہودیوں کا بیان کیا ہے، اور مسلمانوں کو سنایا ہے کہ وہ اس سے محفوظ رہیں، لیکن آج کی دنیا میں مسلمانوں کی بہت بڑی بربادی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ دنیا کے معاملات میں تو بڑے ہوشیار، چست و چالاک ہیں، بیمار ہوتے ہیں تو بہتر سے بہتر ڈاکٹر حکیم کو تلاش کرتے ہیں، کوئی مقدمہ پیش آتا ہے تو اچھے سے اچھا وکیل بیرسٹر ڈھونڈھ لاتے ہیں، کوئی مکان بنانا ہے تو اعلیٰ سے اعلیٰ آرکیٹیکٹ اور انجینئر کا سراغ لگا لیتے ہیں، لیکن دین کے معاملہ میں ایسے سخی ہیں کہ جس کی داڑھی اور کرتہ دیکھا اور کچھ الفاظ بولتے ہوئے سن پایا اس کو مقتدا، عالم، مفتی، رہبر بنالیا، بغیر اس تحقیق کے کہ اس نے باقاعدہ کسی مدرسہ میں بھی تعلیم پائی ہے یا نہیں؟ علماء ماہرین کی خدمت میں رہ کر علم دین کا کچھ ذوق پیدا کیا ہے یا نہیں، کچھ علمی خدمت کی ہے یا نہیں، اچھے بزرگوں اور اللہ والوں کی صحبت میں رہ کر تقویٰ و طہارت پیدا کی ہے یا نہیں؟

اس کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں جو لوگ دین کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں ان کا بہت بڑا حصہ جاہل واعظوں اور جاہل پیروں کے جال میں پھنس کر دین کے صحیح راستہ سے دور جا پڑتا ہے، ان کا علم دین صرف وہ کہانیاں رہ جاتی ہیں جن میں نفس کی خواہشات پر

تو فوراً پکڑا جاتا ہے، معنوی تحریف بظاہر کی جا سکتی ہے اور کرنے والوں نے کی بھی ہے، مگر اس کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرما دیا ہے کہ اس امت میں قیامت تک ایک ایسی جماعت قائم رہے گی جو قرآن و سنت کے صحیح مفہوم کی حامل ہوگی اور تحریف کرنے والوں کی قلعی کھول دے گی۔

جرمِ عظیم رشوت خوری

دوسری آیت میں ان کی ایک دوسری خصلت یہ بیان فرمائی ہے: اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ، یعنی یہ لوگ سحت کھانے کے عادی ہیں۔ سحت کے لفظی معنی کسی چیز کو جڑ بنیاد سے کھود کر برباد کرنے کے ہیں۔ اسی معنی میں قرآن کریم نے فرمایا ہے فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ یعنی اگر تم اپنی حرکت سے باز نہ آؤ گے تو اللہ تعالیٰ اپنے عذاب سے تمہارا استیصال کر دے گا، یعنی تمہاری جڑ بنیاد ختم کر دی جائے گی۔ قرآن مجید میں اس جگہ لفظ سحت سے مراد رشوت ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، ابراہیم نخعی، حسن بصری، مجاہد، قتادہ، ضحاک وغیرہ ائمہ تفسیر نے اس کی تفسیر رشوت سے کی ہے۔

رشوت کو سحت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف لینے دینے والوں کو برباد کرتی ہے، بلکہ پورے ملک و ملت کی جڑ بنیاد اور امن عامہ کو تباہ کرنے والی ہے، جس ملک یا جس محکمہ میں رشوت چل جائے وہاں قانون معطل ہو کر رہ جاتا ہے، اور قانون ملک ہی وہ چیز ہے جس سے ملک و ملت کا امن برقرار رکھا جاتا ہے، وہ معطل ہو گیا تو نہ کسی کی جان محفوظ رہتی ہے نہ آبرو نہ مال، اس لئے شریعت اسلام میں اس کو سحت فرما کر اشد حرام قرار دیا ہے، اور اس کے دروازہ کو بند کرنے کے لئے امراء و حکام کو جو ہدیے اور تحفے پیش کئے جاتے ہیں ان کو بھی صحیح حدیث میں رشوت قرار دیکر حرام کر دیا گیا ہے (جصاص)۔

اور ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ رشوت لینے والے اور دینے والے پر لعنت کرتے ہیں، اور اس شخص پر بھی جو ان دونوں کے درمیان دلال اور واسطہ بنے (جصاص)۔

رشوت کی تعریف شرعی یہ ہے کہ جس کا معاوضہ لینا شرعاً درست نہ ہو اس کا معاوضہ لیا جائے، مثلاً جو کام کسی شخص کے فرائض میں داخل ہے اور اس کا پورا کرنا اس کے ذمہ لازم ہے اس پر کسی فریق سے معاوضہ لینا جیسے حکومت کے افسر اور کلرک سرکاری ملازمت کی رو سے اپنے فرائض ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں، وہ صاحب معاملہ سے کچھ لیں تو یہ رشوت ہے، یا لڑکی کے ماں باپ اس کی شادی کرنے کے ذمہ دار ہیں کسی سے اس کا معاوضہ نہیں لے سکتے وہ جس کو رشتہ دیں اس سے کچھ معاوضہ لیں تو وہ رشوت ہے، یا صوم و صلوٰۃ

اور حج اور تلاوت قرآن عبادات میں جو مسلمان کے ذمہ ہیں، اُن پر کسی سے کوئی معاوضہ لیا جائے تو وہ رشوت ہے، تعلیم قرآن وغیرہ اس سے مستثنیٰ ہیں بر فتویٰ متأخرین۔

پھر جو شخص رشوت لے کر کسی کا کام حق کے مطابق کرتا ہے وہ رشوت لینے کا گنہگار ہے، اور یہ مال اس کے لئے سُحت اور حرام ہے، اور اگر رشوت کی وجہ سے حق کے خلاف کام کیا تو یہ دوہرا شدید جرم حق تلفی اور حکم خداوندی کو بدل دینے کا اس کے علاوہ ہوگیا، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے بچائے۔

إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ

ہم نے نازل کی توریت کہ اس میں ہدایت اور روشنی ہے اس پر حکم کرتے تھے پیغمبر

الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا

جو کہ حکم بردار تھے اللہ کے یہود کو اور حکم کرتے تھے درویش اور عالم اس واسطے

اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ ۚ فَلَا

کہ وہ نگہبان ٹھہرائے گئے تھے اللہ کی کتاب پر اور اس کی خبر گیری پر مقرر تھے سو تم نہ

تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ

ڈرو لوگوں سے اور مجھ سے ڈرو اور مت خریدو میری آیتوں پر مول تھوڑا،

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ﴿٤٤﴾

اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا سو وہی لوگ ہیں کافر،

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ

اور لکھ دیا ہم نے اُن پر اس کتاب میں کہ جی کے بدلے جی اور آنکھ کے بدلے آنکھ،

وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَن

اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا بدلہ ان کے برابر پھر

تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ

جس نے معاف کر دیا تو وہ گناہ سے پاک ہوگیا اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے

اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٤٥﴾ وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم

اتارا سو وہی لوگ ہیں ظالم، اور پیچھے بھیجا ہم نے انہی کے قدموں پر

بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ

عیسیٰ مریم کے بیٹے کو تصدیق کرنے والا توریت کی جو آگے سے تھی اور

اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ

اس کو دی ہم نے انجیل جس میں ہدایت اور روشنی تھی اور تصدیق کرتی تھی اپنے سے

يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۶﴾

اگلی کتاب توریت کی اور راہ بتلانے والی اور نصیحت تھی ڈرنے والوں کو

وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۭ وَمَنْ لَّمْ

اور چاہئے کہ حکم کریں انجیل والے موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے اس میں اور جو کوئی حکم

يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَ

نہ کرے موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے سو وہی لوگ ہیں نافرمان اور

اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ

تجھ پر اتاری ہم نے کتاب سچی تصدیق کرنے والی سابقہ

مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ

کتابوں کی اور ان کے مضامین پر نگہبان سو تو حکم کر ان میں موافق اس کے جو کہ اتارا

اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ عَمَّا جَاۗءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۭ لِكُلٍّ

اللہ نے اور ان کی خوشی پر مت چل چھوڑ کر سیدھا رستہ جو تیرے پاس آیا ہر ایک کو

جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ

تم میں سے دیا ہم نے ایک دستور اور راہ اور اللہ چاہتا تو تم کو ایک

اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا

دین پر کر دیتا لیکن تم کو آزمانا چاہتا ہے اپنے دیے ہوئے حکموں میں سو تم دوڑ کر

الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ

لو خوبیاں اللہ کے پاس تم سب کو پہنچنا ہے پھر جتلا دے گا جس بات میں

فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

تم کو اختلاف تھا اور یہ فرمایا کہ حکم کر ان میں موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے

وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا

اور مت چل اُن کی خوشی پر اور بچتا رہ ان سے کہ تجھ کو بہکا نہ دیں کسی ایسے حکم سے جو

أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ

اللہ نے اُتارا تجھ پر پھر اگر نہ مانیں تو جان لے کہ اللہ نے یہی چاہا ہے کہ پہنچائے

يُصِيبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ ﴿۴۹﴾

ان کو کچھ سزا اُن کے گناہوں کی اور لوگوں میں بہت ہیں نافرمان

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا

اب کیا حکم چاہتے ہیں کفر کے وقت کا اور اللہ سے بہتر کون ہے حکم کرنیوالا

لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۵۰﴾

یقین کرنیوالوں کے واسطے

ع ۷
۱۱

خلاصۂ تفسیر

ربط یہ سورۂ مائدہ کا ساتواں رکوع ہے اس میں حق تعالیٰ نے یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں کو یکجائی طور پر ایک اہم اور خاص حکم شرعی پر متنبہ فرمایا ہے جس کا ذکر سورۂ مائدہ میں متفرق طور پر . . . .

. . . . اوپر سے چلا آیا ہے، اور وہ معاملہ ہے اللہ جل شانہٗ سے کئے ہوئے عہد و پیمان کی خلاف ورزی کا اور اس کے بھیجے ہوئے احکام میں تغیر و تبدل اور تحریف و تاویل کا جو یہود و نصاریٰ کی دائمی خصلت و عادت بن گیا تھا۔

اس رکوع میں حق تعالیٰ نے اوّل اہلِ تورات یہود کو مخاطب فرما کر ان کو اس کج روی اور اس کے انجام بد پر ابتدائی دو آیتوں میں متنبہ فرمایا، اور اس کے ضمن میں قصاص کے متعلق بعض احکام بھی اس مناسبت سے ذکر فرما دیئے کہ پچھلی آیتوں میں جو واقعہ یہود کی سازش کا ذکر کیا گیا ہے وہ قصاص کے متعلق تھا کہ بنو نضیر دیت اور قصاص میں مساوات کے قائل نہ تھے بلکہ بنو قریظہ کو اپنے سے کم دیت لینے پر مجبور کر رکھا تھا، ان دونوں آیتوں میں یہود کو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے خلاف اپنا قانون جاری کرنے پر سخت تنبیہ فرمائی، اور ایسا کرنے والوں کو کافر اور ظالم قرار دیا۔

اس کے بعد تیسری آیت میں اہلِ انجیل نصاریٰ کو اسی مضمون کا خطاب فرما کر اللہ کے نازل کئے ہوئے قانون کے خلاف کوئی قانون جاری کرنے پر سخت تنبیہ فرمائی، اور ایسا

کرنے والوں کو سرکش و نافرمان قرار دیا۔

اس کے بعد تیسری پانچویں اور چھٹی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کر مسلمانوں کو اسی مضمون کے متعلق ہدایات دی گئیں کہ وہ اہل کتاب کی اس بیماری میں مبتلا نہ ہوجائیں کہ جاہ و مال کے لالچ میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو بدلنے لگیں، یا اس کے قانون کے خلاف کوئی قانون اپنی طرف سے جاری کرنے لگیں۔

اس کے ضمن میں ایک اور اہم اصولی مسئلہ یہ بھی بیان فرمادیا کہ اگرچہ اصول عقائد اور اصول عبادات میں حق جل شانہ کے نزدیک تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی طریقہ کے پابند ہیں، لیکن بمقتضائے حکمت ہر پیغمبر کو اس کے زمانہ کے مناسب شریعت دی گئی جن میں بہت سے فروعی اور جزوی احکام مختلف ہیں، اور یہ بتلایا کہ ہر پیغمبر کو جو شریعت دی گئی اس کے زمانہ میں وہی مقتضائے حکمت اور واجب الاتباع تھی، اور جب اس کو منسوخ کرکے دوسری شریعت نازل کی گئی تو اس وقت وہی عین حکمت و مصلحت اور واجب الاتباع ہوگئی، اس میں شریعتوں کے مختلف ہوتے رہنے اور بدلتے رہنے کی ایک خاص حکمت **کی طرف بھی اشارہ فرمادیا۔**

ہم نے (موسیٰ علیہ السلام پر) توریت نازل فرمائی تھی جس میں (عقائد صحیحہ کی بھی) ہدایت تھی اور (احکام عملیہ کا بھی) وضوح تھا، انبیاء (بنی اسرائیل) جو کہ (باوجود لاکھوں آدمیوں کے مقتدا و مطاع ہونے کے) اللہ تعالیٰ کے مطیع تھے اس (توراۃ) کے موافق یہود کو حکم دیا کرتے تھے اور (اسی طرح ان میں کے) اہل اللہ اور علماء بھی (اسی کے موافق کرتے تھے) اس وقت کی شریعت تھی حکم دیتے تھے، بوجہ اس کے کہ ان (اہل اللہ و علماء) کو اس کتاب اللہ (پر عمل کرنے اور کرانے) کی نگہداشت کا حکم (حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے) دیا گیا تھا اور وہ اس کے (یعنی اس پر عمل کرنے کرانے کے) اقراری ہوگئے تھے (یعنی چونکہ ان کو اس کا حکم ہوا تھا اور انہوں نے اس حکم کو قبول کرلیا تھا، اس لئے ہمیشہ اس کے پابند رہے، سو (اے اس زمانہ کے رؤساء و علماء یہود جب ہمیشہ سے تمہارے سب مقتدا توراۃ کو مانتے آئے ہیں تو) تم بھی (تصدیق رسالت محمدیہ کے باب میں جس کا حکم توریت میں ہے) لوگوں سے (یہ) اندیشہ مت کرو (کہ ہم تصدیق کرلیں گے تو عام لوگوں کی نظر میں ہماری جاہ میں فرق آجائے گا) اور (صرف) مجھ سے ڈرو (کہ تصدیق نہ کرنے پر سزا دوں گا) اور میرے احکام کے بدلہ میں (دنیا کی) متاع قلیل (جو کہ تم کو اپنے عوام سے وصول ہوتی ہے) مت لو (کہ یہی حب جاہ و حب مال تم کو باعث

ہوتی ہیں تصدیق نہ کرنے پر) اور (یاد رکھو کہ) جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق
حکم نہ کرے (بلکہ غیر حکم شرعی کو قصداً حکم شرعی بتلا کر اس کے موافق حکم کرے) سو ایسے
لوگ بالکل کافر ہیں (جیسا یہ یہود تم کر رہے ہو کہ عقائد میں بھی مثل عقیدۂ رسالت محمدیہ اور
اعمال میں بھی جیسے حکم رجم وغیرہ اپنے مخترعات کو حکم الٰہی بتلا کر ضلال و ضلال میں مبتلا
ہو رہے ہیں) اور ہم نے ان (یہود) پر اس (توراۃ) میں یہ بات فرض کی تھی کہ (اگر کوئی کسی
کو ناحق عمداً قتل یا زخمی کرے اور صاحب حق دعویٰ کرے تو) جان بدلے جان کے اور آنکھ
بدلے آنکھ کے اور ناک بدلے ناک کے اور کان بدلے کان کے اور دانت بدلے دانت کے
اور (اسی طرح دوسرے) خاص زخموں کا بھی بدلہ ہے پھر جو شخص (اس قصاص یعنی بدلہ لینے
کا مستحق ہو کر بھی) اس (قصاص) کو معاف کر دے وہ (معاف کرنا) اس (معاف کرنیوالے)
کے لئے (اس کے گناہوں کا) کفارہ (یعنی گناہوں کے دور ہونے کا سبب) ہو جاویگا
(یعنی معاف کرنا موجب ثواب ہے) اور (چونکہ یہود نے ان احکام کو چھوڑ رکھا تھا اس لئے
مکرر وعید سناتے ہیں کہ) جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے
(جس کے معنے اوپر گذرے) سو ایسے لوگ بالکل ستم ڈھارہے ہیں (یعنی بہت برا کام کر رہے
ہیں) اور ہم نے ان (نبیوں) کے پیچھے (جن کا ذکر یَحۡکُمُ بِهَا النَّبِيُّوۡنَ میں آیا ہے) عیسیٰ بن
مریم (علیہ السلام) کو اس حالت میں (پیغمبر بنا کر) بھیجا کہ وہ اپنے سے قبل کی کتاب
یعنی توریت کی تصدیق فرماتے تھے (جو کہ لوازم رسالت سے ہے کہ تمام کتب الٰہیہ
کی تصدیق کرے) اور ہم نے ان کو انجیل دی جس میں (توریت ہی کی طرح عقائد صحیحہ کی
بھی) ہدایت تھی اور (احکام عملیہ کی بھی) وضوح تھا اور وہ (انجیل) اپنے سے قبل کی کتاب
یعنی توریت کی تصدیق (بھی) کرتی تھی (کہ یہ بھی لوازم کتاب الٰہی سے ہے) اور وہ سراسر
ہدایت اور نصیحت تھی خدا سے ڈرنے والوں کے لئے اور ہم نے انجیل دے کر حکم کیا تھا کہ انجیل
والوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس میں نازل فرمایا ہے اس کے موافق حکم کیا کریں
اور (اے اس زمانہ کے نصاریٰ سن رکھو کہ) جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے کے
موافق حکم نہ کرے (اور اس کے معنی اوپر گذر چکے ہیں) تو ایسے لوگ بالکل بے حکمی
کرنے والے ہیں (اور انجیل رسالتِ محمدیہ کی خبر دے رہی ہے، تو تم اس کے خلاف
کیوں چل رہے ہو) اور (توراۃ و انجیل کے بعد) ہم نے یہ کتاب (مسمیٰ بقرآن)
آپ کے پاس بھیجی ہے جو خود بھی صدق (و راستی) کے ساتھ موصوف ہے اور اس سے پہلے
جو (آسمانی) کتابیں (آچکی) ہیں (جیسے توراۃ و انجیل و زبور) ان کی بھی تصدیق کرتی ہے،

(کہ وہ نازل من اللہ ہیں) اور (چونکہ وہ کتاب مسمّٰی بالقرآن قیامت تک محفوظ و معمول بہ ہے
اور اس میں ان کتب سماویہ کی تصدیق موجود ہے اس لئے وہ کتاب) ان کتابوں (کے صادق ہونے
کے مضمون) کی (ہمیشہ کے لئے) محافظ ہے (کیونکہ قرآن میں ہمیشہ یہ محفوظ رہے گا کہ وہ کتب
نازل من اللہ ہیں جب قرآن ایسی کتاب ہے) تو ان (اہل کتاب) کے باہمی معاملات میں (جب
کہ آپ کے اجلاس میں پیش ہوں) اس بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ فرمایا کیجئے اور
یہ جو ان کی کتاب آپ کو ملی ہے اس سے دور ہو کر ان کی (خلاف شرع) خواہشوں (اور فرمائشوں)
پر (آئندہ بھی) عمل درآمد نہ کیجئے (جیسا اب تک باوجود ان کی درخواست والتماس کے
آپ نے صاف انکار فرمایا، یعنی یہ آپ کی رائے نہایت ہی درست ہے اس پر ہمیشہ
قائم رہئے، اور اے اہل کتاب تم کو اس قرآن کے حق جاننے سے اور اس کے
فیصلہ کو ماننے سے کیوں انکار ہے؟ کیا دین جدید کا آنا کچھ تعجب کی بات ہے؟ آخر)
تم میں سے ہر ایک (امت) کے لئے (اس کے قبل) ہم نے خاص شریعت اور خاص
طریقت تجویز کی تھی (مثلاً یہود کی شریعت وطریقت توراۃ تھی، اور نصاریٰ کی
شریعت اور طریقت انجیل تھی، پھر اگر امت محمدیہ کے لئے شریعت وطریقت
قرآن مقرر کیا گیا، جس کا حق ہونا بھی دلائل سے ثابت ہے تو وجہ انکار کیا) اور اگر اللہ
تعالیٰ کو (سب کا ایک ہی طریقہ رکھنا) منظور ہوتا تو (وہ اس پر بھی قدرت رکھتے تھے کہ
تم سب (یہود و نصاریٰ و اہل اسلام) کو (ایک ہی شریعت دے کر) ایک ہی امت
میں کر دیتے (اور شرع جدید نہ آتی جس سے تم کو توحش ہوتا ہے) لیکن (اپنی حکمت کی
ایسا نہیں کیا، بلکہ ہر امت کو جدا جدا طریقہ دیا) تاکہ جو دین تم کو (ہر زمانہ میں نیا نیا)
دیا ہے اس میں تم سب کا (تمہارے انقیاد و طاعت کے لئے) امتحان فرماویں (کیونکہ
اکثر طبعی امر ہے کہ نئے طریقہ سے وحشت اور مخالفت کی حرکت ہوتی ہے،
لیکن جو شخص عقل صحیح و انصاف سے کام لیتا ہے، وہ اس ظہور حقیقت کے بعد اپنی طبیعت
کو موافقت پر مجبور کر دیتا ہے اور یہ ایک امتحان عظیم ہے، پس اگر سب کی ایک ہی شریعت
ہوتی تو اس شریعت کی ابتداء کے وقت جو لوگ ہوتے ان کا امتحان تو ہو جاتا، لیکن
دوسرے جو ان کے مقلد و اس طریق سے مالوف ہوتے ان کا امتحان نہ ہوتا، اور اب
ہر امت کا امتحان ہو گیا، اور امتحان کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان کو جس چیز
سے روکا جائے خواہ معمول بہ ہو یا متروک اس پر حرص ہوتی ہے، اور یہ امتحان شرائع کے
تعدد میں اقوی ہے کہ منسوخ سے روکا جاتا ہے، اور شریعت کے اتحاد میں گو معاصی سے

روکے لیکن ان میں حقیقت کا تو شبہ نہیں ہوتا، اس لئے امتحان اس درجہ کا نہیں، ان
دونوں امتحانوں کا مجموعہ ہر امت کے سلف اور خلف سب کو عام ہو گیا (جیسا کہ صورت
اوّل کو صرف سلف سے خصوصیت ہے، پس جب شرع جدید میں یہ حکمت ہے) تو
تعصب کو چھوڑ کر مفید باتوں کی طرف (یعنی ان عقائد و اعمال و احکام کی طرف جن پر
قرآن مشتمل ہے) دوڑو (یعنی قرآن پر ایمان لا کر اس پر عمل کرو) تم سب
کو خدا ہی کے پاس جانا ہے پھر وہ تم سب کو جتلا دے گا جس میں تم (باوجود وضوح حق
کے دنیا میں خواہ مخواہ) اختلاف کیا کرتے تھے (اس لئے اس اختلاف بے جا کو چھوڑ کر
حق کو جو کہ اب منحصر ہے قرآن میں قبول کر لو) اور چونکہ ان اہل کتاب نے ایسی بلند پروازی
کی کہ آپ سے درخواست اپنے موافق مقدمہ طے کر دینے کی کرتے ہیں، جہاں کہ اس کا
احتمال ہی نہیں اس لئے ان کے حوصلے پست کرنے کو اور اس کوشش کو ہمیشہ ہمیشہ ان
کے ناامید کر دینے کو ہم آپ کو حکم دیتے ہیں کہ آپ ان (اہل کتاب) کے باہمی معاملات
میں (جب کہ آپ کے اجلاس میں پیش ہوں) اس بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ
فرمایا کیجئے اور ان کی (خلاف شرع) خواہشوں (اور فرمائشوں) پر (آئندہ بھی) عملدرآمد
نہ کیجئے (جیسا اب تک کبھی نہیں کیا) اور ان سے یعنی ان کی اس بات سے (آئندہ بھی مثل
سابق) احتیاط رکھئے کہ وہ آپ کو خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے کسی حکم سے بھی بچلا دیں
(یعنی گو اس کا احتمال نہیں لیکن اس کا قصد بھی ہے تو وجوب ثواب بھی ہے) پھر
(باوجود وضوح قرآن اور اس کے فیصلہ کے حق ہونے کے بھی) اگر یہ لوگ (قرآن سے
اور آپ کے فیصلے سے جو موافق قرآن کے ہوگا) اعراض کریں تو یقین کر لیجئے کہ بس خدا
ہی کو منظور ہے کہ ان کے بعضے جرموں پر (دنیا ہی میں) ان کو سزا دیدیں (اور وہ بعض
جرم فیصلہ نہ ماننا ہے، اور حقانیت قرآن کے نہ ماننے کی سزا پوری آخرت میں ملے گی،
کیونکہ پہلا جرم ذمی ہونے کے خلاف ہے اور دوسرا جرم ایمان کے خلاف، حرمت ذمہ کی سزا دنیا میں
ہوتی ہے اور کفر کی سزا آخرت میں، چنانچہ بنی قریظہ و بنی نضیر سے نقض عہد ہوا تو ان کو قتل اور قید و اخراج
وطن کی سزا دی گئی) اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ حالت سن کر آپ کو رنج ضرور
ہوگا، لیکن آپ زیادہ غم نہ کیجئے کیونکہ زیادہ آدمی تو دنیا میں ہمیشہ سے بے حکم ہی
ہوتے (آئے) ہیں، یہ لوگ (فیصلہ قرآنی سے جو کہ عین عدل ہے اعراض کر کے) پھر کیا
زمانہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں (جس کو انہوں نے برخلاف شرائع سماویہ کے تجویز
کر لیا تھا، جس کا ذکر دو واقعوں کے ضمن میں اس رکوع سے پہلے رکوع یا ایھا الرسول لا یحزنک

کی تمہید میں گذر چکا کہ یہ حکم زنا کے متعلق سراسر عدل و دلیل کے خلاف ہے، یعنی اہل علم ہو کر علم سے اعراض کرنا اور جہل کا طالب ہونا عجیب در عجیب ہے) اور فیصلہ کرنے میں اللہ سے کون اچھا (فیصلہ کرنے والا) ہوگا (بلکہ کوئی مساوی بھی نہیں، پس خدائی فیصلہ کو چھوڑ کر دوسرے کے فیصلہ کا طالب ہونا عین جہل نہیں تو کیا ہے، لیکن یہ بات بھی یقین (و ایمان) رکھنے والوں ہی کے نزدیک (ہے) کیونکہ اس کا سمجھنا موقوف ہے قوتِ عقلیہ کی صحت پر اور وہ کفار اس سے بے نصیب ہیں)

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ”یعنی ہم نے اپنی کتاب تورات بھیجی جس میں حق کی طرف رہنمائی اور ایک خاص نور تھا، اس میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ آج جو شریعت تورات کو منسوخ کیا جا رہا ہے تو اس میں تورات کی کوئی تنقیص نہیں، بلکہ تغیر زمانہ کے سبب تغیر احکام کی ضرورت کے ماتحت ایسا کیا گیا، ورنہ تورات بھی ہماری نازل کردہ کتاب ہے، اس میں بنی اسرائیل کے لئے اصول ہدایت بھی مذکور ہیں، اور ایک خاص نور بھی ہے، جو روحانی طور پر ان کے قلوب پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ ”یعنی تورات کو ہم نے اس لئے نازل کیا تھا کہ جب تک اس کی شریعت کو منسوخ نہ کیا جائے اس وقت تک آنے والے انبیاء اور ان کے نائب اللہ والے اور علماء سب اسی تورات کے مطابق فیصلے کیا کریں، اسی قانون کو دنیا میں چلایا کریں، اس میں انبیاء علیہم السلام کے نائبین کو دو قسموں میں ذکر فرمایا ہے، پہلے رَبّٰنِيُّوْنَ دوسرے اَحبار، لفظ ربانی رب کی طرف منسوب ہے جس کے معنی ہیں اللہ والا، اور احبار حبر کی جمع ہے، یہود کے محاورہ میں عالم کو حبر کہا جاتا تھا، اگرچہ بظاہر تو کہا جا سکتا ہے کہ اللہ والا کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے ضروری احکام کا علم بھی ہو، ورنہ بغیر علم کے عمل نہیں ہو سکتا، اور بغیر احکام الٰہیہ کی اطاعت و عمل کے کوئی شخص اللہ والا نہیں ہو سکتا، اسی طرح اللہ کے نزدیک عالم اسی کو کہا جاتا ہے جو اپنے علم پر عمل بھی کرتا ہو، ورنہ وہ عالم جو احکام الٰہیہ سے واقف ہونے کے باوجود ضروری فرائض و واجبات پر بھی عمل نہیں کرتا، نہ اس کی طرف کوئی دھیان دیتا ہے وہ اللہ و رسول کے نزدیک جاہل سے بدتر ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر اللہ والا عالم ہوتا ہے، اور ہر عالم اللہ والا ہوتا ہے

مگر اس جگہ ان دونوں کو الگ الگ بیان فرما کر اس بات پر متنبہ فرما دیا کہ اگرچہ اللہ والے کے لئے علم ضروری اور عالم کے لئے عمل ضروری ہے، لیکن جس پر جس رنگ کا غلبہ ہوا اس کے اعتبار سے اس کا نام رکھا جاتا ہے، جس شخص کی توجہ زیادہ تر عبادات و عمل اور ذکر اللہ میں مصروف ہو، اور علم دین صرف بقدر ضرورت حاصل کر لیتا ہے وہ ربانی یعنی اللہ والا کہلاتا ہے، جس کو آجکل کی اصطلاح میں شیخ، مرشد، پیر وغیرہ کے نام دیئے جاتے ہیں، اور جو شخص علمی مہارت پیدا کر کے دوسروں کو احکام شرعیہ بتلانے سکھلانے کی خدمت میں زیادہ مشغول ہے اور فرائض و واجبات اور سنن مؤکدہ کے علاوہ دوسری نفلی عبادات میں زیادہ وقت نہیں لگا سکتا، اس کو حبر یا عالم کہا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس میں شریعت و طریقت اور علماء و مشائخ کی اصلی وحدت کو بھی بتلا دیا، اور طریق کار اور غالب شغل کے اعتبار سے ان میں فرق کو بھی واضح کر دیا جس سے معلوم ہو گیا کہ علماء اور صوفیاء کوئی دو فرقے یا دو گروہ نہیں، بلکہ دونوں کا مقصد زندگی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت و فرمانبرداری ہے، البتہ اس مقصد کے حصول کے لئے ان کے طریق کار صورۃً مختلف نظر آتے ہیں۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ، یعنی یہ انبیاء اور ان کے دونوں قسم کے نائبین علماء و مشائخ تورات کے احکام جاری کرنے کے پابند اس لئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تورات کی حفاظت ان کے ذمہ لگا دی تھی اور انہوں نے اس کی حفاظت کا عہد و پیمان کر لیا تھا۔

یہاں تک تورات کے کتاب الٰہی ہونے اور ہدایت و نور ہونے کا، اس کا ذکر تھا کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائبین مشائخ و علماء نے اس کی حفاظت فرمائی اس کے بعد موجودہ زمانے کے یہودیوں کی کجروی پر اور اس کجروی کے اصلی سبب پر متنبہ فرمایا گیا کہ تم نے بجائے اس کے کہ اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر تورات کی حفاظت کرتے اس کے احکام میں تحریف و تغیر و تبدل کر دیا، تورات میں بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ نبی آخر الزمان محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کی خبر اور یہود کو ان پر ایمان لانے کی ہدایت مذکور تھی، ان لوگوں نے اس کی خلاف ورزی کی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بجائے آپ کی مخالفت شروع کر دی اور ساتھ ہی ان کی اس مہلک غلطی کا سبب بھی بیان فرما دیا کہ وہ محض دنیا کی حب جاہ اور حب مال ہے، تم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول برحق جاننے کے باوجود آپ سے

کے پاس لاتے ہیں۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ؁ یعنی جو اللہ کے نازل کردہ احکام پر حکم نہ دیں وہ ظالم ہیں، کیونکہ احکام خداوندی کے منکر اور باغی ہیں۔ تیسری آیت میں اول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا ذکر ہے کہ وہ پچھلی کتاب یعنی تورات کی تصدیق کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے پھر انجیل کا ذکر ہے کہ وہ بھی تورات کی طرح ہدایت اور نور ہے۔

چوتھی آیت میں ارشاد فرمایا کہ اہل انجیل کو چاہئے کہ جو قانون اللہ تعالیٰ نے انجیل میں نازل فرمایا ہے اس کے مطابق احکام نافذ کریں اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے خلاف حکم جاری کریں وہ نافرمان اور سرکش ہیں۔

قرآن تورات و انجیل کا بھی محافظ ہے

پانچویں اور چھٹی آیات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا جو اپنے سے پہلی کتابوں تورات و انجیل کی تصدیق بھی کرتا ہے، اور ان کا محافظ بھی ہے، کیونکہ جب اہل تورات نے تورات میں اور اہل انجیل نے انجیل میں تحریف و تغیر و تبدل کیا تو قرآن ہی وہ محافظ و نگران ثابت ہوا جس نے ان کی تحریفات کا پردہ چاک کر کے حق اور حقیقت کو روشن کر دیا اور تورات و انجیل کی اصل تعلیمات آج بھی قرآن ہی کے ذریعہ دنیا میں باقی ہیں جبکہ ان کتابوں کے وارثوں اور ان کی پیروی کے مدعیوں نے ان کا حلیہ ایسا بگاڑ دیا ہے کہ حق و باطل کا امتیاز ناممکن ہو گیا، آخر آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہی حکم دیا گیا جو اہل تورات و اہل انجیل کو دیا گیا تھا کہ آپ کے احکام اور فیصلے سب اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق ہونے چاہئیں، اور یہ لوگ جو آپ سے اپنی خواہشات کے مطابق فیصلہ کرانا چاہتے ہیں ان کے مکر سے باخبر رہیں، اس ارشاد کی ایک خاص وجہ یہ بھی کہ یہود کے چند علماء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہم یہود کے علماء اور پیشوا ہیں، اگر ہم مسلمان ہو گئے تو وہ بھی سب مسلمان ہو جائیں گے، لیکن ہماری ایک شرط یہ ہے کہ ہمارا ایک مقدمہ آپ کی قوم کے لوگوں کے ساتھ ہے ہم یہ مقدمہ آپ کے پاس لائیں گے، آپ اس میں فیصلہ ہمارے موافق فرما دیں تو ہم مسلمان ہو جائیں گے، حق تعالیٰ نے اس پر متنبہ فرمایا کہ آپ ان لوگوں کے مسلمان ہو جانے کے پیش نظر عدل و انصاف اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے خلاف فیصلہ ہرگز نہ دیں، اور اس کی پرواہ نہ کریں کہ یہ مسلمان ہوں گے یا نہیں۔

شرائع میں جزوی اختلاف اور اس کی حکمت

اس آیت میں دوسری ہدایت کے ساتھ ایک اہم اصولی سوال کا جواب بھی بیان فرما دیا گیا ہے، وہ یہ کہ جب تمام انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں، اور اُن پر نازل ہونے والی کتابیں اور صحیفے اور ان کی شریعتیں سب اللہ جل شانہ کی طرف سے ہیں، تو پھر ان کی کتابوں اور شریعتوں میں اختلاف کیوں ہے، اور آنے والی شریعت و کتاب پچھلی شریعت و کتاب کو منسوخ کیوں کرتی ہے، اس کا جواب مع حکمت خداوندی کے اس آیت میں بیان کیا گیا لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۚ وَلَوْ شَاۤءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ، یعنی ہم نے تم میں سے ہر طبقہ کے لئے ایک خاص شریعت اور خاص طریق عمل بنایا ہے، جس میں اصول مشترک اور متفق علیہ ہونے کے باوجود فروعی احکام میں کچھ اختلافات بھی ہوتے ہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب کے لئے ایک ہی شریعت مقرر کر کے سب کو ایک ہی امت ایک ہی ملت بنا دیتا، سب کی ایک ہی کتاب ایک ہی شریعت ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو اس لئے پسند نہیں کیا کہ لوگوں کی آزمائش مقصود تھی کہ کون لوگ ہیں جو عبادت کی حقیقت سے واقف ہو کر ہر وقت گوش برآواز رہتے ہیں کہ جو حکم ملے اس کی تعمیل کریں، جو نئی کتاب یا شریعت آئے اس کا اتباع کریں، اور پچھلی شریعت و کتاب ان کو کتنی ہی محبوب ہو، اور آبائی مذہب ہو جانے کے سبب اس کا ترک کرنا ان پر کتنا ہی شاق ہو، مگر وہ ہر وقت گوش برآواز اطاعت کے لئے تیار رہتے ہیں، اور کون ہیں جو اس حقیقت سے غافل ہو کر کسی خاص شریعت یا کتاب کو مقصد بنا بیٹھے اور اس کو ایک آبائی مذہب کی حیثیت سے لئے ہوئے ہیں اس کے خلاف کسی حکم خداوندی پر کان نہیں دھرتے۔

اختلاف شرائع میں یہ ایک بڑی حکمت ہے جس کے ذریعہ ہر زمانہ ہر طبقہ کے لوگوں کو صحیح عبادت و عبودیت کی حقیقت سے آگاہ کیا جاتا ہے کہ در حقیقت عبادت نام ہے بندگی اور اطاعت و فرمانبرداری کا، جو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، یا ذکر و تلاوت میں منحصر نہیں اور نہ یہ چیزیں اپنی ذات میں مقصود ہیں، بلکہ ان سب کا مقصد صرف ایک حکم الٰہی کی اطاعت ہے، یہی وجہ ہے کہ جن اوقات میں نماز کی ممانعت فرمائی گئی ہے، ان میں نماز کوئی کار ثواب نہیں بلکہ گناہ کا موجب ہے، ایام عیدین وغیرہ میں روزہ رکھنا ممنوع ہے تو اس وقت روزہ رکھنا گناہ ہے، نویں ذی الحجہ کے علاوہ کسی دن کسی مہینہ میں میدان عرفات میں جمع ہو کر دعاء و عبادت کرنا کار ثواب نہیں جبکہ

نویں ذی الحجہ میں سب سے بڑی عبادت یہی ہو اسی طرح تمام دوسری عبادات کا حال ہے، جب تک ان کے کرنے کا حکم ہے تو وہ عبادت ہیں، اور جب اور جس حد پر ان کو روک دیا جائے تو وہ بھی حرام و ناجائز ہو جاتی ہیں، جو لوگ اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتے، وہ عبادات ان کی عادات بن جاتی ہیں، بلکہ جن قومی رسوم کو وہ عبادت سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں، صریح احکام خدا و رسول کو بھی ان کے پیچھے نظر انداز کر دیتے ہیں، یہیں سے بدعات و محدثات دین کا جزو بن جاتی ہیں، جو پچھلی شریعتوں اور کتابوں کی تحریف کا سبب ہوئی ہیں، اللہ جل شانہ نے مختلف پیغمبروں پر مختلف کتابیں اور شریعتیں نازل فرما کر انسانوں کو یہی سکھایا ہے کہ کسی ایک عمل یا ایک قسم عبادت کو مقصود نہ بنا لیں، بلکہ صحیح معنی میں اللہ کے فرمانبردار بندے بنیں، اور جس وقت پچھلے عمل کو چھوڑ دینے کا حکم ہو فوراً چھوڑ دیں، اور جس عمل کے کرنے کا ارشاد ہو فوراً اس پر عمل پیرا ہوں۔

اس کے علاوہ اختلاف شرائع کی ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ دنیا کے ہر دور اور ہر طبقہ کے انسانوں کے مزاج و طبائع مختلف ہوتی ہیں، زمانہ کا اختلاف طبیعت انسانی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے، اگر سب کے لئے فروعی احکام ایک ہی کر دیئے جائیں تو انسان بڑی مشکل میں مبتلا ہو جائے، اس لئے حکمت الہیہ کا تقاضا یہ ہوا کہ ہر زمانہ اور ہر طبقہ کے جذبات کی رعایت رکھ کر فروعی احکام میں مناسب تبدیلی کی جائے، یہاں ناسخ و منسوخ کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ حکم دینے والے کو پہلے حالات معلوم نہ تھے تو ایک حکم دیدیا، پھر نئے حالات سامنے آئے تو اس کو منسوخ کر دیا، یا پہلے غفلت و غلطی سے کوئی حکم صادر کر دیا تھا، پھر تنبہ ہوا تو بدل دیا، بلکہ شرائع میں ناسخ و منسوخ کی مثال بالکل ایک حکیم یا ڈاکٹر کے نسخہ کی مثال ہے، جس میں دوائیں تدریجاً بدل جاتی ہیں کہ حکیم ڈاکٹر کو پہلے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تین روز اس دوا کا استعمال کرنے کے بعد مریض پر یہ کیفیات طاری ہو جائیں گی اس وقت فلاں دوا دی جائے گی، جب وہ پہلا نسخہ منسوخ کر کے دوسرا دیتا ہے تو یہ کہنا صحیح نہیں ہوتا کہ پہلا نسخہ غلط تھا اس لئے منسوخ کیا گیا، بلکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ پچھلے ایام میں وہی نسخہ صحیح اور ضروری تھا، اور بعد کے حالات میں یہی دوسرا نسخہ صحیح اور ضروری ہے۔

آیات مذکورہ میں آنحضرت [illegible]

اول ابتدائی آیات سے معلوم ہوا کہ یہود کا مقدمہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا تھا، اور آپ نے اس کا فیصلہ فرمایا تو یہ فیصلہ شہادت تورات کے مطابق تھا، اس سے ثابت ہوا کہ پچھلی شریعتوں

میں جو احکام تھے جب تک قرآن یا وحی نبی نے ان کو منسوخ نہ کیا ہو، وہ بدستور باقی رہتے ہیں، جیسا کہ یہود کے مقدمات میں قصاص کی مساوات اور جرم زنا میں سنگساری کا حکم تورات میں بھی تھا، پھر قرآن نے بھی اس کو جوں کا توں باقی رکھا۔

اسی طرح دوسری آیت میں زخموں کے قصاص کا حکم جو بحوالہ تورات بیان کیا گیا ہے، اسلام میں بھی یہی حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری فرمایا، اسی بنا پر جمہور علماء اسلام کے نزدیک ضابطہ یہ ہے کہ پچھلی شریعتوں کے وہ احکام جن کو قرآن نے منسوخ نہ کیا ہو وہ ہماری شریعت میں بھی نافذ اور واجب الاتباع ہیں، یہی وجہ ہے کہ آیات مذکورہ میں اہل تورات کو تورات کے مطابق اور اہل انجیل کو انجیل کے مطابق حکم دینے اور عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، حالانکہ یہ دونوں کتابیں اور ان کی شریعتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد منسوخ ہو چکی ہیں، مطلب یہ ہے کہ تورات و انجیل کے جو احکام قرآن نے منسوخ نہیں کئے وہ آج بھی واجب الاتباع ہیں۔

تیسرا حکم ان آیات میں یہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے احکام کے خلاف حکم دینا بعض صورتوں میں کفر ہے جبکہ اعتقاداً بھی اس کو حق نہ جانتا ہو، اور بعض صورتوں میں ظلم و فسق ہے، جبکہ عقیدہ کی رو سے تو ان احکام کو حق مانتا ہے، مگر عملاً اس کے خلاف کرتا ہے۔

چوتھا حکم ان آیات میں یہ آیا ہے کہ رشوت لینا مطلقاً حرام ہے، اور خصوصاً عدالتی فیصلہ پر رشوت لینا اور بھی زیادہ اشد ہے۔

پانچواں حکم ان آیات سے یہ واضح ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی شریعتیں اصول میں تو بالکل متفق اور متحد ہیں، مگر جزوی اور فروعی احکام ان میں مختلف ہیں اور یہ اختلاف بڑی حکمتوں پر مبنی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَاۗءَ ۘ

اے ایمان والو مت بناؤ یہود اور نصاریٰ کو دوست

بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ

وہ آپس میں دوست ہیں ایک دوسرے کے اور جو کوئی تم میں سے دوستی کرے ان سے تو وہ انہی میں ہے،

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ

اللہ ہدایت نہیں کرتا ظالم لوگوں کو، اب تو دیکھے گا ان کو

وقف لازم

قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَن تُصِيبَنَا

جن کے دل میں بیماری ہے دوڑ کر ملتے ہیں اُن میں کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ نہ آجائے ہم پر

دَائِرَةٌ ۚ فَعَسَى اللَّهُ أَن يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِّنْ عِندِهِ فَيُصْبِحُوا

گردش زمانہ کی سو قریب ہے کہ اللہ جلدی ظاہر فرمادے فتح یا کوئی حکم اپنے پاس سے تو لگیں اپنے جی

عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا فِي أَنفُسِهِمْ نَادِمِينَ ۝ وَيَقُولُ الَّذِينَ

کی چھپی بات پر پچھتانے اور کہتے ہیں مسلمان

آمَنُوا أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ ۙ

کیا یہ وہی لوگ ہیں جو قسمیں کھاتے تھے اللہ کی تاکید سے

إِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۚ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَأَصْبَحُوا خَاسِرِينَ (۵۳)

کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں برباد گئے ان کے عمل پھر رہ گئے نقصان میں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ

اے ایمان والو جو کوئی تم میں پھرے گا اپنے دین سے تو اللہ عنقریب

يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ

لاوے گا ایسی قوم کو کہ اللہ ان کو چاہتا ہے اور وہ اس کو چاہتے ہیں نرم دل ہیں مسلمانوں پر

أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا

زبردست ہیں کافروں پر لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور ڈرتے

يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ۚ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ

نہیں کسی کے الزام سے یہ فضل ہے اللہ کا دے گا جس کو چاہے،

وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ

اور اللہ کشائش والا ہے خبردار تمہارا رفیق تو وہی اللہ ہے اور اس کا رسول

وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ

اور جو ایمان والے ہیں جو کہ قائم ہیں نماز پر اور دیتے ہیں

الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ۝ وَمَن يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ

زکوٰۃ اور عاجزی کرنے والے ہیں اور جو کوئی دوست رکھے اللہ کو اور اس کے رسول کو

وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ ﴿٥٦﴾ يَا أَيُّهَا

اور ایمان والوں کو تو اللہ کی جماعت وہی سب پر غالب ہیں ۔ اے

الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا

ایمان والو مت بناؤ ان لوگوں کو جو ٹھہراتے ہیں تمہارے دین کو ہنسی اور

وَلَعِبًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ

کھیل وہ لوگ جو کتاب دیئے گئے تم سے پہلے اور نہ کافروں کو اپنا دوست،

وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٥٧﴾ وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ

اور ڈرو اللہ سے اگر ہو تم ایمان والے اور جب تم پکارتے ہو نماز کے لئے

اتَّخَذُوهَا هُزُوًا وَلَعِبًا ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٥٨﴾

تو وہ ٹھہراتے ہیں اس کو ہنسی اور کھیل یہ اس واسطے کہ وہ لوگ بے عقل ہیں

خلاصۂ تفسیر

آیات مذکورہ میں تین اہم اصولی مضامین کا بیان ہے، جو مسلمانوں کی اجتماعی و ملی وحدت و شیرازہ بندی کے بنیادی اصول ہیں:

اوّل یہ کہ مسلمان غیر مسلموں سے رواداری، ہمدردی، خیر خواہی، عدل و انصاف، اور احسان و سلوک سب کچھ کر سکتے ہیں، اور ایسا کرنا چاہئے کہ ان کو اس کی تعلیم دی گئی ہے، لیکن ان سے ایسی گہری دوستی اور خلط ملط جس سے اسلام کے امتیازی نشانات گڈمڈ ہو جائیں اس کی اجازت نہیں، یہی وہ مسئلہ ہے جو ترکِ موالات کے نام سے معروف ہے؛

دوسرا مضمون یہ ہے کہ اگر کسی وقت کسی جگہ مسلمان اس بنیادی اصول سے ہٹ کر غیر مسلموں سے ایسا خلط ملط کرلیں تو یہ نہ سمجھیں کہ اس سے اسلام کو کوئی گزند اور نقصان پہنچے گا، کیونکہ اسلام کی حفاظت اور بقاء کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لی ہے، اس کو کوئی نہیں مٹا سکتا، اگر کوئی قوم ہٹ جائے اور حدود شرعیہ کو توڑ کر فرض کرلو کہ اسلام ہی کو چھوڑ بیٹھے تو اللہ تعالیٰ کسی دوسری قوم کو کھڑا کر دیں گے جو اسلام کے اصول و قانون کو قائم کرے گی،

تیسرا مضمون یہ ہے کہ جب ایک طرف منفی پہلو معلوم ہوگیا تو مسلمان کی گہری دوستی

تو وہ ان اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور ان پر ایمان لانے والوں ہی کے ساتھ ہو سکتی ہے،
یہ اجمال ہے ان مضامین کا جو مذکورہ بالا پانچ آیتوں میں بیان ہوئے ہیں، اب ان آیتوں کی مختصر

تفسیر دیکھئے:

اے ایمان والو تم (منافقین کی طرح) یہود و نصاریٰ کو (اپنا) دوست مت بناؤ وہ
(خود ہی) ایک دوسرے کے دوست ہیں، (یعنی یہودی یہودی باہم، اور نصرانی نصرانی باہم،
مطلب یہ کہ دوستی ہوتی ہے مناسبت سے، سو ان میں باہم تو مناسبت ہے، مگر تم میں اور
ان میں کیا مناسبت، اور جب بعد مذکورہ سے معلوم ہو کہ دوستی ہوتی ہے تناسب سے تو)
جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے گا بیشک وہ (کسی خاص مناسبت کے اعتبار سے)
ان ہی میں سے ہوگا، اور گو یہ ظاہر ہے لیکن یقیناً اللہ تعالیٰ (اس امر کی) سمجھ ہی نہیں
دیتے ان لوگوں کو جو (کفار سے دوستی کرکے) اپنا نقصان کر رہے ہیں (یعنی دوستی میں منہمک
ہونے کی وجہ سے یہ بات اُن کی سمجھ ہی میں نہیں آتی اور چونکہ ایسے لوگ اس امر کو نہیں سمجھتے)
اسی لئے (اے دیکھنے والے) تم ایسے لوگوں کو کہ جن کے دل میں (نفاق کا) مرض ہے دیکھتے
ہو کہ دوڑ دوڑ کر ان (کفار) میں گھستے ہیں (اور کوئی ملامت کرے تو حیلہ بازی اور سخن سازی
کے لئے یوں) کہتے ہیں کہ (ہمارا ان کے ساتھ دل سے نہیں بلکہ دل سے تو تمہارے ساتھ
ہیں صرف ایک مصلحت سے ان کے ساتھ ملتے ہیں وہ یہ کہ) ہم کو اندیشہ ہے کہ (شاید
انقلاب زمانہ سے) ہم پر کوئی حادثہ پڑ جائے (جیسے قحط یا تنگی ہے اور یہ یہودی ہمارے
ساہوکار ہیں ان سے قرض ادھار مل جاتا ہے، اگر ظاہری میل جول قطع کر دیں گے تو وقت
پر ہم کو تکلیف ہوگی، ظاہر نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ کا یہ مطلب لیتے تھے، لیکن
دل میں اور مطلب لیتے کہ شاید آخر میں مسلمانوں پر کفار کے غالب آجانے سے ہم کو انکی
احتیاج پڑے اس لئے ان سے دوستی رکھنا چاہئے) سو قریب امید (یعنی وعدہ) ہے کہ
اللہ تعالیٰ (مسلمانوں کی کامل) فتح (ان کفار کے مقابلہ میں جن سے یہ دوستی کر رہے ہیں)
فرما دے (جس میں مسلمانوں کی کوشش کا بھی دخل ہوگا) یا کسی اور بات کا خاص اپنی
طرف سے ظہور فرما دے، (یعنی ان کے نفاق کا علی التعیین بذریعہ وحی کے اظہار
فرما دیں جس میں مسلمانوں کی تدبیر کا اصلاً دخل نہیں، مطلب یہ کہ مسلمانوں کی فتح اور
ان کی پردہ دری دونوں امر قریب ہونے والے ہیں) پھر (اس وقت) اپنے (سابق)
پوشیدہ دلی خیالات پر نادم ہوں گے (کہ ہم کیا سمجھتے تھے کہ کفار غالب آویں گے اور یہ
کیا برعکس ہو گیا، ایک ندامت تو اپنے خیال کی غلطی پر کہ امر طبعی ہے، اور دوسری ندامت اپنے

نفاق پر جس کی بدولت آج یہ رسوا ہو رہے، مَا آمَنُوْا میں یہ دونوں داخل ہیں، اور یہ تیسری مذمت کہ
کفار کے ساتھ دوستی کرنے پر انگلی کی گئی، وہ مسلمانوں سے بھی بُرے بنے چونکہ دوستی مَا آمَنُوْا
پر بنی تھی، لہذا ان دو مذمتوں کے ذکر سے یہ تیسری بلا ذکر صریح خود مفہوم ہوگئی اور (جب اس
زمانۂ فتح میں ان لوگوں کا نفاق بھی کھل جائے گا تو آپس میں مسلمان لوگ (تعجب سے) کہیں گے
ارے کیا یہ وہی لوگ ہیں کہ بڑے مبالغہ سے (ہمارے سامنے) قسمیں کھایا کرتے تھے کہ ہم (دل
سے) تمہارے ساتھ ہیں (یہ تو کچھ اور ثابت ہوا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) ان لوگوں کی ساری
کارروائیاں (کہ دونوں فریق سے بنا کر رکھنا چاہتے تھے سب) غارت گئیں جس سے دونوں
طرف سے) ناکام رہے (کیونکہ کفار تو مغلوب ہوگئے، ان کا ساتھ دینا محض بیکار ہے اور
مسلمانوں کے سامنے قلعی کھل گئی، ان سے اب بجائے دوستی کے دشمنی ہوگئی "از ایں سو
راندہ ازاں سو ماندہ) اے ایمان والو (یعنی جو لوگ وقت نزول اس آیت کے ایمان والے ہیں،
جو شخص تم میں سے پھرے اپنے اس دین سے (پھر جائے تو اسلام کا کوئی نقصان نہیں
کیونکہ اسلام کی خدمت انجام دینے کے لئے) اللہ تعالیٰ بہت جلد (ان کی جگہ) ایسی قوم
کو پیدا کر دے گا جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہوگی اور ان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی مہربان
ہوں گے وہ مسلمانوں پر تیز ہوں گے کافروں پر (کہ ان سے) جہاد کرتے ہوں گے اللہ کی
راہ میں اور (دین اور جہاد کے معاملہ میں) وہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت
کا اندیشہ نہ کریں گے (جیسے منافقین کا حال ہے کہ دکھلاوے جہاد کے لئے جاتے تھے
مگر اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کفار جن سے دل میں دوستی ہے ملامت کریں گے، یا اتفاق سے
جن کے مقابلہ میں جہاد ہے وہی اپنے دوست اور عزیز ہوں تو سب دیکھنے سننے والے طعن
کریں گے کہ ایسوں کو مارنے گئے تھے) یہ (صفت مذکورہ) اللہ تعالیٰ کا فضل ہے،
جس کو چاہیں عطا فرما دیں اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں (کہ اگر چاہیں تو سب
کو یہ صفات دے سکتے ہیں لیکن) بڑے علم والے (بھی) ہیں (ان کے علم میں جس کو دینا
مصلحت ہوتا ہے اس کو دیتے ہیں) تمہارے دوست تو (جن سے تم کو دوستی رکھنا چاہئے)
اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ایماندار لوگ ہیں جو کہ اس حالت
سے نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں کہ ان کے دلوں میں خشوع ہوتا ہے،
(یعنی عقائد، اخلاق، اعمال بدنی و مالی سب کے جامع ہیں، اور جو شخص (موافق مضمون
مذکور) اللہ سے دوستی رکھے گا اور اس کے رسول سے اور ایماندار لوگوں سے سو (وہ اللہ
کے گروہ میں داخل ہوگیا اور) اللہ کا گروہ بیشک غالب ہے (اور کفار مغلوب ہیں، غالب

مغلوب کی سازگاری اور دوستی کی فکر کرنا محض نازیبا ہے، اے ایمان والو! جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب (آسمانی یعنی توریت و انجیل) مل چکی ہے (مراد یہود و نصاریٰ) جو ایسے ہیں کہ انھوں نے تمھارے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے (جو علامت ہے تکذیب کی) ان کو اور (اسی طرح دوسرے کفار کو (بھی جیسے مشرکین وغیرہ) دوست مت بناؤ (کیونکہ اصل علت کفر و تکذیب تو مشترک ہے) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو (یعنی ایمان دار تو ہو ہی پس جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے اس کو مت کرو) اور (جیسے اصول دین کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں، اسی طرح فروع کے ساتھ بھی چنانچہ) جب تم نماز کے لئے (اذان کے ذریعہ سے) اعلان کرتے ہو تو وہ لوگ (تمھاری) اس (عبادت) کے ساتھ (جس میں اذن اور نماز دونوں آگئیں) ہنسی اور کھیل کرتے ہیں (اور) یہ (حرکت) اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ بالکل عقل نہیں رکھتے (ورنہ امر حق کو سمجھتے اور اس کے ساتھ ہنسی نہ کرتے)۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ سے موالات (یعنی گہری دوستی) نہ کریں جیسا کہ عام غیر مسلموں کا اور یہود و نصاریٰ کا خود یہی دستور ہے کہ وہ گہری دوستی کو صرف اپنی قوم کے لئے مخصوص رکھتے ہیں، مسلمانوں سے یہ معاملہ نہیں کرتے پھر اگر کسی مسلمان نے اس کی خلاف ورزی کرکے کسی یہودی یا نصرانی سے گہری دوستی کرلی تو وہ اسلام کی نظر میں بجائے مسلمان کے اسی قوم کا فرد شمار ہونے کے قابل ہے۔

شانِ نزول

امام تفسیر ابن جریر نے بروایت عکرمہؓ بیان فرمایا ہے کہ یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے، وہ یہ کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں تشریف فرما ہونے کے بعد ان اطراف کے یہود و نصاریٰ سے ایک معاہدہ اس پر کرلیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف نہ خود جنگ کریں گے، نہ کسی جنگ کرنے والی قوم کی امداد کریں گے، بلکہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر اس کا مقابلہ کریں گے، اسی طرح مسلمان ان لوگوں سے جنگ کریں گے نہ اُن کے خلاف کسی قوم کی امداد کریں گے بلکہ مخالف کا مقابلہ کریں گے، کچھ عرصہ تک یہ معاہدہ جانبین سے قائم رہا، لیکن یہودی اپنی سازشی فطرت اور اسلام دشمن طبیعت کی وجہ سے اس معاہدہ پر زیادہ قائم نہ رہ سکے اور مسلمانوں کے خلاف مشرکینِ مکہ سے سازش کرکے ان کو اپنے قلعہ میں بلانے کے لئے خط لکھ دیا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب اس سازش کا انکشاف ہوا تو آپؐ نے

ان کے مقابلہ کے لئے ایک دستہ مجاہدین کا بھیج دیں۔ بنو قریظہ کے یہودی ایک طرف تو مشرکین مکہ سے یہ سازش کرتے تھے اور دوسری طرف مسلمانوں میں گھسے ہوئے بہت سے مسلمانوں سے دوستی کے معاہدے کئے ہوئے تھے، اور اس طرح مسلمانوں کے خلاف مشرکین کے لئے جاسوسی کا کام انجام دیتے تھے، اس لئے یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی جس نے مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی گہری دوستی سے روک دیا، تاکہ مسلمانوں کی خاص خبریں معلوم نہ کر سکیں، اُس وقت بعض صحابہ کرام حضرت عبادہ بن صامت وغیرہ نے تو کھلے طور پر ان لوگوں سے اپنا معاہدہ ختم اور ترکِ موالات کا اعلان کر دیا، اور بعض لوگ جو منافقانہ طور پر مسلمانوں سے ملے ہوئے تھے یا ابھی ایمان اُن کے دلوں میں رچا نہیں تھا ان لوگوں سے قطع تعلق کر دینے میں یہ خطرات محسوس کرتے تھے کہ ممکن ہے کہ مشرکین و یہود کی سازش کامیاب ہو جائے اور مسلمان مغلوب ہو جائیں تو ہمیں اُن لوگوں سے بھی ایسا معاملہ رکھنا چاہئے کہ اُس وقت ہمارے لئے مصیبت نہ ہو جائے، عبداللہ بن اُبی بن سلول نے اسی بناء پر کہا کہ ان لوگوں سے قطع تعلق میں تو ہمیں خطرہ ہے، اس لئے ایسا نہیں کر سکتا اس پر دوسری آیت نازل ہوئی:

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ، یعنی ترکِ موالات کا حکم شرعی سُن کر وہ لوگ جن کے دلوں میں نفاق کا مرض ہے اپنے کافر دوستوں کی طرف دوڑنے لگے اور کہنے لگے کہ ان سے قطع تعلق کرنے میں تو ہمارے لئے خطرات ہیں۔

اللہ جل شانہ نے ان کے جواب میں فرمایا: فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ، یعنی یہ لوگ تو اس خیال میں ہیں کہ مشرکین اور یہود مسلمانوں پر غالب آجائیں گے، مگر اللہ تعالیٰ فیصلہ فرما چکے ہیں کہ ایسا نہیں ہوگا، بلکہ قریب ہے کہ مکہ فتح ہو جائے، یا فتح مکہ سے پہلے اللہ تعالیٰ ان منافقین کے نفاق کا پردہ چاک کر کے ان کو رسوا کر دے، تو اس وقت یہ لوگ اپنے مخفی خیالات پر نادم ہوں گے۔

تیسری آیت میں اس کی مزید تشریح اس طرح بیان فرمائی کہ جب منافقین کے نفاق کا پردہ چاک ہوگا اور ان کی دوستی کے دعووں اور قسموں کی حقیقت کھلے گی تو مسلمان حیرت میں رہ جائیں گے اور کہیں گے کہ کیا یہ وہی ہیں جو ہم سے اللہ تعالیٰ کی مغلظ قسمیں کھا کر دوستی کا دعویٰ کرتے تھے، اور آج ان کا یہ حشر ہوا کہ ان کے سب اسلامی

اعمال جو محض دکھلاوے کے لئے کیا کرتے تھے ضائع ہو گئے۔ اور اللہ جل شانہ نے ان آیات میں جو فتح مکہ اور منافقین کی رسوائی کا ذکر فرمایا ہے وہ چند روز کے بعد سب نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔

چوتھی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ گہری دوستی اور خلط ملط کی جو ممانعت کی گئی ہے یہ خود مسلمانوں ہی کے مفاد کی خاطر ہے، ورنہ اسلام وہ دینِ حق ہے جس کی حفاظت کا ذمہ حق تعالیٰ نے خود لے لیا ہے، کسی فرد یا جماعت کی کجروی یا نافرمانی تو بجائے خود ہے، اگر مسلمانوں کا کوئی فرد یا جماعت سچ مچ اسلام ہی کو چھوڑ بیٹھے اور بالکل ہی مرتد ہو کر غیر مسلموں میں مل جائے اس سے بھی اسلام کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا کیونکہ قادر مطلق جو اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے فوراً کوئی دوسری قوم میدانِ عمل میں لے آئے گا جو اللہ تعالیٰ کے دین کی حفاظت اور اشاعت کے فرائض انجام دے گی، اس کے کام نہ کسی ذات پر موقوف ہیں نہ کسی بڑی سے بڑی جماعت یا ادارہ پر وہ جب چاہتے ہیں تو تنکوں سے شہتیر کا کام لے لیتے ہیں ورنہ شہتیر پڑے کھاد ہوتے رہتے ہیں، کسی نے خوب کہا ہے:

اِنَّ الْمَقَادِیْرَ اِذَا سَاعَدَتْ
اَلْحَقَتِ الْعَاجِزَ بِالْقَادِرِ

"یعنی تقدیر الٰہی جب کسی کی مددگار ہو جاتی ہے تو ایک عاجز و بیکار سے قادر و توانا کا کام لے لیتی ہے"

اس آیت میں جہاں یہ ذکر فرمایا کہ مسلمان اگر مرتد ہو جائیں تو پروا نہیں، اللہ تعالیٰ ایک دوسری جماعت کھڑی کرے گا، وہاں اس پاکباز جماعت کے کچھ اوصاف بھی بیان فرماتے ہیں کہ یہ جماعت ایسے اوصاف کی حامل ہو گی، دین کی خدمت کرنے والوں کو ان اوصاف کا خیال رکھنا چاہئے، کیونکہ آیت سے معلوم ہوا کہ ان اوصاف و عادات کے حامل لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول و محبوب ہیں۔

ان کی پہلی صفت قرآن کریم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سے محبت رکھے گا اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھیں گے، اس صفت کے دو جز ہیں، ایک ان لوگوں کی محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ، یہ تو کسی نہ کسی درجہ میں انسان کے اختیار میں سمجھی جا سکتی ہے کہ ایک انسان کو کسی کے ساتھ اگر طبعی محبت نہ ہو تو کم از کم عقلی محبت اپنے عزم و ارادہ کے تابع رکھ سکتا ہے، اور طبعی محبت بھی اگرچہ اختیار میں نہیں، مگر اس کے بھی اسباب اختیاری ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال اور قدرتِ کاملہ اور انسان پر اس کے احسانات و

نعامات کا مراقبہ اور تصور لازمی طور پر انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت طبعی بھی پیدا کر دیتا ہے۔

لیکن دوسرا جز یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت ان لوگوں کے ساتھ ہوگی، اس میں تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اختیار و عمل کا کوئی دخل نہیں، اور جو چیز ہماری قدرت و اختیار سے باہر ہے اسے سنانے اور بتلانے کا بھی بظاہر کوئی حاصل نہیں نکلتا۔

لیکن قرآن کریم کی دوسری آیت میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ محبت کے اس جز کے اسباب بھی انسان کے اختیار میں ہیں، اگر وہ ان اسباب کا استعمال کرے تو اللہ تعالیٰ کی محبت اُن کے ساتھ لازمی ہوگی اور وہ اسباب آیت قرآن قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ میں مذکور ہیں، یعنی اے رسول آپ لوگوں کو بتلا دیجئے کہ اگر تم کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو میرا اتباع کرو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمانے لگیں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص یہ چاہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت فرمائیں اس کو چاہئے کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی کا محور بنالے، اور زندگی کے ہر شعبے اور ہر کام میں سنت کے اتباع کا التزام کرے، تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اس سے محبت فرمائیں گے، اور اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کفر و ارتداد کا مقابلہ وہی جماعت کرے گی جو متبعِ سنت ہو، نہ احکام شرعیہ کی تعمیل میں کوتاہی کرے، اور نہ اپنی طرف سے خلاف سنت اعمال کو در بدعات کو جاری کرے۔

دوسری صفت اس جماعت کی یہ بتلائی گئی ہے کہ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ، اس میں لفظ اذلہ حسب تصریح قاموس ذلیل یا ذلول دونوں کی جمع ہو سکتی ہے، ذلیل کے معنی عربی زبان میں وہی ہیں جو اردو وغیرہ میں معروف ہیں، اور ذلول کے معنی ہیں نرم اور سہل الانقیاد، یعنی جو آسانی سے قابو میں آجائے، جمہور مفسرین کے نزدیک اس جگہ یہی معنی مراد ہیں، یعنی یہ لوگ مسلمانوں کے سامنے نرم ہوں گے اگر کسی معاملہ میں اختلاف بھی ہوا تو آسانی سے قابو میں آجائیں گے، جھگڑا چھوڑ دیں گے، اگرچہ وہ اپنے جھگڑے میں حق بجانب بھی ہوں، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: انا زعیم ببیت فی ربض الجنۃ لمن ترك المراء وھو محق، "یعنی میں اس شخص کو وسط جنت میں گھر دلوانے کی ذمہ داری لیتا ہوں جو حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے"۔

تو حاصل اس لفظ کا یہ ہوا کہ یہ لوگ مسلمانوں سے اپنے حقوق اور معاملات میں کوئی

جھگڑا نہ رکھیں گے، دوسرا لفظ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِينَ آیا ہے جس میں بھی أَعِزَّةٍ، عزیز کی جمع ہے جس کے معنی غالب، قوی اور سخت کے آتے ہیں، مراد یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ اور اس کے دین کے مخالفوں کے مقابلہ میں سخت اور قوی ہیں، وہ ان پر قابو نہ پا سکیں گے۔

ان دونوں جملوں کو ملانے کا حاصل یہ نکل آیا کہ یہ ایک ایسی قوم ہوگی جس کی محبت و عداوت اور دوستی و دشمنی اپنی ذات اور ذاتی حقوق و معاملات کے بجائے صرف اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین کی خاطر ہوگی، اسی لئے ان کی لڑائی کا رخ اللہ و رسول کے فرمانبرداروں کی طرف نہیں بلکہ اس کے دشمنوں اور نافرمانوں کی طرف ہوگا، یہی مضمون ہے سورۂ فتح کی اس آیت کا، أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ۔

پہلی صفت کا حاصل حقوق اللہ کی تکمیل تھا، اور دوسری صفت کا حاصل حقوق العباد اور معاملات کا اعتدال ہے، تیسری صفت اس جماعت کی یہ بیان فرمائی: يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، یعنی یہ لوگ دین حق کی اشاعت اور برتری کے لئے جہاد کرتے رہیں گے، اس کا حاصل یہ ہے کہ کفر وارتداد کے مقابلہ کے لئے صرف معروف قسم کی عبادتگذاری اور نرم و سخت ہونا کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اقامت دین کا جذبہ بھی ہو، اور اس جذبہ کی تکمیل کے لئے چوتھی صفت یہ بتلائی گئی: وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ، یعنی اقامت دین اور کلمۂ حق کے سربلند کرنے کی کوشش میں یہ لوگ کسی ملامت کی پروا نہ کریں گے۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کسی تحریک کو چلانے والے کی راہ میں دو قسم کی چیزیں حائل ہوا کرتی ہیں، ایک مخالف قوت کا زور، دوسرے اپنوں کے لعن طعن اور ملامت، اور تجربہ شاہد ہے کہ جو لوگ تحریک چلانے کے لئے عزم لے کر کھڑے ہوتے ہیں اور اکثر حالات میں مخالف قوت سے مغلوب نہیں ہوتے، قید و بند اور زخم و قتل سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں، لیکن اپنوں کے طعنوں اور تشنیع و تقبیح سے بڑے بڑے عزم والوں کے قدم میں لغزش آجاتی ہے، شاید اسی لئے حق تعالیٰ نے اس جگہ اس کی اہمیت جتلانے کے لئے اسی پر اکتفا فرمایا کہ یہ لوگ کسی کی ملامت کی پروا کئے بغیر اپنا جہاد جاری رکھتے ہیں۔

آخر آیت میں یہ بھی بتلا دیا کہ یہ صفات و خصائل حسنہ اللہ تعالیٰ ہی کے انعام ہیں، وہی جس کو چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں، انسان محض اپنی سعی و عمل سے بغیر فضل خداوندی کے ان کو حاصل نہیں کر سکتا۔

آیت کے الفاظ کی تشریح سے یہ واضح ہوچکا کہ اگر مسلمانوں میں کچھ لوگ مرتد بھی ہوجائیں تو دین اسلام کو کوئی گزند نہ پہنچے گا بلکہ اس کی حفاظت و حمایت کیلئے

اللہ جل شانہٗ ایک اعلیٰ اخلاق و اعمال کی جماعت کو کھڑا کر دیں گے۔

جمہور مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ آیت درحقیقت آنے والے فتنہ کی پیشگوئی اور اس کا ہمت کے ساتھ مقابلہ کر کے کامیاب ہونے والی جماعت کے لئے بشارت ہے آنے والا وہ فتنہ ارتداد ہے جس کے کچھ جراثیم تو عہد نبوت کے بالکل آخری ایام میں پھیلنے لگے تھے، اور پھر بعد وفات آنحضرت کے عام ہو کر پورے جزیرۃ العرب میں اس کا طوفان کھڑا ہو گیا اور بشارت پانے والی وہ جماعت صحابہ کرامؓ کی ہے جس نے خلیفہ اول صدیق اکبرؓ کے ساتھ مل کر اس **فتنہ ارتداد کا مقابلہ کیا۔**

واقعہ یہ تھا کہ سب سے پہلے تو مسیلمہ کذاب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک نبوت ہونے کا دعویٰ کیا، اور یہاں تک جرأت کی کہ آپ کے قاصدوں کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اگر مصلحت تبلیغ و اصلاح یہ دستور عام نہ ہوتا کہ قاصدوں اور سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تمہیں قتل کر دیتا، مسیلمہ اپنے دعوے میں کذاب تھا، پھر آپ کو اس کے خلاف جہاد کا موقع نہیں ملا، یہاں تک کہ وفات ہو گئی۔

اسی طرح یمن میں قبیلہ مذحج کے سردار اسود عنسی نے اپنی نبوت کا اعلان کر دیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے مقرر کئے ہوئے حاکم یمن کو اس کا مقابلہ کرنے کا حکم دیدیا، مگر جس رات میں اس کو قتل کیا گیا اس کے اگلے دن ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، صحابہ کرام تک اس کی خبر ربیع الاول کے آخر میں پہنچی، اسی طرح کا واقعہ قبیلہ بنو اسد میں پیش آیا کہ ان کا سردار طلیحہ بن خویلد خود اپنی **نبوت کا مدعی بن گیا۔**

یہ تین قبیلوں کی جماعتیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات ہی میں مرتد ہو چکی تھیں، آپ کی وفات کی خبر نے اس فتنہ ارتداد کو ایک طوفانی شکل میں منتقل کر دیا، عرب کے سات قبیلے مختلف مقامات پر اسلام اور اس کی حکومت سے منحرف ہو گئے، اور خلیفہ وقت ابوبکر صدیقؓ کو اسلامی قانون کے مطابق زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا

وفات سرور کائنات کے بعد ملک و ملت کی ذمہ داری خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ پر عائد ہوئی، ایک طرف ان حضرات پر اس حادثۂ عظیم کا صدمہ جانگداز اور دوسری طرف یہ فتنوں اور بغاوتوں کے سیلاب، صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو صدمہ میرے والد حضرت ابوبکر صدیقؓ پر پڑا اگر وہ مضبوط پہاڑوں پر بھی پڑ جاتا تو ریزہ ریزہ ہو جاتے، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو صبر و استقامت

کا وہ علی مقام عطا فرمایا تھا کہ تمام آفات و مصائب کا پوری عزم و ہمت کے ساتھ مقابلہ کیا اور بالآخر کامیاب ہوئے۔

بغاوتوں کا مقابلہ ظاہر ہے کہ طاقت استعمال کر کے ہی کیا جا سکتا تھا، مگر حالات کی نزاکت اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ صدیق اکبرؓ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا تو کسی کی رائے نہیں ہوئی کہ اس وقت بغاوتوں کے مقابلہ میں کوئی سخت قدم اٹھایا جائے، خطرہ یہ تھا کہ حضرات صحابہؓ اگر اندرونی جنگ میں مشغول ہو جاتے ہیں تو بیرونی طاقتیں اس جدید اسلامی ملک پر دوڑ پڑیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے صدیق کے قلب کو اس جہاد کے لئے مضبوط فرما دیا، اور آپؓ نے ایک ایسا بلیغ خطبہ صحابہ کرام کے سامنے دیا کہ اس جہاد کے لئے ان کا بھی شرح صدر ہو گیا، اس خطبہ میں اپنے پورے عزم و استقلال کو ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ:

"جو لوگ مسلمان ہونے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے احکام اور قوانین اسلام کا انکار کریں تو میرا فرض ہے کہ میں ان کے خلاف جہاد کروں، اگر میرے مقابلہ پر تمام جن و انس اور دنیا کے شجر و حجر سب کو جمع کر لائیں، اور کوئی میرا ساتھی نہ ہو، تب بھی میں تنہا اپنی گردن سے اس جہاد کو انجام دوں گا!"

اور یہ فرما کر گھوڑے پر سوار ہو کر نکلنے لگے، اس وقت صحابہ کرام آگے آئے اور صدیق اکبرؓ کو اپنی جگہ بٹھا کر مختلف محاذوں پر مختلف حضرات کی روانگی کا نقشہ بن گیا، اسی لئے حضرت علی مرتضیٰ، حسن بصریؒ، ضحاکؒ، قتادہ وغیرہ ائمہ تفسیر نے بیان فرمایا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں آئی ہے وہی سب سے پہلے اس قوم کا مصداق ثابت ہوئے جن کے من جانب اللہ میدانِ عمل میں لائے جانے کا آیتِ مذکورہ میں ارشاد ہے۔

مگر یہ اس کے منافی نہیں کہ کوئی دوسری جماعت بھی اس آیت کی مصداق ہو، اس لئے جن حضرات نے اس آیت کا مصداق حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ یا دوسرے صحابہ کرام کو قرار دیا ہے، وہ بھی اس کا مخالف نہیں بلکہ صحیح یہی ہے کہ یہ سب حضرات بلکہ قیامت تک آنے والے وہ مسلمان جو قرآنی ہدایات کے مطابق کفر و ارتداد کا مقابلہ کریں گے، سب اسی آیت کے مصداق میں داخل ہوں گے، بہرحال صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت حضرت صدیق اکبرؓ کے زیر ہدایت اس فتنۂ ارتداد کے مقابلہ کے لئے کھڑی ہو گئی، حضرت خالد بن ولیدؓ کو ایک بڑا لشکر دے کر مسیلمہ کذاب کے مقابلہ پر یمامہ کی طرف روانہ کیا،

سابقہ چار آیات میں مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ گہری دوستی رکھنے سے منع فرمایا گیا پانچویں آیت میں مثبت طور پر یہ بتلا دیا کہ مسلمانوں کو گہری دوستی اور رفاقت خاص کا تعلق جن سے ہو سکتا ہے وہ کون ہیں، ان میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ اور پھر اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے کہ درحقیقت مومن کا ولی و رفیق ہر وقت ہر حال میں اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور وہی ہو سکتا ہے، اور اس کے تعلق کے سوا ہر تعلق اور ہر دوستی فانی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے، اس سے الگ نہیں، تیسرے نمبر میں مسلمانوں کے رفیق اور مخلص دوست ان مسلمانوں کو قرار دیا ہے جو صرف نام کے مسلمان نہیں بلکہ سچے مسلمان ہیں، جن کی تین صفات و علامات یہ بتلائی ہیں:

الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُونَ

اوّل یہ کہ وہ نماز کو اس کے پورے آداب و شرائط کے ساتھ پابندی سے ادا کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ اپنے مال میں سے زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، تیسرے یہ کہ وہ لوگ متواضع اور فروتنی کرنے والے ہیں اپنے اعمالِ خیر پر ناز اور تکبر نہیں کرتے۔

اس آیت کا تیسرا جملہ وَهُمْ رٰكِعُونَ میں لفظ رکوع کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں، اسی لئے ائمہ تفسیر میں سے بعض نے فرمایا کہ رکوع سے مراد اس جگہ اصطلاحی رکوع ہی ہے جو نماز کا ایک رکن ہے، اور يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ کے بعد وَهُمْ رٰكِعُونَ کا جملہ اس مقصد سے لایا گیا کہ مسلمانوں کی نماز کو دوسرے فرقوں کی نماز سے ممتاز کر دینا مقصود ہے، کیونکہ نماز تو یہود و نصاریٰ بھی پڑھتے ہیں، مگر اس میں رکوع نہیں ہوتا، رکوع صرف اسلامی نماز کا امتیازی وصف ہے۔ (مظہری)

مگر جمہور مفسرین نے فرمایا کہ لفظ رکوع سے اس جگہ اصطلاحی رکوع مراد نہیں، بلکہ اس کے لغوی معنی مراد ہیں یعنی جھکنا، تواضع اور عاجزی و انکساری کرنا، تفسیر بحر محیط میں ابو حیان نے اور تفسیر کشاف میں زمخشری نے اسی کو اختیار کیا ہے، اور تفسیر مظہری و بیان القرآن وغیرہ میں بھی اسی کو لیا گیا ہے، تو معنی اس جملہ کے یہ ہوگئے کہ ان لوگوں کو اپنے اعمال صالحہ پر ناز نہیں، بلکہ تواضع اور انکساری ان کی خصلت ہے۔

اور بعض روایات میں ہے کہ یہ جملہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے ایک خاص واقعہ کے متعلق نازل ہوا ہے، وہ یہ کہ ایک روز حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز میں مشغول تھے، جب آپ رکوع میں گئے تو کسی سائل نے آکر سوال کیا، آپ نے اسی حالت رکوع میں اپنی ایک انگلی سے انگوٹھی نکال کر اس کی طرف پھینک دی، غریب فقیر کی حاجت روائی

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سب پر غالب آگئے، جو طاقت ان سے ٹکرائی پاش پاش ہوگئی خلیفۂ اول صدیق اکبرؓ کے مقابلہ پر انصار فتنۂ ارتداد وغیرہ کی بڑی جماعتیں تھیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سب پر غالب فرمایا، حضرت فاروق اعظمؓ کے مقابلہ پر دنیا کی سب سے بڑی طاقتیں قیصر و کسریٰ آگئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کا نام و نشان مٹادیا، اور پھر ان کے بعد کے خلفاء اور مسلمانوں میں جب تک اس حکم کی پابندی رہی کہ مسلمانوں نے غیروں کے ساتھ خلط ملط اور گہری دوستی کے تعلقات قائم نہیں کئے وہ ہمیشہ منصور و مظفر رہے۔

چوتھی آیت میں پھر بعنوان دیگر اسی حکم کا اعادہ فرمایا ہے جو شروع رکوع میں بیان ہوا تھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ اے ایمان والو، تم ان لوگوں کو اپنا رفیق یا گہرا دوست نہ بناؤ، جو تمہارے دین کو ہنسی کھیل قرار دیتے ہیں، اور یہ دو گروہ ہیں، ایک اہل کتاب دوسرے عام کفار و مشرکین۔

امام ابو حیان نے بحر محیط میں فرمایا کہ لفظ کفار میں تو اہل کتاب بھی داخل تھے پھر خصوصیت کے ساتھ اہل کتاب کا مستقل ذکر اس جگہ فرمانا اس لئے فرمایا گیا کہ اہل کتاب اگرچہ ظاہر میں بہ نسبت دوسرے کفار کے اسلام کے ساتھ قریب تھے، مگر تجربہ نے یہ بتلایا کہ ان میں سے بہت کم لوگوں نے اسلام کو قبول کیا، یہی وجہ ہے کہ عہد رسالت اور مابعد کے ایمان لانے والے لوگوں کے اعداد و شمار دیکھے جائیں تو ان میں کثرت عام کفار کی نکلے گی، اہل کتاب میں سے مسلمان ہونے والوں کی تعداد بہت کم ہوگی۔

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اہل کتاب کو اس پر ناز ہے کہ ہم دین حق اور کتاب آسمانی کے پابند ہیں، اس غرور نے ان کو حق قبول کرنے سے روکا، اور مسلمانوں کے ساتھ تمسخر و استہزاء کا معاملہ بھی زیادہ تر انھوں نے کیا، اسی شرارت پسندی کا ایک واقعہ وہ ہے جو ساتویں آیت میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا، یعنی جب مسلمان نماز کے لئے اذان دیتے ہیں تو یہ لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں، اس کا واقعہ بحوالہ ابن ابی حاتم تفسیر مظہری میں نقل کیا ہے کہ مدینہ طیبہ میں ایک نصرانی تھا، وہ جب اذان میں اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا لفظ سنتا تو یہ کہا کرتا تھا احرق اللہ الکاذب یعنی جھوٹے کو اللہ تعالیٰ جلا دے۔

آخر کار اس کا یہی کلمہ اس کے پورے خاندان کے جل کر ہلاک ہوجانے کا سبب بن گیا، جس کا واقعہ یہ پیش آیا کہ رات کو جب یہ سو رہا تھا اس کا نوکر کسی ضرورت سے آگ لے کر گھر میں آیا اس کی چنگاری اڑ کر کسی کپڑے پر پڑگئی اور سب کے سوجانے کے بعد وہ

خلاصۂ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب تم ہم میں کیا عیب پاتے ہو بجز اس کے کہ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس کتاب پر جو ہمارے پاس بھیجی گئی ہے (یعنی قرآن) اور اس کتاب پر (بھی) جو (ہم سے) پہلے بھیجی جاچکی ہے (یعنی تمہاری کتاب تورات و انجیل) باوجود اس کے کہ تم میں اکثر لوگ ایمان سے خارج ہیں (کہ نہ قرآن پر ان کا ایمان ہو جس کا خود ان کو بھی اقرار ہے اور نہ تورات و انجیل پر ایمان ہے، کیونکہ ان پر ایمان ہوتا تو ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لانے کی ہدایت موجود ہے اس پر بھی ضرور ایمان ہوتا، قرآن کا انکار اس پر شاہد ہے کہ تورات و انجیل پر بھی ان کا ایمان نہیں ہے، یہ حال تو تم لوگوں کا ہوا اور ہم اس کے برعکس سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں، تو عیب ہم میں نہیں خود تم میں ہے غور کرو) اور آپ ان سے کہہ دیجئے کہ (اگر اس پر بھی تم ہمارے طریقہ کو برا سمجھتے ہو تو آؤ) کیا میں (اچھے برے میں موازنہ کرنے کے لئے، تم کو) ایسا طریقہ بتلاؤں جو (ہمارے) اس (طریقہ) سے بھی (جس کو تم برا سمجھ رہے ہو) خدا کے یہاں سزا ملنے میں زیادہ برا ہو، وہ ان اشخاص کا طریقہ ہے جن کو (اس طریقہ کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہو اور ان پر غضب فرمایا ہو اور ان کو بندر اور سور بنا دیا ہو اور انہوں نے شیطان کی پرستش کی ہو (اب دیکھ لو کہ ان میں کونسا طریقہ برا ہے، آیا وہ طریقہ جس میں غیر اللہ کی عبادت اور اس پر یہ وبال ہوں، یا وہ طریقہ جو سراسر توحید اور نبوت انبیاء کی تصدیق ہو، یقینا موازنہ کا نتیجہ یہی ہے کہ) ایسے اشخاص (جن کا طریقہ ابھی ذکر کیا گیا ہے آخرت میں) مکان کے اعتبار سے بھی (جو ان کو سزا کے طور پر ملے گا) بہت برے ہیں (کیونکہ یہ مکان دوزخ ہے) اور (دنیا میں) راہ راست سے بھی بہت دور ہیں (اشارہ یہ ہے کہ تم لوگ ہم پر ہنستے ہو، حالانکہ استہزاء کے قابل تمہارا طریقہ ہے، کیونکہ یہ سب خصلتیں تم میں پائی جاتی ہیں، کہ یہود نے گوسالہ پرستی کی اور نصاریٰ نے حضرت مسیح کو خدا بنا لیا، پھر اپنے علماء و مشائخ کو خدائی کے اختیارات سپرد کر دیئے، اسی لئے یہودیوں نے جب یوم سبت کے احکام کی خلاف ورزی کی تو اللہ کا عذاب آیا، وہ بندر بنا دیئے گئے اور نصاریٰ کی درخواست پر آسمانی مائدہ نازل ہونے لگا، انہوں نے پھر بھی ناشکری کی تو ان کو بندر اور سور بنا دیا گیا، آگے ان کی ایک خاص جماعت کا ذکر ہے، جو منافق تھے کہ مسلمانوں کے سامنے اسلام کا اظہار کرتے تھے اور اندرونی طور پر یہودی ہی تھے)

اور جب یہ منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے حالانکہ وہ کفر ہی کو لے کر مسلمانوں کی مجلس میں آئے تھے اور کفر ہی کو لے کر چلے گئے اور اللہ تعالیٰ تو خوب جانتے ہیں جس کو یہ اپنے دل میں چھپائے ہوتے ہیں اس لئے ان کا نفاق اللہ تعالیٰ کے سامنے کام نہیں دے گا اور کفر کی بدترین سزا سے سابقہ پڑے گا۔

معارف ومسائل

اَکْثَرَکُمْ فٰسِقُوْنَ میں حق تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے خطاب میں سب کے بجائے اکثر کو فاسق فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ہر حال میں مؤمن ہی رہے، جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نہیں ہوئی تھی وہ احکام تورات وانجیل کے تابع اور ان پر ایمان رکھتے تھے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور قرآن نازل ہوا تو آپ پر بھی ایمان لائے اور احکام قرآن کے تابع ہو گئے۔

تبلیغ و دعوت میں مخاطب کی رعایت

یہاں قُلْ ھَلْ اُنَبِّئُکُمْ میں جو حال ایک مثال کے انداز میں ایسے لوگوں کا بیان کیا ہے جن پر اللہ کی لعنت و غضب ہو، اس کے مصداق درحقیقت خود یہی مخاطب تھے، مقصد اس کا یہ تھا کہ ان پر یہ الزام عائد کیا جاتا کہ تم ایسے ہو، مگر قرآن کریم نے طرز بیان بدل کر اس کو ایک مثال کی صورت دیدی، جس میں پیغمبرانہ دعوت کا ایک خاص اسلوب بتلا دیا گیا کہ عنوان بیان ایسا اختیار کرنا چاہئے جس سے مخاطب کو اشتعال پیدا نہ ہو۔

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَ

اور تو دیکھے گا بہتوں کو ان میں سے کہ دوڑتے ہیں گناہ پر اور ظلم پر اور

اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (٦٢) لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ

حرام کھانے پر بہت برے کام ہیں جو کر رہے ہیں کیوں نہیں منع کرتے

الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ

ان کے درویش اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے

السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (٦٣)

سے بہت ہی برے عمل ہیں جو کر رہے ہیں

خلاصۂ تفسیر

اور آپ ان (یہودیوں) میں بہت آدمی ایسے دیکھتے ہیں جو دوڑ دوڑ کر گناہ (یعنی جھوٹ) اور ظلم اور حرام (مال) کھانے پر گرتے ہیں، واقعی ان کے یہ کام برے ہیں، (یہ تو عوام کا حال تھا آگے خواص کا حال ہے کہ) ان کو مشائخ اور علماء گناہ کی بات کہنے سے (باوجود علم مسئلہ و اطلاع واقعہ کے) کیوں نہیں منع کرتے، واقعی ان کی یہ عادت بری ہے

معارف و مسائل

یہود کی اخلاقی تباہ حالی | آیت مذکورہ میں سے پہلی آیت میں کثیر یہود کی اخلاقی گراوٹ اور عملی بربادی کا ذکر ہے تاکہ سننے والوں کو نصیحت ہو کہ ان افعال اور ان کے اسباب سے بچتے رہیں۔

اگرچہ عام طور پر یہودیوں کا یہی حال تھا، لیکن ان میں کچھ اچھے لوگ بھی تھے، قرآن کریم نے ان کو مستثنیٰ کرنے کے لئے لفظ كَثِيرًا استعمال فرمایا، اور ظلم و تعدی اور حرام خوری دونوں اگرچہ لفظ اِثم یعنی گناہ کے مفہوم میں داخل ہیں، لیکن ان دونوں قسم کے گناہوں کی تباہ کاری اور ان کی وجہ سے پورے امن و اطمینان کی بربادی واضح کرنے کے لئے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر علیحدہ کردیا (بحر محیط)

اور تفسیر روح المعانی وغیرہ میں ہے کہ ان لوگوں کے متعلق دوڑ دوڑ کر گناہوں پر گرنے کا عنوان اختیار کرکے قرآن کریم نے اس کی طرف اشارہ فرمایا، کہ یہ لوگ ان بری خصلتوں کے عادی مجرم ہیں، اور یہ برے اعمال ان کے ملکاتِ راسخہ بن کر ان کی رگ پے میں اس طرح پیوست ہوگئے ہیں کہ بلا ارادہ بھی یہ لوگ اسی طرف چلتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نیک عمل ہو یا بد جب کوئی انسان اس کو بکثرت کرتا ہے، تو رفتہ رفتہ وہ ایک ملکہ راسخہ اور عادت بن جاتی ہے، پھر اس کے کرنے میں اس کو کوئی مشقت اور تکلف باقی نہیں رہتا، بری خصلتوں میں یہود اسی حد پر پہنچے ہوئے تھے، اس کو ظاہر کرنے کے لئے ارشاد فرمایا: يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ، اور اسی طرح اچھی خصلتوں میں انبیاء و اولیاء کا حال ہے، ان کے بارے میں بھی قرآن کریم نے يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ کے الفاظ استعمال فرمائے۔

اصلاح اعمال کا طریقہ | اصلاح اعمال کا سب سے زیادہ اہتمام کرنے والے حضرات صوفیائے کرام

علماء کی یہ سخت بری عادت ہے کہ باوجود فرض منصبی امر بالمعروف ونہی عن المنکر چھوڑ بیٹھے، قوم کو ہلاکت کی طرف جاتا ہوا دیکھتے ہیں اور ان کو نہیں روکتے۔

علماء تفسیر نے فرمایا کہ پہلی آیت جس میں عوام کی غلط کاریوں کا ذکر تھا، اس کے آخر میں تو لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ارشاد فرمایا گیا، اور دوسری آیت جس میں مشائخ وعلماء کی غلطی پر تنبیہ کی گئی ہے اس کے آخر میں لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ کا لفظ ارشاد فرمایا گیا، وجہ یہ ہے کہ عربی لغت کے اعتبار سے لفظ فعل تو ہر کام کو شامل ہے، خواہ با قصد ہو یا بلا قصد، اور لفظ عمل صرف اس کام کے لئے بولا جاتا ہے جو قصد و ارادہ سے کیا جائے، اور لفظ صنع اور صنعت کا ایسے کام کے لئے اطلاق کیا جاتا ہے جس میں قصد و اختیار بھی ہو اور اس کو بار بار بطور عادت اور بقصد کے درست کر کے کیا جائے، اس لئے عوام کی بدعملی کے نتیجہ میں تو صرف لفظ عمل اختیار فرمایا، لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ، اور خواص مشائخ و علماء کی غلط کاری کے نتیجہ میں لفظ صنع اختیار فرمایا لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ، اس میں اس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہو کہ ان کے علماء و مشائخ کی یہ غلط روش کہ یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ اگر ہم ان کو منع کریں گے تو یہ ہمارا کہنا سنیں گے اور باز آجائیں گے، پھر بھی ان لوگوں کے نذرانوں کے لالچ یا بد اعتقاد ہو جانے کے خوف سے ان کے دلوں میں حمیت حق کا کوئی داعیہ پیدا نہیں ہوتا، **یہ اُن بدکاروں کے اعمالِ بد سے بھی زیادہ اشد ہے۔**

جس کا حاصل یہ ہوا کہ جس قوم کے لوگ جرائم اور گناہوں میں مبتلا ہوں گے اور ان کے مشائخ و علماء کو یہ بھی اندازہ ہو کہ ہم ان کو روکیں گے تو یہ باز آجائیں گے، ایسے حالات میں اگر یہ کسی لالچ یا خوف کی وجہ سے ان جرائم اور گناہوں کو نہیں روکتے تو ان کا جرم اصل مجرموں اور بدکاروں کے جرم سے بھی زیادہ اشد ہے، اس لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ مشائخ و علماء کے لئے پورے قرآن میں اس آیت سے زیادہ سخت تنبیہ کہیں نہیں، اور امام تفسیر ضحاک نے فرمایا کہ میرے نزدیک مشائخ علماء کے لئے یہ آیت سب **سے زیادہ خوفناک ہے** (ابن جریر و ابن کثیر)

وجہ یہ ہے کہ اس آیت کی رو سے ان کا جرم تمام چوروں، ڈاکوؤں اور ہر طرح کے بدکاروں کے جرم سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے (العیاذ باللہ) مگر یاد رہے کہ یہ شدت اور وعید اسی صورت میں ہے جبکہ مشائخ و علماء کو اندازہ بھی ہو کہ ان کی بات سنی اور مانی جائیگی اور جس جگہ قرائن یا تجربہ سے یہ گمان غالب ہو کہ کوئی سنے گا نہیں، بلکہ اس کے مقابلہ میں ان کو ایذائیں دی جائیں گی تو وہاں حکم یہ ہے کہ ان کی ذمہ داری تو ساقط ہو جاتی ہے،

گئے ہوں یا ابرار ہیں۔ مالک بن دینارؒ فرماتے ہیں کہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو حکم دیا کہ فلاں بستی کو تباہ کر دو، فرشتوں نے عرض کیا کہ اس بستی میں تو آپ کا فلاں عبادت گذار بندہ بھی ہے، حکم ہوا کہ اس کو بھی عذاب چکھاؤ، کیونکہ ہماری نافرمانیوں اور گناہوں کو دیکھ کر اس کو کبھی غصہ نہیں آیا، اور اس کا چہرہ غصہ سے کبھی متغیر نہیں ہوا۔

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ آپ کی قوم کے ایک لاکھ آدمی عذاب سے ہلاک کئے جائیں گے جن میں چالیس ہزار نیک لوگ ہیں اور ساٹھ ہزار بدعمل، حضرت یوشع علیہ السلام نے عرض کیا کہ رب العالمین بدکرداروں کی ... ہلاکت کی وجہ تو ظاہر ہے، لیکن نیک لوگوں کو کیوں ہلاک کیا جا رہا ہے؟ تو ارشاد ہوا کہ یہ نیک لوگ بھی ان بدکرداروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، ان کے ساتھ کھانے پینے، اور ہنسی دل لگی کے شریک رہتے تھے، میری نافرمانیوں اور گناہ دیکھ کر کبھی ان کے چہرہ پر کوئی ناگواری کا اثر تک نہ آیا (یہ سب روایات بحر محیط سے منقول ہیں)

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ ۚ غُلَّتْ اَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا

اور یہود کہتے ہیں اللہ کا ہاتھ بند ہو گیا انہی کے ہاتھ بند ہو جاویں اور لعنت ہے ان کو

بِمَا قَالُوا ۘ بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ وَلَيَزِيدَنَّ

اس کہنے پر، بلکہ اس کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں خرچ کرتا ہے جس طرح چاہے اور ان میں بہتوں کو

وقف لازم

كَثِيرًا مِنْهُمْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ وَ

بڑھے گی اس کلام سے جو تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے شرارت اور انکار اور

اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ كُلَّمَا

ہم نے ڈال رکھی ہے ان میں دشمنی اور بیر قیامت کے دن تک جب کبھی

اَوْقَدُوا نَارًا لِلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ

آگ سلگاتے ہیں لڑائی کے لئے اللہ اس کو بجھا دیتا ہے اور دوڑتے ہیں ملک میں

فَسَادًا ۚ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿۶۴﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ

فساد کرتے ہوئے اور اللہ پسند نہیں کرتا فساد کرنے والوں کو اور اگر اہل کتاب ایمان

اٰمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ

لاتے اور ڈرتے تو ہم دور کر دیتے ان سے ان کی برائیاں اور ان کو داخل کرتے

اور نیچے سے یعنی زمین سے پیداوار ہوتی، خوب فراغت سے کھاتے رہتے، یہ ایمان کی برکات دنیویہ کا ذکر ہوا، لیکن کفر پر مصر رہے، اس سے تنگی میں پڑ گئے، جس پر بعض نے حق تعالیٰ کی طرف نعوذ باللہ بخل کی نسبت کر کے گستاخی کی، مگر پھر بھی سب یہود و نصاریٰ برابر نہیں، چنانچہ) ان میں ایک جماعت راہ راست پر چلنے والی بھی ہے (جیسے یہود میں حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی، اور نصاریٰ میں حضرت نجاشی اور ان کے ساتھی، لیکن ایسے قلیل ہیں اور (باقی) زیادہ ان میں ایسے ہیں کہ ان کے کردار بہت برے ہیں، (کیونکہ کفر خود سب سے بدترین کردار ہوگا) اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ لوگوں کو سب پہنچا دیجئے اور اگر (بالفرض محال) آپ ایسا نہ کریں گے تو (یہ سمجھا جائے گا جیسے) آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام بھی نہیں پہنچایا (کیونکہ یہ مجموعہ فرض ہے، تو جیسے کل کے اخفاء سے یہ فرض فوت ہوتا ہے اسی طرح بعض کے اخفاء سے بھی وہ فرض فوت ہوتا ہے، اور تبلیغ کے باب میں کفار کا کچھ خوف نہ کیجئے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے (یعنی اس سے کہ آپ کے مقابل ہو کر قتل و ہلاک کر ڈالیں) محفوظ رکھے گا اور یقیناً اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو (اس طرح قتل و ہلاک کر ڈالنے کے واسطے آپ تک) راہ نہ دیں گے۔

معارف ومسائل

پہلی آیت میں یہود کی ایک گستاخی کا جواب | قولہ تعالیٰ وَقَالَتِ الْيَهُودُ، اس آیت میں یہود کا ایک سنگین جرم اور ایک بدترین کلمہ ذکر کیا گیا ہے، وہ کم بخت یہ کہنے لگے کہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ تنگ دست ہو گیا۔

واقعہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے یہودیوں کو مال و دولت میں صاحب وسعت بنایا تھا، مگر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور آپ کی دعوت ان کو پہنچی تو ان لوگوں نے اپنی قومی چودھراہٹ اور اپنی جاہل قوم سے حاصل ہونے والے نذرانوں کی خاطر اس دعوت حق سے روگردانی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی تو اس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے ان پر دنیا بھی تنگ کر دی، یہ تنگ دست ہو گئے، اس پر ان نالائقوں کی زبان سے ایسے کلمات نکلنے لگے کہ معاذ اللہ خدا کے خزانہ میں کمی آگئی، یا اللہ نے بخل اختیار کر لیا، اس کے جواب میں اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ ہاتھ تو انہی کے بندھیں گے، اور ان پر لعنت ہوگی جس کا اثر آخرت میں عذاب اور دنیا میں

دو رکوع میں یہود و نصاریٰ کی کجروی و بے راہی اور ضد و ہٹ دھرمی اور مخالفت اسلام سازشوں کا ذکر چلا آرہا تھا۔

تبلیغ کی تاکید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی

اس کا ایک اثر طبعی طور پر بمقتضائے بشریت یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مایوس ہو کر یا مجبور ہو کر تبلیغ رسالت میں کچھ کمی ہو جائے، اور دوسرا اثر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آپ مخالفت اور دشمنی اور ایذا رسانی کی پرواہ کئے بغیر تبلیغ رسالت میں لگے رہیں، اور اس کے نتیجہ میں آپ کو دشمنوں کے ہاتھ سے تکالیف و مصائب کا سامنا ہو، اس لئے تیسری آیت میں ایک طرف تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکیدی حکم دیدیا گیا کہ جو کچھ آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا جائے وہ سب کا سب بغیر کسی جھجک کے آپ لوگوں کو پہنچا دیں، کوئی برا مانے یا بھلا، اور مخالفت کرے یا قبول کرے، اور دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خوشخبری دے کر مطمئن بھی کر دیا گیا کہ تبلیغ رسالت کے سلسلہ میں یہ کفار آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، اللہ تعالیٰ خود آپ کی حفاظت فرمائیں گے۔

اس آیت میں ایک جملہ تو یہ قابل غور ہے کہ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ، مراد اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی ایک حکم خداوندی بھی آپ نے امت کو نہ پہنچایا تو آپ اپنے فرض پیغمبری سے سبکدوش نہیں ہوں گے، یہی وجہ تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمر اس فریضہ کی ادائیگی میں اپنی پوری ہمت و قوت صرف فرمائی، اور حجۃ الوداع کا مشہور خطبہ جو ایک حیثیت سے اسلام کا آئین اور دستور تھا، اور دوسری حیثیت سے ایک رؤف و رحیم اور ماں باپ سے زیادہ شفیق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت تھی۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نصیحت

اس خطبہ میں آپ نے صحابہ کرام کے ایک عظیم مجمع کے سامنے اہم ہدایات فرمانے کے بعد مجمع سے سوال فرمایا:

اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ، دیکھو کیا میں نے آپ کو دین پہنچا دیا؟ صحابہ کرامؓ نے اقرار فرمایا کہ ضرور پہنچا دیا، اس پر ارشاد فرمایا کہ آپ اس پر گواہ رہو، اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ، یعنی جو لوگ اس مجمع میں حاضر ہیں وہ غائبوں تک میری بات پہنچا دیں، غائبین میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو اس وقت دنیا میں موجود تھے، مگر مجمع میں حاضر نہ تھے، اور وہ لوگ بھی داخل ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئے، ان کو پیغام پہونچانے کا طریقہ علم دین کی نشر و اشاعت تھی جس کو حضرات صحابہؓ و تابعینؒ نے پوری کوشش سے انجام دیا۔

اسی کا یہ اثر تھا کہ مختصر مدت میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول کریم

كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۖ

بڑھے گی اس کلام سے جو تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے شرارت اور کفر

فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٦٨﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ

سو تو افسوس نہ کر اس قوم کافر پر ۔ بے شک جو مسلمان ہیں اور جو

هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ

یہودی ہیں اور فرقہ صابی اور نصاریٰ جو کوئی ایمان لاوے اللہ پر اور روز

الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٩﴾

قیامت پر اور عمل کرے نیک نہ ان پر ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۔

ربطِ آیات اوپر اہل کتاب کو اسلام کی ترغیب تھی آگے ان کے موجودہ طریقہ کا جس کے حق ہونے کے وہ مدعی تھے عند اللہ ناکارہ اور نجات میں ناکافی ہونا اور نجات کا اسلام پر موقوف ہونا مذکور ہے، اور اس کے بعد بھی ان کے اصرار علی الکفر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی کا مضمون ارشاد فرمایا، اور درمیان میں ایک خاص مناسبت اور ضرورت سے تبلیغ کا مضمون آگیا تھا۔

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان یہود و نصاریٰ سے) کہئے کہ اے اہل کتاب تم کسی راہ پر بھی نہیں (کیونکہ غیر مقبول راہ پر ہونا مثل بے راہی کے ہے) جب تک کہ توریت کی اور انجیل کی اور جو کتاب (اب) تمہارے پاس (بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) تمہارے رب کی طرف سے بھیجی گئی ہے (یعنی قرآن) اس کی بھی پوری پابندی نہ کرو گے (جس کے معنی اور ترغیب اور برکات اوپر مذکور ہوتے ہیں، اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ان میں اکثر لوگ تعصب مذموم میں مبتلا ہیں اس لئے یہ) ضرور ہے کہ جو مضمون آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے بھیجا جاتا ہے وہ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور کفر کی ترقی کا سبب ہو جاتا ہے، (اور اس میں ممکن ہے کہ آپ کو رنج و غم ہو، لیکن جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ متعصب ہیں) تو آپ ان کافر لوگوں (کی اس حالت) پر غم نہ کیا کیجئے، یہ تحقیقی بات ہے کہ (مسلمان) اور یہودی اور فرقہ صابئین اور نصاریٰ (ان سب میں) جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ (کی ذات و صفات) پر

در قیامت پر اور کار گزاری اچھی کرے (یعنی موافق قانون شریعت کے) ایسوں پر (آخرت میں) نہ کسی طرح کا اندیشہ ہے اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

معارف و مسائل

اہل کتاب کو شریعت محمدیہ کے اتباع کی ہدایت پچھلی آیت میں اہل کتاب یہود و نصاریٰ کو شریعت محمدیہ کے اتباع کی ہدایت اس عنوان سے فرمائی گئی تھی کہ اگر تم نے احکام شرعیہ کی پابندی نہ کی تو تم کچھ نہیں، مطلب یہ ہے کہ شریعت اسلام کی پابندی کے بغیر تمہارے سارے کمالات اور احوال سب بیکار ہیں، تم کو اللہ تعالیٰ نے ایک کمال نسبی یہ عطا فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی اولاد ہو، دوسرے تورات و انجیل کے علمی کمالات بھی تمہیں حاصل ہیں، تم میں سے بہت سے آدمی درویش منش بھی ہیں، مجاہدات و ریاضیات کرتے ہیں، مگر ان سب چیزوں کی قیمت اور وزن اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اس پر موقوف ہے کہ تم شریعت محمدیہ کا اتباع کرو، اس کے بغیر نہ کوئی نسبی فضیلت کام آوے گی نہ علمی تحقیقات تمہاری نجات کا سامان بنیں گی نہ مجاہدات و ریاضیات۔

اس ارشاد میں مسلمانوں کو بھی یہ ہدایت مل گئی کہ کوئی درویشی و سلوک و طریقت مجاہدات و ریاضت اور کشف و الہام اس وقت تک اللہ کے نزدیک فضیلت اور نجات کی چیز نہیں جب تک کہ شریعت کی پوری پابندی نہ ہو۔

اس آیت میں شریعت محمدیہ کی پیروی کے لئے تین چیزوں کے اتباع کی ہدایت کی گئی ہے، اول تورات، دوسرے انجیل جو یہود و نصاریٰ کے لئے پہلے نازل ہو چکی تھیں، تیسری وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ، یعنی جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس بھیجا گیا۔

جمہور مفسرین صحابہ و تابعین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد قرآن کریم ہے، جو تمام امت دعوت کے لئے بشمول یہود و نصاریٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے بھیجا گیا، اس لئے معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ جب تک تم تورات، انجیل، قرآن کے لائے ہوئے احکام پر صحیح صحیح اور پورا پورا عمل نہ کرو گے تمہارا کوئی نسبی یا علمی کمال اللہ کے نزدیک مقبول و معتبر نہیں ہو گا۔

یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ اس آیت میں تورات و انجیل کی طرح قرآن کا مختصر نام ذکر کر دینے کے بجائے ایک طویل جملہ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ استعمال فرمایا گیا ہے، اس میں کیا حکمت ہے؟ ہو سکتا ہے کہ اس میں اُن احادیث کے مضمون کی طرف اشارہ ہو جن میں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس طرح مجھے علم و حکمت کا خزانہ قرآن کریم دیا گیا، اسی طرح دوسرے علوم و معارف بھی عطا کئے گئے ہیں جن کو ایک حیثیت سے قرآن کریم کی تشریح بھی کہا جا سکتا ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

الا انی اوتیت القرآن ومثلہ معہ الا یوشک رجل شبعان علی اریکتہ یقول علیکم بھذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ وما وجدتم فیہ من حرام فحرموہ وان ما حرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کما حرم اللہ (ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی بغیرہ)	"یاد رکھو کہ مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ اسی کے مثل اور بھی علوم دیئے گئے، آئندہ زمانہ میں ایسا ہونے والا ہے کہ کوئی شکم سیر راحت پسند یہ کہنے لگے کہ تم صرف قرآن کافی ہے، جو اس میں حلال ہے صرف اس کو حلال سمجھو اور جو اس میں حرام ہے صرف اس کو حرام سمجھو، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو اللہ کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہو وہ بھی ایسی ہی حرام ہے جیسی اللہ تعالیٰ کے کلام کے ذریعہ حرام کی ہوئی اشیاء حرام ہیں"

احکام کی تین اقسام اور خود قرآن بھی اسی مضمون کا شاہد ہے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتا ہے، اور جن حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات اپنے اجتہاد اور قیاس کے ذریعہ فرماتے ہیں اور بذریعہ وحی پھر اس کے خلاف آپ کو کوئی ہدایت نہیں ملتی تو انجام کار وہ قیاس اور اجتہاد بھی بحکم وحی ہو جاتا ہے۔

جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام امت کو دیئے ان میں ایک تو وہ ہیں جو قرآن کریم میں صراحۃً مذکور ہیں، دوسرے وہ ہیں جو صراحۃً قرآن میں مذکور نہیں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جداگانہ وحی کے ذریعہ نازل ہوئے، تیسرے وہ جو آپ نے اپنے اجتہاد و قیاس سے کوئی حکم دیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف کوئی حکم نازل نہیں فرمایا، وہ بھی بحکم وحی ہو گیا، یہ تینوں قسم کے احکام واجب الاتباع ہیں اور وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ میں داخل ہیں۔

شاید آیت مذکورہ میں قرآن کا مختصر نام چھوڑ کر یہ طویل جملہ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ اسی طرف اشارہ کرنے کے لئے لایا گیا ہو کہ ان تمام احکام کا اتباع لازم و واجب ہے جو صراحۃً قرآن میں مذکور ہوں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ احکام دیئے ہوں۔

دوسری بات اس آیت میں قابل غور یہ ہے کہ اس میں یہود و نصاریٰ کو تورات، انجیل، قرآن تینوں کے احکام پر عمل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، حالانکہ ان میں سے بعض بعض کے لئے ناسخ ہیں، انجیل نے تورات کے بعض احکام کو منسوخ ٹھہرایا اور قرآن نے تورات و انجیل کے بہت سے احکام کو منسوخ قرار دیا، تو پھر تینوں کے مجموعہ پر عمل کیسے ہو؟

جواب واضح ہے کہ ہر آنے والی کتاب نے پچھلی کتاب کے جن احکام کو بدل دیا، تو بدلے ہوئے طریقہ پر عمل کرنا ان دونوں کتابوں پر عمل کرنا ہے، منسوخ شدہ احکام پر **عمل کرنا دونوں کتابوں کے مقتضاء کے خلاف ہے۔**

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی: آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے ارشاد فرمایا کہ اہل کتاب کے ساتھ اتنی رعایت و عنایت کے باوجود ان میں بہت سے لوگ ایسے ہوں گے کہ اس عنایت ربانی سے کوئی فائدہ نہ اٹھائیں گے، بلکہ ان کا عناد اور بڑھ جائے گا، آپ اس سے غمگین نہ ہوں، اور ایسے لوگوں پر ترس نہ کھائیں۔

[illegible] ایمان اور عمل صالح: دوسری آیت میں حق تعالیٰ شانہٗ نے چار قوموں کو مخاطب کرکے ایمان و عمل صالح کی ترغیب اور اس پر فلاح آخرت کا وعدہ فرمایا، ان میں سے پہلے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یعنی مسلمان ہیں، دوسرے اَلَّذِیْنَ ھَادُوْا یعنی یہود، تیسرے صٰبِـُٔوْنَ اور چوتھے نصاریٰ، ان میں تین قومیں مسلمان، یہود، نصاریٰ تو معروف و مشہور اور دنیا کے بیشتر خطوں میں موجود ہیں، صابئون یا صابئہ کے نام سے آجکل کوئی قوم معروف نہیں، اسی لئے اس کی تعیین میں علماء و ائمہ کے اقوال مختلف ہیں، امام تفسیر ابن کثیرؒ نے بحوالہ قتادہ ایک یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ صابئون وہ لوگ ہیں جو فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں اور قبلہ کے خلاف نماز پڑھتے ہیں اور آسمانی کتاب زبور کی تلاوت کرتے ہیں (جو حضرت **داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی)۔**

قرآن کریم کے اس سیاق سے ابن جریر کی تائید ہوتی ہے کہ چار آسمانی کتابیں جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے، تورات، زبور، انجیل، اور قرآن، اس میں ان چار کتابوں کے **ماننے والوں کا ذکر آگیا۔**

اسی مضمون کی ایک آیت تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ سورۂ بقرہ کے ساتویں رکوع میں گذر چکی ہے، اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۞ اس میں بتقاضائے مقام بعض الفاظ کی تقدیم

تاخیر کے سوا کوئی فرق نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک نجات کا مدار عمل صالح پر ہے

خلاصۂ مضمون ان دونوں آیتوں کا یہ ہے کہ ہمارے دربار میں کسی کی نسبی، وطنی اور قومی خصوصیت کچھ نہیں، جو شخص پوری طاعت اعتقاد اور عمل صالح اختیار کرے گا، خواہ وہ پہلے سے کیسا ہی ہو، ہمارے یہاں مقبول اور اس کی خدمت مشکور ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ بعد نزول قرآن کے پوری اطاعت مسلمان ہونے میں منحصر ہے، کیونکہ کتب سابقہ تورات وانجیل میں بھی اس کی ہدایات موجود ہیں، اور قرآن کریم تو سراسر اسی کے لئے نازل ہوا، اسی لئے نزول قرآن اور بعثت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر نہ تورات وانجیل کا اتباع صحیح ہو سکتا ہے نہ زبور کا، تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ ان تمام اقوام میں سے جو مسلمان ہو جائے گا آخرت میں نجات و ثواب کا مستحق ہوگا، اس میں اس خیال کا جواب ہو گیا کہ یہ کفر و معصیت اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شرارتیں جو اب تک کرتے رہے ہیں مسلمان ہو جانے کے بعد ان کا کیا انجام ہوگا، معلوم ہوا کہ پچھلے سب گناہ اور خطائیں معاف کر دی جائیں گی، اور آخرت میں نہ اُن لوگوں کو اندیشہ رہیگا نہ کوئی غم و رنج پیش آئے گا۔

مضمون پر نظر کرنے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کا ذکر نہ ہونا چاہئے کیونکہ وہ تو ایمان واطاعت کے اُس مقام پر ہیں جو اس آیت میں مطلوب ہے، یہاں ذکر صرف اُن لوگوں کا کرنا چاہئے جن کو اس مقام کی طرف بلانا ہے، مگر اس طرز خاص میں کہ مسلمانوں کا ذکر بھی ان کے ساتھ ملا دیا گیا ایک خاص بلاغت پیدا ہوگئی، اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ کسی ایسے موقع پر یوں کہے کہ ہمارا قانون عام ہے، خواہ کوئی موافق ہو یا مخالف جو شخص اطاعت کرے گا وہ موردِ عنایت و انعام ہوگا، اب ظاہر ہے کہ موافق تو اطاعت کر ہی رہا ہے، سُنانا تو اصل میں اس کو ہے جو مخالفت کر رہا ہے، لیکن اس جگہ موافق کو بھی ذکر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ ہم کو جو موافقین کے ساتھ عنایت ہے وہ کسی نسبی یا قومی خصوصیت کی بنا پر نہیں بلکہ ان کی صفتِ اطاعت پر تمام عنایت و انعام کا مدار ہے، اگر مخالف بھی اطاعت اختیار کرے گا وہ بھی اسی لطف و عنایت کا مستحق ہوگا۔

مذکرہ چار قوموں کو خطاب کر کے جس امر کی ہدایت دی گئی اس کے تین جز ہیں،

ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، اور عمل صالح۔

ایمان بالرسالۃ کے بغیر نجات نہیں

ظاہر ہے کہ اس آیت میں تمام ایمانیات اور عقائد اسلام کی تفصیلات بیان کرنا منظور نہیں، نہ اس کا کوئی موقع ہے، اسلام کے چند بنیادی عقائد

ذکر کرکے تمام رسولوں کی تعلیمات کی طرف اشارہ کردیا، اور ان کی طرف دعوت دینا مقصود ہے، اور یہ
کوئی نادر بات ہے کہ جس آیت میں صرف ایمان کا ذکر ہے اس کی ساری تفصیلات وہیں ذکر کی جائیں
اس لئے اس جگہ ایمان بالرسول یا ایمان بالنبوۃ کا ذکر صراحۃً نہ ہونے سے کسی ادنیٰ فہم و عقل
اور انصاف و دانش رکھنے والے کو کسی شبہ کی گنجائش نہ تھی خصوصاً جبکہ پورا قرآن اور اس کی
سینکڑوں آیتیں ایمان بالرسالت کی تصریحات سے لبریز ہیں جن میں یہ تصریحات موجود ہیں کہ رسول
اور ارشادات رسول پر مکمل ایمان لائے بغیر نجات نہیں، اور کوئی ایمان و عمل بغیر اس کے مقبول
و معتبر نہیں، لیکن ملحدین کا ایک گروہ جو کسی نہ کسی طرح قرآن میں اپنے مزعومہ نظریات کو
ٹھونسنا چاہتا ہے، انہوں نے اس آیت میں صراحۃً ذکر رسالت نہ ہونے سے ایک نیا
نظریہ قائم کرلیا، جو قرآن و سنت کی بے شمار تصریحات کے قطعاً خلاف ہے، وہ یہ کہ ہر شخص اپنے
اپنے مذہب یہودی نصرانی یہاں تک کہ ہندو بت پرست رہتے ہوئے بھی اگر صرف اللہ
پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو اور نیک کام کرے تو نجات آخرت کا مستحق ہو سکتا ہے،
نجات اخروی کے لئے اسلام میں داخل ہونا ضروری نہیں (نعوذ باللہ منہ)

جن لوگوں کو حق تعالیٰ نے تلاوتِ قرآن کی توفیق اور اس پر صحیح ایمان عطا فرمایا ہے،
ان کے لئے قرآنی تصریحات نے اس مغالطہ کو دور کردیا، کسی بڑے علم و فن کا محتاج
نہیں، قرآن کریم کا اردو ترجمہ جاننے والے حضرات بھی اس تخیل کی غلطی کو بآسانی سمجھ سکتے
ہیں، چند آیات بطور مثال کے یہ ہیں:

قرآن کریم نے جس جگہ ایمان مفصل کا بیان فرمایا اس کے الفاظ سورۂ بقرہ کے
آخر میں یہ ہیں:

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۤئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ

"سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اس طرح کہ اس کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے"

اس آیت میں واضح طور پر ایمان کی جو تفصیلات بیان فرمائی ہیں ان میں یہ بھی واضح
کردیا کہ کسی ایک یا چند رسولوں پر ایمان لے آنا قطعاً نجات کے لئے کافی نہیں، بلکہ تمام
رسولوں پر ایمان شرط ہے، اگر کسی ایک رسول پر بھی ایمان نہ لایا تو اس کا ایمان اللہ کے
نزدیک معتبر اور مقبول نہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کردیں (کہ اللہ پر تو ایمان لائیں مگر رسولوں پر ایمان نہ ہو) اور وہ کہتے ہیں کہ ہم مانتے ہیں بعضوں کو اور نہیں مانتے بعضوں کو اور وہ چاہتے ہیں کہ کفر و اسلام کے بیچ بیچ کا ایک راستہ نکال لیں تو سمجھ لو کہ وہ ہی اصل میں کافر ہیں"

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا لَمَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِيْ.

"یعنی اگر بالفرض آج حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو بھی میرے (اتباع کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا)" ([illegible])

تو اب کسی کا یہ کہنا کہ ہر مذہب والے اپنے اپنے مذہب پر عمل کریں تو بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور بغیر مسلمان ہوئے وہ جنت اور فلاحِ آخرت پا سکتے ہیں قرآن کریم کی مذکورہ آیات کی کھلی مخالفت ہے۔

اس کے علاوہ اگر ہر مذہب و ملت ایسی چیز ہو کہ اس پر ہر زمانہ میں عمل کر لینا نجات اور فلاح کے لئے کافی ہے، تو پھر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزولِ قرآن ہی بے معنی ہو جاتا ہے، اور ایک شریعت کے بعد دوسری شریعت بھیجنا فضول ہو جاتا ہے، سب سے پہلا رسول ایک شریعت یک کتاب لے آتا، وہ کافی تھی، دوسرے رسولوں، کتب اور شریعتوں کے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی، زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں کا وجود کافی ہوتا جو اس شریعت و کتاب کو باقی رکھنے اور اس پر عمل کرنے اور کرانے کا اہتمام کرتے جو عام طور پر ہر امت کے علماء کا فریضہ رہا ہے، اور اس صورت میں قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ۚ یعنی ہم نے تم میں سے ہر امت کے لئے ایک خاص شریعت اور خاص راستہ بنایا ہے، یہ سب بے معنی ہو جاتا ہے۔

اور پھر اس کا کیا جواز رہ جاتا ہے، کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوپر اور اپنی کتاب قرآن پر ایمان نہ رکھنے والے تمام یہود و نصاریٰ اور دوسری قوموں سے نہ صرف تبلیغی جہاد کیا، بلکہ قتل و قتال اور سیف و سنان کی جنگیں بھی لڑیں اور اگر انسان کے مومن اور مقبول عند اللہ ہونے کے لئے صرف اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان لے آنا کافی ہو تو پھر وہ ابلیس کس جرم میں مردود ہو گیا اس کو اللہ پر ایمان نہ تھا، یا وہ روزِ آخرت اور قیامت

خلاصۂ تفسیر

ہم نے بنی اسرائیل سے (اوّل توریت میں تمام پیغمبروں کی تصدیق و اطاعت کا) عہد لیا اور (اس عہد کے یاد دلانے کو) ہم نے ان کے پاس بہت پیغمبر بھیجے (لیکن اُن کی یہ حالت تھی کہ) جب کبھی ان کے پاس کوئی پیغمبر ایسا حکم لایا جس کو ان کا جی نہ چاہتا تھا (تب ہی ان کے ساتھ مخالفت سے پیش آئے،) سو بعضوں کو (تو) جھوٹا بتلایا اور بعضوں کو (بے دھڑک) قتل ہی کر ڈالتے تھے اور (ہمیشہ ہر شرارت پر جب چندے روز سزا سے مہلت دی گئی) یہی گمان کیا کہ کچھ سزا نہ ہوگی اس (گمان) سے وہ (بھی) اندھے اور بہرے (کی طرح) بن گئے (کہ نہ دلائل صدقِ انبیاء کو دیکھا نہ اُن کے کلام کو سنا) پھر ایک مدت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرمائی (کہ اور کسی پیغمبر کو بھیجا تاکہ اب بھی راہ پر آویں مگر) پھر بھی (اسی طرح) اندھے اور بہرے بنے رہے یعنی (سب تو نہیں مگر) اُن میں کے بہتیرے، اور اللہ تعالیٰ ان کے (ان) اعمال کو خوب دیکھنے والے ہیں (یعنی ان کا گمان غلط تھا، چنانچہ ان کو وقتاً فوقتاً سزا بھی ہوتی رہی، مگر ان کا یہی شیوہ رہا، حتیٰ کہ اب آپؐ کے ساتھ اسی طرح تکذیب و خلاف کا برتاؤ کیا)

معارف و مسائل

بنی اسرائیل کی عہد شکنی | كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ، یعنی جب بنی اسرائیل کے پاس ان کا رسول کوئی حکم لاتا جو اُن کے مذاق کے مطابق نہ ہوتا تو عہد و پیمان توڑ کر خدا سے غداری کرتے پھرتے، اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں میں سے کسی کو جھٹلایا، کسی کو قتل کیا، یہ تو ان کے "ایمان باللہ اور عمل صالح" کا حال تھا، "ایمان بالیوم الآخر" کا اندازہ اس سے کرلو کہ اس قدر شدید مظالم اور باغیانہ جرائم کا ارتکاب کرکے بالکل بے فکر ہو بیٹھے، گویا ان حرکات کا کوئی خمیازہ بھگتنا نہیں پڑے گا، اور ظلم و بغاوت کے خراب نتائج کبھی سامنے نہ آئیں گے، یہ خیال کرکے خدائی نشانات اور خدائی کلام کی طرف سے بالکل ہی اندھے اور بہرے ہوگئے، اور جو ناکردنی کام تھے وہ کئے، حتیٰ کہ بعض انبیاء کو قتل اور بعض کو قید کیا، آخر خدا تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط کیا، پھر ایک مدت دراز کے بعد بعض ملوکِ فارس نے بخت نصر کی قیدِ ذلت و رسوائی سے چھڑا کر بابل سے بیت المقدس کو واپس کیا، اس وقت لوگوں نے توبہ کی، اور اصلاحِ حال کی طرف متوجہ ہوئے، خدا نے

توبہ قبول کی لیکن کچھ زمانہ کے بعد پھر وہی شرارتیں سوجھیں اور بالکل اندھے بہرے ہو کر حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کے قتل کی جرأت کی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل پر تیار ہو گئے۔ (فوائد عثمانی)

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ط
بے شک کافر ہوئے جنہوں نے کہا اللہ وہی مسیح ہے مریم کا بیٹا،

وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ط
اور مسیح نے کہا ہے کہ اے بنی اسرائیل بندگی کرو اللہ کی جو رب ہے میرا اور تمہارا

إِنَّهُ مَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ
بے شک جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا سو حرام کی اللہ نے اس پر جنت اور

مَأْوَاهُ النَّارُ ط وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ ﴿۷۲﴾ لَقَدْ كَفَرَ
اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور کوئی نہیں گنہگاروں کی مدد کرنے والا، بیشک کافر ہوئے

الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ م وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ
جنہوں نے کہا اللہ ہے تین میں کا ایک حالانکہ کوئی معبود نہیں بجز ایک

وقف لازم

وَاحِدٌ ط وَإِن لَّمْ يَنتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ
معبود کے اور اگر نہ باز آویں گے اس بات سے کہ کہتے ہیں تو بیشک پہنچے گا ان میں سے کفر پر

كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۷۳﴾ أَفَلَا يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَ
قائم رہنے والوں کو عذاب دردناک، کیوں نہیں توبہ کرتے اللہ کے آگے اور

يَسْتَغْفِرُونَهُ ط وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۷۴﴾ مَّا الْمَسِيحُ ابْنُ
گناہ بخشواتے اس سے اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان نہیں ہے مسیح مریم کا

مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ ج قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط وَأُمُّهُ
بیٹا مگر رسول گزر چکے اس سے پہلے بہت رسول اور اس کی ماں

صِدِّيقَةٌ ط كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ط انظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ
ولی ہے دونوں کھاتے تھے کھانا، دیکھ ہم کیسے بتلاتے ہیں ان کو

الْآيَاتِ ثُمَّ انظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿۷۵﴾ قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِن
دلیلیں پھر دیکھ وہ کہاں الٹے جارہے ہیں، تو کہہ دے کیا تم ایسی چیز کی بندگی کرتے ہو

دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۭ وَاللّٰهُ هُوَ

اللہ کو چھوڑ کر جو مالک نہیں تمہارے برے کی اور نہ بھلے کی اور اللہ وہی ہے

السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

سننے والا جاننے والا

خلاصۂ تفسیر

بیشک وہ لوگ کافر ہو چکے جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ عین مسیح ابن مریم ہے (یعنی دونوں میں اتحاد ہے) حالانکہ حضرت مسیح نے خود فرمایا ہے کہ اے بنی اسرائیل تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے (اور اس قول میں تصریح ہے رب اور بندہ ہونے کی جو منافی ہے، پھر ان کا یہ کہنا کیسی بات ہے کہ عین مسیح کو خدا کہتے ہیں) بیشک جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ (خدائی میں یا خدائی کی خصوصیات میں) شریک قرار دے گا سو اس پر اللہ تعالیٰ جنت کو حرام کر دے گا اور اس کا ٹھکانا (ہمیشہ کے لئے) دوزخ ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا (کہ دوزخ سے بچا کر جنت میں پہنچا دے) جیسے عقیدۂ اتحاد کفر ہے اسی طرح عقیدۂ تثلیث بھی کفر ہے، چنانچہ بلاشبہ وہ لوگ بھی کافر ہو چکے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تین معبودوں میں کا ایک ہے، حالانکہ بجز ایک معبود (برحق) کے اور کوئی معبود (برحق) نہیں نہ دو نہ تین (جب یہ عقیدہ بھی کفر ٹھہرا تو [illegible] میں جو مذکور ہے وہ ان پر بھی مرتب ہوگی) اور اگر یہ دونوں عقیدے کے لوگ اپنے اقوال (کفریہ) سے باز نہ آئے تو (یاد رکھیں) کہ جو لوگ ان میں کافر رہیں گے ان پر (آخرت میں) دردناک عذاب واقع ہوگا (جب ان مضامین توحید و وعید کو سن لیا) کیا پھر بھی (اپنے ان عقائد و اقوال سے) خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ نہیں کرتے اور اس سے معافی نہیں چاہتے، حالانکہ اللہ تعالیٰ (جب کوئی توبہ کرتا ہے تو) بڑی مغفرت کرنے والے (اور) بڑی رحمت فرمانے ہیں، حضرت مسیح ابن مریم [illegible] کچھ بھی نہیں صرف ایک پیغمبر ہیں جن سے پہلے اور بھی پیغمبر (صاحب معجزات) گذر چکے ہیں (جن کو عیسائی خدا نہیں مانتے، پس اگر پیغمبری یا خرق عادت دلیل الوہیت ہے تو سب کو خدا ماننا چاہئے اور اگر دلیل الوہیت نہیں ہے تو حضرت مسیح کو کیوں خدا کہا جاتا ہے غرض جب اوروں کو خدا نہیں کہتے تو عیسیٰ علیہ السلام کو بھی مت کہو) اور (اسی طرح) ان کی والدہ (بھی خدا یا جزو خدا) نہیں بلکہ وہ ایک ولی بی بی

ہیں، جیسی اور بیبیاں ہیں ویسی ہی یہ ہیں اور دونوں حضرات کے الٰہ نہ ہونے کے دلائل میں سے ایک بہت بڑی دلیل یہ ہے کہ یہ دونوں (حضرات) کھانا کھایا کرتے تھے، اور جو شخص کھانا کھاتا ہو وہ اس کا محتاج ہوتا ہے اور کھانا کھانا خواص مادیت سے ہے، اور احتیاج اور مادیت خاصہ ممکن الوجود کا ہے، جس کا وجود ضروری ہو، اور ممکن یعنی جس کا وجود ہی ضروری نہ ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا (دیکھئے تو سہی) ہم کیونکر صاف صاف دلائل ان سے بیان کر رہے ہیں، پھر دیکھئے وہ الٹے کدھر جا رہے ہیں، آپ ان سے فرمایئے کیا خدا کے سوا ایسی مخلوق کی عبادت کرتے ہو جو نہ تم کو کوئی ضرر پہنچانے کا اختیار رکھتی ہو اور نہ نفع پہنچانے کا (اختیار رکھتی ہو) اور عاجز ہونا خود خدائی کے منافی ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ سب سنتے ہیں جانتے ہیں (پھر بھی خدا سے نہیں ڈرتے اور اپنے کفر و شرک سے باز نہیں آتے)۔

معارف و مسائل

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ، یعنی حضرت مسیح، روح القدس اور اللہ یا مسیح، مریم اور اللہ تینوں خدا ہیں (نعوذ باللہ) ان میں کا ایک حصہ دار اللہ ہے، پھر وہ تینوں ایک اور وہ ایک تین ہیں، عیسائیوں کا عام عقیدہ یہ ہے، اور اس خلافِ عقل و بداہت عقیدہ کو گول مول اور پیچیدار عبارتوں سے ادا کرتے ہیں، اور جب کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تو اس کو ماوراء العقل حقیقت قرار دیتے ہیں (فوائد عثمانی)

مسیح علیہ السلام کی الوہیت کی تردید

قولہ تعالیٰ: قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، یعنی جس طرح اور انبیاء دنیا میں آئے اور کچھ دن رہ کر چل بسے، ان کو دوام اور بقاء حاصل نہ تھا جو الوہیت کی شان ہے، اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام (بھی انہی کی طرح ایک انسان ہیں) کو دوام اور بقاء حاصل نہیں، لہٰذا وہ الٰہ نہیں ہو سکتے۔

ذرا غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جو شخص کھانے پینے کا محتاج ہے وہ تقریباً دنیا کی ہر چیز کا محتاج ہے، زمین، ہوا، پانی، سورج، اور حیوانات سے اسے استغناء نہیں ہو سکتا، غلہ کے پیٹ میں پہنچنے اور ہضم ہونے تک خیال کرو، بالواسطہ یا بلا واسطہ کتنی چیزوں کی ضرورت ہے، پھر کھانے سے جو اثرات و نتائج پیدا ہوں گے ان کا سلسلہ کہاں تک جاتا ہے، احتیاج و افتقار کے اس طویل و ذیل سلسلہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم الوہیتِ مسیح و مریم کے ابطال کو بشکل استدلال یوں بیان کر سکتے ہیں کہ مسیح و مریم اکل و شرب کی ضروریات سے مستغنی نہ تھے، جو مشاہدہ اور تواتر سے ثابت ہے، اور جو اکل و شرب سے مستغنی نہ ہو وہ دنیا کی کسی

مدینہ اور مشرکین مکہ میں مسلمانوں کی عداوت کے علاقہ سے جن کا منشاء اتحاد فی الکفر تھا باہم خوب سازگاری تھی جو کام (خفیہ طور پر) اپنے آگے (بھیجتے) کے لئے کیا ہے یعنی کفر جو سبب تھا دوستی کفار اور عداوت مؤمنین کا) وہ بے شک بُرا ہے کہ (اس کے سبب) اللہ تعالیٰ ان پر (ہمیشہ کے لئے) ناخوش ہوا اور (اس ناخوشی کا ثمرہ یہ ہوگا کہ) یہ لوگ عذاب میں ہمیشہ رہیں گے، اور اگر یہ (یہودی) لوگ اللہ پر ایمان رکھتے اور پیغمبر (یعنی موسیٰ علیہ السلام) پر (ایمان رکھتے جس کا ان کو دعویٰ ہے) اور اس کتاب پر (ایمان رکھتے) جو ان (پیغمبر) کے پاس بھیجی گئی تھی (یعنی توریت) تو ان (مشرکین) کو دوست نہ بناتے، لیکن ان میں زیادہ لوگ (دائرۂ) ایمان سے خارج ہیں (اس لئے کافروں کے ساتھ ان کا اتحاد اور دوستی ہوگئی)

معارف و مسائل

بنی اسرائیل کی گمراہی کا ایک دوسرا سبب

ربط آیات: قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ، پچھلی آیات میں بنی اسرائیل کی سرکشی اور ان کے ظلم و ستم کو بیان کیا گیا تھا کہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول جو ان کے لئے ہدایت جو دونوں کا ذریعہ اور ان کی دنیا و آخرت سنوارنے کا دستور العمل لے کر آئے تھے ان کی قدر و منزلت پہچانتے اور تعظیم و تکریم کرنے کے بجائے انہوں نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَقْتُلُوْنَ، یعنی بعض انبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا اور بعض کو قتل ہی کر ڈالا۔

مذکورہ آیات سے بنی اسرائیل کی گمراہی کا دوسرا رخ بتلایا گیا ہے کہ یہ جاہل یا تو سرکشی اور نافرمانی کے اس کنارے پر تھے کہ اللہ کے رسولوں کو جھوٹا کہا، اور بعض کو قتل کر ڈالا، اور یا پھر ان ہی یہودی کے اس انتہا پر پہنچ گئے کہ رسولوں کی تعظیم میں غلو کرکے ان کو خدا ہی بنا دیا۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ، یعنی وہ لوگ یقیناً کافر ہوگئے جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ تو عیسیٰ ابن مریم ہی کا نام ہے۔

یہاں تو یہ قول صرف نصاریٰ کا مذکور ہے، دوسری جگہ یہی غلو اور گمراہی یہود کی بھی بیان فرمائی گئی ہے: وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ، یعنی یہود نے تو یہ کہہ دیا کہ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، اور نصاریٰ نے یہ کہہ دیا کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔

غلو کے معنی حد سے نکل جانے کے ہیں، دین میں غلو کا مطلب یہ ہے کہ اعتقاد و عمل میں دین نے جو حدود مقرر کی ہیں ان سے آگے بڑھ جائیں مثلاً انبیاء کی تعظیم کی حد یہ ہے کہ ان کو خلق خدا میں

أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ

ان کی آنکھوں کو کہ ابلتی ہیں آنسوؤں سے اس وجہ سے کہ انھوں نے پہچان لیا حق بات کو

يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿٨٣﴾ وَمَا لَنَا لَا

کہتے ہیں اے رب ہمارے ہم ایمان لائے سو تو لکھ ہم کو ماننے والوں کے ساتھ اور ہم کو کیا ہوا

نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَنْ يُدْخِلَنَا

کہ یقین نہ لاویں اللہ پر اور اس چیز پر جو پہنچی ہم کو حق سے اور توقع رکھیں اس کی کہ داخل کرے ہم کو

رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ ﴿٨٤﴾ فَأَثَابَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا

رب ہمارا ساتھ نیک بختوں کے پھر ان کو بدلے میں دیئے اللہ نے اس کہنے پر ایسے

جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ

باغ کہ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں رہا کریں ان میں ہی اور یہ ہے

جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ﴿٨٥﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا

بدلہ نیکی کرنے والوں کا اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلانے لگے ہماری آیتوں

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿٨٦﴾

کو وہ ہیں دوزخ کے رہنے والے

ع ۱۱ / ۹

رابطِ آیات

اوپر یہود کا مشرکین سے دوستی رکھنا مذکور تھا، آگے ان کا مع مشرکین کے مسلمانوں سے عداوت رکھنا مذکور ہے، جو اس دوستی کا اصلی سبب تھا، اور چونکہ ہر معاملہ میں قرآن مجید عدل و انصاف کا سب سے بڑا داعی ہے، اس لئے یہود و نصاریٰ میں بھی سب کو ایک درجہ میں شمار نہیں کیا، جس میں کوئی خوبی تھی اس کا بھی اظہار کیا گیا، مثلاً نصاریٰ کی ایک خاص جماعت میں بہ نسبت ان یہود کے تعصب کا کم ہونا، اور ان نصاریٰ میں جنھوں نے حق قبول کرلیا تھا ان کا مستحق حسن ثناء و حسن جزاء ہونا مذکور ہے، اور یہ خاص جماعت حبشہ کے نصاریٰ کی ہے، جنھوں نے مسلمانوں کو جبکہ ہجرت مدینہ کے قبل وہ اپنا وطن مکہ چھوڑ کر حبشہ چلے گئے تھے، کچھ تکلیف نہیں دی، اور جو اور نصرانی ایسا ہی ہو وہ بھی حکماً انہی میں داخل ہے، اور ان میں سے جنھوں نے حق قبول کرلیا تھا وہ حبش کا بادشاہ اور ان کے مصاحب ہیں کہ حبشہ میں بھی قرآن سن کر رو دئے اور مسلمان ہوگئے، پھر تیس آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قرآن سن کر روئے اور اسلام قبول کیا، یہی اس آیت کا شانِ نزول ہے۔

خلاصۂ تفسیر

(یعنی مؤمنین میں) تمام آدمیوں سے زیادہ مسلمانوں سے عداوت رکھنے والے آپ ان یہود اور ان مشرکین کو پاویں گے اور ان (غیر مؤمن آدمیوں) میں مسلمانوں کے ساتھ دوستی رکھنے کے قریب تر (بہ نسبت اوروں کے) ان لوگوں کو پاویں گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں (قریب تر کا یہ مطلب ہے کہ دوست تو وہ بھی نہیں، مگر دوسرے کفار مذکورین سے غنیمت ہیں، یہ دوستی سے قریب تر ہونا اور عداوت میں کم ہونا) اس سبب سے ہے کہ ان (نصاریٰ) میں بہت سے علم دوست عالم ہیں اور بہت سے تارک دنیا درویش ہیں (اور جب کسی قوم میں ایسے لوگ بکثرت ہوتے ہیں تو عوام میں بھی حق کے ساتھ زیادہ عناد نہیں ہوتا، اگرچہ خواص و عوام حق کو قبول بھی نہ کریں) اور اس سبب سے ہے کہ یہ (نصاریٰ) لوگ متکبر نہیں ہیں (قسیسین و رہبان سے جلدی متاثر ہو جاتے ہیں اور نیز تواضع کا خاصہ ہے اور حق کے سامنے نرم ہو جانا اس سے ان کو عداوت زیادہ نہیں، پس قسیسین و رہبان یعنی علم و مشیخت کا وجود اشارہ ہے علت فاعلہ کی طرف اور عدم استکبار قابلیت کی طرف، بخلاف یہود و مشرکین کے کہ محب دنیا اور متکبر ہیں، اور گو یہود میں بھی بعض علماء حقانی تھے جو مسلمان ہو گئے تھے، لیکن بوجہ ان کی قلت کے عوام میں اثر نہیں پہنچا تھا اس لئے ان میں خود رائی ہے جو سبب ہو جاتا ہے شدت عداوت کا، اسی لئے یہود تو مؤمن ہی کم ہوئے اور مشرکین میں سے جب عناد نکل گیا تب مؤمن ہونا شروع ہوئے) اور (بعضے ان میں ... جو کہ آخر میں مسلمان ہو گئے تھے ایسے ہیں کہ) جب وہ اس (کلام) کو سنتے ہیں جو کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف بھیجا گیا ہے (یعنی قرآن) تو آپ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہتی ہوئی دیکھتے ہیں، اس سبب سے کہ انہوں نے (دین) حق (یعنی اسلام) کو پہچان لیا (مطلب یہ کہ حق کو سن کر متاثر ہوتے ہیں اور) یوں کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم مسلمان ہو گئے تو ہم کو بھی ان لوگوں کے ساتھ لکھ لیجئے (یعنی ان میں شمار کر لیجئے) جو (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے حق ہونے کی) تصدیق کرتے ہیں ... اور ہمارے پاس کونسا عذر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر (حسب تعلیم شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور جو (دین) حق ہم کو (اب) پہنچا ہے اس پر ایمان نہ لاویں اور (پھر) اس بات کی امید (بھی) رکھیں کہ ہمارا رب ہم کو نیک لوگوں (مقبولین) کی معیت میں داخل کر دے گا، (بلکہ یہ امید موقوف اسلام پر ہے، اس لئے مسلمان ہونا ضروری ہے) سو ان (لوگوں) کو اللہ تعالیٰ ان کے (اس) قول (مع الاعتقاد) کی پاداش میں ایسے باغ (بہشت کے) دیں گے جن کے (محلات)

داخل ہیں، پھر سورۃ آیت کے بعد بہت سے مشرف بہ اسلام ہو گئے، لیکن یہ اتنی کم تعداد تھی کہ امتوں اور قوموں کے ذکر کے وقت اس کو ذکر نہیں کیا جاسکتا تھا، بخلاف یہود کا حال کھلا ہوا تھا، کہ وہ مسلمانوں کی عداوت اور بغض کینہ میں سب سے آگے تھے، اسی لئے شروع آیت میں یہود کا یہ حال ذکر فرمایا:
لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ، یعنی مسلمانوں کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اس آیت میں نصاریٰ کی ایک خاص جماعت کی مدح فرمائی گئی ہے، جو خدا ترسی اور حق پرستی کی حامل تھی، جس میں نجاشی اور اس کے اعوان و انصار بھی داخل ہیں، اور دوسرے نصاریٰ بھی جو ان صفات کے حامل تھے یا آئندہ زمانہ میں داخل ہوں، لیکن اس کے ... یہ معنی اس آیت سے نکلتے ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں کہ نصاریٰ خواہ کیسے بھی گمراہ ہو جائیں اور اسلام دشمنی میں کتنے ہی سخت قدم کریں ان کو بھی مسلمانوں کا دوست سمجھا جائے، اور مسلمان ان کی دوستی کی طرف ہاتھ بڑھائیں، کیونکہ یہ بداہۃً غلط اور واقعات کے قطعاً خلاف ہے، اسی لئے امام ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ بعض جاہل جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ان آیات میں مطلقاً نصاریٰ کی مدح ہے اور وہ علی الاطلاق یہود سے بہتر ہیں، یہ سراسر جہالت ہے، کیونکہ اگر عام طور پر دونوں جماعتوں کے مذہبی عقائد کا موازنہ کیا جائے تو نصاریٰ کا شرک زیادہ واضح ہے، اور مسلمانوں کے ساتھ معاملات کو دیکھا جائے تو آجکل کے عام نصاریٰ نے بھی اسلام دشمنی میں یہودیوں سے کم حصہ نہیں لیا، ہاں یہ صحیح ہے کہ نصاریٰ میں ایسے لوگوں کی کثرت ہوئی ہے، جو خدا ترس اور حق پرست تھے، اسی کے نتیجہ میں ان کو قبول اسلام کی توفیق ہوئی، اور یہ آیات ان دونوں جماعتوں کے مابین اسی فرق کو ظاہر کرنے کے لئے نازل ہوئی ہیں، خود اسی آیت کے آخر میں قرآن نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح فرما دیا ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ، یعنی جن نصاریٰ کی مدح ان آیات میں کی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں علماء اور خدا ترس تارک الدنیا حضرات ہیں، اور ان میں تکبر نہیں کہ دوسروں کی بات پر غور کرنے کے لئے تیار نہ ہوں، مقابلہ سے معلوم ہوا کہ یہود کے یہ حالات نہ تھے، ان میں خدا ترسی اور حق پرستی نہ تھی، ان کے علماء نے بھی بجائے ترک دنیا کے اپنے علم کو صرف ذریعہ معاش بنا لیا تھا، اور طلب دنیا میں ایسے مست ہو گئے تھے کہ حق و ناحق، اور حلال و حرام کی بھی پرواہ نہ رہی تھی۔

قوم و ملت کی اصلی روح حق پرست علماء و مشائخ ہیں

آیت مذکورہ کے بیان سے ایک اہم بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ قوم و ملت کی اصلی روح حق پرست، خدا ترس علماء و مشائخ ہیں، ان کا وجود پوری قوم

معارف ومسائل

ترک دنیا اگرچہ ایک درجہ میں پسندیدہ ہے مگر حد سے گزرنا حرام ہے

مذکورہ آیت میں یہ بتلا دیا گیا ہے کہ اگرچہ ترک دنیا اور ترک شہوات و لذات ایک درجہ میں محبوب و پسندیدہ ہیں، مگر اس میں بھی حدود شرعیہ سے تجاوز کرنا مذموم اور حرام ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کے تین درجے

کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کے تین درجے ہیں، ایک یہ کہ اعتقاداً اس کو حرام سمجھ لیا جائے، دوسرے یہ کہ قولاً کسی چیز کو اپنے لئے حرام کرلے مثلاً قسم کھالے کہ ٹھنڈا پانی نہ پیوں گا، یا فلاں قسم کا حلال کھانا نہ کھاؤں گا، یا فلاں جائز کام نہ کروں گا، تیسرے یہ کہ اعتقاد و قول تو کچھ نہ ہو محض عملاً ہمیشہ کے لئے کسی حلال چیز کو چھوڑ دینے کا عزم کرے۔

پہلی صورت میں اگر اس چیز کا حلال ہونا قطعی دلیل سے ثابت ہو تو اس کا حرام سمجھنے والا قانونِ الٰہی کی صریح مخالفت کی وجہ سے کافر ہو جائے گا۔

اور دوسری صورت میں اگر الفاظ قسم کہہ کر اس چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دیا ہے تو قسم ہو جائے گی، قسم کے الفاظ بہت ہیں، جو کتب فقہ میں مفصل مذکور ہیں، ان میں ایک مثال یہ ہے کہ صراحۃً یہ کہے کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ فلاں چیز نہ کھاؤں گا، یا فلاں کام نہ کروں گا، یا یہ کہے کہ میں فلاں چیز یا فلاں کام کو اپنے اوپر حرام کرتا ہوں، اس کا حکم یہ ہے کہ بلا ضرورت ایسی قسم کھانا گناہ ہے، اس پر لازم ہے کہ اس قسم کو توڑ دے اور کفارۂ قسم ادا کرے، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

تیسری قسم جس میں اعتقاد اور قول سے کسی حلال کو حرام نہ کیا ہو، بلکہ عمل میں ایسا معاملہ کرے جیسا حرام کے ساتھ کیا جاتا ہے، کہ دائمی طور پر اس کے چھوڑنے کا التزام کرے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر حلال کو چھوڑنا ثواب سمجھتا ہے تو یہ بدعت اور رہبانیت ہے، جس کا گناہ عظیم ہونا قرآن و سنت میں منصوص ہے، اس کے خلاف کرنا واجب اور ایسی پابندی پر قائم رہنا گناہ ہے، ہاں اگر ایسی پابندی بہ نیتِ ثواب نہ ہو بلکہ کسی دوسری وجہ سے ہو مثلاً کسی جسمانی یا روحانی بیماری کے سبب سے کسی خاص چیز کو دائمی طور پر چھوڑ دے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، بعض صوفیائے کرام اور بزرگوں سے حلال چیزوں کے چھوڑنے کی جو روایات منقول ہیں وہ سب اسی قسم میں داخل ہیں کہ انھوں نے اپنے نفس کے لئے اُن چیزوں کو مضر سمجھا، یا کسی بزرگ نے مضر بتلایا، اس لئے بطور علاج چھوڑ دیا، اس میں کوئی مضائقہ نہیں

کے اعتبار سے کھانا کھلانے کے بھی آتے ہیں، اور کسی کو کھانا دیدینے کے بھی، اس لئے فقہاء رحمہم اللہ نے آیت مذکورہ کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ کفارہ دینے والے کو دونوں باتوں کا اختیار ہے، کہ دس مسکینوں کی دعوت کرکے کھانا کھلادے، یا کھانا ان کی ملکیت میں دیدے، مگر پہلی صورت میں یہ ضروری ہے کہ متوسط درجہ کا کھانا جو وہ عادۃً اپنے گھر کھاتا ہے دس مسکینوں کو دونوں وقت پیٹ بھر کر کھلائے، اور دوسری صورت میں ایک مسکین کو بقدر ایک فطرہ کے دیدے، مثلاً پونے دو سیر گیہوں یا اس کی قیمت، تینوں میں جو چیز چاہے اختیار کرے، لیکن روزہ رکھنا صرف اس صورت میں کافی ہو سکتا ہے جب ان تینوں میں سے کسی پر قدرت نہ ہو۔

قسم ٹوٹنے سے پہلے کفارہ کی ادائیگی معتبر نہیں

آخر آیت میں تنبیہ کے لئے دو ارشاد فرمائے گئے ہیں، اول ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ یعنی یہ ہے کفارہ تمہاری قسم کا جب تم نے قسم کھالی، امام اعظم ابو حنیفہؒ اور دوسرے ائمہ کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ جب قسم کسی آئندہ کام کرنے یا نہ کرنے پر کھالو اور پھر اس کی خلاف ورزی ہو جائے تو اس کا کفارہ وہ ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ کفارہ کی ادائیگی قسم ٹوٹنے کے بعد ہوگی، جو قسم توڑنے سے پہلے اگر کفارہ دیدیا جائے تو وہ معتبر نہ ہوگا، وجہ یہ ہے کہ کفارہ لازم ہونے کا سبب قسم توڑنا ہے، جب تک قسم نہیں ٹوٹی تو کفارہ واجب ہی نہیں ہوا، تو جیسے وقت سے پہلے نماز نہیں ہوتی، رمضان سے پہلے رمضان کا روزہ نہیں ہوتا، اسی طرح قسم ٹوٹنے سے پہلے قسم کا کفارہ بھی ادا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ یعنی اپنی قسموں کی حفاظت کرو، مطلب یہ ہے کہ اگر کسی چیز کی قسم کھالی ہے تو بلا ضرورت شرعی یا طبعی قسم کو نہ توڑو، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قسم کھانے میں جلد بازی سے کام نہ لو، اپنی قسم کو محفوظ رکھو، جب تک شدید مجبوری نہ ہو قسم نہ کھاؤ (مظہری)۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ

اے ایمان والو یہ جو ہے شراب اور جوا اور بت

وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ

اور پانسے سب گندے کام ہیں شیطان کے سو ان سے بچتے رہو تاکہ

تُفْلِحُوْنَ ۝۹۰ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ

تم نجات پاؤ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ ڈالے تم میں

۱۵

الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ

دشمنی اور بیر بذریعہ شراب اور جوئے کے اور روکے تم کو

ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ ۖ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ﴿۹۱﴾ وَ

اللہ کی یاد سے اور نماز سے سو اب بھی تم باز آؤ گے اور

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا ۚ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ

حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور بچتے رہو پھر اگر تم پھر جاؤ گے

فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴿۹۲﴾

تو جان لو کہ ہمارے رسول کا ذمہ صرف پہنچا دینا ہے کھول کر

ربطِ آیات: اوپر حلال چیزوں کے ترک یا حرام کی ممانعت تھی آگے بعض حرام چیزوں کے استعمال کی ممانعت ہے

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں، سو ان سے بالکل الگ رہو تاکہ تم کو (دونوں جہان کی مضرتوں سے بچنے کے بعد) فلاح ہو (اور وہ مضرتیں دنیوی بھی ہیں اور دینی بھی جن کا بیان یہ ہے کہ) شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے آپس میں (برتاؤ میں) عداوت اور (دلوں میں) بغض واقع کر دے (چنانچہ ظاہر ہے کہ شراب میں تو عقل نہیں رہتی، گالی گلوچ جنگ فساد ہو جاتا ہے جس سے بعد میں بھی طبعاً کدورت باقی رہتی ہے، اور جوئے میں جو شخص مغلوب ہوتا ہے اس کو غالب پر غیظ ہوتا ہے، اور جب اس کو رنج ہوگا دوسرے پر بھی اس کا اثر پہنچے گا، یہ تو دنیوی مضرت ہوئی) اور شیطان یوں چاہتا ہے کہ اسی شراب اور جوئے کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے جو کہ اللہ کی یاد کا سب سے افضل طریقہ ہے تم کو باز رکھے (یہ دینی مضرت ہوئی کیونکہ شراب میں تو ہوش ہی نہیں رہتے اور قمار میں غالب کو تو غالب ہونے کا نشاط اس درجہ ہوتا ہے کہ وہ اس میں غرق ہوتا ہے اور مغلوب کو مغلوب ہونے کا رنج اور منصوبہ غالب آنے کی کوشش اس درجہ ہوتی ہے کہ اس سے فراغ نہیں ہوتا یہ دینی مضرت ہوئی، جب ایسی بری چیزیں ہیں) سو بتلاؤ اب بھی باز آؤ گے؟ اور تم (تمام احکام میں) اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے رہو اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرتے رہو اور (مخالفت حکم سے) احتیاط رکھو اگر (اطاعت سے) اعراض کرو گے تو یہ جان رکھو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف صاف صاف حکم کا پہنچا دینا تھا (اور وہ اس کو بخوبی انجام دے چکے اور تم کو حکم پہنچ چکا اب تمہارے پاس کسی عذر کی گنجائش نہیں رہی)۔

معارف و مسائل

حرمت کی حقیقی وجہ انسان کے نفع کے لئے ہے ان آیات میں بتلانا یہ منظور ہے کہ مالک کائنات نے ساری کائنات کو انسان کی خدمت کے لئے پیدا فرمایا، اور ہر ایک چیز کو انسان کی خاص خاص خدمت پر لگا دیا ہے، اور انسان کو مخدوم کائنات بنایا ہے، انسان پر صرف ایک پابندی لگا دی کہ ساری مخلوقات سے نفع اٹھانے کی جو حدود ہم نے مقرر کر دی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو، جن چیزوں کو تمہارے لئے حلال و طیب بنا دیا ہے ان سے احتراز کرنا بے ادبی اور ناشکری ہے اور جن چیزوں کے کسی خاص استعمال کو حرام قرار دیدیا ہے، اس میں خلاف ورزی کرنا نافرمانی اور بغاوت ہے، بندہ کا کام یہ ہے کہ مالک کی ہدایات کے مطابق اس کی مخلوقات کا استعمال کرے، اسی کا نام عبدیت ہے۔

پہلی آیت میں شراب، جوا، بت اور جوئے کے تیر چار چیزوں کی حرمت کا بیان ہے۔

اسی مضمون کی ایک آیت تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ سورۂ بقرہ میں بھی آچکی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اس میں ان چاروں چیزوں کو رجس فرمایا، رجس عربی زبان میں ایسی گندی چیز کو کہا جاتا ہے جس سے انسان کی طبیعت کو گھن اور نفرت پیدا ہو، یہ چاروں چیزیں ایسی ہیں کہ اگر انسان ذرا بھی عقل سلیم اور طبع سلیم رکھتا ہو تو خود بخود ہی ان چیزوں سے اس کو گھن اور نفرت ہوگی۔

ازلام کی تشریح ان چار چیزوں میں سے ایک اَزْلَام ہے جو زَلَم کی جمع ہے، اَزْلَام اُن تیروں کو کہا جاتا ہے جن پر قرعہ اندازی کر کے عرب میں جوا کھیلنے کی رسم جاری تھی، جس کی صورت یہ تھی کہ دس آدمی شرکت میں ایک اونٹ ذبح کرتے تھے، پھر اس کا گوشت تقسیم کرنے کے لئے بجائے اس کے کہ دس حصے برابر کر کے تقسیم کرتے اس میں اس طرح جوا کھیلتے کہ دس عدد تیروں میں سے سات تیروں پر کچھ مختلف حصوں کے نشانات بنا رکھے تھے، کسی پر ایک کسی پر دو یا تین اور تین تیروں کو سادہ رکھا ہوا تھا، ان تیروں کو ترکش میں ڈال کر ہلاتے تھے، پھر ایک ایک شریک کے لئے ایک ایک تیر ترکش میں سے نکالتے، اور جتنے حصوں کا تیر کسی کے نام پر نکل آتے وہ اتنے حصوں کا مستحق سمجھا جاتا تھا، اور جس کے نام پر سادہ تیر نکل آئے وہ حصہ سے محروم رہتا تھا، جیسے آجکل بہت سی قسمیں لاٹری کے طریقہ پر بازاروں میں جاری ہیں، اس طرح کی قرعہ اندازی، قمار یعنی جوا ہے جو بروئے قرآن کریم حرام ہے۔

فَاجْتَنِبُوْهُ کہ جب یہ چیزیں ایسی ہیں تو ان سے اجتناب کرو اور پرہیز کرو۔

آخر میں فرمایا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ جس میں بتلایا گیا کہ تمہاری فلاح دنیا و آخرت اسی پر **موقوف ہے کہ ان چیزوں سے پرہیز کرتے رہو۔**

اس کے بعد دوسری آیت میں شراب اور جوئے کے دنیوی اور ظاہری مفاسد کا بیان اس طرح فرمایا گیا، اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ، یعنی شیطان یہ چاہتا ہے کہ تمہیں شراب اور جوئے میں مبتلا کرکے تمہارے درمیان بغض و عداوت کی بنیادیں ڈال دے،

ان آیات کا نزول بھی کچھ ایسے ہی واقعات کے بارہ میں ہوا ہے کہ شراب کے نشہ میں ایسی حرکات صادر ہوئیں جو باہمی غیظ و غضب اور پھر جنگ و جدل کا سبب بن گئیں، اور یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ شراب کے نشہ میں جب آدمی عقل کھو بیٹھتا ہے تو اس سے ایسی **حرکات کا صدور لازمی جیسا ہوجاتا ہے۔**

اسی طرح جوئے کا معاملہ ہے کہ ہارنے والا اگرچہ اپنی ہار مان کر اس وقت نقصان اٹھا لیتا ہے، مگر اپنے حریف پر غیظ و غضب اور بغض و عداوت اس کے لازمی اثرات میں سے ہے، حضرت قتادہؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ بعض عرب کی عادت تھی کہ جوئے میں اپنے اہل و عیال اور مال و سامان سب کو ہار کر انتہائی رنج و غم کی زندگی گذارتے تھے۔

آخر آیت میں پھر ان چیزوں کی ایک اور خرابی ان الفاظ میں ارشاد فرمائی: وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ، "یعنی یہ چیزیں تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے غافل **کردیتی ہیں"۔**

یہ خرابی بظاہر دینی اور اخروی خرابی ہے، جس کو دنیوی خرابی کے بعد مکرر ذکر فرمانے میں اشارہ ہوسکتا ہے کہ اصل قابل نظر اور قابل فکر وہ زندگی ہے جو ہمیشہ رہنے والی ہے، عقلمند کے نزدیک اسی کی خوبی مطلوب و مرغوب ہونی چاہئے، اور اسی کی خرابی سے ڈرنا چاہئے، دنیا کی چند روزہ زندگی کی خوبی نہ کوئی قابل فخر چیز ہے، نہ خرابی زیادہ قابل رنج و غم ہے، کہ اس کی دونوں حالتیں چند روز میں ختم ہوجانے والی ہیں ؎

دوران بقا چو باد صحرا بگذشت

تلخی و خوشی و زشت و زیبا بگذشت

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ذکر اللہ اور نماز سے غفلت یہ دنیا و آخرت اور جسم و روح دونوں کے لئے مضر ہے، آخرت اور روح کے لئے مضر ہونا تو ظاہر ہے کہ اللہ

سے غافل، بے نماز کی آخرت تباہ اور روح مُردہ ہے، اور ذرا غور سے دیکھا جائے تو اللہ سے غافل کی دنیا بھی وبالِ جان ہوتی ہے کہ جب اللہ سے غافل ہو کر اس کا انتہائی مقصود مال و دولت اور عزت و جاہ ہو جائے تو وہ اتنے جھگڑے اپنے ساتھ لاتے ہیں کہ وہ خود ایک مستقل غم ہوتے ہیں جن میں مبتلا ہو کر انسان اپنے مقصود و مقصد یعنی راحت و آرام اور اطمینان و سکون سے محروم ہو جاتا ہے، اور ان اسباب راحت میں ایسا مست ہو جاتا ہے کہ خود راحت کو بھی بھول جاتا ہے، اور اگر کسی وقت یہ مال و دولت یا عزت و جاہ جاتے رہیں یا ان میں کمی آجائے تو ان کے غم و رنج کی انتہا نہیں رہتی، غرض یہ غافل دنیادار انسان دونوں حالتوں میں رنج و فکر اور غم و اندوہ میں گھرا رہتا ہے، ؎

اگر دنیا نباشد دردمندیم
وگر باشد بمہرش پائے بندیم

بخلاف اس شخص کے جس کا دل اللہ کی یاد سے روشن اور نورِ نماز سے منور ہے، دنیا کے مال و منال اور جاہ و منصب اس کے قدموں پر گرتے ہیں، اور ان کو صحیح راحت و آرام پہنچاتے ہیں، اور اگر یہ چیزیں جاتی رہیں تو ان کے قلوب اس سے متاثر نہیں ہوتے، ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ ؎

نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے
بہ پیشِ ہمتِ ما ہر چہ آمد بود مہمانے

خلاصہ یہ ہے کہ ذکر اللہ اور نماز سے غفلت اگر غور سے دیکھا جائے تو آخرت اور دنیا دونوں طرح کی خرابی ہے، اس لئے ممکن ہو کہ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ سے نقائص اخروی اور روحانی مضرت بیان کرنا مقصود ہو، اور يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ سے نقائص دنیوی اور جسمانی خرابی بتلانا ہو اور يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ سے دین و دنیا کی مشترک تباہی و بربادی کا ذکر کرنا مقصود ہو۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ ذکر اللہ میں تو نماز بھی داخل ہے، پھر نماز کو علیحدہ بیان کرنے میں کیا حکمت ہے، وجہ یہ ہے کہ اس میں نماز کی اہمیت اور ذکر اللہ کی تمام اقسام میں افضل و اشرف ہونے کی طرف اشارہ کرنے کے لئے نماز کو مستقل طور پر ذکر فرمایا گیا ہے۔

ان تمام دینی و دنیوی، جسمانی اور روحانی خرابیوں کی تفصیل بتلانے کے بعد ان چیزوں سے باز رکھنے کی ہدایت ایک عجیب دل نواز انداز سے فرمائی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ یعنی اب یہ ساری خرابیاں تمہارے علم میں آگئیں تو اب بھی ان سے باز آؤ گے۔

ان دونوں آیتوں میں شراب اور جوئے وغیرہ کی حرمت اور شدید مذمت کا بیان تھا، جو قانون الٰہی کی ایک دفعہ ہے، تیسری آیت میں اس حکم کو آسان کرنے اور اس پر عمل کو سہل بنانے کے لئے قرآن کریم نے اپنے خاص اسلوب بیان کے تحت ارشاد فرمایا:

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم تمہارے فائدہ کے لئے ہے، اگر تم نہ مانو تو اللہ جل شانہ کا کوئی نقصان ہے نہ اس کے رسول کا، اللہ تعالیٰ کا اس نفع ونقصان سے بالاتر ہونا تو ظاہر تھا، رسول کے متعلق کسی کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ جب ان کی بات نہ مانی گئی تو ان کے اجر وثواب یا قدر ومنزلت میں شاید کچھ فرق آجائے، اس شبہ کے ازالہ کے لئے ارشاد فرمایا، فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ، یعنی اگر تم میں سے کوئی بھی ہمارے رسول کی بات نہ مانے جب بھی اس کی قدر ومنزلت میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ جتنا کام ان کے سپرد تھا وہ کرچکے، یعنی صاف صاف طور پر واضح کرکے اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچا دینا، اس کے بعد جو شخص نہیں مانتا وہ اپنا نقصان کرتا ہے ہمارے رسول کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا ہے۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا

جو لوگ ایمان لائے اور کام نیک کئے ان پر گناہ نہیں اس میں جو کچھ پہلے

طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَآمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوْا

کھا چکے جب کہ آئندہ کو ڈر گئے اور ایمان لائے اور عمل نیک کئے پھر ڈرتے رہے

وَآمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوْا وَأَحْسَنُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۹۳﴾

اور یقین کیا پھر ڈرتے رہے اور نیکی کی اور اللہ دوست رکھتا ہے نیکی کرنے والوں کو

ع ۱۲ / ۲

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللَّهُ بِشَيْءٍ مِنَ الصَّيْدِ

اے ایمان والو البتہ تم کو آزمائے گا اللہ ایک بات سے اس شکار میں کہ جس پر

تَنَالُهُ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَخَافُهُ

پہنچتے ہیں ہاتھ تمہارے اور نیزے تمہارے تاکہ معلوم کرے اللہ کون اس سے ڈرتا ہے

بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾

بن دیکھے، پھر جس نے زیادتی کی اس کے بعد تو اس کے لئے عذاب دردناک ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ وَمَنْ

اے ایمان والو! نہ مارو شکار جس وقت کہ تم ہو احرام میں، اور جو کوئی

قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ

تم میں اس کو مارے جان کر تو اس پر بدلہ ہے اس مارے ہوئے کے برابر مویشی میں سے

يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ

جو تجویز کریں دو آدمی معتبر تم میں سے اس طرح سے کہ وہ جانور بدلہ کا بطور نیاز پہنچایا جاوے

طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ۭ

کعبہ تک یا اس پر کفارہ ہے چند محتاجوں کو کھانا کھلانا یا اس کے برابر روزے تاکہ چکھے سزا اپنے کام کی،

عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ۭ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ۭ وَاللّٰهُ

اللہ نے معاف کیا جو کچھ ہو چکا اور جو کوئی پھر کرے گا اس سے بدلہ لے گا اللہ اور اللہ

عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ

زبردست ہے بدلہ لینے والا۔ حلال ہوا تمہارے لئے دریا کا شکار اور دریا کا کھانا

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا

تمہارے فائدہ کے واسطے اور سب مسافروں کے، اور حرام ہوا تم پر جنگل کا شکار جب تک

دُمْتُمْ حُرُمًا ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾

تم احرام میں رہو، اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے پاس تم جمع ہوگے۔

ربط آیات | اسباب میں مسند احمد سے بروایت ابی ہریرہؓ منقول ہے کہ جب اول کی آیت میں تحریم خمر و میسر نازل ہو چکی تو بعض لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ بہت سے آدمی جو کہ شراب پیتے تھے اور قمار کا مال کھاتے تھے تحریم سے پہلے مر گئے، اور اب معلوم ہوا کہ وہ حرام ہے ان کا کیا حال ہوگا، اس پر آیت لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ نازل ہوئی۔

اور پیچھے آیت یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ میں تحریم طیبات کی ممانعت کا ذکر تھا، اب آیت یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیَبْلُوَنَّکُمُ اللّٰهُ بِشَیْءٍ الخ سے بیان فرماتے

ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو مکمل اختیار حاصل ہے کہ خاص حالات میں خاص خاص چیزوں کو حرام قرار دیدیں (بیان القرآن)

خلاصۂ تفسیر

ایسے لوگوں پر جو کہ ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جس کو وہ کھاتے پیتے ہوں (اور اس وقت وہ حلال ہو گو بعد میں حرام ہو جائے ورنہ گناہ ہوتا) جبکہ (گناہ کا کوئی مقتضی نہ ہو بلکہ ایک امر مانع موجود ہو وہ یہ کہ) وہ لوگ (خدا کے خوف سے اس وقت کی ناجائز چیزوں سے) پرہیز رکھتے ہوں اور (دلیل اس خوف کی یہ ہو کہ وہ لوگ) ایمان رکھتے ہوں (جو کہ خدا سے ڈرنے کا سبب ہے) اور نیک کام کرتے ہوں (جو کہ خوفِ خدا کی علامت ہے) اور اسی حالت پر وہ عمر بھر رہیں، چنانچہ اگر وہ حلال چیز جس کو پہلے کھاتے پیتے تھے آگے کبھی چل کر حرام ہو جاتی تو پھر (اس سے بھی اسی خوف خدا کے سبب) پرہیز کرنے لگتے ہوں اور (اس خوف کی بھی دلیل مثل سابق یہی ہو کہ وہ لوگ) ایمان رکھتے ہوں اور خوب نیک عمل کرتے ہوں (جو کہ موقوف ہیں ایمان پر، پس یہاں بھی سبب اور علامت خوف خدا کے مجتمع ہیں، مطلب یہ کہ ہر بار کی مکرر سہ کرر تحریم میں ان کا یہی عمل درآمد ہو کچھ دو تین بار کی خصوصیت نہیں، پس باوجود مانع اور استمرار مانع کے ہمارے فضل سے بعید ہے کہ وہ گناہگار ہوں اور (ان کی یہ خاص طریقہ مذکورہ کی نیکوکاری صرف لزوم گناہ سے مانع ہی نہیں بلکہ وجود ثواب و محبوبیت کو مقتضی بھی ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں سے محبت رکھتے ہیں (پس ان میں مبغوض ہونے کا احتمال تو کب ہو سکتا ہے، یہ تو غیر مبغوض ہونے سے گذر کر محبوب ہونے کا درجہ رکھتے ہیں)

اے ایمان والو اللہ تعالیٰ قدرے شکار سے تمہارا امتحان کرے گا جن تک (بوجہ تم سے دور دور نہ بھاگنے کے) تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچ سکیں گے (مطلب امتحان کا یہ کہ حالتِ احرام میں وحوش کے شکار کرنے کو تم پر حرام کر کے جیسا آگے تصریحاً آتا ہے، ان وحوش کو تمہارے آس پاس پھراتے رہیں گے) تاکہ اللہ تعالیٰ (ظاہر طور پر بھی) معلوم کرلے کہ کون شخص اس سے (یعنی اس کے عذاب سے) بن دیکھے ڈرتا ہے (اور ارتکاب حرام سے جو کہ موجب عذاب ہے بچتا ہے اسی سے التزاماً یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ شکار حرام ہے) سو جو شخص اس (حرمت) کے بعد (جس پر ابتلاء بھی دلالت کر رہا ہے) حد (شرعی) سے نکلے گا (یعنی شکار ممنوع کا مرتکب ہوگا) اس کے واسطے دردناک سزا (مقرر) ہے، (چنانچہ شکاری

جانور اسی طرح ان کے پاس لگے پھرتے تھے، چونکہ صحابہ میں بہت سے شکار کے عادی تھے اس میں
ان کی اطاعت کا امتحان ہو رہا تھا، جس میں وہ پورے اترے، آگے ممانعت کی زیادہ تصریح ہے کہ)
اے ایمان والو وحشی شکار کو (باستثناء ان کے کہ جن کو شرع نے مستثنیٰ کر دیا) قتل مت کرو،
جبکہ تم حالتِ احرام میں ہو (اسی طرح جبکہ وہ شکار حرم میں ہو گو شکاری احرام میں نہ ہو اس کا بھی
یہی حکم ہے) اور جو شخص تم میں سے اس کو جان بوجھ کر قتل کرے گا تو اس پر (اس کے فعل کی) پاداش
واجب ہوگی جو کہ (باعتبار قیمت کے) مساوی ہوگی اس جانور کے جس کو اس نے قتل کیا ہے (جس
کے تخمینہ) کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر شخص کر دیں (کہ دینداری میں بھی قابل اعتبار ہوں اور
تجربہ و بصیرت میں بھی، پھر اس قاتل کو تخمینہ قیمت کے بعد اختیار ہے) خواہ (اس قیمت کا کوئی
ایسا جانور خرید کر) وہ پاداش (کا جانور) خاص چوپاؤں میں سے ہو (یعنی اونٹ، گائے، بھینس،
بھیڑ بکری نر ہو یا مادہ) بشرطیکہ نیاز کے طور پر کعبہ (کے پاس) تک (یعنی حرم کے اندر) پہنچائی
جائے اور خواہ (اس قیمت کے برابر غلہ بطور) کفارہ (کے) مساکین کو دیدیا جائے (یعنی ایک
مسکین کو بقدر ایک صدقۃ الفطر کے دیا جائے) اور خواہ اس (غلہ) کے برابر روزے رکھ لئے
جائیں (برابری کی صورت یہ ہے کہ ہر مسکین کے حصہ یعنی غلہ کے بدلے ایک روزہ) اور یہ پاداش
اس لئے مقرر کی ہے تاکہ اپنے کئے کی شامت کا مزہ چکھے (بخلاف اس شخص کے جس نے قصداً
شکار نہ کیا ہو کہ گو اس پر بھی جزا تو بھی واجب ہے مگر وہ فعل کی سزا نہیں، بلکہ محل محترم یعنی
شکار حرم جو کہ حرم کی وجہ سے محترم یا احرام کی وجہ سے کالمحترم ہو گیا ہے اس کا ضمان اور جزا ہے
اور اس جزاء کے ادا کر دینے سے) اللہ تعالیٰ نے گذشتہ کو معاف فرما دیا اور جو شخص پھر
ایسی ہی حرکت کرے گا (چونکہ اکثر عود میں ایک گونہ پہلی بار سے زیادہ جرأت ہوتی ہے، تو (اس
وجہ سے علاوہ جزاء مذکور کے جو کہ اصل فعل یا محل کا عوض ہے آخرت میں) اللہ تعالیٰ اس سے
(اس جرأت کا) انتقام لیں گے (البتہ اگر توبہ کر لے تو انتقام کا سبب ختم ہو جاوے گا) اور اللہ
تعالیٰ زبردست ہیں انتقام لے سکتے ہیں، تمہارے لئے (حالت احرام میں) دریا (یعنی پانی)
کا شکار پکڑنا اور اس کا کھانا (سب) حلال کیا گیا ہے تمہارے انتفاع کے واسطے (اور تمہارے
مسافروں کے (انتفاع کے) واسطے (کہ سفر میں اسی کو توشہ بنا دیں) اور خشکی کا شکار (گو بعض
صورتوں میں کھانا حلال ہو مگر) پکڑنا (یا اس میں معین ہونا) تمہارے لئے حرام کیا گیا ہے جب تک
تم حالت احرام میں رہو اور اللہ تعالیٰ (کی مخالفت) سے ڈرو جس کے پاس جمع (کر کے حاضر)
کئے جاؤ گے۔

معارف ومسائل

محققین نے لکھا ہے کہ تقویٰ (یعنی مضار دینی سے مجتنب ہونے کے) کئی درجے ہیں۔ اور ایمان یقین کے مراتب بھی باعتبار قوت وضعف متفاوت ہیں تجربہ اور نصوصِ شرعیہ سے ثابت ہے کہ جس قدر آدمی ذکر وفکر، عمل صالح اور جہاد فی سبیل اللہ میں ترقی کرتا ہے اسی قدر خدا کے خوف اور اس کی عظمت وجلال کے تصور سے قلب معمور اور ایمان ویقین مضبوط ومستحکم ہوتا رہتا ہے۔ مراتب سیر الی اللہ کی اسی ترقی وعروج کی طرف اس آیت میں تقویٰ اور ایمان کی تکرار سے اشارہ فرمایا اور سلوک کے آخری مقام "احسان" اور اس کے ثمرہ پر بھی تنبیہ فرمادی۔ (تفسیر عثمانی)

مسئلہ: صید جو کہ حرم اور حرم میں حرم ہی عام ہے خواہ ماکول یعنی حلال جانور ہو یا غیر ماکول یعنی حرام (لاطلاق الآیۃ)

مسئلہ: صید یعنی شکار ان جانوروں کو کہا جاتا ہے جو وحشی ہوں، عادۃً انسانوں کے پاس نہ رہتے ہوں، پس جو خلقۃً اہلی ہوں جیسے بھیڑ، بکری، گائے، اونٹ، ان کا ذبح کرنا اور کھانا درست ہے۔

مسئلہ: چند چیزیں مستثنیٰ ہو گئی ہیں، ان کو پکڑنا، قتل کرنا حلال ہے، جیسے دریائی جانور کا شکار، لقولہ تعالیٰ أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ، اور بعضے خشکی کے جانور، جیسے کوا اور چیل وغیرہ یا اور سانپ، اور کچھو اور کاٹنے والا کتا، اسی طرح جو درندہ خود حملہ کرے اس کا قتل بھی جائز ہے۔ حدیث میں ان کا استثناء مذکور ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اَلصَّيْدُ میں الف لام عہد کا ہے۔

مسئلہ: جو حلال شکار غیر احرام اور غیر حرم میں کیا جائے اس کا کھانا محرم کو جائز ہے، جب یہ اس کے قتل وغیرہ میں معین یا مشیر یا بتلانے والا نہ ہو، حدیث میں ایسا ہی ارشاد ہے اور آیت کے الفاظ لَا تَقْتُلُوا میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ یہاں لَا تَقْتُلُوا فرمایا ہے لَا تَاْكُلُوا نہیں فرمایا۔

مسئلہ: شکارِ حرم کو جس طرح قصداً قتل کرنے پر جزاء واجب ہے اسی طرح خطاء ونسیان میں بھی واجب ہے۔ (اخرجہ الروح)

مسئلہ: جیسا پہلی بار میں جزاء واجب ہے اسی طرح دوسری تیسری بار قتل کرنے میں بھی واجب ہے۔

مسئلہ: حاصل جزاء کا یہ ہے کہ جس زمان اور جس مکان میں یہ جانور قتل ہوا ہے بہتر تو یہ ہے کہ دو عادل شخص سے اور جائز یہ بھی ہے کہ ایک ہی عادل شخص سے اس جانور کی قیمت کا تخمینہ کرائے، پھر اس میں یہ تفصیل ہے کہ وہ مقتول جانور اگر غیر ماکول ہے تب تو یہ قیمت ایک بکری کی قیمت سے زیادہ واجب نہ ہوگی، اور اگر وہ جانور ماکول تھا تو جس قدر تخمینہ ہوگا وہ سب واجب ہوگا، اور دونوں حال میں آگے اس کو تین صورتوں میں اختیار ہے، خواہ تو اس قیمت کا کوئی جانور حسب شرائط قربانی کے خرید لے، اور حدودِ حرم کے اندر ذبح کر کے فقراء کو بانٹ دے، اور یا اس قیمت کے برابر غلہ حسب شرائط صدقہ فطر

کہ فی مسکین نصف صاع فقراء کو دیدے، یا بحساب فی مسکین نصف صاع جتنے مساکین کو وہ غلہ پہنچ سکتا ہو اتنے ہی روزے رکھ لے اور تقسیم غلہ و روزوں میں حرم کی قید نہیں، اور اگر قیمت نصف صاع سے بھی کم واجب ہوئی ہے تو اختیار ہے خواہ ایک مسکین کو دیدے یا ایک روزہ رکھ لے اسی طرح اگر فی مسکین نصف صاع دے کر نصف صاع سے کم بچ گیا تو بھی یہی اختیار ہے کہ خواہ وہ بقیہ ایک مسکین کو دیدے یا ایک روزہ رکھ لے نصف صاع کا وزن ہمارے وزن کے اعتبار سے پونے دو سیر ہوتا ہے۔

مسئلہ: تخمینہ مذکور میں جتنے مساکین کا حصہ قرار پاوے اگر ان کو دو وقت کھانا شکم سیر کر کے کھلاوے تب بھی جائز ہے۔

مسئلہ: اگر اس قیمت کے برابر ذبح کے لئے جانور تجویز کیا، مگر کچھ قیمت بچ گئی تو اس بقیہ میں اختیار ہے خواہ دوسرا جانور خرید لے یا اس کا غلہ دیدے، یا غلہ کے حساب سے روزے رکھ لے، جس طرح قتل میں جزاء واجب ہے اسی طرح ایسے جانور کو زخمی کرنے میں بھی تخمینہ کرایا جائے گا کہ اس سے جانور کی کس قدر قیمت کم ہوگئی اس مقدار قیمت میں پھر وہی تینوں مذکورہ صورتیں جائز ہوں گی۔

مسئلہ: محرم کو جس جانور کا شکار کرنا حرام ہے اس کا ذبح کرنا بھی حرام ہے، اگر اس کو ذبح کرے گا تو اس کا حکم مردار کا سا ہوگا، (وفی لا تقتلوا اشارۃ الی ان ذبحہ کالقتل)۔

مسئلہ: اگر جانور کے قتل ہونے کی جگہ جنگل ہے تو جو آبادی اس سے قریب ہو وہاں کے اعتبار سے تخمینہ کیا جائے گا۔

مسئلہ: اشارہ و دلالت و اعانت شکار میں مثل شکار کرنے کے حرام ہے۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ

اللہ نے کر دیا کعبہ کو جو کہ گھر ہے بزرگی والا قیام کا باعث لوگوں کیلئے اور بزرگی والے

الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ

مہینوں کو اور قربانی کو جو کہ نیاز کعبہ کی ہو اور جن کے گلے میں پٹہ ڈال کر لیجاویں کعبہ کو یہ اس واسطے کہ تم جان لو بیشک اللہ کو

مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾

معلوم ہے جو کچھ کہ ہے آسمانوں اور زمین میں اور اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۸﴾

جان لو کہ بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے اور بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلٰغُ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا
رسول کے ذمہ نہیں مگر پہنچا دینا اور اللہ کو معلوم ہے جو تم ظاہر میں کرتے ہو اور جو

تَكْتُمُونَ ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ
چھپا کر کرتے ہو تو کہہ دے کہ برابر نہیں ناپاک اور پاک اگرچہ تجھ کو بھلی لگے

كَثْرَةُ الْخَبِيثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓأُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۰۰﴾
ناپاک کی کثرت سو ڈرتے رہو اللہ سے اے عقلمندو تاکہ تمہاری نجات ہو

ع ۱۳ / ۷ / ۲

خلاصۂ تفسیر

خدا تعالیٰ نے کعبہ کو جو کہ ادب کا مکان ہے، لوگوں (کی مصلحتوں) کے قائم رہنے کا سبب قرار دیدیا ہے اور (اسی طرح) عزت والے مہینہ کو بھی اور (اسی طرح) حرم میں قربانی ہونے والے جانور کو بھی اور (اسی طرح) ان جانوروں کو بھی جن کے گلے میں (اس نشانی کے لئے) پٹے ہوں کہ یہ اللہ کی نیاز ہیں حرم میں ذبح ہوں گے یہ (قرار داد علاوہ اور دنیوی مصلحتوں کے) اس (دینی مصلحت) کے (لئے بھی) ہے تاکہ (تمہارا اعتقاد درست اور پختہ ہو اس طرح سے کہ تم ان مصالح سے استدلال کرکے اس بات کا یقین زیادہ کر لو کہ) بیشک اللہ تعالیٰ تمام آسمانوں اور زمین کے اندر کی چیزوں کا علم (کامل) رکھتے ہیں (کیونکہ ایسا حکم مقرر کرنا جس میں آئندہ کے ایسے مصالح مرعی ہوں کہ عقول بشریہ اکو نہ سوچ سکیں دلیل ہے کمال صفت علمیہ کی) اور (ان معلومات مذکورہ کے ساتھ تعلق علم کامل سے استدلال کرکے یقین کر لو کہ) بیشک اللہ تعالیٰ سب چیزوں کو خوب جانتے ہیں (کیونکہ ان معلومات کے علم پر کسی چیز نے مطلع نہیں کیا، معلوم ہوا کہ علم ذاتی کی نسبت جمیع معلوم کے ساتھ یکساں ہوتی ہے) تم یقین سے جان لو کہ اللہ تعالیٰ سزا بھی سخت دینے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت اور رحمت والے بھی ہیں (تو ان کے احکام کی خلاف مت کیا کرو اور جو اخیانا ہو گیا ہو، موافق قواعد شرعیہ کے توبہ کر لو) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذمہ تو صرف پہنچانا ہے، (سو وہ خوب پہنچا چکے اب تمہارے پاس کوئی عذر و حیلہ نہیں رہا) اور اللہ تعالیٰ سب جانتے ہیں جو کچھ تم (زبان یا جوارح سے) ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ (دل میں) پوشیدہ رکھتے ہو (سو تم کو چاہئے کہ اطاعت ظاہر و باطن دونوں سے کرو) آپ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان سے یہ بھی) فرما دیجئے کہ ناپاک اور پاک (یعنی گناہ اور اطاعت یا گناہ کرنے والا اور اطاعت کرنے والا) برابر نہیں، (بلکہ خبیث مبغوض ہے اور طیب مقبول ہے، پس اطاعت کرکے مقبول بنا چاہئے

معصیت کرکے مغضوب نہ ہونا چاہئے، گرچہ اے دیکھنے والے، تجھ کو ناپاک کی کثرت جیسا اکثر دنیا میں یوں واقع ہوتا ہے، تعجب میں ڈالتی ہو کہ باوجود ناپسندیدہ ہونے کے یہ کثیر کیوں ہے، مگر یہ سمجھ لو کہ کثرت جو کسی حکمت سے ہے دلیل محمود ہونے کی نہیں، جب کثرت پر مدار نہیں پایا کہ جب اللہ تعالیٰ کے علم و عقاب پر بھی مطلع ہوگئے، تو اس کو مت دیکھو بلکہ، خدا تعالیٰ کے خلاف حکم کرنے سے ڈرتے رہو تاکہ تم (پورے طور سے) کامیاب ہو کہ وہ جنت اور رضائے حق ہے)

مَعارف و مَسائل

امن و اطمینان کے چھ ذرائع پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے چار چیزوں کو لوگوں کے قیام و بقاء اور امن و اطمینان کا سبب بتلایا ہے۔

اول کعبہ، لفظ کعبہ عربی زبان میں ایسے مکان کو کہتے ہیں جو مربع یعنی چوکور ہو عرب میں قبیلہ خثعم کا بنایا ہوا ایک اور مکان بھی اسی نام سے موسوم تھا جس کو کعبہ یمانیہ کہا جاتا تھا، اسی لئے بیت اللہ کو اس کعبہ سے ممتاز کرنے کے لئے لفظ کعبہ کے ساتھ البیت الحرام کا لفظ بڑھایا گیا۔

لفظ قیام اور قوام اسم مصدر ہے، اس چیز کو کہا جاتا ہے جس پر کسی چیز کا قیام و بقاء موقوف ہو، اس لئے قِیٰمًا لِّلنَّاسِ کے معنے یہ ہوئے کہ کعبہ اور اس کے متعلقات لوگوں کے قیام و بقاء کا سبب اور ذریعہ ہیں۔

اور لفظ ناس لغت میں عام انسانوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس جگہ قرینۂ مقام کی وجہ سے خاص مکہ والے یا اہل عرب بھی مراد ہو سکتے ہیں، اور عام دنیا کے انسان بھی، اور ظاہر یہی ہے کہ پورے عالم کے انسان اس میں داخل ہیں، البتہ مکہ اور عرب والے ایک خاص خصوصیت رکھتے ہیں، اس لئے مطلب آیت کا یہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ بیت اللہ اور جن چیزوں کا ذکر آگے آتا ہے، اُن کو پورے عالم انسانیت کے لئے قیام و بقاء اور امن و سکون کا ذریعہ بنا دیا ہے، جب تک دنیا کا ہر ملک، ہر خطہ اور ہر سمت کے لوگ اس بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرتے رہیں اور بیت اللہ کا حج ہوتا رہے جن پر حج فرض ہو وہ حج ادا کرتے رہیں اس وقت تک یہ پوری دنیا قائم اور محفوظ رہے گی۔ اور اگر ایک سال بھی ایسا ہو جائے کہ کوئی حج نہ کرے یا کوئی شخص بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا نہ کرے تو پوری دنیا پر عذاب عام آجائے گا۔

بیت اللہ پورے عالم کا عمود ہے اسی مضمون کو امام تفسیر حضرت عطاءؒ نے ان الفاظ میں

بیان فرمایا ہے: لو ترکوہ عامًا واحدًا لم ینظروا ولم یؤخروا (بحر محیط)، اس سے معلوم ہوا کہ معنوی طور پر بیت اللہ اس پورے عالم کا عمود ہے، جب تک اس کا استقبال اور حج ہوتا رہے گا دنیا قائم رہے گی، اور اگر کسی وقت بیت اللہ کا یہ احترام ختم ہوا تو دنیا بھی ختم کر دی جائے گی، رہا یہ معاملہ کہ نظامِ عالم اور بیت اللہ میں جوڑ اور ربط کیا ہے؟ سو اس کی حقیقت معلوم ہونا ضروری نہیں، جس طرح مقناطیس اور لوہے اور کہربا اور تنکے کے ربطِ باہمی کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں، مگر وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو مشاہدہ میں آتی ہے اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا، بیت اللہ اور نظامِ عالم کے باہمی ربط کی حقیقت کا ادراک بھی انسان کے قبضہ میں نہیں، وہ خالقِ کائنات کے بتلانے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، بیت اللہ کا پورے عالم کی بقاء کے لئے سبب ہونا تو ایک معنوی چیز ہے، ظاہری نظریں اس کو نہیں پا سکتیں، لیکن عرب اور اہلِ مکہ کے لئے اس کا موجبِ امن و سلامتی ہونا طویل تجربات اور مشاہدات سے ثابت ہے۔

بیت اللہ کا وجود امنِ عالم کا سبب ہے عام دنیا میں قیامِ امن کی صورت حکومتوں کے قوانین اور ان کی گرفت ہوتی ہے، اس کی وجہ سے ڈاکو، چور، قتل و غارت گری کرنے والے کی جرأت نہیں ہوتی، لیکن جاہلیتِ عرب میں نہ کوئی باقاعدہ حکومت قائم تھی، اور نہ امنِ عامہ کے لئے کوئی قانون عام تھا، سیاسی نظام محض قبائلی بنیادوں پر قائم تھا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کی جان و مال عزت و آبرو سب ہی چیزوں پر جب چاہے حملہ کر سکتا تھا، اس لئے کسی قبیلہ کے لئے کسی وقت امن و اطمینان کا موقع نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کو حکومت کے قائم مقام ذریعۂ امن بنا دیا، جس طرح حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت کوئی سمجھدار انسان نہیں کر سکتا، اسی طرح بیت اللہ شریف کی حرمت و تعظیم حق تعالیٰ نے زمانۂ جاہلیت میں بھی عام لوگوں کے دلوں میں اس طرح پیوست کر دی تھی کہ اس کے احترام کے لئے اپنے سارے جذبات و خواہشات کو پیچھے ڈال دیتے تھے۔

عرب جاہلیت جو اپنی جنگ جوئی اور قبائلی تعصب میں پوری دنیا میں ضرب المثل تھی، اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ اور اس کے متعلقات کی اتنی حرمت و تعظیم اُن کے دلوں میں پیوست کر دی تھی کہ ان کا کیسا ہی جانی دشمن یا سخت سے سخت مجرم ہو اگر وہ حرم شریف میں داخل ہو جائے تو انتہائی غم و غصہ کے باوجود اس کو کچھ نہ کہتے، باپ کا قاتل حرم میں بیٹے کو ملتا تو بیٹا نیچی نظریں کر کے گذر جاتا تھا۔

اسی طرح جو شخص حج و عمرہ کے لئے نکلا ہو یا جو جانور حرم شریف میں قربانی کے لئے لایا گیا ہو اس کا بھی اتنا ہی احترام عرب میں مسلم تھا کہ کوئی بڑے سے بڑا شخص بھی اس کو کوئی گزند نہ پہنچاتا تھا، اور اگر وہ جانی دشمن بھی ہے تو ایسی حالت میں جبکہ اس نے حج و عمرہ کی کوئی علامت احرام یا قلادہ باندھا ہوا ہو اس کو قطعی کچھ نہ کہتے تھے۔

سنہ ہجری ۶ میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کی ایک خاص جماعت کے ساتھ عمرہ کا احرام باندھ کر بقصد بیت اللہ روانہ ہوئے اور حدود حرم کے قریب مقام حدیبیہ پر قیام فرمایا کر حضرت عثمان غنیؓ کو چند رفیقوں کے ساتھ مکہ بھیجا کہ مکہ کے سرداروں سے کہہ دیں کہ مسلمان اس وقت کسی جنگ کی نیت سے نہیں بلکہ عمرہ ادا کرنے کے لئے آئے ہیں، مسلمانوں کی راہ میں کوئی مزاحمت نہ ہونی چاہئے۔

قریشی سرداروں نے بہت سی بحث و مباحثہ کے بعد اپنا ایک نمائندہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ شخص حرمت بیت اللہ کا خاص لحاظ رکھنے والا ہے، اس لئے اپنے قربانی کے جانور جن پر قربانی کا نشان لگا ہوا ہے اس کے سامنے کر دو، اس نے جب ہدایا (قربانی کے جانور) دیکھے تو اقرار کیا کہ بیشک ان لوگوں کو بیت اللہ سے ہرگز نہیں روکنا چاہئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حرم محترم کا احترام زمانہ جاہلیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب میں ایسا رکھ دیا تھا کہ اس کی وجہ سے امن و امان قائم رہتا تھا، اس احترام کے نتیجہ میں صرف حرم شریف کے اندر آنے جانے والے اور وہ لوگ مامون ہو جاتے تھے جو حج و عمرہ کے لئے نکلے ہیں، اور حج کی کوئی علامت ان پر موجود ہے، اطراف عالم کے لوگوں کو اس سے کوئی نفع امن و اطمینان کا حاصل نہ ہوتا تھا، لیکن عرب میں جس طرح بیت اللہ کے مکان اور اس کے گرد و پیش کے حرم محترم کا احترام عام تھا اسی طرح حج کے مہینوں کا بھی خاص احترام تھا کہ ان مہینوں کو اشہر حرم کہتے تھے، ان کے ساتھ رجب کو بھی بعض نے شامل کر لیا تھا، ان مہینوں میں حرم سے باہر بھی قتل و قتال کو **تمام عرب حرام سمجھتا اور پرہیز کرتا تھا۔**

اسی لئے قرآن کریم نے قِیٰمًا لِّلنَّاسِ ہونے میں کعبہ کے ساتھ تین اور چیزوں کو شامل فرمایا ہے۔ اول اَلشَّهْرَ الْحَرَامَ یعنی عزت و عظمت کا مہینہ، یہاں چونکہ لفظ شَهر مفرد لایا گیا ہے اس لئے عام مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس جگہ "شہر حرام" سے مراد ماہ ذی الحجہ ہے جس میں حج کے ارکان و اعمال ادا کئے جاتے ہیں، اور بعض نے فرمایا

کہ لفظ اگرچہ مفرد ہے مگر مراد اس سے جنس ہے، اس لئے سب ہی اشہر حرم (عزت کے مہینے) اس میں داخل ہیں۔

دوسری چیز ھدی ہے، ھدی اس جانور کو کہا جاتا ہے جس کی قربانی حرم شریف میں کی جاتی، ایسے جانور جس شخص کے ساتھ ہوں عام عرب کا معمول تھا کہ اس کو کچھ نہ کہتے تھے، وہ امن و اطمینان کے ساتھ سفر کرتا اور اپنا مقصد پورا کر سکتا تھا، اس لئے ھدی بھی قیامِ امن کا ایک سبب ہوئی۔

تیسری چیز قلائد ہیں، قلائد قلادہ کی جمع ہے، گلے کے ہار کو کہا جاتا ہے۔ جاہلیت عرب کی رسم یہ تھی کہ جو شخص حج کے لئے نکلتا تو اپنے گلے میں ایک ہار بطور علامت کے ڈال لیتا تھا، تاکہ اس کو دیکھ کر لوگ سمجھ لیں کہ یہ حج کے لئے جا رہا ہے کوئی تکلیف نہ پہنچائیں، اسی طرح قربانی کے جانوروں کے گلے میں بھی اس طرح کے ہار ڈالے جاتے تھے ان کو بھی قلائد کہتے ہیں، اس لئے قلائد بھی قیام امن و سکون کا ایک ذریعہ بن گئے۔

اور اگر غور کیا جائے تو یہ تینوں چیزیں شہر حرام، ھدی اور قلائد سب کے سب بیت اللہ کے متعلقات میں سے ہیں، ان کا احترام بھی بیت اللہ ہی کے احترام کا ایک شعبہ ہے، خلاصہ یہ ہے کہ بیت اللہ اور اس کے متعلقات کو اللہ تعالیٰ نے پوری عالم انسانیت کے لئے عموماً و عرب اور اہلِ مکہ کے لئے خصوصاً ان کے تمام امور دین و دنیا دونوں کے لئے قیام و قوام بنا دیا ہے۔

قِیٰمًا لِّلنَّاسِ کی تفسیر میں بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ بیت اللہ اور حرمِ محترم سب کے لئے جائے امن بنا دیا گیا ہے، بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد اہل مکہ کے لئے وسعت رزق ہے، کہ باوجودیکہ اس زمین میں کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی، مگر اللہ تعالیٰ دنیا بھر کی چیزیں وہاں پہنچاتے رہتے ہیں۔

بعض نے کہا کہ اہل مکہ جو کہ بیت اللہ کے خدام و محافظ کہلاتے تھے اُن کو لوگ اللہ والے سمجھ کر ہمیشہ ان کی تعظیم کا معاملہ کرتے تھے، قِیٰمًا لِّلنَّاسِ سے اُن کا یہ خاص اعزاز مراد ہے۔

امام عبد اللہ رازیؒ نے فرمایا کہ ان سب اقوال میں کوئی اختلاف نہیں لفظ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ کے مفہوم میں یہ سب چیزیں داخل ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو سب لوگوں کے لئے بقا و قیام اور معاش و معاد کی صلاح و فلاح کا ذریعہ بنایا ہے، اور اہلِ عرب اور اہلِ مکہ کو خصوصیت کے ساتھ اس کی برکاتِ ظاہرہ و باطنہ سے نوازا ہے۔

ٹ

١٦

آخر آیت میں ارشاد فرمایا ذٰلِکَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ یعنی ہم نے بیت اللہ کو اور اس کے متعلقات کو لوگوں کے لئے ذریعہ امن وامان اور قیام و بقاء بنادیا ہے جس کا مشاہدہ اہل عرب خصوصیت کے ساتھ کرتے رہتے ہیں، یہ اس لئے کیا گیا کہ سب لوگ یہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کی ہر چیز کو پورا پورا جانتے ہیں اور وہی اس کا انتظام کرسکتے ہیں۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا گیا اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ یعنی سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب والے ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ بہت مغفرت کرنے والے رحم فرمانے والے ہیں، اس میں تنبیہ کردی کہ جو احکام حلال وحرام کے دیئے گئے ہیں وہ عین حکمت ومصلحت ہیں ان کی تعمیل ہی میں تمہارے لئے خیر ہے، اُن کی خلاف ورزی سخت وبال ومصائب ہے، ساتھ ہی یہ بھی بتلادیا کہ انسانی بھول اور غفلت سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو اللہ تعالیٰ فوراً عذاب نہیں دیتے، بلکہ توبہ کرنے والوں اور شرمندہ ہونے والوں کے لئے مغفرت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

تیسری آیت میں ارشاد فرمایا: مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ، وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَکْتُمُوْنَ یعنی ہمارے رسول کے ذمہ تو اتنا ہی کام ہے کہ ہمارے احکام مخلوق کو پہنچادیں، پھر وہ نہ مانیں اس کا نفع وضرر انہی کو پہنچتا ہے، ان کی نافرمانی سے ہمارے رسول کا کچھ نقصان نہیں، اور یہ بھی سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی فریب نہیں دیا جاسکتا، وہ تمہارے ظاہر وباطن اور کھلے اور چھپے ہر کام سے واقف ہیں۔

چوتھی آیت میں ارشاد فرمایا: قُلْ لَّا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ، عربی زبان میں طیب اور خبیث دو متقابل لفظ ہیں، طیب ہر چیز کے عمدہ اور جید کو اور خبیث ہر چیز کے ردی اور خراب کو کہا جاتا ہے، اس آیت میں اکثر مفسرین کے نزدیک خبیث سے مراد حرام یا ناپاک ہے، اور طیب سے مراد حلال اور پاک، معنی آیت کے یہ ہوگئے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلکہ ہر عقل سلیم کے نزدیک پاک و ناپاک یا حلال وحرام برابر نہیں ہوسکتے۔

اس جگہ لفظ خبیث اور طیب اپنے عموم کے اعتبار سے حرام وحلال مال ودولت کو بھی شامل ہے، اور اچھے بُرے انسانوں کو بھی اور بھلے بُرے اعمال واخلاق کو بھی مطلب آیت کا واضح ہے کہ کسی عقل سلیم کے نزدیک نیک وبد اور بھلا بُرا برابر نہیں ہوتا اسی فطری قانون کے مطابق اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال وحرام یا پاک وناپاک چیزیں

برابر نہیں اسی طرح اچھے اور بُرے اعمال و اخلاق برابر نہیں، اسی طرح نیک و بد انسان برابر نہیں۔

آگے ارشاد فرمایا وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ یعنی اگرچہ دیکھنے والوں کو بعض اوقات خراب اور خبیث چیزوں کی کثرت مرعوب کر دیتی ہے، اور گرد و پیش میں خبیث و خراب چیزوں کے پھیل جانے اور غالب آجانے کے سبب انہی کو اچھا سمجھنے لگتے ہیں، مگر یہ انسانی علم و شعور کی بیماری اور احساس کا قصور ہوتا ہے۔

آیت کا شانِ نزول | آیت کے شانِ نزول کے متعلق بعض روایات میں ہے کہ جب اسلام میں شراب کو حرام اور اس کی خرید و فروخت کو بھی ممنوع قرار دیدیا گیا تو ایک شخص جس کا کاروبار شراب فروشی کا تھا، اور اس ذریعہ سے اس نے کچھ مال جمع کر رکھا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! یہ مال جو شراب کی تجارت سے میرے پاس جمع ہوا ہے اگر میں اس کو کسی نیک کام میں خرچ کر دوں تو کیا وہ میرے لئے مفید ہوگا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم اس کو حج یا جہاد وغیرہ میں خرچ کرو گے تو وہ اللہ کے نزدیک مچھر کے ایک پر کے برابر بھی قیمت نہ رکھے گا، اللہ تعالیٰ پاک اور حلال چیز کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں فرماتے۔

حرام مال کی یہ بے توقیری تو آخرت کے اعتبار سے ہوئی، اور اگر گہری نظر سے معائنہ کیا جائے اور سب کاموں کے آخری انجام کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے کاروبار میں بھی حلال و حرام مال برابر نہیں ہوتے، حلال سے جتنے فوائد اور اچھے نتائج اور حقیقی آرام و راحت نصیب ہوتی ہے وہ کبھی حرام سے نہیں ہوتی۔

تفسیر درمنثور میں بحوالہ ابن ابی حاتم نقل کیا ہے کہ زمانہ تابعین کے خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جب سابق امراء کے زمانہ کے عائد کئے ہوئے ناجائز ٹیکس بند کئے، اور جن لوگوں سے ناجائز طور پر اموال لئے گئے وہ واپس کئے اور سرکاری بیت المال خالی ہوگیا اور آمدنی بہت محدود ہوگئی، تو ایک صوبہ کے گورنر نے ان کی خدمت میں خط لکھا کہ بیت المال کی آمدنی بہت گھٹ گئی ہے، فکر ہے کہ حکومت کے کاروبار کس طرح چلیں گے، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جواب میں یہی آیت تحریر فرمادی، لَا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ، اور لکھا کہ تم سے پہلے لوگوں نے ظلم و جور کے ذریعہ جتنا خزانہ جمع کیا تھا تم اس کے بالمقابل عدل و انصاف قائم کرکے اپنے خزانہ کو کم کر لو اور کوئی پروا نہ کرو، ہماری حکومت کے کام اسی کم

تُبْدَ لَكُمْ ۚ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿١٠١﴾ قَدْ سَأَلَهَا

تو تم پر ظاہر کر دی جاویں بری لگیں، اللہ نے ان سے درگذر کی ہے اور اللہ بخشنے والا تحمل والا ہے، ایسی باتیں پوچھ چکی ہے

قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ ﴿١٠٢﴾ مَا جَعَلَ اللَّهُ

ایک جماعت تم سے پہلے پھر ہو گئے ان باتوں سے منکر، نہیں مقرر کیا اللہ نے

مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ وَلَا حَامٍ ۙ وَلَٰكِنَّ

بحیرہ اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حامی، ولیکن

الَّذِينَ كَفَرُوا يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۖ وَأَكْثَرُهُمْ

کافر باندھتے ہیں اللہ پر بہتان اور ان میں اکثروں کو

لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٠٣﴾

عقل نہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو ایسی (فضول) باتیں مت پوچھو (جن میں یہ احتمال ہو کہ) اگر تم سے ظاہر کر دی جاویں تو تمہاری ناگواری کا سبب ہو (یعنی یہ احتمال ہو کہ جواب تمہاری منشاء کے خلاف آیا تو تمہیں ناگوار ہوگا) اور (جن میں یہ احتمال ہو کہ) اگر تم زمانہ نزول قرآن (وحی) میں ان باتوں کو پوچھو تو تم سے ظاہر کر دی جاویں (یعنی سوال کرنے میں تو یہ دوسرا احتمال ہو کہ جواب مل جائے اور جواب ملنے میں وہ پہلا احتمال ہو کہ ناگوار گذرے، اور یہ دونوں احتمال جو مجموعی طور پر علت ممانعت سوال کی ہیں واقعی ہیں پس ایسا سوال ممنوع ہے، البتہ جو ایسے) سوالات گذشتہ (جو اس وقت تک کر چکے ہو وہ تو) اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیئے، (مگر آئندہ مت کرنا) اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے ہیں (اس لئے گذشتہ سوالات معاف کر دیئے) اور بڑے حلم والے ہیں (اس لئے اگر آئندہ کے خلاف ورزی پر دنیا میں سزا نہ دے تو دھوکہ میں مت پڑ جانا کہ آگے بھی کوئی عذاب و سزا نہ ہوگی) ایسی باتیں تم سے پہلے (زمانہ میں) اور (امتوں کے) لوگوں نے بھی (اپنے پیغمبروں سے) پوچھی تھیں پھر (ان کو جواب ملا تو) ان باتوں کا حق نہ بجا لائے (یعنی ان جوابوں میں جو متعلق احکام کے تھے ان کے موافق عمل نہ کیا، اور جو متعلق واقعات کے تھے ان سے متاثر نہ ہوئے، پس کہیں تم کو بھی ایسی ہی نوبت نہ پیش آئے، اس لئے بہتری اسی میں ہے کہ ایسے

سوالات چھوڑو۔ (اللہ تعالیٰ نے نہ بحیرہ کو مشروع کیا ہے اور نہ سائبہ کو اور نہ وصیلہ کو اور نہ حامی کو لیکن جو لوگ کافر ہیں وہ ان رسوم کے پابند ہیں، اللہ تعالیٰ پر جھوٹ لگاتے ہیں (کہ خدا تعالیٰ ان اعمال سے خوش ہیں) اور اکثر کافر (دین کی) عقل نہیں رکھتے اور اس سے کام نہیں لیتے بلکہ محض اپنے بڑوں کی دیکھا دیکھی یہ جہالتیں کرتے ہیں)

معارف ومسائل

بے ضرورت سوال کرنے کی ممانعت | ان آیات میں اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ بعض لوگوں کو احکام الٰہیہ میں بلا ضرورت تدقیق و بال کی کھال نکالنے کا شوق ہوتا ہے، اور جو احکام نہیں دیئے گئے ان کے متعلق بغیر کسی داعیۂ ضرورت کے سوالات کیا کرتے ہیں، اس آیت میں ان کو یہ ہدایت دی گئی کہ وہ ایسے سوالات نہ کریں جن کے نتیجہ میں ان پر کوئی مشقت پڑ جائے **یا ان کو خفیہ رازوں کے اظہار سے رسوائی ہو۔**

شان نزول | ان آیات کا شان نزول مسلم کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ جب حج کی فرضیت نازل ہوئی تو اقرع بن حابسؓ نے سوال کیا کہ کیا ہر سال ہمارے ذمہ حج فرض ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سوال کا جواب نہ دیا، تو مکرر سوال کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی سکوت فرمایا، انھوں نے تیسری مرتبہ پھر سوال کیا، تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عتاب کے ساتھ تنبیہ فرمائی کہ اگر میں تمہارے جواب میں یہ کہہ دیتا کہ ہاں ہر سال حج فرض ہے تو ایسا ہی ہو جاتا اور پھر تم اس کو پورا نہ کر سکتے، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جن چیزوں کے متعلق میں تمہیں کوئی حکم نہ دوں ان کو اسی طرح رہنے دو، ان میں کھود کرید کر کے سوالات نہ کرو، تم سے پہلے بعض امتیں اسی کثرت سوال کے ذریعہ ہلاک ہو چکی ہیں، کہ جو چیزیں اللہ اور اس کے رسول نے فرض نہیں کی تھیں سوال کر کر کے ان کو فرض کرا لیا اور پھر اس کی خلاف ورزی میں مبتلا ہو گئے، تمہارا وظیفہ یہ ہونا چاہئے کہ جس کام کا میں حکم دوں اس کو مقدور بھر پورا کرو اور جس چیز سے منع کر دوں اس کو چھوڑ دو (مراد یہ ہے کہ جن چیزوں سے سکوت کیا جائے ان کے متعلق کھود کرید نہ کرو)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت اور سلسلہ وحی ختم ہے | اس آیت میں ایک ضمنی جملہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا گیا کہ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ، یعنی نزول قرآن کے زمانہ میں اگر تم ایسے سوالات کرو گے تو بذریعہ وحی ان کا جواب آجائے گا، اس میں نزول قرآن کے زمانہ کے ساتھ مقید کر کے اس کی طرف اشارہ فرما دیا کہ نزول قرآن

کی تکمیل کے بعد نبوت و وحی کا سلسلہ بند کر دیا جائے گا۔

ختم نبوت اور سلسلۂ وحی کے انقطاع کے بعد ایسے سوالات کا اگرچہ یہ اثر نہ ہوگا کہ نئے احکام آجائیں جو چیزیں فرض نہیں ہیں وہ فرض ہوجائیں یا بذریعہ وحی کسی کا مخفی راز آشکارا ہوجائے لیکن بے ضرورت سوالات گھڑ گھڑ کر ان کی تحقیقات میں پڑنا یا بے ضرورت چیزوں کے متعلق سوالات کرنا بعد انقطاع نبوت کے بھی مذموم اور ممنوع ہی رہے گا، کیونکہ اس میں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيْهِ یعنی مسلمان ہونے کی ایک خوبی یہ ہے کہ آدمی فضول باتوں کو چھوڑ دیتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بہت سے مسلمان جو بالکل فضول چیزوں کی تحقیق میں لگے رہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا کیا نام تھا، اور نوح علیہ السلام کی کشتی کا طول و عرض کیا تھا جن کا کوئی اثر انسان کے عمل پر نہیں، ایسے سوالات کرنا مذموم ہے خصوصاً جبکہ یہ بھی معلوم ہو کہ ایسے سوالات کرنے والے حضرات اکثر ضروری اور اہم مسائل دین سے بے خبر ہوتے ہیں، فضول کاموں میں پڑنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ آدمی ضروری کاموں سے محروم ہوجاتا ہے، رہا یہ معاملہ کہ حضرات فقہاء نے خود ہی بہت سی مفروضہ صورتیں مسائل کی نکال کر اور سوالات قائم کر کے ان کے احکام بیان کر دیئے ہیں سو یہ بے ضرورت چیز نہ تھی آنے والے واقعات نے بتلا دیا کہ آئندہ نسلوں کو ان کی ضرورت تھی، اس لئے وہ فضول اور لایعنی سوالات نہ تھے۔ اسلام کی تعلیمات میں یہ بھی ایک تعلیم ہے کہ علم ہو یا عمل کوئی کام ہو یا کلام جب تک اس میں کوئی دینی یا دنیوی فائدہ پیش نظر نہ ہو اس میں لگ کر وقت ضائع نہ کریں۔

بحیرہ، سائبہ وغیرہ کی تعریف: بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حامی، یہ سب زمانہ جاہلیت کے رسوم و شعائر سے متعلق ہیں، مفسرین نے ان کی تفسیر میں بہت اختلاف کیا ہے، ممکن ہو ان میں سے ہر ایک لفظ کا اطلاق مختلف صورتوں پر ہوتا ہو، ہم صرف سعید بن المسیب کی تفسیر صحیح بخاری سے نقل کرتے ہیں۔

بحیرہ: جس جانور کا دودھ بتوں کے نام پر وقف کر دیتے تھے، کوئی اپنے کام میں نہ لاتا تھا۔

سائبہ: جو جانور بتوں کے نام پر ہمارے زمانہ کے سانڈ کی طرح چھوڑ دیا جاتا تھا۔

حامی: نر اونٹ جو ایک خاص عدد سے جفتی کر چکا ہو اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔

وصیلہ: جو اونٹنی مسلسل مادہ بچے جنے درمیان میں نر بچہ پیدا نہ ہو اسے بھی بتوں کے

خلاصۂ تفسیر

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام نازل فرمائے ہیں ان کی طرف اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف (جن پر وہ احکام نازل ہوئے ہیں) رجوع کرو (تاکہ اس سے حق ثابت ہو حق سمجھو اور جو باطل ہو باطل سمجھو) تو کہتے ہیں کہ ہم کو (ان احکام اور رسول کی ضرورت نہیں ہم کو) وہی (طریقہ) کافی ہے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو دیکھا ہے (حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) کیا (وہ طریقہ ان کے لئے ہر حال میں کافی ہے) گو ان کے بڑے (دین کی) نہ کچھ سمجھ رکھتے ہوں اور نہ (کسی آسمانی کتاب کی) ہدایت رکھتے ہوں۔ اے ایمان والو اپنی (اصلاح کی) فکر کرو (اصل کام تمہارے ذمہ یہ ہے باقی دوسروں کی اصلاح کے متعلق یہ ہے کہ جب تم اپنی طرف سے اپنی قدرت کے مطابق اصلاح کی سعی کر رہے ہو مگر دوسرے پر اثر نہیں ہوتا تو تم اثر مرتب نہ ہونے کی فکر میں نہ پڑو کیونکہ) جب تم (دین کی) راہ پر چل رہے ہو (اور واجباتِ دین کو ادا کر رہے ہو اس طرح کہ اپنی بھی اصلاح کر رہے ہو اور دوسروں کی اصلاح میں بھی کوشش کر رہے ہو) تو جو شخص (باوجود تمہاری سعیِ اصلاح کے بھی) گمراہ رہے تو اس (کے گمراہ رہنے) سے تمہارا کوئی نقصان نہیں (اور جیسا اصلاح وغیرہ میں حد سے زیادہ فکر و غم سے منع کیا جاتا ہے ایسے ہی ہدایت سے ناامید ہونے کی صورت میں غصہ میں آ کر دنیا ہی میں ان پر عذاب نازل ہونے کی تمنا بھی ممنوع ہے کیونکہ حق و باطل کا مکمل فیصلہ تو آخرت میں ہوگا چنانچہ) اللہ ہی کے پاس تم سب کو جانا ہے پھر وہ تم سب کو بتلا دیں گے جو کچھ تم سب کیا کرتے تھے (اور جتلا کر حق پر ثواب اور باطل پر عذاب کا حکم نافذ فرمادیں گے)۔

معارف و مسائل

آیت کا شانِ نزول جاہلیت کی رسموں میں ایک تقلید آبائی بھی تھی، جس نے ان کو ہر برائی میں مبتلا اور ہر بھلائی سے محروم رکھا تھا، تفسیر درمنثور میں بحوالہ ابن ابی حاتم نقل کیا ہے کہ ان میں سے کوئی خوش نصیب اگر حق بات کو مان کر مسلمان ہو جاتا تو اس کو یوں عار دلائی جاتی تھی کہ تو نے اپنے باپ دادوں کو بیوقوف سمجھا، کہ ان کے طریق کو چھوڑ کر دوسرا طریق اختیار کر لیا۔

ان کی اس گمراہی در گمراہی پر یہ آیت نازل ہوئی، وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَاۗءَنَا. یعنی جب ان کو کہا جاتا کہ تم اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حقائق اور احکام اور رسول کی طرف رجوع کرو جو ہر حیثیت سے حکمت و

مصلحت اور تمہارے صلاح و فلاح کے ضامن ہیں تو ان کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہیں ہوتا کہ ہم کو تو وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا۔

یہ وہ شیطانی استدلال ہے جس نے اکثر انسانوں کو معمولی سمجھ بوجھ اور علم و ہنر رکھنے کے باوجود گمراہ کیا، قرآن کریم نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا، غور کرنے والوں کے لئے قرآن کے اس ایک جملے نے کسی شخص یا جماعت کی اقتدا کرنے کا ایک صحیح اصول بیان کرکے اندھوں کے لئے بینائی کا اور جاہل و غافل کے لئے انکشافِ حقیقت کا مکمل سامان فراہم کر دیا ہے، وہ یہ کہ یہ بات تو معقول ہے کہ نہ جاننے والے جاننے والوں کی، ناواقف لوگ واقف کاروں کی پیروی کریں، جاہل آدمی عالم کی اقتدا کرے، لیکن یہ کوئی معقول بات نہیں کہ علم و عقل اور ہدایت کے معیار سے ہٹ کر اپنے باپ دادا یا کسی بھی برادری کی اقتدا کو اپنا طریقہ کار بنا لیا جائے، اور بغیر یہ جانے ہوئے کہ یہ مقتدا خود کہاں جا رہا ہے، اور ہمیں کہاں پہنچائے گا اس کے پیچھے لگ لیا جائے۔

اسی طرح بعض لوگ کسی کے اتباع و تقلید کا معیار لوگوں کی بھیڑ کو بنا لیتے ہیں جس طرف یہ بھیڑ دیکھی اسی طرف چل پڑے، یہ بھی ایک نامعقول حرکت ہے، کیونکہ اکثریت تو ہمیشہ دنیا میں بیوقوفوں یا کم عقلوں کی اور عمل کے لحاظ سے بدعملوں کی رہتی ہے، اس لئے لوگوں کی بھیڑ حق و ناحق یا بھلے برے کی تمیز کا معیار نہیں ہو سکتی۔

جہالت کو مقتدا بنانا ہلاکت کو دعوت دینا ہے

قرآن کریم کے اس جملے نے سب کو ایک واضح حکمت کا سبق دیا کہ ان میں سے کوئی چیز مقتدا و پیشوا بنانے کے لئے ہرگز کافی نہیں، بلکہ ہر انسان پر سب سے پہلے تو یہ لازم ہے کہ اپنی زندگی کا مقصد اور اپنے سفر کا رُخ متعین کرے، پھر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ دیکھے کہ کون ایسا انسان ہے جو اس مقصد کا راستہ جاننے والا بھی ہو اور اس راستہ پر چل بھی رہا ہو، جب کوئی ایسا انسان مل جائے تو بے شک اس کے پیچھے لگ لینا اس کو منزلِ مقصود پر پہنچا سکتا ہے، یہی حقیقت ہے ائمہ مجتہدین کی تقلید کی کہ وہ دین کو جاننے والے بھی ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی، اس لئے نہ جاننے والے ان کا اتباع کرکے دین کے مقصد یعنی اتباعِ خدا اور رسول کو حاصل کر سکتے ہیں، اور جو گم کردہ راہ ہو، منزلِ مقصود کو خود بھی نہ جانتا ہو یا جان بوجھ کر منزل کے خلاف سمت چل رہا ہو اس کے پیچھے چلنا ہر عقلمند کے نزدیک اپنی سعی و عمل کو ضائع کرنا، بلکہ اپنی ہلاکت کو دعوت دینا ہے، اس علم و حکمت اور روشن خیالی کے زمانہ میں بھی افسوس ہے کہ لکھے پڑھے ہوش و عقل والے لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کئے ہوئے ہیں، اور آج کی بربادی

اور تباہی کا سب سے بڑا سبب غلط اور غلط مقتداؤں اور لیڈروں کے پیچھے چلنا ہے۔

مقتدا کا معیار

قرآن کریم کے اس جملے نے اقتدا کا نہایت معقول اور واضح معیار دو چیزوں کو بنایا ہے، علم اور اہتداء، علم سے مراد منزلِ مقصود اور اس تک پہونچنے کے طریقوں کا جاننا ہے، اور اہتداء سے مراد اس مقصد کی راہ پر چلنا، یعنی صحیح علم پر عمل مستقیم۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جس شخص کو مقتدا بناؤ تو پہلے یہ دیکھو کہ جس مقصد کے لئے اس کو مقتدا بنایا ہے وہ اس مقصد اور اس کے طریق سے پوری طرح واقف بھی ہے یا نہیں، پھر یہ دیکھو کہ وہ اس کی راہ پر چل بھی رہا ہے؟ اور اس کا عمل اپنے علم کے مطابق ہے یا نہیں؟

غرض کسی کو مقتدا بنانے کے لئے علم صحیح اور عمل مستقیم کے معیار سے جانچنا ضروری ہے، محض باپ دادا ہونا یا بہت سے لوگوں کا لیڈر ہونا، یا صاحبِ مال و دولت ہونا یا صاحبِ حکومت و سلطنت ہونا ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو معیارِ اقتدار سمجھا جائے۔

کسی پر تنقید کرنے کا مؤثر طریقہ

قرآن کریم نے اس جگہ تقلیدِ آبائی کے خوگر لوگوں کی غلطی کو واضح فرمایا، اور اس کے ساتھ ہی کسی دوسرے پر تنقید اور اس کی غلطی ظاہر کرنے کا ایک خاص مؤثر طریقہ بھی بتلا دیا جس سے مخاطب کی دل آزاری یا اس کو اشتعال نہ ہو کیونکہ دینِ آبائی کی تقلید کرنے والوں کے جواب میں یوں نہیں فرمایا کہ تمہارے باپ دادا جاہل یا گمراہ ہیں، بلکہ ایک سوالیہ عنوان بنا کر ارشاد فرمایا کہ کیا باپ دادا کی پیروی اس حالت میں بھی کوئی معقول بات ہو سکتی ہے جب کہ باپ دادا نہ علم رکھتے ہوں نہ عمل۔

اصلاحِ خلق کی فکر کرنے والوں کو ایک تسلی

دوسری آیت میں اصلاحِ خلق کی فکر میں سب کچھ قربان کرنے والے مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ جب تم نے حق کی تبلیغ و تعلیم میں مقدور بھر کوشش کر لی، اور نصیحت و خیر خواہی کا حق ادا کر دیا، تو پھر بھی اگر کوئی گمراہی پر جما رہے تو تم اس کی فکر میں نہ پڑو، اس حالت میں دوسروں کی گمراہی یا غلط کاری سے تمہارا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ ارشاد فرمایا:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ عَلَيۡكُمۡ أَنفُسَكُمۡۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا ٱهۡتَدَيۡتُمۡۚ

یعنی اے مسلمانو تم اپنی فکر کرو، جب تم راہ پر چل رہے ہو تو جو شخص گمراہ رہے تو اس سے تمہارا کوئی نقصان نہیں۔

اس آیت کے ظاہری الفاظ سے چونکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر انسان کو صرف اپنے عمل اور اپنی اصلاح کی فکر کافی ہے، دوسرے کچھ بھی کرتے رہیں اُس پر دھیان دینے کی ضرورت

نہیں اور یہ بات قرآن کریم کی بے شمار تصریحات کے خلاف ہے، جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اسلام کا اہم فریضہ اور اس امت کی امتیازی خصوصیت قرار دیا ہے۔ اسی لئے اس آیت کے نازل ہونے پر کچھ لوگوں کو شبہات پیش آئے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کئے گئے، آپ نے توضیح فرمائی کہ یہ آیت احکام امر بالمعروف کے منافی نہیں، امر بالمعروف کو چھوڑ دوگے تو مجرموں کے ساتھ تم بھی ماخوذ ہوگے۔ اسی لئے تفسیر بحر محیط میں حضرت سعید بن جبیرؓ سے آیت کی یہ تفسیر نقل کی ہے کہ تم اپنے واجبات شرعیہ کو ادا کرتے رہو جن میں جہاد اور امر بالمعروف بھی داخل ہے، یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی جو لوگ گمراہ رہیں تو تم پر کوئی نقصان نہیں۔ قرآن کریم کے الفاظ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ میں غور کریں، تو یہ تفسیر خود واضح ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم راہ پر چل رہے ہو تو دوسروں کی گمراہی تمہارے لئے مضر نہیں، اور ظاہر ہے کہ جو شخص امر بالمعروف کے فریضہ کو ترک کر دے وہ راہ پر نہیں چل رہا ہے۔

تفسیر درمنثور میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کے سامنے کسی نے یہ سوال کیا کہ فلاں فلاں حضرات میں باہمی سخت جھگڑا ہے، ایک دوسرے کو مشرک کہتے ہیں، تو ابن عمرؓ نے فرمایا کہ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تمہیں کہہ دوں گا کہ جاؤ ان لوگوں سے قتال کرو، ہرگز نہیں، جاؤ ان کو نرمی کے ساتھ سمجھاؤ، قبول کریں تو بہتر اور نہ کریں تو ان کی فکر چھوڑ کر اپنی فکر میں لگ جاؤ، پھر یہی آیت آپ نے جواب کی شہادت میں تلاوت فرمائی۔

گناہوں کی روک تھام کے بارے میں حضرت صدیق اکبرؓ کا ایک خطبہ آیت کے ظاہری الفاظ سے سرسری نظر میں جو شبہ ہو سکتا تھا اس کے پیش نظر حضرت صدیق اکبرؓ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ تم لوگ اس آیت کو پڑھتے ہو اور اس کو بے موقع استعمال کرتے ہو، کہ امر بالمعروف کی ضرورت نہیں، خوب سمجھ لو کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ جو لوگ کوئی گناہ ہوتا ہوا دیکھیں اور باوجود قدرت کے اس کو روکنے کی کوشش نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرموں کے ساتھ ان دوسرے لوگوں کو بھی عذاب میں پکڑ لے۔

یہ روایت ترمذی، ابن ماجہ میں موجود ہے اور ابوداؤد کے الفاظ میں اس طرح ہے کہ جو لوگ کسی ظالم کو ظلم کرتے ہوئے دیکھیں اور اس کو ظلم سے (اپنی قدرت کے موافق) نہ روکیں تو اللہ تعالیٰ سب کو عذاب میں پکڑ لیں گے۔

معروف اور منکر کے معنی گزشتہ تفصیل سے یہ بات معلوم ہو چکی کہ ہر مسلمان پر یہ لازم ہے کہ وہ منکر یعنی ناجائز امور کی روک تھام کرے یا کم از کم ان سے اظہار نفرت کرے۔ اب یہ

معلوم کیجئے کہ معروف اور منکر کس کو کہتے ہیں۔

لفظ معروف، معرفہ سے، اور منکر انکار سے ماخوذ ہے، معرفہ کہتے ہیں کسی چیز کو غور و فکر کرکے سمجھنے یا پہچاننے کو، اس کے بالمقابل انکار کہتے ہیں نہ سمجھنے یا نہ پہچاننے کو، یہ دونوں لفظ متقابل سمجھے جاتے ہیں، قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد ہے: يَعْرِفُونَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا یعنی اللہ کی قدرت کاملہ کے مظاہر دیکھ کر اس کی نعمتوں کو پہچانتے ہیں مگر پھر از روئے عناد انکار کرتے ہیں، گویا ان نعمتوں کو جانتے نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ لغوی معنی کے اعتبار سے معروف کے معنی پہچانی ہوئی چیز کے ہیں، اور منکر کے معنی نا پہچانی ہوئی چیز کے، امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں اسی کی مناسبت سے اصطلاح شرع میں معروف و منکر کے یہ معنی بیان فرمائے ہیں کہ معروف اس فعل کو کہا جاتا ہے جس کا مستحسن یعنی اچھا ہونا عقل یا شرع سے پہچانا ہوا ہو، اور منکر ہر اس فعل کا نام ہے جو از روئے عقل و شرع اوپرا اور ناپہچانا ہوا ہو، یعنی بُرا سمجھا جاتا ہو، اس لئے امر بالمعروف کے معنی اچھے کام کی طرف بلانے کے اور نہی عن المنکر کے معنی بُرے کام سے روکنے کے ہو گئے۔

ائمہ مجتہدین کے مختلف اقوال میں کوئی منکر شرعی نہیں ہوتا

لیکن اس جگہ گناہ و ثواب یا طاعت و معصیت کے بجائے معروف و منکر کا لفظ استعمال کرنے میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ وہ دقیق و اجتہادی مسائل جن میں قرآن و سنت کے اجمال یا ابہام کی وجہ سے دو رائیں ہو سکتی ہیں، اور اسی بناء پر ان میں فقہاء امت کے اقوال مختلف ہیں، وہ اس دائرہ سے خارج ہیں، ائمہ مجتہدین جن کی شان اجتہاد علماء امت میں مسلّم ہے، اگر کسی مسئلہ میں ان کے دو مختلف قول ہوں تو ان میں سے کسی کو بھی منکر شرعی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ اس کی دونوں جانبیں معروف میں داخل ہیں، ایسے مسائل میں ایک رائے کو راجح سمجھنے والے کے لئے یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے پر ایسا انکار کرے جیسا کہ گناہ پر کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ و تابعین میں بہت سے اجتہادی اختلافات اور متضاد اقوال کے باوجود یہ کہیں منقول نہیں کہ وہ ایک دوسرے پر فسق یا گنہگار ہونے کا فتویٰ لگاتے ہوں، بحث و تمحیص اور مناظرے و مکالمے سب کچھ ہوتے تھے، اور ہر ایک اپنی رائے کی ترجیح کی وجوہ بیان کرتا اور دوسرے پر اعتراض کرتا تھا، لیکن کوئی کسی کو اس اختلاف کی وجہ سے گنہگار نہ سمجھتا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اجتہادی اختلاف کے موقع پر یہ تو ہر ذی علم کو اختیار ہے کہ جس جانب کو راجح سمجھے اسے اختیار کرے، لیکن دوسرے کے فعل کو منکر سمجھ کر اس پر انکار کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے، اس سے واضح ہوا کہ اجتہادی مسائل میں جنگ و جدل

یا منافرت پھیلانے والے مقالات و مضامین امر بالمعروف یا نہی عن المنکر میں داخل نہیں ان مسائل کو محاذِ جنگ بنانا صرف ناواقفیت یا جہالت ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ شَهَٰدَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ ٱلْمَوْتُ

اے ایمان والو گواہ درمیان تمہارے جب کہ پہنچے کسی کو تم میں موت،

حِينَ ٱلْوَصِيَّةِ ٱثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ أَوْ ءَاخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ

وصیت کے وقت دو شخص معتبر ہونے چاہئیں تم میں سے یا دو شاہد اور ہوں تمہارے سوا،

إِنْ أَنتُمْ ضَرَبْتُمْ فِى ٱلْأَرْضِ فَأَصَٰبَتْكُم مُّصِيبَةُ ٱلْمَوْتِ ۚ

اگر تم نے سفر کیا ہو ملک میں پھر پہنچے تم کو مصیبت موت کی،

تَحْبِسُونَهُمَا مِنۢ بَعْدِ ٱلصَّلَوٰةِ فَيُقْسِمَانِ بِٱللَّهِ إِنِ ٱرْتَبْتُمْ

تو کھڑا کرو ان دونوں کو بعد نماز کے وہ دونوں قسم کھاویں اللہ کی اگر تم کو شبہ پڑے کہیں

لَا نَشْتَرِى بِهِۦ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَٰدَةَ ٱللَّهِ

کہ ہم نہیں لیتے قسم کے بدلے مال اگرچہ کسی کو ہم سے قرابت بھی ہو اور ہم نہیں چھپاتے اللہ کی گواہی

إِنَّآ إِذًا لَّمِنَ ٱلْءَاثِمِينَ ﴿١٠٦﴾ فَإِنْ عُثِرَ عَلَىٰٓ أَنَّهُمَا ٱسْتَحَقَّآ إِثْمًا

نہیں تو ہم بے شک گنہگار ہیں، پھر اگر خبر ہو جاوے کہ وہ دونوں حق بات دبا گئے

فَـَٔاخَرَانِ يَقُومَانِ مَقَامَهُمَا مِنَ ٱلَّذِينَ ٱسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ

تو دو گواہ اور کھڑے ہوں ان کی جگہ ان میں سے کہ جن کا حق دبا ہے جو سب سے زیادہ

ٱلْأَوْلَيَٰنِ فَيُقْسِمَانِ بِٱللَّهِ لَشَهَٰدَتُنَآ أَحَقُّ مِن شَهَٰدَتِهِمَا

قریب ہوں میت سے پھر قسم کھاویں اللہ کی کہ ہماری گواہی تحقیقی ہے پہلوں کی گواہی سے

وَمَا ٱعْتَدَيْنَآ إِنَّآ إِذًا لَّمِنَ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿١٠٧﴾ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰٓ أَن

اور ہم نے زیادتی نہیں کی نہیں تو ہم بے شک ظالم ہیں، اس میں امید ہے کہ

يَأْتُوا۟ بِٱلشَّهَٰدَةِ عَلَىٰ وَجْهِهَآ أَوْ يَخَافُوٓا۟ أَن تُرَدَّ أَيْمَٰنٌۢ

ادا کریں شہادت کو ٹھیک طرح پر اور ڈریں کہ الٹی پڑے گی قسم ہماری ان کی

بَعْدَ أَيْمَٰنِهِمْ ۗ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَٱسْمَعُوا۟ ۗ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى

قسم کے بعد، اور ڈرتے رہو اللہ سے اور سن رکھو، اور اللہ نہیں چلاتا سیدھی

الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿١٠٨﴾
راہ پر نافرمانوں کو

ربطِ آیات اوپر مصالحِ دینیہ کے متعلق احکام تھے، آگے مصالحِ دنیویہ کے متعلق جزئی احکام کا ذکر کیا گیا ہے، اور اس میں اشارہ کر دیا کہ حق تعالیٰ اپنی رحمت سے مثل اصلاحِ معاد کے اپنے بندوں کی معاش کی اصلاح بھی فرماتے ہیں (بیان القرآن)

شانِ نزول آیات مذکورہ کے نزول کا واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص "بدیل" نامی جو مسلمان تھا دو شخصوں تمیم و عدی کے ساتھ جو اس وقت نصرانی تھے بغرض تجارت ملک شام کی طرف گیا، شام پہنچ کر بدیل بیمار ہو گیا، اس نے اپنے مال کی فہرست لکھ کر اسباب میں رکھ دی، اور اپنے دونوں رفیقوں کو اطلاع نہ کی، مرض جب زیادہ بڑھا، تو اس نے دونوں نصرانی رفقاء کو وصیت کی کہ کل سامان میرے وارثوں کو پہنچا دینا، انھوں نے سب سامان لا کر وارثوں کے حوالہ کر دیا، مگر چاندی کا ایک پیالہ جس پر سونے کا ملمع یا نقش و نگار تھا، اس میں سے نکال لیا، وارثوں کو فہرست اسباب میں سے دستیاب ہوئی، انھوں نے اوصیاء سے پوچھا کہ میت نے کچھ مال فروخت کیا تھا یا کچھ زیادہ بیمار رہا کہ معالجہ وغیرہ میں خرچ ہوا ہو، ان دونوں نے اس کا جواب نفی میں دیا، آخر معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا، چونکہ وارثوں کے پاس گواہ نہ تھے تو ان دونوں نصرانیوں سے قسم لی گئی کہ ہم نے میت کے مال میں کسی طرح کی خیانت نہیں کی، نہ کوئی چیز اس کی چھپائی، آخر قسم پر فیصلہ ان کے حق میں کر دیا گیا، کچھ مدت کے بعد ظاہر ہوا کہ وہ پیالہ ان دونوں نے مکہ میں کسی سنار کے ہاتھ فروخت کیا ہے، جب سوال ہوا تو کہنے لگے کہ ہم نے میت سے خرید لیا تھا، چونکہ خریداری کے گواہ موجود نہ تھے اس لئے ہم نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا، مبادا ہماری تکذیب کر دی جائے۔

میت کے وارثوں نے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا، اب پہلی صورت کے برعکس اوصیاء خریداری کے مدعی اور وارث منکر تھے، شہادت موجود نہ ہونے کی وجہ سے وارثوں میں سے دو شخصوں نے جو میت سے قریب تر تھے قسم کھائی کہ پیالہ میت کی ملک تھا، اور یہ دونوں نصرانی اپنی قسم میں جھوٹے ہیں، چنانچہ جس قیمت پر انھوں نے فروخت کیا تھا (ایک ہزار درہم پر) وہ وارثوں کو دلائی گئی۔

مثلاً واقعہ آیت میں جس کو پہلے ذکر کر دیا گیا ہے، جب پیالہ مکہ میں ملا اور دونوں وصیوں نے دریافت کرنے پر میت سے خریدنے کا دعویٰ کیا جس سے میت سے لے لینے کا اقرار لازم آتا ہے، اور وہ ان کے پہلے قول کا مخالف ہے جس میں مطلقاً لینے ہی سے انکار کیا تھا، چونکہ اقرار بالمعنیٰ حجت ہی اس لئے ظاہراً ان کا خائن اور کاذب ہونا معلوم ہوا، تو ایسی صورت میں مقدمہ کا رُخ بدل جائے گا وصی جو کہ پہلے مدعا علیہ تھے اب خریدنے کے مدعی ہوگئے، اور ورثاء جو کہ پہلے مدعی خیانت کے تھے اب مدعا علیہ ہوگئے، اس لئے اب فیصلہ کی یہ صورت ہوگئی کہ اول وصیوں سے گواہ خریدنے کے طلب کئے جائیں، اور جب وہ گواہ پیش نہ کرسکیں تو ان (وارث) لوگوں میں سے جن کے مقابلہ میں (ان اوصیاء کی جانب سے) گناہ (مذکور) کا ارتکاب ہوا تھا اور (جو کہ شرعاً) مستحق میراث ہوں مثلاً صورت واقعہ آیت میں، دو شخص (تھے) جو سب (ورثہ) میں باعتبار (استحقاق میراث) قریب تر ہیں جہاں (حلف کے لئے) وہ دونوں وصی کھڑے ہوئے تھے (اب) یہ دونوں (حلف کے لئے) کھڑے ہوں پھر دونوں (اس طرح) خدا کی قسم کھاویں کہ (صیغہ حلف کے ساتھ یہ کہیں کہ) بالیقین ہماری یہ قسم (بوجہ اس کے کہ بالکل اشتباہ سے ظاہراً و حقیقۃً پاک ہے) ان دونوں (اوصیاء) کی اس قسم سے زیادہ راست ہے (کیونکہ اس کی حقیقت کا گو ہم کو علم نہیں، لیکن ظاہراً تو وہ مشتبہ ہوگئی) اور ہم نے (حق سے) ذرا تجاوز نہیں کیا (ورنہ) ہم (اگر ایسا کریں تو) اس حالت میں سخت ظالم ہوں گے، (کیونکہ پرایا مال جان بوجھ کر بلا اجازت لے لینا ظلم ہے، یہ بھی تغلیظ ہے جو حاکم کی رائے پر ہے، پھر اصل مضمون پر قسم لی جائے، جس کا صیغہ بوجہ اس کے کہ فعل غیر پر ہے یہ ہوگا کہ خدا کی قسم ہمارے علم میں میت نے ان مدعیوں کے ہاتھ جام فروخت نہیں کیا، اور چونکہ علم کی واقعیت وعدم واقعیت کی کوئی ظاہری سبیل نہیں ہوسکتی، اس لئے اس کی واقعیت پر زیادہ موکد قسم لی گئی، جیسا لفظ اَحَقّ دال ہے، جس کا حاصل یہ ہوا کہ اس کا مدار چونکہ ضمیر ہی پر ہے اس لئے قسم کھانا ہول کہ جب اس میں کذب ظاہری کا ثبوت نہیں ہوسکتا، اسی طرح حقیقت میں کذب بھی نہیں ہو، اور یہ قرینہ مفید ہے، کہ یہاں حلف علم پر ہے، اور چونکہ اس کا کذب بلا اقرار کبھی ثابت نہیں ہوسکتا، اس لئے اس میں جو حق تلفی ہوگی وہ اشد درجہ کا ظلم ہوگا، عجب نہیں کہ یہاں ظالمین اسی لئے کہا گیا ہو) یہ (قانون جو مجموعہ آیتین میں مذکور ہوا) بہت قریب ذریعہ ہے اس امر کا کہ وہ (اوصیاء) لوگ واقعہ کو ٹھیک طور پر ظاہر کریں (اگر بیہودگی مال زائد کی نہیں ہوئی قسم کھالیں، اور اگر ہوئی ہے تو گناہ سے ڈر کر انکار کر دیں) یہ حکمت تو تحلیف اوصیاء

آیات و روایات سے اطلاق ثابت ہے۔

مسئلہ: اگر مدعا علیہ کسی غیر کے فعل کے متعلق قسم کھاوے تو الفاظ یہ ہوتے ہیں کہ مجھ کو اس فعل کی اطلاع نہیں۔

مسئلہ: اگر میراث کے مقدمہ میں وارث مدعا علیہ ہوں تو جن کو شرعاً میراث پہنچتی ہے ان پر قسم آوے گی خواہ وہ واحد ہو یا متعدد، اور جو وارث نہیں ان پر قسم نہ ہوگی (بیان القرآن)

ایک کافر کی شہادت دوسرے کافر کے معاملہ میں قابل قبول ہے

قولہ تعالیٰ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ (الی قولہ) اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ۔ اس آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے تو دو ایسے آدمیوں کو وصی بناؤ جو تم میں سے ہوں اور نیک ہوں، اور اگر اپنی قوم کے آدمی نہیں ہیں تو غیر قوم یعنی کفار ہی کو بنا دو۔

اس سے امام ابوحنیفہؒ نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ کفار کی شہادت بعض کی بعض پر جائز ہے، کیونکہ اس آیت میں کفار کی شہادت مسلمانوں پر جائز قرار دی ہے، جیسا کہ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ سے ظاہر ہے، تو کفار کی شہادت بعض کی بعض پر بطریق اولیٰ جائز ہے، لیکن بعد میں آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ (الی قولہ) وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ، سے کفار کی شہادت مسلمانوں پر منسوخ ہوگئی، لیکن کفار کی بعض کی بعض پر اسی طرح باقی ہے۔ (قرطبی، احکام القرآن للجصاص)

امام صاحب کے مسلک کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ ایک یہودی نے زنا کیا تو اس کے لوگوں نے اس کا چہرہ سیاہ کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں پیش کیا آپ نے اس کی حالت دیکھ کر وجہ دریافت فرمائی تو انہوں نے کہا کہ اس نے زنا کیا ہے تو آپ نے گواہوں کی شہادت کے بعد اس کو رجم کرنے کا حکم دیا (جصاص)

جس شخص پر کسی کا حق ہو وہ اس کو قید کر سکتا ہے

قولہ تعالیٰ: تَحْبِسُوْنَهُمَا۔ اس آیت سے ایک اصول معلوم ہوا کہ جب آدمی پر کسی کا کوئی حق واجب ہو اس کو اس حق کی خاطر ضرورت کے وقت قید کیا جا سکتا ہے (قرطبی)

(قولہ تعالیٰ) مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ۔ صلوٰۃ سے عصر کی نماز مراد ہے، اس وقت کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت کی تعظیم اہل کتاب بہت کرتے تھے، جھوٹ بولنا ایسے وقت میں خصوصاً ان کے ہاں ممنوع تھا، اس سے معلوم ہوا کہ قسم میں کسی خاص وقت یا کسی مقام وغیرہ کی قید لگا کر تغلیظ کرنا جائز ہے (قرطبی)

مذکور ہو چکا جس سے مقصود اہل کتاب کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بعض مضامین سنانا ہے جن سے ان کی عبدیت کا اثبات اور الوہیت کی نفی ہے (اگرچہ اس مخاطبت کا وقوع قیامت میں ہوگا)

خلاصۂ تفسیر

وہ دن بھی کیسا ہولناک ہوگا جس روز اللہ تعالیٰ تمام پیغمبروں کو (مع ان کی امتوں کے) جمع کریں گے پھر (ان امتوں میں جو نافرمان ہوں گے بغرض توبیخ ان کے سنانے کو ان پیغمبروں سے) ارشاد فرمائیں گے کہ تم کو (ان امتوں کی طرف سے) کیا جواب ملا تھا، وہ عرض کریں گے کہ (ظاہری جواب تو ہم کو معلوم ہے اور اس کو بیان بھی کردیں گے، لیکن ان کے دل میں جو کچھ ہو اس کی) ہم کو کچھ خبر نہیں (اس کو آپ ہی جانتے ہیں کیونکہ) آپ بیشک پوشیدہ باتوں کے پورے جاننے والے ہیں (مطلب یہ کہ ایک دن ایسا ہوگا اور عمل والوں کی تفتیش ہوگی، اس لئے تم کو مخالفت و معصیت سے ڈرتے رہنا چاہئے اور اسی روز عیسیٰ علیہ السلام سے یہ خاص گفتگو ہوگی) جبکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ اے عیسیٰ بن مریم میرا انعام یاد کرو (تاکہ لذت تازہ ہو) جو تم پر اور تمہاری والدہ پر (مختلف اوقات میں مختلف صورتوں سے) ہوا ہے مثلاً جبکہ میں نے تم کو روح القدس (یعنی جبرئیل علیہ السلام) سے امداد اور تائید دی (اور) تم آدمیوں سے (دونوں حالتوں میں یکساں) کلام کرتے تھے (ماں کی) گود میں بھی اور بڑی عمر میں بھی (دونوں کلاموں میں کچھ تفاوت نہ تھا) اور جبکہ میں نے تم کو (آسمانی) کتابیں اور سمجھ کی باتیں اور بالخصوص توریت و انجیل تعلیم کیں اور جبکہ تم گارے سے ایک شکل بناتے تھے جیسے پرندہ کی شکل ہوتی ہے میرے حکم سے پھر تم اس (مصنوعی ہیئت) کے اندر پھونک مار دیتے تھے جس سے وہ (سچ مچ کا جاندار) پرندہ بن جاتا تھا میرے حکم سے اور تم اچھا کردیتے تھے مادرزاد اندھے کو اور برص (جذام) کے بیمار کو میرے حکم سے اور جبکہ تم مردوں کو (قبروں سے نکال کر اور جلا کر) کھڑا کرلیتے تھے میرے حکم سے اور جب کہ میں نے بنی اسرائیل (میں سے جو آپ کے مخالف تھے ان) کو تم سے (یعنی تمہارے قتل و ہلاک سے) باز رکھا جب انھوں نے تم کو ضرر پہنچانا چاہا جبکہ تم ان کے پاس (اپنی نبوت کی) دلیلیں (معجزات) لے کر آئے تھے پھر ان میں جو کافر تھے انھوں نے کہا تھا کہ یہ (معجزات) بجز کھلے جادو کے اور کچھ بھی نہیں۔

معارف ومسائل

قیامت میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے سوال: قولہ تعالیٰ، یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ، قیامت میں سب سے پہلے سوال ہوگا اگرچہ اول سے آخر تک پیدا ہونے والے تمام انسان ایک ہی میدان میں کھڑے ہوں گے، اور کسی خطہ، کسی ملک اور کسی زمانہ کا انسان موجود اس میدان میں حاضر ہوگا اور سب سے ان کے عمر بھر کے اعمال کا حساب لیا جائے گا، لیکن یہاں بیان خصوصیت کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا گیا، یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ یعنی اس دن کو یاد کرو جس دن اللہ تعالیٰ سب رسولوں کو حساب کے لئے جمع فرمائیں گے، مراد یہ ہے کہ جمع تو سارے عالم کو کیا جائے گا، مگر سب سے پہلے سوال انبیاء علیہم السلام سے ہوگا، تاکہ پوری مخلوق دیکھ لے، کہ آج کے دن کوئی حساب اور سوال وجواب سے مستثنیٰ نہیں، پیغمبروں سے جو سوال کیا جائے گا وہ یہ ہے کہ مَاذَآ اُجِبْتُمْ، یعنی جب آپ لوگوں نے اپنی اپنی امتوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے دین حق کی طرف بلایا تو ان لوگوں نے آپ کو کیا جواب دیا تھا؟ اور کیا انھوں نے آپ کے بتلائے ہوئے احکام پر عمل کیا؟ یا انکار ومخالفت؟

اس سوال کے مخاطب اگرچہ انبیاء علیہم السلام ہوں گے، لیکن درحقیقت سنانا ان کی امتوں کو مقصود ہوگا کہ امتوں نے جو اعمال نیک یا بد کئے ہیں ان کی شہادت سب سے پہلے ان کے رسولوں سے لی جائے گی، امتوں کے لئے یہ وقت بڑا نازک ہوگا، کہ وہ تو اس ہوش ربا ہنگامہ میں انبیاء علیہم السلام کی شفاعت کے متوقع ہوں گے، ادھر انبیاء علیہم السلام ہی سے ان کے متعلق یہ سوال ہو جائے گا تو ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کوئی غلط یا خلاف واقع بات تو کہہ نہیں سکتے، اس لئے مجرموں اور گنہگاروں کو اندیشہ یہ ہوگا کہ جب خود انبیاء علیہم السلام ہی ہمارے جرائم کے شاہد بنیں گے تو اب کون ہے جو کوئی شفاعت یا مدد کر سکے۔

انبیاء علیہم السلام اس سوال کا جواب یہ دیں گے قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۖ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ، یعنی ہمیں اُن کے ایمان وعمل کا کوئی علم نہیں، آپ خود ہی تمام غیب کی چیزوں سے پورے باخبر ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ: یہاں سوال یہ ہے کہ ہر رسول کی امت کے وہ لوگ جو اُن کی وفات کے بعد پیدا ہوئے ان کے بارے میں تو انبیاء علیہم السلام کا یہ جواب صحیح اور صاف ہے، کہ ان کے ایمان وعمل سے وہ باخبر نہیں، کیونکہ غیب کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں، لیکن ایک بہت بڑی تعداد امت میں ان لوگوں کی بھی تو ہے جو خود انبیاء علیہم السلام کی انتھک

کوششوں سے انہی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، اور پیغمبروں کے حکم کی پیروی ان کے سامنے کرتے رہے، اسی طرح وہ کافر جنہوں نے انبیاء کی بات نہ مانی اور مخالفت و دشمنی سے پیش آئے، ان کے بارے میں یہ کہنا کیسے صحیح ہوگا کہ ہمیں ان کے ایمان و عمل کا علم نہیں۔ تفسیر بحر محیط میں ہے کہ امام ابو عبداللہ رازی نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہاں دو چیزیں الگ الگ ہیں، ایک علم جس کے معنی یقین کامل کے ہیں، اور دوسرے ظن یعنی غالب گمان، اور ظاہر ہے کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کے ساتھ ہونے کے باوجود اس کے ایمان و عمل کی گواہی گر دے سکتا ہے، تو محض ظن یعنی غالب گمان کے اعتبار سے دے سکتا ہے، ورنہ دلوں کا راز اور حقیقی ایمان جس کا تعلق دل سے ہے وہ تو کسی کو یقینی طور پر بغیر وحی الٰہی کے معلوم نہیں ہو سکتا، ہر امت میں منافقین کے گروہ رہے ہیں، جو ظاہر میں ایمان بھی لاتے تھے اور احکام کی پیروی بھی کرتے تھے، مگر ان کے دلوں میں ایمان نہ تھا، اور نہ پیروی کا کوئی جذبہ، وہاں جو کچھ تھا سب ریاکاری تھی، لیکن دنیا کے تمام احکام ظاہری افعال پر دائر ہوتے تھے جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے اور احکام خداوندی کا اتباع کرے، اور خلاف اسلام و ایمان اس سے کوئی قول و فعل ثابت نہ ہو تو انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتیں اس کو مومن صالح کہنے پر مجبور تھے خواہ وہ دل میں مومن مخلص ہو یا منافق، اسی لئے **رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:**

نَحْنُ نَحْكُمُ بِالظَّاهِرِ وَاللّٰهُ مُتَوَلِّي السَّرَائِرِ	"یعنی ہم تو ظاہر عمل پر حکم جاری کرتے ہیں، دلوں کے مخفی رازوں کا متولی خود **اللہ جل شانہٗ ہے**"

اسی ضابطہ کے تحت دنیا میں تو انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب خلفاء و علماء ظاہری اعمال پر حسن ظن کے مطابق کسی کے مومن صالح ہونے کی شہادت دے سکتے تھے لیکن آج وہ عالم دنیا جس کا سارا مدار ظن و گمان پر تھا ختم ہو چکا، یہ محشر کا میدان ہے جہاں بال کی کھال نکالی جائے گی، حق کو حق آشکارا کیا جائے گا، مجرموں کے مقابلہ میں پہلے دوسرے لوگوں سے شہادتیں لی جائیں گی، ان سے اگر مجرم مطمئن نہ ہوا اور اپنے جرم کا اعتراف نہ کیا تو خاص قسم کے سرکاری گواہ بروقت کار لائے جائیں گے، ان کے منہ اور زبان پر تو مہر سکوت لگا دی جائے گی، اور مجرم کے ہاتھوں، پاؤں اور کھال سے گواہی لی جائے گی، وہ ہر فعل کی پوری حقیقت بیان کر دیں گے، اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ اس وقت انسانوں کو معلوم ہوگا کہ میرے تمام

احمد رب العالمین کی تفسیر یہ لیں تھے ان کے بیان کے بعد تحریر کی کوئی ضرورت باقی نہیں۔

خلاصہ یہ کہ اس عالم کا کوئی حکم محض ظن و تخمین پر نہیں چلے گا بلکہ علم و یقین پر ہر چیز کا مدار ہوگا اور یہ بھی معلوم ہو چکا کہ کسی شخص کے ایمان و عمل کا حقیقی اور یقینی علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، اس لئے انبیاء علیہم السلام سے جب محشر میں یہ سوال ہوگا کہ مَاذَآ اُجِبْتُمْ تو وہ اس سوال کی حقیقت کو پہچان لیں گے کہ یہ سوال عالم دنیا میں نہیں ہو رہا جس کا جواب ظن کی بنیاد پر دیا جاسکے، بلکہ یہ سوال محشر میں ہو رہا ہے جہاں یقین کے سوا کوئی بات چلنے والی نہیں، اس لئے ان کا یہ جواب کہ ہمیں ان کے متعلق کوئی علم نہیں، یعنی علم یقینی نہیں بالکل بجا اور درست ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب انبیاء کی انتہائی شفقت کا ظہور

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امتوں کے قبول و عدم قبول ایمان یا نافرمانی کے جو واقعات ان کے سامنے پیش آئے ان سے جس طرح کا علم بلفظ غالب ان کو حاصل ہوا، اس سوال کے جواب میں وہ تو بیان کر دینا چاہئے تھا، صرف اس علم کے درجہ یقین کا حوالہ اللہ تعالیٰ پر کیا جاسکتا ہے، مگر یہاں انبیاء علیہم السلام نے اپنی معلومات اور پیش آمدہ واقعات کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا، علم الٰہی کے حوالے کرکے خاموش ہوگئے۔

حکمت اس میں یہ تھی کہ انبیاء علیہم السلام اپنی امتوں اور عام خلق اللہ پر بے انتہا شفیق ہوتے ہیں، ان کے متعلق ایسی کوئی بات اپنی زبان سے کہنا نہیں چاہیں گے جس سے یہ لوگ گرفت میں آجائیں، ہاں کوئی مجبوری ہی ہوتی تو کہنا پڑتا، یہاں علم یقینی نہ ہونے کا عذر موجود تھا، اس عذر سے کام لے کر اپنی زبانوں سے اپنی امتوں کے خلاف کچھ کہنے سے بچ سکتے تھے اس طرح اس سے بچ گئے۔

محشر میں پانچ چیزوں کا سوال

خلاصہ یہ کہ اس آیت میں قیامت کے ہولناک منظر کی ایک جھلک سامنے کردی گئی، کہ موقف حساب میں اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ برگزیدہ و مقبول رسول کھڑے ہیں اور لرز رہے ہیں تو دوسروں کا کیا حال ہوگا، اس سے اس روز کی فکر آج سے چاہئے، اور فرصت عمر کو اس حساب کی تیاری کے لئے غنیمت سمجھنا چاہئے۔

ترمذی شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ
عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ
اكْتَسَبَهٗ وَاَيْنَ اَنْفَقَهٗ وَمَاذَا عَمِلَ بِمَا عَلِمَ

"یعنی کسی آدمی کے قدم محشر میں اس وقت تک آگے نہ سرک سکیں گے جبتک اس سے پانچ سوالوں کا جواب نہ لے لیا جائے، ایک یہ کہ اس نے اپنی عمر کے طویل و کثیر لیل ونہار کس کام میں خرچ کئے، دوسرے یہ کہ خصوصیت سے جوانی کا زمانہ جو قوت عمل کا زمانہ تھا، اس کو کن کاموں میں خرچ کیا، تیسری یہ کہ ساری عمر میں جو مال اس کو حاصل ہوا وہ کہاں اور کن حلال یا حرام طریقوں سے کمایا، چوتھے یہ کہ مال کو کن جائز یا ناجائز کاموں میں خرچ کیا، پانچویں یہ کہ اپنے علم پر کیا عمل کیا؟"

اللہ تعالیٰ نے نہایت رحمت و شفقت سے امتحان کا پرچہ سوالات بھی پہلے ہی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ امت کو بتلا دیا، اب ان کا کام صرف اتنا رہ گیا کہ ان سوالات کا حل سیکھیں اور محفوظ رکھیں، امتحان سے پہلے ہی سوالات بتلا دینے کے بعد بھی کوئی ان میں فیل ہوجائے تو اس سے زیادہ کون محروم ہوسکتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے خصوصی سوال و جواب — پہلی آیت میں تو عام انبیاء علیہم السلام کا حال اور ان سے سوال و جواب کا تذکرہ تھا، دوسری آیت میں اور اس کے بعد ختم سورت تک کی نو آیت میں خصوصیت سے بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ اور ان پر اللہ تعالیٰ کے مخصوص انعامات کی کچھ تفصیل کا بیان ہے، اور محشر میں ان سے ایک خصوصی سوال اور اس کے جواب کا ذکر ہے، جو اگلی آیتوں میں آرہا ہے۔

حاصل اس سوال و جواب کا بھی بنی اسرائیل اور تمام مخلوق کو یہ ہولناک منظر دکھلانا ہے کہ اس میدان میں جب روح اللہ اور کلمۃ اللہ سے سوال ہوتا ہے کہ آپ کی امت نے جو آپ کو خدا کا شریک بنایا، تو وہ ساری عزت و عظمت اور عصمت و نبوت کے باوجود کس قدر گھبرا کر اپنی برأت بارگاہِ عزوجل میں پیش فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نہیں بار بار مختلف عنوانات سے اس کی نفی کرتے ہیں کہ میں نے ان کو یہ تعلیم نہ دی تھی، اوّل عرض کیا: سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ، "یعنی پاک ہیں آپ میری کیا مجال تھی کہ میں ایسی بات کہتا جس کا مجھے حق نہ تھا۔"

اپنی برأت کا دوسرا پہلو اس طرح اختیار فرماتے ہیں کہ خود حق تعالیٰ کو اپنا گواہ بنا کر کہتے ہیں کہ اگر میں ایسا کہتا تو آپ کو ضرور اس کا علم ہوتا، کیونکہ آپ تو میرے دل کے بھید سے بھی واقف ہیں، قول و فعل کا تو کیا کہنا، آپ تو علام الغیوب ہیں۔

اس ساری تمہید کے بعد اصل سوال کا جواب دیتے ہیں:۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب بارگاہِ ایزدی میں

یعنی یہ کہ میں نے اُن کو وہی تعلیم دی تھی جس کا آپ نے مجھے حکم فرمایا تھا، اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ، یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی، پھر اس تعلیم کے بعد جب تک میں ان لوگوں کے اندر رہا تو میں ان کے اقوال و افعال کا گواہ تھا (اُس وقت تک اُن میں کوئی ایسے نہ کہتا تھا) پھر جب آپ نے مجھے اٹھا لیا تو پھر یہ لوگ آپ ہی کی نگرانی میں تھے، آپ ہی ان کے اقوال و افعال سے پورے واقف ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر چند مخصوص انعامات کا ذکر

ان آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جس سوال و جواب کا ذکر کیا گیا ہے اس سے پہلے اُن مخصوص انعامات کا بھی ذکر ہے جو خصوصی طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر مبذول ہوئے، اور بشکل معجزات ان کو عطا فرمائے گئے اس مجموعہ میں ایک طرف انعامات خاصہ کا اور دوسری طرف جواب طلبی کا منظر دکھلا کر بنی اسرائیل کی ان دونوں قوموں کو تنبیہ کی گئی ہے، جن میں سے ایک نے تو ان کی توہین کی اور طرح طرح کی تہمتیں لگائیں اور ستایا، اور دوسری قوم نے ان کو خدا یا خدا کا بیٹا بنا دیا، انعامات کا ذکر کر کے پہلی قوم کو اور سوال و جواب کا ذکر کر کے دوسری قوم کو تنبیہ کی گئی، یہاں جن انعامات کا تفصیلی ذکر کئی آیتوں میں کیا گیا ان میں سے ایک جملہ زیادہ قابلِ غور ہے جس میں ارشاد ہوا ہے: تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا، یعنی ایک خصوصی معجزہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا وہ یہ ہے کہ آپ لوگوں سے بچہ ہونے کی حالت میں بھی کلام کرتے ہیں، اور ادھیڑ عمر ہونے کی حالت میں بھی۔

اس میں پہلی بات کا معجزہ اور خصوصی انعام ہونا تو ظاہر ہے، ابتداء ولادت میں بچے کلام کرنے کے قابل نہیں ہوا کرتے، کوئی بچہ ماں کی گود یا گہوارہ میں بولنے لگے تو یہ اس کا خصوصی امتیاز ہوگا، ادھیڑ عمر میں بولنا یا کلام کرنا جو مذکور ہے وہ تو کوئی قابل ذکر چیز نہیں، ہر انسان اس عمر میں بولا ہی کرتا ہے، اور کلام کرتا ہے، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خصوصی حال پر غور کریں تو اس کا بھی معجزہ ہونا واضح ہو جائے گا، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام ادھیڑ عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی دنیا سے اٹھا لئے گئے، اب یہاں کے انسانوں سے ان کا کلام کرنا ادھیڑ عمر کو پہنچنے کے بعد جب ہی ہو سکتا ہے جب وہ دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں، جیسا کہ مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ ہے، اور قرآن و سنت کی تصریحات سے ثابت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بچپن میں کلام کرنا معجزہ تھا اسی طرح ادھیڑ عمر میں کلام کرنا بھی بوجہ اس دنیا میں دوبارہ آنے کے معجزہ ہی ہے۔

وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي قَالُوا

اور جب میں نے دل میں ڈال دیا حواریوں کے کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول پر تو کہنے لگے

آمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُونَ ﴿۱۱۱﴾ إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَا عِيسَى

ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم فرمانبردار ہیں ۔ جب کہا حواریوں نے اے عیسیٰ

ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً

مریم کے بیٹے تیرا رب کر سکتا ہے کہ اتارے ہم پر خوان بھرا ہوا

مِنَ السَّمَاءِ ۖ قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۱۲﴾

آسمان سے بولا ڈرو اللہ سے اگر ہو تم ایمان والے

قَالُوا نُرِيدُ أَنْ نَأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ

بولے کہ ہم چاہتے ہیں کہ کھاویں اس میں سے اور مطمئن ہو جاویں ہمارے دل اور ہم جانیں

قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِينَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ عِيسَى

کہ تو نے ہم سے سچ کہا اور رہیں ہم اس پر گواہ کہا عیسیٰ

ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ

مریم کے بیٹے نے اے اللہ رب ہمارے اتار ہم پر خوان بھرا ہوا آسمان سے

تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِنْكَ ۖ وَارْزُقْنَا

کہ وہ دن عید رہے ہمارے لئے پہلوں اور پچھلوں کے واسطے اور نشانی ہو تیری طرف سے اور روزی دے ہم کو

وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿۱۱۴﴾ قَالَ اللَّهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا

اور تو ہی ہے سب سے بہتر روزی دینے والا کہا اللہ نے میں بیشک اتاروں گا وہ خوان

عَلَيْكُمْ ۖ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا

تم پر پھر جو کوئی تم میں ناشکری کرے گا اس کے بعد تو میں اس کو وہ عذاب دوں گا

لَا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿۱۱۵﴾

جو کسی کو نہ دوں گا جہان میں

ع ۱۵ / ۷ / ۵

خلاصۂ تفسیر

اور جبکہ میں نے حواریین کو (انجیل میں تمہاری زبانی) حکم دیا کہ تم مجھ پر اور میرے رسول (عیسیٰ علیہ السلام) پر ایمان لاؤ انھوں نے (جواب میں تم سے) کہا کہ ہم (خدا اور رسول یعنی آپ پر) ایمان لائے اور آپ شاہد رہئے کہ ہم (خدا کے اور آپ کے) پورے فرمانبردار ہیں، وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے جب کہ حواریین نے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے) عرض کیا کہ اے عیسیٰ ابن مریم (علیک السلام) کیا آپ کے رب ایسا کر سکتے ہیں (یعنی کوئی امر مثل خلاف حکمت ہونے وغیرہ کے اس سے مانع تو نہیں) کہ ہم پر آسمان سے کچھ کھانا (پکا پکایا) نازل فرما دیں آپ نے فرمایا کہ خدا سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو (مطلب یہ کہ تم تو ایمان دار ہو اس لئے خدا سے ڈرو اور معجزات کی فرمائش سے کہ بے ضرورت ہونے کی وجہ سے خلافِ ادب ہے بچو) وہ بولے کہ (ہمارا مقصود بے ضرورت فرمائش کرنا نہیں ہے، بلکہ ایک مصلحت سے اس کی درخواست کرتے ہیں وہ یہ کہ) ہم (ایک تو) یہ چاہتے ہیں کہ (برکت حاصل کرنے کو) اس میں سے کھائیں اور (دوسرے یہ چاہتے ہیں کہ) ہمارے دلوں کو (ایمان پر) پورا اطمینان ہو جاوے اور (مطلب اطمینان کا یہ ہے کہ) ہمارا یہ یقین اور بڑھ جاوے کہ آپ نے (دعویٰ رسالت میں) ہم سے سچ بولا ہے (کیونکہ جس قدر دلائل بڑھتے جاتے ہیں دعوے کا یقین بڑھتا جاتا ہے) اور (تیسرے یہ چاہتے ہیں کہ) ہم (ان لوگوں کے سامنے جنھوں نے یہ معجزہ نہیں دیکھا) گواہی دینے والوں میں سے ہو جاویں (کہ ہم نے ایسا معجزہ دیکھا ہے تاکہ ان کے سامنے ثبات رسالت کر سکیں، اور ان کی ہدایت کا یہ ذریعہ بن جاوے) عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) نے (جب دیکھا کہ اس درخواست میں ان کی غرض صحیح ہے تو حق تعالیٰ سے) دعا کی کہ اے اللہ ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے کھانا نازل فرمائیے کہ وہ (مائدہ) ہمارے لئے یعنی ہم میں جو اوّل (یعنی موجودہ زمانہ میں) ہیں اور جو بعد (کے زمانہ میں آنے والے) ہیں، سب کے لئے ایک خوشی کی بات ہو جاوے (حاضرین کی خوشی تو کھانے سے اور درخواست قبول ہونے سے اور بعد والوں کی خوشی اپنے سلف پر انعام ہونے سے، اور یہ غایت تو خاص ہے مؤمنین کے ساتھ) اور (میری پیغمبری پر) آپ کی طرف سے ایک نشان ہو جاوے، (کہ مؤمنین کا یقین بڑھ جاوے اور منکرین حاضرین یا غائبین پر حجت ہو جاوے اور یہ مقصد مؤمنین وغیرہ سب کے لئے عام ہے) اور آپ ہم کو (وہ مائدہ) عطا فرمائیے، اور آپ سب عطا کرنے والوں سے اچھے ہیں (کیونکہ سب کا دینا اپنے نفع کے لئے اور آپ کا

دنیا مخلوق کے نفع کے لئے ہے، اس لئے ہم اپنے منافع کو پیش کرکے آپ سے مائدہ کی درخواست کرتے ہیں، حق تعالیٰ نے (جواب میں) ارشاد فرمایا کہ (آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ) میں وہ کھانا آسمان سے تم لوگوں پر نازل کرنے والا ہوں پھر جو شخص تم میں سے اس کے بعد (اس کی) ناحق شناسی کرے گا (یعنی اس کے حقوق واجبہ عقلاً و نقلاً ادا نہ کرے گا) تو میں اس کو ایسی سزا دوں گا کہ وہ سزا (اس وقت کے) جہان والوں میں سے کسی کو نہ دوں گا

معارف و مسائل

مؤمن کو معجزات کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے

(قولہ تعالیٰ) قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ، جب حواریوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے آسمان سے مائدہ کے اترنے کا مطالبہ کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ اگر تم ایمان دار ہو تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اس سے معلوم ہوا کہ ایمان دار بندہ کو لائق نہیں کہ وہ اس قسم کی فرمائشیں کرکے خدا کو آزمائے، اور اس سے خرقِ عادت کی چیزوں کا مطالبہ کرے، بلکہ اس کو چاہئے کہ روزی وغیرہ کو انہی ذرائع سے طلب کرے جو قدرت نے مقرر کر رکھے ہیں۔

جب نعمت غیر معمولی بڑی ہو تو ناشکری کا وبال بھی بڑا ہوتا ہے

(قولہ تعالیٰ) فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ، اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب نعمت غیر معمولی اور نرالی ہوگی تو اس کی شکر گذاری کی تاکید بھی معمولی سے بہت بڑھ کر ہونی چاہئے، اور ناشکری پر عذاب بھی غیر معمولی اور نرالا آئے گا۔

مائدہ آسمان سے نازل ہوا تھا یا نہیں؟ اس بارے میں مفسرین حضرات کا اختلاف ہے، جمہور نزول کے قائل ہیں، چنانچہ ترمذی کی حدیث میں عمار بن یاسرؓ سے منقول ہے کہ مائدہ آسمان سے نازل ہوا، اس میں روٹی اور گوشت تھا، اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ ان لوگوں نے (یعنی بعض نے) خیانت کی، اور اگلے دن کے لئے اٹھاکر رکھا، پس بندر اور خنزیر کی صورت میں مسخ ہوئے (نعوذ باللہ من غضب اللہ)

اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس میں سے کھاتے بھی تھے جیسا تَاْكُلُ میں ان کی یہ غرض بھی مذکور ہے، البتہ آگے کے لئے رکھ لینا ممنوع تھا۔

(بیان القرآن)

وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي

اور جب کہے گا اللہ اے عیسیٰ مریم کے بیٹے تو نے کہا لوگوں کو کہ ٹھہرا لو مجھ کو

وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۖ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ

اور میری ماں کو دو معبود سوا اللہ کے کہا تو پاک ہے مجھ کو لائق نہیں کہ

أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي ۚ بِحَقٍّ ۚ إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ۚ تَعْلَمُ

کہوں ایسی بات جس کا مجھ کو حق نہیں اگر میں نے یہ کہا ہوگا تو تجھ کو ضرور معلوم ہوگا تو جانتا ہے

مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴿۱۱۶﴾

جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے بیشک تو ہی ہے جاننے والا چھپی باتوں کا

مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي

میں نے کچھ نہیں کہا ان کو مگر جو تو نے حکم کیا کہ بندگی کرو اللہ کی جو رب ہے میرا

وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ فَلَمَّا

اور تمہارا اور میں ان سے خبردار تھا جب تک ان میں رہا، پھر جب

تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

تو نے مجھ کو اٹھا لیا تو تو ہی تھا خبر رکھنے والا اُن کی اور تو ہر چیز سے

شَهِيدٌ ﴿۱۱۷﴾ إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ

خبردار ہے اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ بندے ہیں تیرے اور اگر تو ان کو معاف

فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۱۸﴾

کر دے تو تو ہی ہے زبردست حکمت والا

خُلاصۂ تفسیر

اور وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے جبکہ اللہ تعالیٰ (قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کفار نصاریٰ کے سنانے کے لئے) فرمائیں گے کہ اے عیسیٰ ابن مریم (ان لوگوں میں جن کا عقیدہ تثلیث کا تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کو شریکِ الوہیت مانتے تھے) تو کیا تم نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو (یعنی عیسیٰ علیہ السلام

کو) اور میری ماں (حضرت مریمؑ) کو بھی علاوہ خدا کے معبود قرار دیدو تو عیسیٰ (علیہ السلام) عرض کریں گے کہ (توبہ توبہ) میں تو (خود اپنے عقیدہ میں) آپ کو (شریک سے) منزّہ سمجھتا ہوں (جیسا کہ آپ واقع میں بھی منزّہ (پاک) ہیں تو ایسی حالت میں) مجھ کو کسی طرح زیبا نہ تھا کہ میں ایسی بات کہتا جس کے کہنے کا مجھ کو کوئی حق نہیں (نہ باعتبار اپنے عقیدے کے کہ میں موحد یعنی یک خدا کا قائل ہوں اور نہ باعتبار پیغام الٰہی پہنچنے کے کہ مجھ کو ایسا کوئی پیغام نہیں دیا گیا تھا، اور دلیل میری اس نہ کہنے کی یہ ہے کہ) اگر میں نے (واقع میں) کہا ہوگا تو آپ کو اس کا (یقیناً) علم ہوگا (مگر جب آپ کے علم میں بھی میں نے نہیں کہا تو واقع میں بھی نہیں کہا اور کہنے کی صورت میں آپ کو اس کا علم ہونا اس لئے ضروری ہے کہ) آپ تو میرے دل کے اندر کی بات بھی جانتے ہیں (تو جو زبان سے کہتا اس کا علم تو کیوں نہ ہوتا) اور میں (تو مثل دیگر مخلوقات کے اتنا عاجز ہوں کہ) آپ کے علم میں جو کچھ ہے اس کو (بدون آپ کے بتلائے ہوئے) نہیں جانتا (جیسے دیگر مخلوقات کا بھی یہی حال ہے پس) تمام غیبوں کے جاننے والے آپ ہی ہیں (سو جب اپنا اس قدر عجز اور آپ کا کمال مجھ کو معلوم ہے تو الوہیت میں شرکت کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں، یہاں تک تو اس بات کے کہنے کی نفی ہوئی، آگے اس کی نقیض کے کہنے کا اثبات ہے کہ) میں نے تو اُن سے اور کچھ نہیں کہا، صرف وہی (بات) جو آپ نے مجھ سے کہنے کو فرمایا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کرو جو میرا بھی رب ہے، اور تمہارا بھی رب ہے، (اور (یہاں تک تو عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی حالت کے متعلق عرض کیا، آگے ان لوگوں کی حالت کے متعلق عرض کرتے ہیں کیونکہ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ میں گو تصریح تو سوال اس کا ہے کہ آپ نے ایسا کلمہ کہا ہے یا نہیں، لیکن اشارۃً اس کا بھی سوال معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقیدۂ تثلیث کہاں سے پیدا ہوا پس عیسیٰ علیہ السلام اس باب میں یوں عرض کریں گے کہ) میں ان (کی حالت) پر مطلع رہا جب تک ان میں (موجود) رہا (سو اس وقت تک کا حال تو میں نے مشاہدہ کیا ہے اس کے متعلق بیان کر سکتا ہوں) پھر جب آپ نے مجھ کو اٹھا لیا (یعنی اوّل بار میں تو زندہ آسمان کی طرف اور دوسری بار میں وفات کے طور پر) تو (اس وقت صرف) آپ اُن (کے احوال) پر مطلع رہے (اس وقت مجھ کو خبر نہیں کہ ان کی گمراہی کا سبب کیا ہوا اور کیونکر ہوا) اور آپ ہر چیز کی پوری خبر رکھتے ہیں (یہاں تک تو اپنا اور ان کا معاملہ عرض کیا آگے ان کے اور حق تعالیٰ کے معاملات کے متعلق عرض کرتے ہیں کہ) اگر آپ ان کو (اس عقیدہ پر) سزا دیں تو (جب بھی آپ مختار ہیں، کیونکہ) یہ آپ کے بندے ہیں

(اور آپ ان کے مالک، اور مالک کو حق ہے کہ بندوں کو ان کے جرم پر سزا دے) اور اگر آپ ان کو معاف فرما دیں تو (جب بھی آپ مختار ہیں کیونکہ) آپ زبردست (قدرت والے) ہیں (تو معافی پر بھی قادر ہیں اور) حکمت والے (بھی) ہیں (تو آپ کی معافی بھی حکمت کے موافق ہوگی، اس لئے اس میں بھی کوئی برائی نہیں ہوسکتی، مطلب یہ ہے کہ دونوں حال میں آپ مختار ہیں میں کچھ دخل نہیں دیتا)

(غرض عیسیٰ علیہ السلام نے معروض اوّل سُبْحٰنَكَ الخ میں اپنی تبرّی ان اہلِ تثلیث کے عقیدے سے اور اس کی تعلیم سے، دوسری عرض وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ الخ میں اپنی تبرّی ان کے اس عقیدہ کے مفصّل جاننے تک سے اور عرض سوم اِنْ تُعَذِّبْهُمْ الخ میں اپنی تبرّی ان کے باب میں کوئی تحریک کرنے تک سے ظاہر کر دی، اور یہی مقصود تھا حق تعالیٰ کا عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان مخاطبات سے، پس ان میں ان کفار کو پوری زجر اپنی نادانی پر اور حسرت اپنی ناکامی پر ہوگی)۔

معارف و مسائل

فوائد مہمہ

قولہ تعالیٰ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى الخ، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والے ہیں، لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام سے سوال اس لئے نہیں فرما رہے کہ ان کو معلوم نہیں ہے، بلکہ اس سے مقصود ان کی قوم نصاریٰ کی ملامت اور سرزنش ہے کہ جس کو تم الٰہ مانتے ہو وہ خود تمہارے عقیدے کے خلاف اپنی عبدیت کا اقرار کر رہا ہے، اور تمہارے بہتان سے وہ بری ہے (ابن کثیر)

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ حضرت مسیح علیہ السلام کی موت یا رفع الی السماء وغیرہ کی بحث سورہ آلِ عمران میں آیت اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ کے تحت گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ کیا جائے فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ اس آیت سے عیسیٰ علیہ السلام کی موت اور رفع الی السماء کے انکار پر استدلال صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ یہ گفتگو قیامت کے روز ہوگی، اور اس وقت آسمان سے نزول کے بعد آپ کو موت حقیقی حاصل ہو چکی ہوگی چنانچہ ابن کثیر نے بروایت ابوموسیٰ اشعری ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب قیامت کا روز ہوگا تو انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتیں بلائی جائیں گی، پھر عیسیٰ علیہ السلام کو بلایا جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ ان کو اپنی نعمتیں یاد دلائے گا، اور ان کو تنبیہ کر کے فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بیٹے مریم کے اُذْكُرْ نِعْمَتِيْ

عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ، یہاں تک کہ فرمائے گا يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ، عیسیٰ علیہ السلام انکار کریں گے کہ پروردگار میں نے نہیں کہا ہے، پھر نصاریٰ سے سوال ہوگا تو یہ لوگ کہیں گے کہ ہاں اس نے ہم کو یہی حکم دیا تھا، اس کے بعد ان کو دوزخ کی طرف ہانکا جائے گا۔

قولہ تعالیٰ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ، یعنی آپ اپنے بندوں پر ظلم اور بیجا سختی نہیں کر سکتے، اس لئے اگر ان کو سزا دیں گے تو عین عدل و حکمت پر مبنی ہوگی، اور فرض کیجئے معاف کر دیں تو یہ معافی بھی از راہ عجز نہ ہوگی، کیونکہ آپ عزیز (زبردست اور غالب) ہیں اس لئے کوئی مجرم آپ کے قبضۂ قدرت سے نکل کر بھاگ نہیں سکتا، کہ اس پر آپ قابو نہ پا سکیں، اور چونکہ حکیم (حکمت والے) ہیں اس لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی مجرم کو یونہی بے موقع چھوڑ دیں، بہرحال جو فیصلہ آپ ان مجرمین کے حق میں کریں گے وہ بالکل حکیمانہ اور قادرانہ ہوگا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ کلام چونکہ محشر میں ہوگا جہاں کفار کے حق میں کوئی شفاعت اور استدعاء رحم وغیرہ نہیں ہو سکتی، اس لئے حضرت مسیح نے "عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ" کی جگہ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ وغیرہ صفات کو اختیار نہیں فرمایا، برخلاف اس کے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دنیا میں اپنے پروردگار سے عرض کیا تھا، رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (اے پروردگار ان بتوں نے بہت سے آدمیوں کو گمراہ کر دیا تو جو ان میں سے میرے تابع ہوا وہ میرا آدمی ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو پھر تو غفور رحیم ہے، یعنی ابھی موقع ہے کہ تو اپنی رحمت سے آئندہ ان کو توبہ اور رجوع الی الحق کی توفیق دے کر پچھلے گناہوں کو معاف فرما دے (فوائد عثمانی)

ابن کثیرؒ نے بروایت ابو ذرؓ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ پوری رات ایک ہی آیت پڑھتے رہے، اور وہ آیت اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ، ہے، پھر جب صبح ہوئی تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ یہی آیت پڑھتے رہے، رکوع اسی سے اور سجدے اسی سے کرتے رہے، یہاں تک کہ صبح ہوگئی، تو فرمایا کہ میں نے اپنے پروردگار سے اپنے واسطے شفاعت کی درخواست کی تو مجھے عطا فرمائی اور وہ انشاء اللہ تعالیٰ ملنے والی ہے، ایسے شخص کے واسطے جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کیا ہو۔

دوسری روایت میں آتا ہے کہ آپ نے مذکورہ آیت پڑھ کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور کہا اَللّٰهُمَّ اُمَّتِيْ یعنی میرے پاک پروردگار میری امت کی طرف نظر رحمت فرما، اور آپ رونے لگے، اس پر اللہ تعالیٰ نے بذریعہ جبریل امین رونے کی وجہ دریافت

ربطِ آیات: اب سورت ختم ہونے کو ہے۔ پوری سورت میں کچھ اصولی اور فروعی احکام بیان ہوئے ہیں، اس لئے آخر میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا مالک ہے، اس لئے اُسے یہ احکام دینے کا حق ہے۔ اور بندوں کو یہ احکام پوری طرح ماننے چاہئیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتے ہیں، وہ نافرمانی کی صورت میں سزا اور فرماں برداری کی صورت میں انعام دینے پر قادر ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا اللہ ہی کی ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی، اور ان چیزوں کی جو ان (آسمانوں اور زمین) میں موجود ہیں، اور وہ ہر شے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

معارف و مسائل

فائدہ: قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ۔ عام طور پر واقع کے مطابق قول کو صدق اور خلافِ واقع کو کذب سمجھا جاتا ہے، لیکن قرآن و سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ صدق و کذب عام ہے، لہٰذا قول اور عمل دونوں کو شامل ہے، چنانچہ اس حدیث میں خلافِ واقع عمل کو کذب کہا گیا ہے: مَنْ تَحَلّٰى بِمَا لَمْ يُعْطَ كَانَ كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُوْرٍ (مشکوٰۃ) "یعنی اگر کوئی اپنے آپ کو ایسے زیور سے آراستہ کرے جو اس کو نہیں دیا گیا، یعنی کسی ایسی صفت یا عمل کا دعویٰ کرے جو اس میں نہیں ہے تو گویا اس نے جھوٹ کے دو کپڑے پہنے"۔

ایک دوسری حدیث میں علانیہ اور تنہائی میں اچھی طرح نماز پڑھنے والے کو سچا بندہ کہا گیا ہے، ارشاد ہے:

إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا صَلّٰى فِي الْعَلَانِيَةِ فَأَحْسَنَ وَصَلّٰى فِي السِّرِّ فَأَحْسَنَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى هٰذَا عَبْدِيْ حَقًّا (مشکوٰۃ)

"یعنی جو آدمی علانیہ اچھی طرح نماز پڑھتا ہو اور وہ تنہائی میں بھی اسی طرح ادا کرتا ہو تو ایسے آدمی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ میرا سچا بندہ ہے"۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ، یعنی اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے، ایک حدیث میں آتا ہے کہ جنت ملنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ بڑی نعمت یہ ہے کہ میں تم سے راضی ہوا اب کبھی تم پر ناراض نہ ہوں گا۔

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ، یعنی یہی بڑی کامیابی ہے، ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا کامیابی ہوگی کہ مالک و خالق جل جلالہٗ راضی ہیں۔

لِلّٰهِ الْحَمْدُ أَوَّلُهٗ وَآخِرُهٗ

سورۂ مائدہ تمام شد

سورة الانعام

سُوْرَۃُ الْاَنْعَامِ

سُوْرَۃُ الْاَنْعَامِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ مِائَۃٌ وَّخَمْسٌ وَّسِتُّوْنَ اٰیَۃً وَّعِشْرُوْنَ رُکُوْعًا

سورۂ انعام مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو پینسٹھ آیتیں ہیں اور بیس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے پیدا کئے آسمان اور زمین اور بنایا

الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۬ ثُمَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّھِمْ یَعْدِلُوْنَ ﴿۱﴾

اندھیرا اور اجالا پھر بھی یہ کافر اپنے رب کے ساتھ اوروں کو برابر کئے دیتے ہیں

ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰٓی اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّی

وہی ہے جس نے پیدا کیا تم کو مٹی سے پھر مقرر کر دیا ایک وقت اور ایک مدت مقرر ہے

عِنْدَہٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ﴿۲﴾ وَھُوَ اللّٰہُ فِی السَّمٰوٰتِ وَفِی

اس کے نزدیک پھر بھی تم شک کرتے ہو اور وہی ہے اللہ آسمانوں میں اور

الْاَرْضِ ؕ یَعْلَمُ سِرَّکُمْ وَجَھْرَکُمْ وَیَعْلَمُ مَا تَکْسِبُوْنَ ﴿۳﴾

زمین میں جانتا ہے تمہارا چھپا اور کھلا اور جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو

وَمَا تَاْتِیْھِمْ مِّنْ اٰیَۃٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّھِمْ اِلَّا کَانُوْا عَنْھَا

اور نہیں آتی ان کے پاس کوئی نشانی اپنے رب کی نشانیوں میں سے مگر کرتے ہیں اس

مُعْرِضِیْنَ ﴿۴﴾ فَقَدْ کَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَھُمْ ؕ فَسَوْفَ

سے تغافل سو بیشک جھٹلایا انہوں نے حق کو جب ان تک پہنچا سو اب

يَأْتِيهِمْ أَنْبٰٓؤُا مَا كَانُوا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٥﴾	
آنی جاتی ہے ان کے آگے حقیقت اس بات کی جس پر ہنستے تھے	

خلاصۂ تفسیر

تمام تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا، اور تاریکیوں اور روشنی کو بنایا، پھر بھی کافر لوگ (عبادت میں) دوسروں کو اپنے رب کے برابر قرار دیتے ہیں وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تم (سب) کو (بواسطہ آدم علیہ السلام کے) مٹی سے بنایا، پھر (تمہارے مرنے کا) ایک وقت معین کیا اور (دوسرا وقت معین (دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کا) خاص اللہ ہی کے نزدیک (معلوم) ہے، پھر بھی تم (میں سے بعض) شک رکھتے ہو (کہ قیامت کو محال سمجھتے ہو حالانکہ جس نے اول حیات بخشی دوبارہ دینا اس کو کیا مشکل ہے)، اور وہی ذات معبود برحق آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی (یعنی اور سب معبود باطل ہیں) وہ تمہارے پوشیدہ حالات کو بھی اور تمہارے ظاہر حالات کو بھی (یکساں) جانتے ہیں اور بالخصوص تم جو کچھ ظاہراً یا باطناً عمل کرتے ہو جس پر جزا و سزا کا مدار ہے اس کو جانتے ہیں، اور ان (کفار) کے پاس کوئی نشانی بھی ان کے رب کی نشانیوں میں سے نہیں آتی، مگر وہ اس سے اعراض ہی کیا کرتے ہیں سو (چونکہ یہ ان کی عادت بنی ہوئی ہے، انھوں نے اس سچی کتاب (قرآن) کو بھی جھوٹا بتلایا جبکہ وہ ان کے پاس پہنچی سو (ان کی یہ تکذیب خالی نہ جائے گی بلکہ) جلد ہی ان کو خبر مل جاوے گی اس چیز کی جس کے ساتھ یہ لوگ استہزاء کیا کرتے تھے (مراد اس سے عذاب ہے جس کی خبر قرآن میں سنکر ہنستے تھے، اور اس کی خبر ملنے کا مطلب یہ ہے کہ جب عذاب نازل ہوگا تو اس خبر کی تصدیق آنکھوں سے دیکھ لیں گے)

معارف و مسائل

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ سورۂ انعام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ پوری سورت بجز چند آیات کے بیک وقت مکہ میں اس طرح نازل ہوئی ہے کہ ستر ہزار فرشتے اس کے جلو میں تسبیح پڑھتے ہوئے آئے تھے، ائمہ تفسیر میں سے مجاہد، کلبی، قتادہ وغیرہ کا بھی تقریباً یہی قول ہے۔

ابو اسحاق اسفرائنی نے فرمایا کہ یہ سورت توحید کے تمام اصول و قواعد پر مشتمل ہے

اس سورۃ کو کلمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے شروع کیا گیا جس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، اور مراد اس سے لوگوں کو حمد کی تعلیم دینا ہے، اور تعلیم کے اس طرز خاص میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ کسی کی حمد و تعریف کا محتاج نہیں، کوئی حمد کرے یا نہ کرے وہ اپنے ذاتی کمال کے اعتبار سے خود بخود محمود ہے۔ اس جملہ کے بعد آسمان و زمین اور اندھیرے، اجالے کے پیدا کرنے کا ذکر فرما کر اس کے محمود ہونے کی دلیل بھی بتلا دی کہ جو ذات اس عظیم قدرت و حکمت کی حامل ہے وہی حمد و تعریف کی مستحق ہو سکتی ہے۔

اس آیت میں سمٰوٰت کو جمع اور اَرض کو مفرد ذکر فرمایا ہے، اگرچہ دوسری آیت میں آسمان کی طرح زمین کے بھی سات ہونے کا ذکر موجود ہے، شاید اس میں اس طرف اشارہ ہو کہ سات آسمان اپنی ہیئت و صورت اور دوسری صفات کے اعتبار سے باہم بہت امتیاز رکھتے ہیں، اور ساتوں زمینیں ایک دوسرے کی ہم شکل اور مثل ہیں، اس لئے ان کو مثل ایک عدد کے قرار دیا گیا (مظہری)

اسی طرح ظُلُمٰت کو جمع اور نُور کو مفرد ذکر فرمانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ نور تعبیر ہے صحیح راہ اور صراط مستقیم سے اور وہ ایک ہی ہے، اور ظلمات تعبیر ہے غلط راستہ کی، اور وہ ہزاروں ہیں **(مظہری و بحر محیط)**

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آسمانوں اور زمین کے بنانے کو لفظ خَلَقَ سے تعبیر کیا گیا، اور اندھیرے اُجالے کے بنانے کو لفظ جَعَلَ سے، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اندھیرا اجالا آسمان و زمین کی طرح مستقل قائم بالذات چیزیں نہیں، بلکہ عوارض اور صفات میں سے ہیں، اور ظلمت کو نور پر مقدم شاید اس لئے ذکر فرمایا گیا کہ اس جہان میں اصل ظلمت ہے، اور نور خاص خاص چیزوں سے وابستہ ہے، جب وہ سامنے ہوتی ہیں روشنی پیدا ہوتی ہے، جب نہیں ہوتیں تو اندھیرا رہتا ہے۔

مقصود اس آیت کا توحید کی حقیقت اور اس کی واضح دلیل کو بیان فرما کر دنیا کی ان تمام قوموں کو تنبیہ کرنا ہے جو یا تو سرے سے توحید کی قائل نہیں، یا قائل ہونے کے **باوجود توحید کی حقیقت کو چھوڑ بیٹھی ہیں۔**

مجوس دنیا کے دو خالق مانتے ہیں یزدان اور اہرمن، یزدان کو خالق خیر اور اہرمن کو خالق شر قرار دیتے ہیں، اور انہی دونوں کو نور و ظلمت سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

ہندوستان کے مشرک تینتیس کروڑ دیوتاؤں کو خدا کا شریک بتاتے ہیں، آریہ سماج توحید کے قائل ہونے کے باوجود روح و مادّہ کو قدیم اور خدا تعالیٰ کو قدرت و خلقت سے

آزاد قرار دے کر توحید کی حقیقت سے ہٹ گئے، اسی طرح نصاریٰ توحید کے قائل ہونے کے باوجود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو خدا تعالیٰ کا شریک و سہیم بنانے لگے، اور پھر عقیدۂ توحید کو نباہنے کے لئے ان کو ایک تین اور تین ایک کا غیر معقول نظریہ اختیار کرنا پڑا، اور عرب کے مشرکین نے تو خدائی کی تقسیم میں یہاں تک سخاوت دکھلائی کہ ہر پہاڑ کا ہر پتھر ان کے نزدیک نوعِ انسانی کا معبود بن سکتا تھا، غرض انسان جس کو اللہ تعالیٰ نے مخدوم کائنات اور اشرف المخلوقات بنایا تھا، جب راہ سے بھٹکا تو اس نے صرف چاند، سورج، اور ستاروں کو بلکہ آگ، پانی اور درخت، پتھر یہاں تک کہ کیڑوں مکوڑوں کو اپنا مسجود و معبود اور حاجت روا مشکل کشا بنا لیا۔

قرآن کریم نے اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو آسمان و زمین کا خالق اور اندھیرے اُجالے کا بنانے والا بتلا کر ان سب غلط خیالات کی تردید کر دی کہ نور و ظلمت اور آسمان و زمین اور ان میں پیدا ہونے والی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی اور بنائی ہوئی ہیں، تو پھر ان کو کیسے خدا تعالیٰ کا شریک و سہیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلی آیت میں عالم کبیر یعنی پوری دنیا کی عظیم ترین چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق و محتاج بتلا کر انسان کو صحیح عقیدۂ توحید کا سبق دیا گیا ہے، اس کے بعد دوسری آیات میں انسان کو بتلایا ہے کہ تیرا وجود خود ایک عالم صغیر ہے، اگر اسی کی ابتداء و انتہاء اور بود و باش پر نظر کرے تو عقیدۂ توحید ایک واضح حقیقت بن کر سامنے آجائے، اس میں ارشاد فرمایا:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰىٓ اَجَلًا ، یعنی اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا کہ آدم علیہ السلام کو مٹی کے خمیر سے پیدا فرما کر ان میں جان ڈال دی، اور عام انسانوں کی غذا مٹی سے نکلتی ہے، غذا سے نطفہ، اور نطفہ سے انسان کی تخلیق عمل میں آتی ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری ..... فرماتے ہیں، کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹی کی ایک خاص مقدار سے پیدا فرمایا جس میں پوری زمین کے اجزاء شامل کئے گئے، یہی وجہ ہے کہ اولادِ آدم، رنگ و روپ اور اخلاق و عادات میں مختلف ہیں، کوئی کالا کوئی گورا، کوئی سُرخ، کوئی سخت کوئی نرم، کوئی پاکیزہ خصلت کوئی خبیث الطبع ہوتا ہے، (مظہری بروایت ابن عدی بسند حسن)

یہ تو انسان کی ابتداء آفرینش کا ذکر تھا، اس کے بعد انتہا کی دو منزلوں کا ذکر ہے، ایک انسان کی شخصی انتہا جس کو موت کہا جاتا ہے، دوسری پوری نوع انسانی اور اس کے کائناتی خوادم سب کے مجموعہ کی انتہا، جس کو قیامت کہا جاتا ہے، انسان کی شخصی انتہا

کے لیے فرمایا، ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا، یعنی انسان کی پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی بقا و حیات کے لیے ایک میعاد مقرر کردی، اس میعاد پر پہنچنے کا نام موت ہے، جس کو اگرچہ انسان نہیں جانتا مگر اللہ کے فرشتے جانتے ہیں، بلکہ خود انسان بھی اس حیثیت سے اپنی موت کو جانتا ہے کہ ہر وقت ہر جگہ اپنے گردوپیش میں اولادِ آدم کو مرتے دیکھتا ہے۔

اس کے بعد پورے عالم کی انتہا یعنی قیامت کا ذکر اس طرح فرمایا وَاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَهٗ، یعنی ایک اور میعاد مقرر ہے جس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اس کی میعاد کا پورا علم نہ کسی فرشتہ کو ہے نہ کسی انسان کو۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ پہلی آیت میں عالمِ اکبر یعنی پوری دنیا کا حال یہ بتلایا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی اور بنائی ہوئی ہے، اور دوسری آیت میں اسی طرح عالمِ اصغر یعنی انسان کا مخلوقِ خداوندی ہونا بیان فرمایا، پھر انسان کو غفلت سے چونکانے کے لئے یہ بتلایا کہ ہر انسان کی ایک خاص عمر ہے جس کے بعد اس کی موت یقینی ہے اور یہ ایسی چیز ہے کہ اس کا مشاہدہ ہر انسان کو اپنے گردوپیش میں ہر وقت ہوتا رہتا ہے، وَاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَهٗ میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ انسان کی شخصی موت سے پورے عالم کی عمومی موت یعنی قیامت پر استدلال ایک فطری اور طبعی امر ہے، اس لئے قیامت کے آنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں، اس لئے آخر آیت میں بطور تعجب ارشاد فرمایا، ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ، یعنی ایسے واضح دلائل کے باوجود تم قیامت کے بارے میں شبہات و شکوک نکالتے ہو۔

تیسری آیت میں پہلی دو آیتوں کے مضمون کا نتیجہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ ہی وہ ذات ہے جو آسمانوں اور زمین میں لائق عبادت و اطاعت ہے، اور وہی تمہارے ظاہر و باطن کے ہر حال اور ہر قول و فعل سے پورا واقف ہے۔

چوتھی آیت میں غفلت شعار انسان کی ہٹ دھرمی اور خلافِ حق ضد کی شکایت اس طرح فرمائی گئی ہے کہ : وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کے واضح دلائل اور کھلی نشانیوں کے باوجود منکر انسانوں نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی نشانی ان کی ہدایت کے لئے بھیجی جاتی ہے وہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں، اس میں ذرا غور نہیں کرتے۔

پانچویں آیت میں اسی غفلت شعاری کی مزید تفصیل بعض واقعات کی طرف اشارہ کرکے بیان فرمائی ہے کہ فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ، یعنی جب حق اُن کے سامنے آیا تو انھوں نے حق کو جھٹلا دیا، حق سے مراد قرآن بھی ہو سکتا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

ذاتِ اقدس بھی۔

کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابتداء عمر سے آخر تک اسی قبائل عرب کے درمیان رہے، بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپا انہی کی آنکھوں کے سامنے آیا، ان کو یہ بھی پوری طرح روشن تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی انسان سے مطلق کوئی تعلیم حاصل نہیں کی، یہاں تک کہ اپنا نام بھی خود نہ لکھتے تھے، پورے عرب میں آپ کا لقب اُمّی مشہور تھا، چالیس سال کی عمر اسی حال میں ان کے درمیان گذری، کہ نہ کبھی شعر و شاعری سے دلچسپی ہوئی نہ کبھی کوئی علم و حکمت سے مناسبت ہوئی، پھر چالیس سال پورے ہوتے ہی دفعۃً آپ کی زبان مبارک سے وہ حقائق و معارف اور علوم و فنون جاری ہوگئے کہ دنیا کے بڑے بڑے ماہر فلسفہ بھی اُن کے سامنے عاجز نظر آتے، عرب کے تمام فصحاء و بلغاء کو اپنے مرے ہوئے کلام کا مقابلہ کرنے کے لئے چیلنج دیا، یہ لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شکست دینے کے لئے اپنی جان، مال، عزت و آبرو، اولاد و خاندان سب کچھ قربان کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے، ان میں سے کسی کی یہ جرأت نہ ہوئی کہ اس چیلنج کو قبول کرکے قرآن کی ایک آیت کی مثال ہی پیش کردیتے۔

اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا اپنا وجود خود حقانیت کی بہت بڑی نشانی تھی اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ہزاروں معجزات اور کھلی کھلی نشانیاں ایسی ظاہر ہوئیں جن کا انکار کوئی صحیح الحواس انسان نہیں کرسکتا، مگر ان لوگوں نے ان ساری نشانیوں کو یکسر جھٹلا دیا، اسی لئے اس آیت میں ارشاد فرمایا: فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ۔

آخر آیت میں اُن کے کفر و انکار اور تکذیب کے انجام بد کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ارشاد فرمایا: فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنْبٰٓؤُا مَا كَانُوا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ، یعنی آج تو یہ انجام سے غافل لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور آپ کی لائی ہوئی ہدایات اور قیامت و آخرت سب کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے، جب یہ سارے حقائق ان کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گے، قیامت قائم ہوگی، ایمان و عمل کا حساب دینا ہوگا، اور ہر شخص اپنے کئے کی جزاء و سزاء پائے گا، مگر اس وقت کا یقین و اقرار ان کے کام نہ آئے گا، کیونکہ وہ روز عمل نہیں بلکہ روزِ جزاء ہوگا، ابھی غور و فکر کی فرصت خدا تعالیٰ نے دے رکھی ہے، اس کو غنیمت سمجھ کر آیاتِ الٰہیہ پر ایمان لانے ہی میں دنیا و آخرت کی فلاح ہے۔

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّن قَرْنٍ مَّكَّنَّاهُمْ فِي

کیا دیکھتے نہیں کہ کتنی ہلاک کر دیں ہم نے ان سے پہلے اُمتیں جن کو جما دیا تھا ہم نے

الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّن لَّكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِم مِّدْرَارًا

ملک میں اتنا کہ تم کو نہیں جمایا اور چھوڑ دیا ہم نے اُن پر آسمان کو لگاتار برستا ہوا

وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ

اور بنا دیں ہم نے نہریں بہتی ہوئی ان کے نیچے پھر ہلاک کیا ہم نے ان کو ان کے گناہوں پر

وَأَنشَأْنَا مِن بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ﴿٦﴾ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ

اور پیدا کیں ہم نے ان کے بعد اور امتیں ، اور اگر اتاریں ہم تجھ پر

كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا

لکھا ہوا کاغذ میں پھر چھو لیویں وہ اس کو اپنے ہاتھوں سے البتہ کہیں گے کافر

إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿٧﴾ وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ

یہ نہیں ہے مگر صریح جادو ، اور کہتے ہیں کیوں نہیں اترا اس پر کوئی

مَلَكٌ وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنظَرُونَ ﴿٨﴾

فرشتہ اور اگر ہم اتاریں فرشتہ تو طے ہو جاوے قصہ پھر ان کو مہلت بھی نہ ملے ،

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا

اور اگر ہم رسول بنا کر بھیجتے کسی فرشتہ کو تو وہ بھی آدمی ہی کی صورت میں ہوتا اور ان کو اسی شبہ میں ڈالتے جس میں

يَلْبِسُونَ ﴿٩﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ

اب پڑ رہے ہیں ، اور بہت ٹھٹھا ہنسی کر چکے ہیں رسولوں سے تجھ سے پہلے پھر گھیر لیا

بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿١٠﴾ قُلْ

ان سے ہنسی کرنے والوں کو اس چیز نے کہ جس پر ہنسا کرتے تھے ، تو کہہ دے

ع ۱

سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

کہ سیر کرو ملک میں پھر دیکھو کیا انجام ہوا

الْمُكَذِّبِينَ ﴿١١﴾

جھٹلانے والوں کا

خلاصۂ تفسیر

کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ ہم ان سے پہلے کتنی جماعتوں کو (عذاب سے) ہلاک کرچکے ہیں جن کو ہم نے دنیا میں ایسی قوت (جسمانی اور مالی) دی تھی کہ تم کو وہ قوت نہیں دی اور ہم نے ان پر خوب بارشیں برسائیں اور ہم نے ان کے (کھیت اور باغوں کے) نیچے سے نہریں جاری کیں (جس سے زراعت اور پھلوں کی خوب ترقی ہوئی اور وہ خوش حالی کی زندگی بسر کرنے لگے) پھر (اس قوت وقدرت اور سامان واسباب کے ہوتے ہوئے) ہم نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب (انواع عذاب سے) ہلاک کر ڈالا اور ان کے بعد دوسری جماعتوں کو پیدا کر دیا (تو اگر تم پر بھی عذاب نازل کر دیں تو تعجب کیا ہے) اور ان لوگوں کے عناد کی یہ حالت ہے کہ اگر ہم کاغذ پر لکھا ہوا کوئی نوشتہ آپ پر نازل فرماتے، پھر اس کو یہ لوگ اپنے ہاتھ سے چھو بھی لیتے (جیسا کہ ان کا مطالبہ تھا کہ لکھی ہوئی کتاب آسمان سے آجائے اور ہاتھوں سے چھو لینے کا ذکر کرکے نظر بندی کے شبہ کو بھی دور کر دیا) تب بھی یہ کافر لوگ یہی کہتے کہ یہ کچھ بھی نہیں مگر صریح جادو ہے (کیونکہ جب بات ماننے کا ارادہ ہی نہیں تو سر دلیل میں کوئی نہ کوئی بات نکال لینا کیا مشکل ہے) اور یہ لوگ یوں بھی کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) کے پاس کوئی فرشتہ (جس کو ہم دیکھیں اور باتیں سنیں) کیوں نہیں بھیجا گیا (حق تعالیٰ فرماتے ہیں) اور اگر ہم کوئی فرشتہ (اسی طرح) بھیج دیتے تو سارا قصہ ہی ختم ہو جاتا پھر (نزول فرشتہ کے بعد) ان کو ذرا مہلت نہ دی جاتی (کیونکہ عادت الٰہیہ یہ ہے کہ جن لوگوں کا منہ مانگا معجزہ دکھلا دیا گیا اگر پھر بھی انھوں نے ایمان سے انکار کیا تو فوراً بلا مہلت کے عذاب سے ہلاک کر دیا جاتا ہے اور جب تک ایسا مطلوبہ معجزہ نہ دیکھیں دنیا میں مہلت ملتی رہتی ہے) اور اگر ہم اس (پیغام پہونچانے والے) کو فرشتہ ہی قرار دیتے تو (اس کو بشکل فرشتہ بھیجیں تو اسکی ہیبت انسانوں سے برداشت نہ ہو، اس لئے ہم اس (فرشتہ) کو آدمی ہی (کی شکل) بناتے تو اس پر بھی وہی شبہ کرتے جو اب کر رہے ہیں (یعنی اس فرشتہ کو بشر سمجھ کر پھر بھی اعتراض کرتے. غرض نزول فرشتہ جس کا یہ مطالبہ کرتے ہیں اگر اس کو پورا کر دیا جائے تو ان کو اس سے کوئی فائدہ تو اس لئے نہیں ہو سکتا کہ فرشتہ بشکل فرشتہ دیکھنے پر ان کو قدرت نہیں، اور بشکل انسان بھیجنے سے ان کا شبہ رفع نہیں ہوگا. اور دوسری طرف ان کو نقصان یہ پہونچے گا کہ نہ ماننے پر خود ہی عذاب کے مستحق ہو جائیں گے) اور (آپ ان کے بیہودہ مطالبات سے غم نہ کریں کیونکہ) واقعی آپ سے پہلے جو پیغمبر ہوئے ہیں

ان کے ساتھ بھی (مخالفین کی طرف سے) استہزا کیا گیا ہے، پھر جن لوگوں نے ان سے تمسخر کیا تھا انکو اس عذاب نے آگھیرا جس کا تمسخر اڑاتے تھے (جس سے معلوم ہوا کہ ان کے اس طرزِ عمل سے انبیاء کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، بلکہ یہ خود انہی کے لئے عذاب اور مصیبت بنا اور اگر یہ لوگ امم سابقہ کے عذاب کا انکار کرنے لگیں) تو آپ (ان سے) فرما دیجئے کہ ذرا زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھ لو کہ تکذیب کرنے والوں کا کیا انجام ہوا۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں احکامِ الٰہیہ اور تعلیماتِ رسُل سے اعراض کرنے یا مخالفت کرنے والوں پر وعید شدید کا ذکر تھا، ان آیات میں انہی منکرین کا رُخ اپنے گرد وپیش کے حالات اور اگلے زمانہ کے تاریخی واقعات کی طرف پھیر کر ان کو عبرت و نصیحت حاصل کرنے کا موقع دیا گیا، کہ بلاشبہ تاریخ عالم عبرتوں کی ایک کتاب ہے، جس کو اگر چشمِ بصیرت سے دیکھا جائے، تو وہ ہزاروں وعظوں سے زیادہ مؤثر وعظ ہے، ایک حکیم کا یہ جملہ بہت ہی پسندیدہ ہے کہ: "دنیا ایک بہترین کتاب ہے، اور زمانہ بہترین معلم"۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کا ایک بہت بڑا عنصر قصص اور تاریخ ہے، لیکن عام طور پر غفلت شعار انسان نے دنیا کی تاریخ کو بھی ایک تفریحی مشغلہ کی حیثیت سے زیادہ وقعت نہیں دی، بلکہ اس وعظ و حکمت کی بہترین کتاب کو بھی اپنی غفلت و معصیت کا ایک ذریعہ بنالیا، پچھلے قصّوں اور کہانیوں کا یا تو صرف یہ کام رہ گیا کہ نیند سے پہلے ان کو خواب آور دوا کے قائم مقام استعمال کیا جائے، اور یا پھر خالی اوقات میں دل بہلانے اور وقت گذارنے کا مشغلہ بنایا جائے۔

شاید اسی لئے قرآن کریم نے تاریخ عالم کی رُوح کو عبرت و نصیحت کے لئے لیا ہے، مگر عام دنیا کی تاریخی اور افسانوی کتابوں کی طرح نہیں، جن میں قصہ گوئی یا تاریخ نگاری خود ہی ایک مقصد ہوتا ہے، اسی لئے تاریخی واقعات کو مسلسل قصہ کی صورت سے بیان نہیں فرمایا، بلکہ قصہ کا جتنا ٹکڑا جس معاملہ اور جس حال سے متعلق تھا وہاں اتنا ہی ٹکڑا ذکر کر دیا، پھر کسی دوسری جگہ اس قصہ کا دوسرا ٹکڑا وہاں کی مناسبت سے بیان فرما دیا، اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ کوئی خبر یا قصہ کبھی خود مقصود نہیں ہوتا، بلکہ ہر خبر سے کوئی انشاء، اور ہر واقعہ کے اظہار سے کوئی عملی نتیجہ نکالنا مقصد ہوتا ہے، اس لئے اس واقعہ کا جتنا حصہ اس مقصد کے لئے ضروری ہے اس کو پڑھو، ...... اور آگے بڑھو اور اپنے حالات کا جائزہ لو، اور واقعاتِ ماضیہ سے سبق حاصل کر کے اپنی اصلاح کرو،

آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلاواسطہ مخاطب یعنی اہل مکہ کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا کہ کیا ان لوگوں نے اپنے سے پہلے گذرنے والی قوموں کا حال نہیں دیکھا جس سے ان کو عبرت و نصیحت ہوتی، اور دیکھنے سے مراد ان کے حال پر غور و فکر کرنا ہے کیونکہ وہ قومیں اس وقت تو ان کے سامنے نہیں تھیں جن کو وہ دیکھ سکتے، اس کے بعد اگلی قوموں کی ہلاکت و بربادی کا ذکر فرمایا: اَلَمۡ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ، یعنی ہم نے ان سے پہلے کتنے قرنوں کو ہلاک کر دیا۔

لفظ قرن اس جماعت کو بھی کہا جاتا ہے جو ایک وقت اور ایک زمانہ میں مجتمع موجود ہو، اور زمانہ کے ایک حصہ کو بھی جس کے بارے میں دس سال سے لے کر سو سال تک کے مختلف اقوال ہیں، مگر بعض واقعات و روایت حدیث سے تائید اس کی ہوتی ہے کہ لفظ قرن سو سال کے لئے بولا جاتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن بشر مازنی کو فرمایا تھا کہ تم ایک قرن زندہ رہو گے، اور وہ پورے ایک سو سال زندہ رہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بچہ کو دعا دی کہ قرن بھر زندہ رہو تو وہ پورے سو سال زندہ رہا، اکثر حضرات علماء نے حدیث خَيۡرُ الۡقُرُوۡنِ قَرۡنِيۡ ثُمَّ الَّذِيۡنَ يَلُوۡنَهُمۡ ثُمَّ الَّذِيۡنَ يَلُوۡنَهُمۡ کا یہی مطلب قرار دیا ہے، کہ ہر قرن کو سو سال مانا گیا۔

اس آیت میں گذشتہ اقوام عالم کے بارے میں پہلے یہ بتلایا گیا کہ ان کو حق تعالیٰ نے زمین میں وہ وسعت و قوت اور سامان عیشت عطا فرمایا تھا، جو بعد کے لوگوں کو نصیب بھی نہیں ہوا، لیکن جب انہوں نے رسولوں کی تکذیب اور احکام خداوندی کی مخالفت اختیار کی تو یہ سارا جاہ و جلال اور مال و منال اللہ کے عذاب کے سامنے بیکار ثابت ہوا، اور سب کے سب نیست و نابود ہو کر رہ گئے، تو آج کے مخاطب اہل مکہ جن کو نہ عاد و ثمود جیسی قوت و طاقت حاصل ہے، نہ اہل شام و یمن جیسی خوش حالی ان کو اقوام ماضیہ کے واقعات سے عبرت حاصل کرنا اور اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہئے، کہ مخالفت کر کے ان کا کیا انجام ہوگا۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: وَاَنۡشَاۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ قَرۡنًا اٰخَرِيۡنَ، یعنی اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ کا صرف یہی تصرف نہیں تھا کہ بڑی بڑی جاہ و جلال اور حکومت و سلطنت کی مالک اور بڑی دولت و قوت و طاقت والی قوموں کو چشم زدن میں ہلاک و برباد کر دیا، بلکہ ان کو ہلاک کرتے ہی ان کی جگہ دوسری قومیں پیدا کر کے ایسی طرح بسا دیا کہ دیکھنے والوں کو یہ بھی محسوس نہ ہو سکتا کہ یہاں سے کوئی انسان کم بھی ہوا ہے۔

اور حق جل و علا شانہ کی اس قدرت و حکمت کا مشاہدہ تو ویسے بھی ہر زمانہ ہر وقت میں

جو تا رہتا ہے کہ روزانہ ہزاروں لاکھوں انسان ہلاک ہوتے رہتے ہیں، مگر کہیں خلا نظر نہیں آتا کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہاں کے آدمی ہلاک ہوگئے تو اس میں بسنے والے نہ رہے ؎

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی!
ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی

ایک مرتبہ میدانِ عرفات میں جہاں تقریباً دس لاکھ انسانوں کا مجمع تھا اس طرف نظر گئی کہ آج سے تقریباً ستر اسّی سال پہلے اس سارے مجمع میں سے کسی انسان کا وجود نہ تھا اور اس جگہ پر تقریباً اتنے ہی انسان دوسرے موجود تھے جن کا آج نام و نشان نہیں ہے، اس طرح انسانوں کے ہر مجمع اور لوگوں کے ہر جھرمٹ کو جب اس کے ماضی و مستقبل کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو ایک بہت ہی مؤثر واعظ نظر آتا ہے، فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

دوسری آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی کہ عبداللہ بن ابی اُمیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک معاندانہ مطالبہ پیش کیا اور کہا کہ میں تو آپ پر اُس وقت تک ایمان نہیں لا سکتا جب تک کہ میں یہ واقعہ نہ دیکھ لوں کہ آپ آسمان میں چڑھ جائیں، اور وہاں سے ہمارے سامنے ایک کتاب لے کر آئیں، جس میں میرا نام لے کر یہ ہو کہ میں آپ کی تصدیق کروں، اور یہ سب کہہ کر یہ بھی کہہ دیا کہ اگر آپ یہ سب کچھ کر بھی دکھائیں میں تو جب بھی مسلمان ہوتا نظر نہیں آتا۔

اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ پھر یہی صاحب مسلمان ہوئے اور ایسے ہوئے کہ اسلام کے غازی بن کر غزوہ طائف میں شہید ہوئے۔

قوم کے ایسے بیہودہ معاندانہ مطالبات اور استہزاء کے رنگ میں مکالمات نے ماں باپ سے زیادہ شفیق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر کیا اثر کیا ہوگا، اس کا صحیح اندازہ ہم نہیں کر سکتے، صرف وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جس کو قوم کی صلاح و فلاح کی فکر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح لگی ہو۔

اس لئے اس آیت میں آپ کو تسلی دینے کے لئے ارشاد فرمایا گیا کہ ان کے یہ مطالبات کسی غرض و مقصد کے لئے نہیں، نہ اُن کو عمل کرنا مقصود ہے، اُن کا حال تو یہ ہے کہ جو کچھ یہ طلب کر رہے ہیں اگر اس سے بھی زیادہ واضح صورتیں آپ کی سچائی کی ان کے سامنے آجائیں، جب بھی قبول نہ کریں، مثلاً ہم اُن کی فرمائش کے مطابق آسمان سے کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب اُتار دیں اور صرف یہی نہیں کہ وہ آنکھوں سے دیکھ لیں جس میں نظر بندی یا جادو وغیرہ کا احتمال ہے بلکہ وہ اس کتاب کو اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیں کہ محض خیال نہیں

حقیقت ہے مگر چونکہ ان کی ساری باتیں محض عناد کی وجہ سے ہیں تو پھر بھی یہی کہیں گے کہ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ "یعنی یہ تو کھلا ہوا جادو ہے"۔

تیسری آیت کے نزول کا بھی ایک واقعہ ہے کہ یہی عبداللہ بن ابی امیہ اور نضر بن حارث اور نوفل بن خالد ایک مرتبہ جمع ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ مطالبہ پیش کیا کہ ہم تو آپ پر جب ایمان لائیں گے جب کہ آپ آسمان سے ایک کتاب لے کر آئیں، اور اس کے ساتھ چار فرشتے آئیں جو اس کی گواہی دیں کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے آئی ہے اور یہ کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

اس کا جواب حق تعالیٰ نے ایک تو یہ دیا کہ یہ غافل خود ایسے مطالبات کر کے اپنی موت و ہلاکت کو دعوت دے رہے ہیں، کیونکہ قانون الٰہی یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی پیغمبر سے کسی خاص معجزہ کا مطالبہ کرے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا مانگا ہوا معجزہ دکھلا دیا جائے، تو اگر وہ پھر بھی ماننے اور اسلام لانے میں ذرا تاخیر کریں تو پھر ان کو عذاب عام کے ذریعہ ہلاک کر دیا جاتا ہے، یہ قوم اہل مکہ بھی یہ مطالبہ کسی نیک نیتی سے تو کر نہ رہی تھی جس سے مان لینے کی توقع کی جاتی، اس لئے فرمایا: وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ، یعنی اگر ہم ان کا مانگا ہوا معجزہ دکھلا دیں کہ فرشتہ بھیج دیں اور یہ قوم ماننے والی تو ہے نہیں، تو اس معجزہ کے دیکھنے کے بعد بھی جب خلاف ورزی کرے گی تو اللہ کا حکم ان کے ہلاک کرنے کے لئے جاری ہو جائے گا، اور اس کے بعد ان کو ذرا بھی مہلت نہ دی جائے گی اس لئے ان کو سمجھنا چاہئے کہ ان کی مانگی ہوئی کوئی نشانی اگر ظاہر نہیں کی گئی تو اس میں ان کی خیر ہے۔

اسی بات کا ایک دوسرا جواب چوتھی آیت میں دوسرے انداز سے یہ دیا گیا کہ یہ سوال کرنے والے عجیب بیوقوف ہیں کہ فرشتوں کے نازل کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں، کیونکہ فرشتوں کے نازل ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ فرشتہ اپنی اصلی ہیئت و صورت میں سامنے آجائے تو اس کی ہیبت کو تو کوئی انسان برداشت نہیں کر سکتا، بلکہ خوف کھا کر فوراً مر جانے کا خطرہ ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ بشکل انسانی آئے، جیسے جبرئیل امین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت مرتبہ بشکل انسانی آئے ہیں، تو اس صورت میں اس سوال کرنیوالے کو جو اعتراض آپ پر ہے وہی اس فرشتہ پر بھی ہوگا، کہ اس کو ایک انسان ہی سمجھے گا۔

ان تمام معاندانہ سوالات کے جواب دینے کے بعد پانچویں آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے ارشاد فرمایا کہ یہ استہزاء و تمسخر اور ایذا رسانی کا معاملہ جو آپ کی قوم آپ کے ساتھ کر رہی ہے کچھ آپ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، آپ سے پہلے بھی سب رسولوں کو ایسے دل دوز اور ہمت شکن واقعات سے سابقہ پڑا ہے، مگر انھوں نے ہمت نہیں ہاری، اور انجام یہ ہوا کہ استہزاء و تمسخر کرنے والی قوم کو اس عذاب نے آپکڑا جس کا تمسخر کیا کرتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ کا کام تبلیغ احکام ہے، وہ کر کے آپ اپنے قلب کو فارغ فرمالیں اس کا اثر کسی نے کچھ لیا یا نہیں، اس کی نگہداشت آپ کے ذمہ نہیں، اس لئے اس میں مشغول ہو کر آپ قلب کو مغموم نہ کریں۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلْ لِّلّٰهِ ۭ كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ
تو پوچھ کہ کس کا ہے جو کچھ کہ ہے آسمانوں اور زمین میں کہدے اللہ کا ہے اس نے لکھا ہے اپنے اوپر

الرَّحْمَةَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰي يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اَلَّذِيْنَ
مہربانی کرنا البتہ تم کو اکٹھا کرے گا قیامت کے دن تک کہ اس میں کچھ شک نہیں جو لوگ

خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي
نقصان میں ڈال چکے اپنی جانوں کو وہی ایمان نہیں لاتے اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ آرام پکڑتا ہے

الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ
رات میں اور دن میں اور وہی ہے سب کچھ سننے والا جاننے والا تو کہہ دے کیا اور کسی کو بناؤں پنا

وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۭ
مددگار اللہ کے سوا جو بنانے والا ہے آسمانوں اور زمین کا اور وہ سب کو کھلاتا ہے اور اس کو کوئی نہیں کھلاتا

قُلْ اِنِّىْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ
کہدے مجھ کو حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلے حکم مانوں اور تو ہرگز نہ ہو

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾
شرک والا

خلاصہ تفسیر

آپ (ان مخالفین سے بطور الزام حجت کے) کہئے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں موجود

بندوں پر غالب اور برتر ہیں اور (قدرت کے غلبہ سے) وہی بڑی حکمت والے اور پوری خبر رکھنے والے ہیں (پس وہ خود سب کے حال جانتے ہیں اور قدرت سے سب کو جمع کریں گے اور حکمت سے مناسب جزا و سزا دیں گے) آپ ان منکرین توحید و رسالت سے کہئے کہ (اچھا یہ تو بتاؤ کہ) سب سے بڑھ کر چیز گواہی دینے کے لئے کون ہے (جس کی گواہی دینے پر سب کا اتفاق ہو جب وہ اس کا جواب نہ دیں تو ظاہر ہے یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑھ کر ہیں) آپ کہئے کہ میرے اور تمہارے درمیان (جس مسئلہ میں اختلاف ہے اس میں وہی) اللہ تعالیٰ گواہ ہے (جن کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے، اور ان کی گواہی یہ ہے کہ) میرے پاس یہ قرآن بطور وحی کے (منجانب اللہ) بھیجا گیا ہے تاکہ میں اس قرآن کے ذریعہ تم کو اور جس جس کو یہ قرآن پہنچے ان سب کو (ان وعیدوں سے) ڈراؤں (جو توحید و رسالت کے انکار پر اس میں مذکور ہیں کیونکہ قرآن مجید کے اعجاز اور اس کی مثل بنانے سے ساری دنیا کا عاجز ہونا اللہ تعالیٰ کی تکوینی شہادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی پر ہوگئی، اور مضامین قرآن سے اس کی تشریعی شہادت ہوگئی) کیا تم (اس شہادت کبریٰ کے بعد بھی جو کہ توحید کو شامل ہے توحید کے بارے میں) سچ مچ یہی گواہی دو گے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ (استحقاق عبادت میں) کچھ اور معبود بھی شریک ہیں، اور اگر وہ ہٹ دھرمی سے اس پر بھی کہہ دیں کہ ہاں ہم تو یہی گواہی دیں گے تو اس وقت ان سے بحث کرنا فضول ہے، بلکہ صرف آپ (اپنے عقیدہ کو ظاہر کرنے کے لئے) کہہ دیجئے کہ میں تو اس کی گواہی نہیں دیتا اور بیشک میں تمہارے شرک سے بری ہوں (اور آپ کی رسالت کے بارے میں جو یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے یہود و نصاریٰ سے پوچھ کر دیکھ لیا تو اس معاملہ کی تحقیق یہ ہے کہ) جن لوگوں کو ہم نے کتاب (تورات و انجیل) دی ہے وہ سب لوگ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو (ایسا) پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں (لیکن جب شہادت کبریٰ کے ہوتے ہوئے اہل کتاب کی شہادت پر مدار ہی نہیں تو ان کے نہ ہونے سے بھی کوئی استدلال نہیں کیا جاسکتا، اور ایسی شہادت کبریٰ کے ہوتے ہوئے بھی) جن لوگوں نے اپنے کو ضائع کر لیا ہے وہ ایمان نہ لاویں گے (عقل کو ضائع کرنے سے مطلب یہ ہے کہ اس کو معطل کر دیا عقل سے کام نہیں لیا، اس سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے، یا اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھوٹا بتلاوے ایسے بے انصافوں کا حال یہ ہوگا کہ) ان کو (قیامت کے دن) خلاصی نہ ہوگی (بلکہ دائمی عذاب میں گرفتار رہیں گے)

یعنی مجھ پر بطور وحی قرآن بھیجا گیا تاکہ اس کے ذریعہ میں تم کو اللہ کے عذاب سے ڈراؤں، اور ان لوگوں کو ڈراؤں جن کو قیامت تک یہ قرآن پہونچے گا۔

اس سے ثابت ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین اور آخری پیغمبر ہیں، اور قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے، قیامت تک اس کی تعلیم و تلاوت باقی رہے گی، اور لوگوں پر اس کا اتباع لازم رہے گا۔

حضرت سعید بن جبیرؓ نے فرمایا کہ جس شخص کو قرآن پہونچ گیا وہ ایسا ہے گویا اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرلی۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص کو قرآن پہنچ گیا میں اس کا نذیر ہوں۔

اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو تاکید فرمائی: بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَةً یعنی میرے احکام و تعلیمات لوگوں تک پہونچا دو اگرچہ ایک ہی آیت ہو۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو تر و تازہ اور ہمیشہ خوش رکھے جس نے میرا کوئی مقالہ سنا پھر اس کو یاد رکھا پھر اس کو امت تک پہونچا دیا، کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی خود کسی کلام کے مفہوم کو اتنا نہیں سمجھتا جتنا بعد میں آنے والا سمجھتا ہے جس کو یہ کلام اس نے پہونچایا ہے۔

آخری آیت میں ان لوگوں کے اس قول کی تردید ہے کہ ہم نے یہود و نصاریٰ سے سب تحقیق کرلی کوئی بھی آپ کی سچائی اور نبوت کی گواہی نہیں دیتا۔ اس کے متعلق ارشاد فرمایا اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ، یعنی یہود و نصاریٰ تو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔

وجہ یہ ہے کہ تورات و انجیل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا حلیہ شریف آپ کے وطن اصلی پھر وطن ہجرت کا، اور آپ کے عادات و اخلاق اور آپ کے کارناموں کا ایسا تفصیلی ذکر ہے کہ اس کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی، بلکہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ذکر نہیں، آپ کے صحابہ کرامؓ کے حالات کا مفصل تذکرہ تک تورات و انجیل میں موجود ہے، اس لئے اس کا کوئی امکان نہیں کہ جو شخص تورات و انجیل کو پڑھتا اور ان پر ایمان رکھتا ہو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پہچانے۔

اس جگہ حق تعالیٰ نے تشبیہ کے موقع پر یہ ارشاد فرمایا کہ جیسے لوگ اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں، یہ نہیں فرمایا کہ جیسے بچے اپنے ماں باپ کو پہچانتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ ماں باپ کی پہچان اپنے بچوں کے لئے سب سے زیادہ تفصیلی اور یقینی ہوتی ہے، بچوں کے بدن کا ہر حصہ ماں باپ

کے سامنے آتا اور رہتا ہے، وہ بچپن سے لے کر جوانی تک اُن کے ہاتھوں اور گود میں پرورش پاتے ہیں، اس لئے وہ جتنا اپنی اولاد کو پہچان سکتے ہیں کسی دوسری چیز کو نہیں پہچان سکتے۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ جو پہلے یہود میں داخل تھے، پھر مسلمان ہوگئے، حضرت فاروق اعظمؓ نے ان سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں خبر دی ہے کہ تم لوگ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا پہچانتے ہو جیسے اپنی اولاد کو، اس کی کیا وجہ ہے؟ عبداللہ ابن سلامؓ نے فرمایا کہ ہاں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ اوصاف کے ساتھ جانتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تورات میں نازل فرمائے، اس لئے اس کا علم ہمیں یقینی اور قطعی طور پر ہے، بخلاف اپنی اولاد کے کہ اس میں شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ ہماری اولاد ہے بھی یا نہیں۔

حضرت زید بن سعنہ جو اہل کتاب میں سے ہیں انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تورات و انجیل کے بیان کردہ اوصاف ہی کے ذریعہ پہچانا تھا، صرف ایک وصف ایسا تھا جس کی ان کو پہلے تصدیق نہیں ہوسکی تھی، امتحان کے بعد تصدیق ہوئی، وہ یہ کہ آپؐ کا حلم آپؐ کے غصہ پر غالب ہوگا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہونچ کر تجربہ کیا تو یہ صفت بھی پوری طرح آپؐ میں پائی اسی وقت مسلمان ہوگئے۔

آخر آیت میں فرمایا کہ یہ اہل کتاب جو پوری طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننے کے باوجود مسلمان نہیں ہوتے یہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو برباد کر رہے ہیں، اور خسارہ میں پڑ رہے ہیں، اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ

اور جس دن ہم جمع کریں گے ان سب کو پھر کہیں گے ان لوگوں کو جنھوں نے شرک کیا تھا

شُرَكَاۗؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ

کہاں ہیں شریک تمہارے جن کا تم دعویٰ کرتے تھے، پھر نہ رہے گا اُن کے

فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾

پاس کوئی فریب مگر یہی کہ کہیں گے قسم ہے اللہ کی جو ہمارا رب ہے ہم نہ تھے شرک کرنے والے

اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا

دیکھو تو کیسے جھوٹ بولے اپنے اوپر اور کھوئی گئیں ان سے وہ باتیں جو

يَفْتَرُونَ (۲۴) وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ

بنایا کرتے تھے اور بعضے ان میں ہیں کہ کان لگائے رہتے ہیں تیری طرف اور ہم نے ان کے دلوں پر

أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ

ڈال رکھے ہیں پردے تاکہ اس کو نہ سمجھیں اور رکھ دیا ان کے کانوں میں بوجھ اور اگر دیکھ لیں تمام

آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا ۚ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ

نشانیاں تو بھی ایمان نہ لاویں ان پر یہاں تک کہ جب آتے ہیں تیرے پاس تجھ سے جھگڑنے کو تو کہتے

الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (۲۵) وَهُمْ

ہیں وہ کافر نہیں ہے یہ مگر کہانیاں پہلے لوگوں کی اور یہ لوگ

يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْأَوْنَ عَنْهُ ۖ وَإِنْ يُهْلِكُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ

روکتے ہیں اس سے اور بھاگتے ہیں اس سے اور نہیں ہلاک کرتے مگر آپ کو

وَمَا يَشْعُرُونَ (۲۶)

اور نہیں سمجھتے

خلاصۂ تفسیر

کیفیت عدم فلاح مشرکین اور وہ وقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے جس روز ہم ان تمام خلائق کو میدان حشر میں جمع کریں گے، پھر ہم مشرکین سے (بلاواسطہ یا بواسطہ بطور زجر و توبیخ کے) کہیں گے کہ (بتلاؤ) تمہارے وہ شرکاء جن کے معبود ہونے کا تم دعویٰ کرتے تھے کہاں گئے (کہ تمہاری سفارش نہیں کرتے جس پر تم کو بھروسہ تھا) پھر ان کے شرک کا انجام اس کے سوا اور کچھ بھی (ظاہر) نہ ہوگا کہ وہ (اس شرک سے خود بیزاری اور نفرت کا اظہار کریں گے اور بدحواسی کے عالم میں) یوں کہیں گے قسم اللہ کی اپنے پروردگار کی کہ ہم مشرک نہیں تھے (حق تعالیٰ نے فرمایا تعجب کی نظر سے) ذرا دیکھو تو کس طرح (صریح) جھوٹ بولتے ہیں اپنی جانوں پر اور جن چیزوں کو وہ جھوٹ موٹ تراشا کرتے تھے (یعنی ان کے بت اور جن کو وہ خدا کا شریک ٹھہراتے تھے) وہ سب غائب ہوگئے (تشنیع بر انکار قرآن) وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ اور ان (مشرکین) میں بعضے ایسے ہیں کہ (آپ کے قرآن پڑھنے کے وقت اس کے سننے کے لئے) آپ کی طرف کان لگاتے ہیں اور

عرصۂ دراز تک حیرت و تذبذب کے عالم میں کھڑے رہیں گے، مدت کے بعد حساب کتاب اور سوالات شروع ہوں گے۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ تم کو میدانِ حشر میں ایسی طرح جمع کر دیں گے جیسے تیروں کو ترکش میں جمع کر دیا جاتا ہے، اور پچاس ہزار سال اسی طرح رہو گے، اور ایک روایت میں ہے کہ قیامت کے روز ایک ہزار سال سب اندھیری میں رہیں گے، آپس میں بات چیت بھی نہ کر سکیں گے یہ روایت حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے ذکر کی ہے،

اس روایت میں جو پچاس ہزار اور ایک ہزار کا فرق ہے یہی فرق قرآن کی دو آیتوں میں بھی مذکور ہے، ایک جگہ ارشاد ہے كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ، یعنی اس دن کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی، اور دوسری جگہ ارشاد ہے اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ، "یعنی ایک دن تمہارے رب کے پاس ایک ہزار سال کا ہوگا" اور وجہ اس فرق کی یہ ہے کہ یہ روز شدت تکلیف و مشقت کے اعتبار سے دراز ہوگا، اور درجات محنت و مشقت کے مختلف ہوں گے، اس لئے بعضوں کے لئے یہ دن پچاس ہزار سال کا اور بعض کے لئے ایک ہزار سال کا محسوس ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس سب سے بڑی امتحان گاہ میں اول تو ایک عرصۂ دراز ایسا گذرے گا کہ امتحان شروع ہی نہ ہوگا، یہاں تک کہ یہ لوگ تمنا کرنے لگیں گے کہ کسی طرح امتحان اور حساب جلد ہو جائے، انجام کچھ بھی ہو، یہ تردد اور تذبذب کی تکلیف تو جائے، اسی طول قیام اور عرصۂ دراز کی طرف اشارہ کرنے کے لئے لفظ ثُمَّ کے ساتھ فرمایا ثُمَّ نَقُوْلُ،

اسی طرح دوسری آیت میں مشرکین کی طرف سے جو جواب مذکور ہے وہ بھی لفظ ثُمَّ کے ساتھ آیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ بھی بڑے وقفہ کے بعد بہت غور و فکر اور سوچ بچار کر کے یہ جواب دیں گے کہ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ، یعنی اللہ رب العالمین کی قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم تو مشرک نہ تھے، اس آیت میں ان کے جواب کو لفظ فتنة سے تعبیر فرمایا ہے، اور یہ لفظ امتحان و آزمائش کے لئے بھی بولا جاتا ہے، اور کسی پر فریفتہ و مفتون ہو جانے کے لئے بھی، اور یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں، پہلی صورت میں ان کے جواب امتحان کو امتحان سے تعبیر کر دیا گیا ہے، اور دوسری صورت میں مراد یہ ہوگی کہ یہ لوگ دنیا میں ان بتوں اور خود ساختہ معبودوں پر مفتون تھے، اپنے جان و مال اُن پر قربان کرتے تھے، مگر آج وہ ساری محبت و فریفتگی ختم ہو گئی، اور ان کا جواب بجز اس کے کچھ نہ ہوا کہ ان سے

ب

برأت اور علیحدگی کا دعویٰ کریں۔

ان کے جواب میں ایک عجیب چیز یہ ہے کہ میدان قیامت کے ہولناک مناظر اور رب الارباب کی قدرت کاملہ کے عجیب و غریب واقعات دیکھنے کے بعد ان کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہو کر جھوٹ بولیں اور وہ بھی اس شدومد کے ساتھ کہ اسی کی ذات کبریا کی قسم بھی کھا کر کہہ رہے ہیں کہ ہم مشرک نہیں تھے۔

عامۂ مفسرین نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ان کا یہ جواب کچھ عقل و ہوش اور انجام بینی پر مبنی نہیں، بلکہ فرط ہیبت سے بدحواسی کی بنا پر ہے، اور ایسی حالت میں آدمی جو کچھ منہ میں آتے بولا کرتا ہے، لیکن میدان حشر کے عام واقعات و حالات میں غور کرنے کے بعد یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کی پوری کیفیت اور حالت کو سامنے لانے کے لئے ان کو یہ قدرت بھی دیدی کہ وہ آزادانہ جو چاہیں کہیں جس طرح دنیا میں کہا کرتے تھے، تاکہ کفر و شرک کے گناہ عظیم کے ساتھ ان کا یہ عیب بھی اہل محشر کے سامنے آجائے کہ یہ جھوٹ بولنے میں بھی یکتا ہیں کہ اس ہولناک موقع پر بھی جھوٹ بولنے سے نہیں چوکتے، قرآن مجید کی ایک دوسری آیت فَيَحْلِفُونَ لَهُ كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ سے اسی کی طرف اشارہ ہوتا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ جس طرح مسلمانوں کے سامنے جھوٹی قسمیں کھا جاتے ہیں اسی طرح خود رب العالمین کے سامنے بھی دروغ حلفی سے نہ چوکیں گے۔

محشر میں جب یہ قسمیں کھا کر اپنے شرک و کفر سے انکاری ہو جائیں گے تو اس وقت قادر مطلق ان کے مونہوں پر مہر سکوت لگا دیں گے، اور ان کے اعضاء و جوارح، ہاتھ پاؤں کو حکم دیں گے کہ تم شہادت دو کہ یہ لوگ کیا کیا کرتے تھے، اس وقت ثابت ہو گا کہ ہمارے ہاتھ پاؤں آنکھ، کان یہ سب کے سب خدا تعالیٰ کی خفیہ پولیس تھی، وہ تمام اعمال و افعال کو ایک ایک کر کے سامنے رکھ دیں گے، اسی کے متعلق سورۂ یٰسین میں ارشاد ہے:۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۔ اس مشاہدہ قدرت کے بعد کسی کو یہ جرأت نہ رہے گی کہ کچھ کوئی بات چھپائے یا جھوٹ بولے۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہے: وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا، یعنی اس روز وہ اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے، اس کا مطلب حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے یہی بتلایا کہ پہلے پہلے تو خوب جھوٹ بولیں گے اور جھوٹی قسمیں کھائیں گے، لیکن جب خود ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے تو اس وقت کوئی غلط بات کہنے کی جرأت نہ ہوگی۔

نے مشرکین کو حشر کے ہولناک میدان میں جب یہ اختیار دیا کہ وہ آزادانہ جو چاہیں کہہ سکیں یہاں تک کہ جھوٹی قسم کھا کر انھوں نے شرک سے انکار کردیا، اس میں شاید اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جھوٹ بولنے کی عادت ایک ایسی خبیث عادت ہے جو چھوٹتی نہیں، یہاں تک کہ یہ لوگ جو دنیا میں مسلمانوں کے سامنے جھوٹی قسمیں کھایا کرتے تھے یہاں بھی باز نہ آئے اور پوری خلق خدا کے سامنے ان کی رسوائی ہوئی، اسی لئے قرآن و حدیث میں جھوٹ بولنے پر شدید وعید اور مذمت فرمائی گئی ہے۔ قرآن میں جا بجا کاذب پر لعنت کے الفاظ آئے ہیں، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جھوٹ سے بچو کیونکہ جھوٹ فجور کا ساتھی ہے، اور جھوٹ اور فجور دونوں جہنم میں جائیں گے (ابن حبان فی صحیحہ)

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ وہ عمل کیا ہے جس سے آدمی دوزخ میں جائے، آپ نے فرمایا کہ وہ عمل جھوٹ ہے (مسند احمد) اور شب معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کی دونوں باچھیں چیری جاتی ہیں وہ پھر درست ہو جاتی ہیں، پھر چیری جاتی ہیں، اسی طرح یہ عمل اس کے ساتھ قیامت تک ہوتا رہے گا، آپ نے جبرئیل امین سے دریافت کیا کہ یہ کون ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ یہ جھوٹ بولنے والا ہے۔

اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی پورا مومن اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک جھوٹ کو بالکل نہ چھوڑ دے یہاں تک کہ مزاح و مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولے۔

نیز بیہقی وغیرہ میں بسند صحیح وارد ہے کہ مسلمان کی طبیعت میں اور بُری خصلتیں تو ہو سکتی ہیں مگر خیانت اور جھوٹ نہیں ہو سکتا۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ جھوٹ انسان کے رزق کو گھٹا دیتا ہے۔

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ، عام مفسرین ضحاکؒ، قتادہؒ، محمد بن حنفیہؒ کے نزدیک یہ آیت عام کفار مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو لوگوں کو قرآن سننے اور اس کا اتباع کرنے سے منع کرتے تھے، اور خود بھی اس سے دور رہتے تھے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب اور دوسرے ان چچاؤں کے متعلق ہے جو لوگوں کو آپ کی ایذا رسانی سے روکتے اور آپ کی حمایت کرتے تھے، مگر نہ قرآن پر ایمان لاتے نہ اس پر عمل کرتے، اس صورت میں يَنْهَوْنَ عَنْهُ کی ضمیر بجائے قرآن کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہوگی (مظہری بروایت ابن ابی حاتم عن سعید بن ابی ہلال)

خلاصۂ تفسیر

اور اگر آپ ان کو اس وقت دیکھیں (تو بڑا ہولناک واقعہ نظر آئے) جبکہ یہ (مشرکین) دوزخ کے پاس کھڑے کئے جاویں گے (اور قریب ہوگا کہ جہنم میں ڈال دیئے جاویں) تو (ہزاروں تمناؤں کے ساتھ) کہیں گے ہائے کیا اچھی بات ہوتی کہ ہم (دنیا میں) پھر واپس بھیج دیئے جاویں اور اگر ایسا ہو جاوے تو ہم (پھر) اپنے رب کی آیات (مثل قرآن وغیرہ) کو کبھی جھوٹا نہ بتلاویں اور ہم ضرور ایمان والوں میں سے ہو جاویں (حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کی یہ تمنا اور وعدہ کچھ رغبت اور قصد طاعت سے نہیں، بلکہ (اس وقت ایک مصیبت میں پھنس رہے ہیں کہ) جس چیز کو اس سے پہلے (دنیا میں) دبایا (اور مٹایا) کرتے تھے، وہ آج ان کے سامنے آگئی ہے (وہ اس حیثیت سے آخرت کا عذاب ہے جس کی وعید انبیاء کی وساطت پر دنیا میں ان کو کی جاتی تھی اور وہ سننے سے ہی انکار کرتے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت جان پر آبنی ہے اس سے جان بچانے کو یہ سارے وعدے کرتے ہیں اور دل سے ہرگز وعدہ پورا کرنے کا ارادہ نہیں یہاں تک کہ اگر بالفرض یہ لوگ پھر واپس بھی بھیج دیئے جاویں تب بھی یہ وہی کام کریں جس سے ان کو منع کیا گیا تھا یعنی کفر و نافرمانی، اور یقیناً یہ (ان وعدوں میں) بالکل جھوٹے ہیں (یعنی نہ اس وقت ایفائے وعدہ کا قصد نہ دنیا میں جاکر ایفائے وعدہ کا ان سے احتمال ہے) اور یہ (منکرین) کہتے ہیں کہ زندگی اور کہیں نہیں، بس یہی دنیا کی زندگی اور ہم (اس زندگی کے ختم ہونے کے بعد پھر) زندہ نہ کئے جاوینگے، جیسا کہ انبیاء علیہم السلام فرماتے ہیں، اور اگر آپ (ان کو) اس وقت دیکھیں (تو عجیب واقعہ نظر آوے) جب کہ یہ اپنے رب کے سامنے حساب کے لئے کھڑے کئے جاویں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے فرماوے گا کہ (کہو) کیا یہ (قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونا) امر واقعی نہیں وہ کہیں گے بیشک واقعی ہے قسم اپنے رب کی اللہ تعالیٰ فرماوے گا تو اب اپنے کفر کا مزہ چکھو (اس کے بعد دوزخ میں بھیج دیئے جاویں گے) بے شک (سخت) خسارے میں پڑے وہ لوگ جنہوں نے اللہ سے ملنے کی (یعنی قیامت کے روز زندہ ہوکر خدا تعالیٰ کے سامنے پیشی کی) تکذیب کی اور یہ تکذیب تھوڑے دنوں رہیگی یہاں تک کہ جب وہ معین وقت (یعنی قیامت کا دن مع مقدمات) ان پر دفعۃً (بلا اطلاع) آپہنچے گا (اس وقت سارے دعوے اور تکذیب ختم ہو جاویں گے اور) کہنے لگیں گے ہائے افسوس ہماری کوتاہی (اور غفلت) پر جو اس (قیامت) کے بارے میں

ہم سے ہوئی اور حالت ان کی یہ ہوگی کہ وہ اپنے (کفر و نافرمانی کا) بار اپنی کمر پر لادے ہوئے ہوں گے، خوب سن لو کہ بری ہوگی وہ چیز جس کو اپنے اوپر لادیں گے، اور دنیوی زندگانی تو کچھ بھی نہیں بجز لعب ولہو کے (بوجہ فانی و غیر باقی ہونے کے) اور پچھلا گھر پرہیزگاروں کے لئے بہتر ہے کیا تم سوچتے نہیں۔

معارف ومسائل

اسلام کے تین بنیادی اصول ہیں: توحید، رسالت، عقیدۂ آخرت، باقی سب عقائد انہی تین کے تحت داخل ہیں، اور یہ وہ اصول ہیں جو انسان کو اس کی اپنی حقیقت اور مقصد زندگی سے روشناس کرکے اس کی زندگی میں انقلاب پیدا کرتے ہیں اور اس کو ایک سیدھی و صاف راہ پر کھڑا کر دیتے ہیں، ان میں بھی عملی طور پر عقیدۂ آخرت اور اس میں حساب جزاء و سزا کا عقیدہ ایک ایسا انقلابی عقیدہ ہے جو انسان کے ہر عمل کا رخ ایک خاص طرف پھیر دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے تمام مضامین انہی تین میں دائر رہتے ہیں .... مذکورہ آیات میں خصوصیت کے ساتھ آخرت کے سوال و جواب، وہاں کے شدید و مدید ثواب و عذاب کا اور دنیائے ناپائیدار کی حقیقت کا بیان ہے۔

پہلی آیت میں مجرمین منکرین کا یہ حال بیان فرمایا گیا ہے کہ آخرت میں جب ان کو دوزخ کے کنارے کھڑا کیا جائے گا اور وہ وہم وخیال سے بھی زیادہ ہولناک عذاب کا مشاہدہ کریں گے تو وہ یہ تمنا ظاہر کریں گے کہ کاش ہمیں پھر دنیا میں بھیج دیا جاتا تو ہم اپنے رب کی بھیجی ہوئی آیات اور احکام کی تکذیب نہ کرتے بلکہ ان پر ایمان لاتے اور مومنین میں داخل ہو جاتے۔

دوسری آیت میں علیم و خبیر حکیم و حاکم نے ان کی اس گھبرائی ہوئی تمنا کا پول اس طرح کھولا کہ ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ جیسے ہمیشہ سے جھوٹ کے عادی تھے وہ اپنے اس قول و تمنا میں بھی جھوٹے ہیں، اور بات اس کے سوا نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ جو حقائق ان کے سامنے رکھے گئے تھے وہ یہ لوگ ان کو جاننے پہچاننے کے باوجود محض ہٹ دھرمی سے یا دنیوی عزت و نام کی وجہ سے ان حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوشش کیا کرتے تھے، آج وہ سب یک کرکے ان کے سامنے آگئے، اللہ جل شانہ کی یکتائی اور قدرت کاملہ کے مناظر آنکھوں سے دیکھے، انبیاء علیہم السلام کی سچائی کا

خودکشی حرام اور موت کی دعا یا تمنا کرنا ممنوع ہے، اس میں خدا تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت کی ناشکری ہے۔ بعض بزرگوں کے حالات میں ہے کہ وفات کے قریب مولانا جامیؒ کا یہ شعر ان کی زبان پر تھا ؎

با دو روزِ زندگی جامیؔ نشد سیر غمت
وہ چہ خوش بودے کہ عمرِ جاودانی داشتیم

اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ مذکورہ آیت میں سے آخری آیت میں اور متعدد آیاتِ قرآنیہ میں جو حیاتِ دنیا کو لہو و لعب فرمایا ہے یا احادیث کثیرہ میں دنیا کی جو مذمت آئی ہے اس سے مراد حیاتِ دنیا کے وہ لمحات و ساعات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر سے غفلت میں گذریں، ورنہ جو وقت اللہ تعالیٰ کی طاعت و ذکر میں گذرتا ہے اس کے برابر دنیا کی کوئی نعمت و دولت نہیں ؎

دن وہی دن ہے شب وہی شب ہے
جو تری یاد میں گذر جائے

ایک حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جس میں ارشاد ہے:

اَلدُّنْیَا مَلْعُوْنَۃٌ وَّمَلْعُوْنٌ مَّا فِیْہَا اِلَّا ذِکْرُ اللّٰہِ اَوْ عَالِمٌ اَوْ مُتَعَلِّمٌ،	"یعنی دنیا بھی ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے سب ملعون ہے مگر اللہ کی یاد اور عالم یا طالب علم"۔

اور اگر غور سے دیکھا جائے تو عالم اور طالب علم بھی ذکر اللہ ہی میں داخل ہو جاتے ہیں کیونکہ علم سے وہی علم مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب بنے، تو ایسے علم کا سیکھنا اور سکھانا دونوں ہی ذکر اللہ میں داخل ہیں، بلکہ امام جزریؒ کی تصریح کے مطابق دنیا کا ہر وہ کام جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت یعنی احکامِ شریعت کی مطابقت میں کیا جائے وہ سب ذکر اللہ ہی میں داخل ہے، اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کے سب ضروری کام، کسبِ معاش کے تمام جائز طریقے اور دوسری ضروریات جو حدودِ شریعت سے باہر نہ ہوں وہ سب ذکر اللہ میں داخل ہیں، اہل و عیال، اقرباء و احباب، پڑوسی و مہمان وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی کو احادیثِ صحیحہ میں صدقہ و عبادت سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ اس دنیا میں حق تعالیٰ کی اطاعت اور ذکر اللہ کے سوا کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں، استاذ محترم حضرت مولانا انور شاہ صاحب قدس سرہ نے خوب فرمایا ہے ؎

بگذر از یادِ گل و گلبن کہ ہیچم یاد نیست
در زمین و آسماں جز ذکرِ حق آباد نیست

اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ

تجھ سے ہو سکے کہ ڈھونڈ نکالے کوئی سرنگ زمین میں یا کوئی سیڑھی آسمان میں

فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى

پھر لا دے ان کو ایک معجزہ اور اگر اللہ چاہتا تو جمع کر دیتا سب کو سیدھی راہ پر

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ

سو تو مت ہو نادانوں میں ماننے وہی ہیں جو

يَسْمَعُوْنَ ۭ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾

سنتے ہیں اور مردوں کو زندہ کرے گا اللہ پھر اس کی طرف لائے جاویں گے

وقف غفران / وقف لازم

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓي اَنْ

اور کہتے ہیں کیوں نہیں اتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب کی طرف سے کہہ دے کہ اللہ کو قدرت ہے اس بات پر

يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَمَا مِنْ

کہ اتارے نشانی لیکن ان میں اکثر نہیں جانتے اور نہیں ہے

دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰۗىِٕرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ

کوئی چلنے والا زمین میں اور نہ کوئی پرندہ کہ اڑتا ہے اپنے دو بازوؤں سے مگر ہر ایک امت ہے

اَمْثَالُكُمْ ۭ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ

تمہاری طرح ہم نے نہیں چھوڑی لکھنے میں کوئی چیز پھر سب اپنے رب کے سامنے

يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي

جمع ہوں گے اور جو جھٹلاتے ہیں ہماری آیتوں کو وہ بہرے اور گونگے ہیں

الظُّلُمٰتِ ۭ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ۭ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰي

اندھیروں میں جس کو چاہے اللہ گمراہ کرے اور جس کو چاہے ڈال دے

صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ

سیدھی راہ پر تو کہہ دیکھو تو اگر آوے تم پر عذاب اللہ کا

اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ

یا آوے تم پر قیامت کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے بتاؤ اگر تم

صٰدِقِيْنَ ۞ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ
سچے ہو۔ بلکہ اسی کو پکارتے ہو پھر دور کر دیتا ہے اس مصیبت کو جس کے لئے اس کو پکارتے ہو اگر

وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۞
چاہتا ہے اور بھول جاتے ہو جن کو شریک کرتے تھے

ع۴ (۱۱) ۱۰

خلاصہ تفسیر

کفار کے بیہودہ کلمات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی

ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کو ان کفار کے اقوال مغموم کرتے ہیں سو آپ مغموم نہ ہوجیے بلکہ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کیجیے کیونکہ یہ لوگ (بلا واسطہ) آپ کو جھوٹا نہیں کہتے، لیکن یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا (قصداً) انکار کرتے ہیں، (گو اس سے آپ کی تکذیب بھی لازم آتی ہے مگر ان کا اصل مقصود آیات اللہ کی تکذیب ہے جیسا کہ ان میں بعض مشرکین ابو جہل وغیرہ اس کے اقراری بھی ہیں، اور جب ان کا اصل مقصد آیات اللہ کی تکذیب ہے تو ان کا یہ معاملہ خود اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوا، وہ خود ہی ان کو سمجھ لیں گے، آپ کیوں غم میں مبتلا ہوں، اور آپ کی یہ تکذیب کوئی نئی بات نہیں بلکہ) بہت سے پیغمبر جو آپ سے پہلے ہوئے ہیں ان کی بھی تکذیب کی جاچکی ہے جس پر انھوں نے صبر ہی کیا کہ ان کی تکذیب کی گئی، اور ان کو (طرح طرح کی) ایذائیں پہنچائی گئیں یہاں تک کہ ہماری امداد ان کو پہنچی (جس سے مخالف مغلوب ہوگئے، اس وقت تک وہ صبر ہی کرتے رہے، اور اسی طرح صبر کرنے کے بعد آپ کو بھی امداد ہی پہنچے گی کیونکہ) اللہ تعالیٰ کی باتوں (یعنی وعدوں) کو کوئی بدلنے والا نہیں اور امداد کا وعدہ آپ سے ہوچکا ہے، جیسا فرمایا لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ، اور آپ کے پاس پیغمبروں کے بعض قصص (قرآن میں) پہنچ چکے ہیں (جن سے اللہ کی امداد اور مخالفین کا بالآخر مغلوب ہونا ثابت ہوتا ہے، اور حاصل اس تسلی کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ابتداءً چند روزہ صبر کے بعد وہ اپنے رسولوں کو امداد بھیج دیتے ہیں جس سے دنیا میں بھی حق کا غلبہ ہوتا ہے اور باطل مغلوب ہوجاتا ہے، اور آخرت میں بھی ان کو عزت و فلاح ملتی ہے، آپ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہونے والا ہے، آپ مغموم نہ ہوں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ تمام انسانوں کے ساتھ شفقت و محبت انتہا کی تھی آپ باوجود اس تسلی کے یہ چاہتے تھے کہ یہ مشرکین اگر موجودہ معجزات و نبوت کے دلائل پر مطمئن ہوکر ایمان نہیں لاتے تو جس قسم کے معجزات کا یہ مطالبہ کرتے ہیں وہی معجزات واقع ہوجائیں، شاید ایمان لے آویں، اور اس اعتبار سے ان کا کفر دیکھ کر صبر نہ آتا تھا، اس لئے اگلی آیات میں

اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا کہ بمقتضائے حکمت الٰہیہ ان کے فرمائشی معجزات واقع نہ کئے جاویں گے، آپؐ تا چندے صبر کریں ان کے وقوع کی فکر میں نہ پڑیں، چنانچہ فرمایا وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ) اور اگر آپ کو (منکرین) کا اعراض (و انکار) گراں گذرتا ہے (اور اس لئے جی چاہتا ہے کہ ان کے فرمائشی معجزات ظاہر ہو جاویں) تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں (جانے کو) کوئی سرنگ یا آسمان میں (جانے کو) کوئی سیڑھی ڈھونڈ لو پھر اس کے ذریعہ زمین یا آسمان میں جا کر وہاں سے) معجزہ (فرمائشی معجزوں میں سے) لے آؤ تو (بہتر ہے آپ ایسا) کر لو (یعنی ہم تو ان کی یہ فرمائشیں بوجہ عدم ضرورت و بمقتضائے حکمت کے پوری نہیں کرتے اگر آپ یہی چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح یہ مسلمان ہی ہو جاویں تو آپ خود اس کا انتظام کیجئے) اور اللہ کو (تکوینا) منظور ہوتا تو ان سب کو راہ راست پر جمع کر دیتا (لیکن چونکہ یہ خود ہی اپنا بھلا نہیں چاہتے اس لئے تکوینا اللہ کو یہ منظور نہیں ہوا پھر آپ کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے) سو آپ (اس فکر کو چھوڑ دیجئے اور) نادانوں میں سے نہ ہو جیئے (امر حق و ہدایت کو تو) وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو (حق بات کو طلب حق کے ارادہ سے) سنتے ہیں اور (اگر اس انکار و اعراض کی پوری سزا ان کو دنیا میں نہ ملی تو کیا ہوا آخر ایک دن) مُردوں کو اللہ تعالیٰ قبروں سے زندہ کر کے اٹھا دیں گے، پھر وہ سب اللہ ہی کی طرف (حساب کے لئے) لائے جاویں گے اور یہ (منکر) لوگ (براہِ عناد) کہتے ہیں کہ اگر یہ نبی ہیں تو ان پر (ہمارے فرمائشی معجزات میں سے) کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل کیا گیا، آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کو بے شک پوری قدرت ہے اس پر کہ وہ (ایسا ہی) معجزہ نازل فرما دیں، لیکن ان میں اکثر (اس کے انجام سے) بے خبر ہیں، (اس لئے ایسی درخواست کرتے ہیں، اور وہ انجام یہ ہے کہ اگر پھر بھی ایمان نہ لادیں گے تو سب فوراً ہلاک کر دیئے جاویں گے لقولہ تعالیٰ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ، حاصل یہ ہے کہ ان کا فرمائشی معجزہ ظاہر کرنے کی ضرورت تو اس لئے نہیں کہ پہلے معجزات کافی ہیں، لقولہ تعالیٰ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ الخ اور ہم جانتے ہیں کہ فرمائشی معجزہ پر بھی ایمان نہ لادیں گے جس سے فوری عذاب کے مستحق ہو جاویں گے اس لئے حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کا فرمائشی معجزہ ظاہر نہ کیا جائے، اور آیت کے آخر میں وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ فرمانا محبت و شفقت کے طور پر ہے، لفظ جہالت عربی زبان میں اس معنی عام کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، بخلاف اردو زبان کے، اس لئے اس کا ترجمہ لفظ جہل یا جہالت سے کرنا ادب کے خلاف ہے، اگلی آیات میں تنبیہ کے لئے قیامت اور تمام خلائق کے حشر کا ذکر ہے) اور جتنی قسم کے جاندار زمین پر (خواہ خشکی میں یا پانی میں) چلنے والے ہیں اور جتنی قسم کے پرند جانور ہیں کہ اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتے ہیں ان میں کوئی

قسم ایسی نہیں جو کہ (قیامت کے دن زندہ ہو کر اٹھنے میں) تمہاری طرح کے گروہ نہ ہوں اور اگر
یہ سب چیزیں کثرت کی وجہ سے معلوم ہوتی ہیں کہ بے شمار ہوں لیکن ہمارے حساب میں سب منضبط ہیں کیونکہ
ہم نے اپنے دفتر (لوح محفوظ) میں کوئی چیز جو قیامت تک ہونے والی ہے بے لکھے نہیں چھوڑی
(اگرچہ اللہ تعالیٰ کو لکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی ان کا علم ازلی ابدی کافی ہے لیکن لکھنے کے ذریعے
منضبط کر دینا انتظام کے قریب تر ہے) پھر اس کے بعد اپنے وقت معین پر سب انسان اور جاندار
اپنے پروردگار کے پاس جمع کئے جاویں گے آگے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کا مضمون ہے،
اور جو لوگ ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں وہ تو (حق سننے سے) بہرے (جیسے) اور (حق کہنے سے)
گونگے (جیسے) ہو رہے ہیں، اور اسی وجہ سے طرح طرح کی ظلمتوں میں گرفتار ہیں (کیونکہ
ہر کفر ایک ظلمت ہے اور ان میں مختلف قسم کے کفر جمع ہیں پھر ان اقسام کفر کا بار بار تکرار الگ
ظلمتیں ہیں) اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں (بوجہ عناد عن الحق کے) بے راہ کر دیں اور وہ جس کو چاہیں
(اپنے فضل سے) سیدھی راہ پر لگا دیں آپ (ان مشرکین سے) کہیے کہ (اچھا) یہ تو بتاؤ کہ اگر تم
پر اللہ کا کوئی عذاب آپڑے یا تم پر قیامت ہی آپہونچے تو کیا (اس عذاب اور ہول قیامت کو
ہٹانے کے واسطے) خدا کے سوا کسی اور کو پکارو گے اگر تم (شرک کے دعوے میں) سچے ہو (تو
چاہئے اس وقت بھی غیر اللہ ہی کو پکارو لیکن ایسا ہرگز نہ ہوگا) بلکہ (اس وقت تو) خاص اسی کو
پکارنے لگو پھر جس (آفت) کے (ہٹانے) کے لئے تم اس کو پکارو اگر وہ چاہے تو اس کو
ہٹا بھی دے اور نہ چاہے تو نہ بھی ہٹاوے) اور جن کو تم (رب اللہ کا) شریک ٹھہراتے ہو (اس وقت)
ان سب کو بھول بھال جاؤ۔

معارف ومسائل

آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں تو یہ فرمایا ہے فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ، یعنی یہ کفار
درحقیقت آپ کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ آیات اللہ کی تکذیب کرتے ہیں، اس کا واقعہ تفسیر مظہری
میں بروایت سُدّی یہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ کفار قریش کے دو سردار اخنس بن شریق اور ابوجہل
کی ملاقات ہوئی، تو اخنس نے ابوجہل سے پوچھا کہ اے ابوالحکم (عرب میں ابوجہل
ابوالحکم کے نام سے پکارا جاتا تھا اسلام میں اس کے کفر و عناد کے سبب ابوجہل کا لقب دیا گیا)
یہ تنہائی کا موقع ہے میرے اور تمہارے کلام کو کوئی تیسرا نہیں سن رہا ہے، مجھے محمد بن عبداللہ
(صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق اپنا خیال ٹھیک ٹھیک بتلاؤ کہ ان کو سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا۔
ابوجہل نے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ بلاشبہ محمد سچے ہیں، انھوں نے عمر بھر میں کبھی جھوٹ

نہیں ہوا، لیکن بات یہ ہو کہ قبیلۂ قریش کی ایک شاخ بنو قصی میں ساری خوبیاں اور کمالات جمع ہو جائیں، تو قریش خالی رہ جائیں اس کو ہم کیسے برداشت کریں؟ جھنڈا بنی قصی کے ہاتھ میں ہو، حرم میں حجاج کو پانی پلانے کی اہم خدمت ان کے ہاتھ میں ہے، بیت اللہ کی دربانی اور اس کی کنجی ان کے ہاتھ میں ہے، اب اگر نبوت بھی ہم انہی کے لئے تسلیم کریں تو باقی قریش کے پاس کیا رہ جائے گا۔

ایک دوسری روایت ناجیہ ابن کعب سے منقول ہے کہ ابوجہل نے ایک مرتبہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہمیں آپ پر جھوٹ کا کوئی گمان نہیں اور نہ ہم آپ کی تکذیب کرتے ہیں، ہاں ہم اس کتاب یا دین کی تکذیب کرتے ہیں جس کو آپ لائے ہیں (مظہری)

ان روایات کی بناء پر آیت کو اپنے حقیقی مفہوم میں بھی لیا جا سکتا ہے کہ یہ کفار آپ کی نہیں بلکہ آیات اللہ کی تکذیب کرتے ہیں اور اس آیت کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کفار اگرچہ ظاہر میں آپ ہی کی تکذیب کرتے ہیں، مگر درحقیقت آپ کی تکذیب کا انجام خود اللہ تعالیٰ اور اس کی آیات کی تکذیب ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص مجھے ایذا پہنچاتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچانے کے حکم میں ہے۔"

اور چھٹی آیت وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ سے معلوم ہوا کہ قیامت کے روز انسانوں کے ساتھ تمام جانور بھی زندہ کئے جاویں گے، اور ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ قیامت کے روز تمام جانور، بہائم اور پرندے بھی دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کا انصاف اس حد تک ہے کہ اگر کسی سینگ والے جانور نے بے سینگ کے جانور کو دنیا میں مارا تھا تو آج اُس کا انتقام اس سے لیا جائے گا، (اسی طرح دوسرے جانوروں کے باہمی مظالم کا انتقام لیا جائے گا) اور جب اُن کے آپس کے حقوق و مظالم کے بدلے اور انتقام ہو چکیں گے، تو ان کو حکم ہوگا کہ سب مٹی ہو جاؤ، اور تمام جانور اسی وقت پھر مٹی کا ڈھیر ہو کر رہ جائیں گے، یہی وقت ہوگا جبکہ کافر کہے گا: يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا، یعنی کاش میرا بھی یہی معاملہ ہو جاتا کہ مجھے مٹی بنا دیا جاتا، اور عذاب جہنم سے بچ جاتا۔

اور امام بغویؒ نے ایک دوسری روایت میں حضرت ابوہریرہؓ ہی سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز سب اہل حقوق کے حق ادا کئے جائیں گے یہاں تک کہ بے سینگ کی بکری کا انتقام سینگ والی بکری سے بھی لیا جاوے گا۔

حقوقِ خلق کی انتہائی اہمیت | یہ سب کو معلوم ہے کہ جانور کسی شریعت اور احکام کے مکلف

نہیں ان کے مکلف صرف انسان اور جن ہیں، اور ظاہر ہے کہ غیر مکلف سے جزاء و سزا کا معاملہ نہیں ہو سکتا، اس لئے علماء نے فرمایا ہے کہ محشر میں جانوروں کا انتقام ان کے مکلف ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ رب العالمین کے غایت عدل و انصاف کی وجہ سے ہے کہ ایک جاندار کسی جاندار پر کوئی ظلم کرے تو اس کا بدلہ دلوایا جائے گا، باقی ان کے کسی اور عمل پر جزاء و سزا نہ ہوگی، اس سے معلوم ہوا کہ مخلوقات کے باہمی حقوق و مظالم کا معاملہ اتنا سنگین ہے کہ غیر مکلف جانوروں کو بھی اس سے آزاد نہیں کیا گیا، مگر افسوس ہے کہ بہت سے دیندار اور عبادت گذار آدمی بھی اس میں غفلت برتتے ہیں۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَأَخَذْنَاهُم بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ

اور ہم نے رسول بھیجے تھے بہت سی امتوں پر تجھ سے پہلے پھر ان کو پکڑا ہم نے سختی میں اور تکلیف

لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ ﴿٤٢﴾ فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُم بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَٰكِن

میں تاکہ وہ گڑگڑائیں پھر کیوں نہ گڑگڑائے جب آیا ان پر عذاب ہمارا لیکن

قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾

سخت ہوگئے دل ان کے اور بھلے کر دکھلائے ان کو شیطان نے جو کام وہ کر رہے تھے

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ

پھر جب وہ بھول گئے اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی کھول دیئے ہم نے ان پر دروازے ہر چیز کے یہاں تک

إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ ﴿٤٤﴾

کہ جب خوش ہوئے ان چیزوں پر جو ان کو دی گئیں پکڑ لیا ہم نے ان کو اچانک پس اس وقت وہ رہ گئے ناامید

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٥﴾

پھر کٹ گئی جڑ ان ظالموں کی، اور سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو پالنے والا ہے سارے جہان کا

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے آپ سے پہلے اور امتوں کی طرف بھی پیغمبر بھیجے تھے (مگر انہوں نے ان کو نہ مانا) تو ہم نے ان کو تنگدستی اور بیماری سے پکڑا تاکہ وہ ڈھیلے پڑ جاویں (اور اپنے کفر و معصیت سے توبہ کر لیں) سو جب ان کو ہماری سزا پہونچی تھی وہ ڈھیلے کیوں نہ پڑے (کہ ان کا جرم معاف ہو جاتا) لیکن ان کے قلوب تو ویسے ہی سخت (کے سخت) رہے، اور شیطان ان کے اعمال بد کو ان کے خیال میں (بدستور) آراستہ (و مستحسن) کر کے دکھاتا رہا، پھر جب وہ لوگ (بدستور) ان چیزوں

کو بھُولے رہے (اور چھوڑے رہے) جس کی ان کو (پیغمبروں کی طرف سے) نصیحت کی جاتی تھی (یعنی ایمان و طاعت) تو ہم نے اُن پر (عیش و عشرت کی) ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب اُن چیزوں پر جو کہ ان کو ملی تھیں وہ خوب اِترا گئے (اور غفلت و مستی میں ان کا کفر اور بڑھ گیا اس وقت) ہم نے ان کو دفعۃً (بے گمان عذاب میں) پکڑ لیا (اور عذاب شدید نازل کیا جس کا ذکر قرآن میں جا بجا آیا ہے) پھر (اس عذاب سے) ظالم لوگوں کی جڑ (تک) کٹ گئی اور اللہ کا شکر ہے جو تمام عالم کا پروردگار ہے (کہ ایسے ظالموں کا بیج کٹا جن کی وجہ سے دنیا میں نحوست پھیلی تھی)

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں شرک و کفر کا ابطال اور توحید کا اثبات ایک خاص انداز میں کیا گیا ہے کہ پہلے مشرکین مکہ سے سوال کیا گیا کہ اگر تم پر آج کوئی مصیبت آپڑے، مثلاً خدا تعالیٰ کا عذاب اسی دنیا میں تم پر آجائے، یا موت یا قیامت کا ہولناک ہنگامہ برپا ہوجائے، تو اپنے دلوں میں غور کرکے بتلاؤ کہ تم اُس وقت اپنی مصیبت کو دور کرنے کے لئے کس کو پکارو گے اور کس سے امید رکھو گے کہ وہ تمہیں عذاب اور مصیبت سے نجات دلائے، کیا یہ پتھر کے خود تراشیدہ بُت یا مخلوق میں سے دوسرے لوگ جن کو تم نے خدا تعالیٰ کی حیثیت دے رکھی ہے اُس وقت تمہارے کام آئیں گے، اور تم اُن سے فریاد کرو گے یا صرف ایک اللہ جل شانہ کو ہی اس وقت پکارو گے۔

اس کا جواب کسی ذی ہوش انسان کی طرف سے بجز اس کے ہو ہی نہیں سکتا جو خود حق تعالیٰ نے ان کی طرف سے ذکر فرمایا کہ اس مصیبت کے وقت بڑے سے بڑا مشرک بھی سب بُتوں اور خود تراشیدہ معبودوں کو بھول جائے گا اور صرف خدا تعالیٰ کو پکارے گا، تو اب نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ تمہارے بُت اور دوسرے معبود جن کو تم نے خدا تعالیٰ کی حیثیت دے رکھی ہے اور ان کو اپنا مشکل کشا اور حاجت روا جانتے اور کہتے ہو جب اس بڑی مصیبت کے وقت تمہارے کام نہ آئے اور تمہیں یہ جرأت و ہمت بھی نہ ہوسکی کہ ان کو اپنی مدد کے لئے بلاؤ، تو پھر اُن کی عبادت اور ان کی مشکل کشائی کس دن کام آئے گی۔

یہ مضمون سابقہ آیات کا خلاصہ ہے، ان میں بطور فرض کے یہ بتلایا گیا کہ تمہارے کفر و شرک اور نافرمانی کی سزا میں تم پر اسی دنیا کی زندگی میں بھی عذاب آسکتا ہے، اور بالفرض زندگی میں عذاب نہ آیا تو قیامت کا آنا تو یقینی ہے جہاں انسان کے سب اعمال و افعال کا جائزہ لیا جائے گا، اور جزاء و سزا کے احکام نافذ ہوں گے۔

یہاں قیامت سے مراد متعارف معنی قیامت کے بھی ہوسکتے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ

کہ لفظ ساعت سے اس جگہ قیامت صغریٰ مراد ہو جو ہر انسان کی موت پر قائم ہو جاتی ہے جیسا کہ معروف ہے کہ: مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ "یعنی جو شخص مر گیا اس کی قیامت تو آج ہی قائم ہو گئی"، کیونکہ قیامت کے حساب و کتاب کا ابتدائی نمونہ بھی قبر و برزخ میں سامنے آجائے گا اور وہاں کی جزاء و سزا کے نمونے بھی یہیں سے شروع ہو جائیں گے۔

حاصل یہ ہے کہ نافرمانی کرنے والوں کو اس آیت میں متنبہ کیا گیا ہے، کہ اپنی اس نافرمانی کے ساتھ بے فکر ہو کر مت بیٹھو، ہو سکتا ہے کہ اسی دنیا کی زندگی میں تم پر اللہ تعالیٰ کا کوئی عذاب آجائے جیسا پچھلی امتوں پر آیا ہے، اور یہ بھی نہ ہو تو پھر موت یا قیامت کے بعد کا حساب تو یقینی ہے۔

لیکن اپنی زندگی کے محدود واقعات اور اس میں پیش آنے والے نہایت محدود تجربات پر پوری دنیا اور پوری عالم کو قیاس کرنے والے انسان کی طبیعت ایسی چیزوں میں حیلہ جو ہوتی ہے وہ انبیاء علیہم السلام کے انذار و تنبیہات کو موہوم خیالات کہہ کر ٹال جاتے ہیں خصوصاً جبکہ ایسے حالات بھی ہر زمانہ میں سامنے آتے ہیں کہ بہت سے لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی کھلی نافرمانیوں کے باوجود مزے میں رہتے ہیں، دنیا میں مال و دولت، عزت و شوکت سب کچھ ان کو حاصل ہے، ایک طرف یہ مشاہدہ اور دوسری طرف اللہ کے پیغمبر کی یہ تخویف کہ نافرمانی کرنے والوں پر عذاب آیا کرتے ہیں، جب ان دونوں کو ملا کر دیکھتے ہیں تو انکی حیلہ جو طبیعت اور شیطان ان کو یہی سکھاتا ہے کہ پیغمبر کا قول ایک فریب یا موہوم خیال ہے۔

اس کے جواب کے لئے مذکور الصدر آیات میں حق تعالیٰ نے پچھلی امتوں کے واقعات اور ان پر جاری ہونے والا قانونِ قدرت بیان فرمایا ہے، ارشاد فرمایا: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝ "یعنی ہم نے آپ سے پہلے بھی اپنے رسول دوسری امتوں کی طرف بھیجے، اور دو طرح سے ان کا امتحان لیا گیا، اول کچھ سختی اور تکلیف ان پر ڈال کر یہ دیکھا گیا کہ تکلیف و مصیبت سے گھبرا کر بھی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یا نہیں، جب وہ اس میں فیل ہوئے اور بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونے اور سرکشی سے باز آنے کے وہ اور زیادہ اس میں منہمک ہو گئے، تو اب ان کا دوسری قسم کا امتحان لیا گیا کہ ان پر دنیوی عیش و راحت کے دروازے کھول دیئے گئے اور حیات دنیا سے متعلق ان کو سب کچھ دیدیا گیا کہ شاید یہ لوگ نعمتوں کو دیکھ کر اپنے منعم اور محسن کو پہچانیں، اور اس طرح ان کو خدا یاد آئے، لیکن وہ اس امتحان میں بھی ناکام ثابت ہوئے، اپنے محسن و منعم کو پہچاننے اور اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے وہ عیش و عشرت کی بھول بھلیاں میں ایسے کھوئے گئے کہ اللہ اور رسول کے پیغامات و تعلیمات کو یکسر بھلا بیٹھے، اور چند روزہ

عیش میں بدمست ہوگئے تو دونوں طرح کے امتحان و آزمائش میں ناکام رہنے کے بعد ان پر ہر طرح کی حجت تمام ہوگئی تو اللہ تعالیٰ کے عذاب میں دفعۃً پکڑ لئے گئے، اور ایسے نیست و نابود کر دئے گئے کہ ان کا سلسلۂ نسل بھی باقی نہ رہا، یہ عذاب پچھلی امتوں پر اکثر اس طرح آیا کہ کبھی آسمان سے کبھی زمین سے کبھی کسی دوسری صورت سے ایک عذاب عام آیا، اور پوری کی پوری قوم اس میں بھسم ہو کر رہ گئی، نوح علیہ السلام کی پوری قوم کو پانی کے ایسے طوفان عام نے گھیر لیا جس سے پہاڑوں کی چوٹیاں بھی محفوظ نہ رہ سکیں، قوم عاد پر ہوا کا شدید طوفان آٹھ دن تک مسلسل رہا جس سے ان کا کوئی فرد باقی نہ بچا، قوم ثمود کو ایک خوفناک آواز کے ذریعہ تباہ کر دیا گیا، قوم لوط علیہ السلام کی پوری بستی کو الٹ دیا گیا، جو آج تک اردن کے علاقہ میں ایک عجیب قسم کے پانی کی صورت میں موجود ہے جس میں کوئی جانور مینڈک مچھلی وغیرہ زندہ نہیں رہ سکتی، اسی لئے اس کو بحر میت کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، اور بحر لوط کے نام سے بھی۔

غرض پچھلی امتوں کی بات ماننے والوں کی سزا اکثر تو ان مختلف قسم کے عذاب کی شکل میں آئی جس میں یک وقت پوری قوم تباہ و برباد ہو گئی، اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ وہ بظاہر طبعی موت سے مرگئے اور آگے کوئی ان کا نام لیوا بھی باقی نہ رہا۔

آیت مذکورہ میں یہ بھی بتلا دیا کہ رب العالمین کسی قوم پر عذاب دفعۃً نہیں بھیجتے بلکہ بطور تنبیہ کے تھوڑی تھوڑی سزائیں نازل فرماتے ہیں جن کے ذریعہ سعید و نیک بخت لوگ اپنی غفلت سے باز آ کر صحیح راستہ پر لگ سکیں، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو تکلیف اور مصیبت دنیا میں بطور سزا کے دی جاتی ہے اس کی صورت اگرچہ سزا کی ہوتی ہے لیکن حقیقت اس کی بھی سزا نہیں ہوتی، بلکہ غفلت سے چونکانے اور بیدار کرنے کے لئے ہوتی ہے، جو عین مقتضائے رحمت ہے، قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ "یعنی ہم ان کو عذاب اکبر چکھانے سے پہلے ایک عذاب ادنیٰ چکھاتے ہیں تاکہ وہ اب بھی حقیقت کو سمجھ کر اپنے غلط راستہ سے باز آجائیں"۔

اس آیت سے یہ شبہ بھی دور ہو گیا کہ یہ دنیا تو دار الجزاء نہیں بلکہ دار العمل ہے، یہاں تو نیک و بد اور خیر و شر یکجا ملے جلے رہتے ہیں بلکہ بد نیکوں سے اچھے رہتے ہیں، پھر اس دنیا میں سزا جاری ہونے کا کیا مطلب؟ جواب واضح ہے کہ اصل جزاء و سزا تو اسی روز قیامت میں ہوگی جس کا نام ہی یوم الدین یعنی روز جزاء ہے، لیکن کچھ تکلیفیں بطور نمونہ عذاب کے اور کچھ راحتیں بطور نمونہ ثواب کے اس دنیا میں بمقتضائے رحمت بھی دی جاتی ہیں اور بعض

الگ ایک اُمّی محض ہو کر رہنا، ایسی بستی میں پیدا ہونا جس کے آس پاس کبھی کوئی علم و تمدن تھا نہیں، مگر عمر شریف کے چالیس سال اس کی قوم کے سامنے میں سب کے سامنے رہنا، پھر چالیس سال کے بعد دفعۃً آپ کی زبان مبارک سے ایسا محیّر العقول حکیمانہ کلام جاری ہونا جس کی فصاحت و بلاغت نے تمام اہل عرب کو چیلنج دے کر ہمیشہ کے لئے ان کے منہ پر مہر لگا دی، اور جس کی حکمت پرور معانی نے قیامت تک کی ضروریات انسانی کی رعایت کے ساتھ انسان کامل کی زندگی کا ایک ضابطہ جس کو انسانی عقل و دماغ ہرگز مرتب نہیں کرسکتا، نہ صرف نظری اور فکری حیثیت سے جمع کر کے پیش کیا، بلکہ عملی طور پر بھی دنیا میں نہایت کامیابی کے ساتھ رائج کر کے دکھلا دیا، اور وہ انسان جو اپنی انسانیت کو بھلا کر بیل، بکری، گھوڑے، گدھے کی طرح اپنی زندگی کا مقصد صرف کھانے پینے، سونے جاگنے کو قرار دے چکا تھا اس کو پھر انسانیت کا سبق دیا، اس کا رخ اس بلند مقصد کی طرف پھیر دیا جس کے لئے اس کی تخلیق عمل میں آئی تھی، اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر دور اور اس میں پیش آنے والے تمام واقعات میں سے ہر ایک ایک مستقل معجزہ اور آیت بینہ تھی جس کے بعد کسی انصاف پسند عقلمند کے لئے مزید کسی آیت و معجزہ کے طلب کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔

لیکن کفار قریش نے اس کے باوجود دوسری قسم کے معجزات اپنی خواہش کے مطابق طلب کئے، ان کے مطلوبہ معجزات میں سے بھی جس کو حق تعالیٰ نے واضح طور پر عمل میں لا کر دکھلا دیا، چاند کے دو ٹکڑے کرنے کا مطالبہ کیا تھا، شق قمر کا معجزہ نہ صرف قریش نے بلکہ اس وقت کی دنیا میں بسنے والوں کی بڑی تعداد نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔

لیکن ان کے مطالبہ کے موافق ایسے عظیم الشان معجزہ ظاہر ہونے کے باوجود وہ اپنے اسی کفر و ضلالت اور ضد و عناد پر جمے رہے اور اللہ تعالیٰ کی اس آیت بینہ کو اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ کہہ کر نظر انداز کر دیا، اور ان سب چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے باوجود ان کی طرف سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روز نئے نئے معجزات کا مطالبہ رہتا تھا، اور جیسا کہ پچھلی آیتوں میں گذرا ہے: لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓي اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ "یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم واقعی اللہ کے رسول ہیں تو ان کا کوئی معجزہ کیوں ظاہر نہیں ہوتا، قرآن نے ان کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم

دیا کہ آپ ان لوگوں کو بتلا دیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو سب کچھ ہے، اس نے جس طرح معجزات
مانگے بغیر خود ہی بے شمار آیات بینات اور معجزات نازل فرمادیئے اسی طرح وہ تمہارے مطلوبہ
معجزات بھی نازل فرماسکتا ہے، لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ عادۃ اللہ اس بارے میں یہ ہے کہ
جب کسی قوم کو مطلوبہ معجزہ دکھلا دیا جائے اور پھر وہ اس پر بھی ایمان نہ لائیں تو ان کو فوری
عذاب میں پکڑ لیا جاتا ہے، اس لئے قوم کی مصلحت اسی میں تھی اور ہے کہ ان کے مطلوبہ
معجزات ظاہر نہ کئے جائیں، مگر بہت سے لوگ جو اس دقیق حکمت سے جاہل و بے خبر ہیں،
ان کا اصرار یہی رہتا ہے کہ ہمارا مطلوبہ معجزہ دکھلایا جائے۔

مذکور الصدر آیتوں میں ان لوگوں کے ایسے ہی سوالات و مطالبات کا جواب ایک خاص
انداز سے دیا گیا ہے۔

کفار مکہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف اوقات میں تین مطالبے پیش
کئے تھے، اول یہ کہ اگر آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں تو بذریعہ معجزہ ہمارے لئے تمام دنیا
کے خزائن جمع کرا دیجئے، دوسرے یہ کہ اگر آپ واقعی سچے رسول ہیں تو ہمارے مستقبل میں
پیش آنے والے تمام مفید یا مضر حادثات و واقعات بتلا دیجئے تاکہ ہم مفید چیزوں کے حاصل
کرنے اور مضر صورتوں سے بچنے کا انتظام پہلے ہی کرلیا کریں، تیسرے یہ کہ ہماری سمجھ میں
نہیں آتا کہ ہماری ہی قوم کا ایک انسان جو ہماری ہی طرح ماں باپ سے پیدا ہوا، اور تمام
بشری صفات کھانے پینے، بازاروں میں پھرنے وغیرہ میں ہمارے ساتھ شریک ہے وہ
اللہ کا رسول بن جائے، کوئی فرشتہ ہوتا جس کی تخلیق اور اوصاف ہم سب سے ممتاز
ہوتے، تو ہم اس کو خدا تعالیٰ کا رسول اور اپنا پیشوا مان لیتے۔

ان تینوں سوالات کے جواب میں ارشاد ہوا قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّىْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ
یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی گئی کہ ان لوگوں کے ان تینوں سوالات کے جواب
میں آپ ان سے صاف کہہ دیجئے کہ تم جو مجھ سے خزائن دنیا کا مطالبہ کرتے ہو تو میں نے کب
یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سب خزانے میرے ہاتھ میں ہیں، اور تم جو یہ مطالبہ کرتے
ہو کہ مستقبل میں پیش آنے والے ہر مفید یا مضر معاملہ و واقعہ کو میں تمہیں بتلا دوں تو
میں نے کب یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں ہر غیب کی چیز کو جانتا ہوں، اور تم جو مجھ میں فرشتوں
کی مخصوص صفات دیکھنا چاہتے ہو، تو میں نے کب کہا ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مجھ سے وہیں اس چیز کی مانگ ہو سکتی ہے جس کا میں نے دعویٰ کیا ہو

یعنی یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں جس کی بھیجی ہوئی ہدایت انسانوں کو پہونچاتا ہوں اور خود بھی ان کا اتباع کرتا ہوں اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتا ہوں، چنانچہ اس کے لئے ایک دو نہیں بے شمار واضح دلائل پیش کئے جاچکے ہیں۔

اس دعویٰ رسالت کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اللہ کا رسول اللہ کے سب خزانوں کا مالک ہوجائے، اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرح غیب کی ہر چھوٹی بڑی چیز سے واقف ہو، اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ انسانی و بشری صفات سے جدا کوئی فرشتہ ہو بلکہ رسول کا منصب صرف اتنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی وحی کا اتباع کرے، جس میں خود اس پر عمل کرنا بھی داخل ہے، اور دوسرے لوگوں کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دینا بھی۔

اس ہدایت نامہ سے منصب رسالت کی حقیقت کو بھی واضح فرمادیا گیا، اور رسول کے بارے میں جو غلط تصورات ان لوگوں نے قائم کر رکھے تھے ان کا ازالہ بھی کردیا گیا، اور اس کے ضمن میں مسلمانوں کو بھی یہ ہدایت کردی گئی کہ وہ عیسائیوں کی طرح اپنے رسول کو خدا نہ بنائیں، اور خدائی کا مالک قرار دیں، ان کی عظمت و اطاعت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ان کے متعلق یہود و نصاریٰ کی طرح افراط و تفریط میں اور غلو میں نہ پڑجائیں، کہ یہود نے تو انبیاء کے قتل تک سے گریز نہ کیا اور نصاریٰ نے اپنے رسول کو خدا بنادیا۔

اس کے پہلے جملہ میں جو ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے خزانے میرے ہاتھ میں نہیں ان خزانوں سے کیا مراد ہے؟ علماء تفسیر نے بہت سی چیزوں کے نام لئے ہیں، مگر خود قرآن کریم نے جہاں اللہ کے خزانوں کا ذکر کیا ہے تو اس میں فرمایا ہے: وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَاۗىِٕنُهٗ، یعنی کوئی چیز دنیا کی ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ خزائن اللہ کا مفہوم دنیا کی تمام چیزوں پر حاوی ہے کچھ خاص چیزوں کو متعین نہیں کیا جاسکتا، اور جن حضرات مفسرین نے مخصوص چیزوں کے نام لئے ہیں وہ بھی بطور مثال کے ہے، اس لئے اختلاف کچھ نہیں، اور جب اس آیت نے یہ بتلادیا کہ خدائی کے سارے خزانے سید الرسل امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں بھی نہیں ہیں تو پھر امت کے کسی بزرگ یا ولی کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ جو چاہیں کرسکتے ہیں جس کو جو چاہیں دے سکتے ہیں کھلی ہوئی جہالت ہے۔

آخری جملہ میں فرمایا: وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّىْ مَلَكٌ "یعنی میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں جس کی وجہ سے تم بشری صفت کو دیکھ کر رسالت کا انکار کرتے ہو"۔

درمیانی جملہ میں طرز کلام بدل کر بجائے اس کے کہ لَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّىْ اَعْلَمُ الْغَيْبَ

فرمایا تھا۔ یعنی یہ کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میں غیب کو جانتا ہوں، ارشاد یوں فرمایا گیا کہ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ یعنی میں غیب کو نہیں جانتا۔

ابوحیان نے تفسیر بحر محیط میں اس طرز کلام کے بدلنے کی ایک لطیف توجیہ یہ بیان فرمائی ہے کہ تمام خدائی خزانوں کا مالک متولی نہ ہونا، اسی طرح کسی شخص کا فرشتہ ہونا یا نہ ہونا یہ چیزیں تو مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہیں، مخاطب لوگ بھی سب جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے خزائن سب آپ کے ہاتھ میں نہیں اور آپ فرشتہ بھی نہیں، محض عناد سے اس کا مطالبہ کرتے تھے، ان کے جواب میں یہ کہہ دینا کافی تھا کہ میں نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ میں خزائن اللہ کا مالک ہوں یا یہ کہ میں فرشتہ ہوں۔

لیکن علم غیب کا مسئلہ ایسا نہ تھا، کیونکہ وہ لوگ اپنے نجومیوں، کاہنوں کے بارے میں بھی اس کا اعتقاد رکھتے تھے کہ وہ غیب کو جانتے ہیں، تو اللہ کے رسولؐ کے بارے میں ایسا اعتقاد رکھنا کچھ مستبعد نہ تھا، خصوصاً جب کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے انھوں نے بہت سی غیب کی خبریں سنی تھیں، اور ان کے مطابق واقعہ ہونے کا مشاہدہ بھی کیا تھا، اس لئے یہاں صرف دعوی اور قول کی نفی کرنے کو کافی نہ سمجھا، بلکہ اصل فعل کی نفی کی گئی اور یہ فرمایا وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ یعنی میں غیب کو نہیں جانتا، اس میں ان کی اس غلط فہمی کو بھی رفع کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی یا الہام جن غیب کی چیزوں کا علم کسی فرشتہ یا رسول یا ولی کو دیا جاتا ہے اصطلاح قرآنی میں اس کو علم غیب یا اس کے جاننے والے کو عالم الغیب نہیں کہا جا سکتا۔

اسی سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ امت میں کسی مسلمان کو کلام نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کی ہزاروں لاکھوں چیزوں کا علم عطا فرمایا تھا، بلکہ تمام فرشتوں اور اولین و آخرین کو جتنا علم دیا گیا ہے ان سب سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم عطا فرمایا گیا ہے، یہی پوری امت کا عقیدہ ہے، ہاں اس کے ساتھ ہی قرآن و سنت کی بے شمار تصریحات کے مطابق تمام ائمہ سلف و خلف کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ تمام کائنات کا علم محیط صرف حق تعالیٰ شانہ کی مخصوص صفت ہے، جس طرح اس کے خالق و رازق، قادر مطلق ہونے میں کوئی فرشتہ یا رسول اس کے برابر نہیں ہو سکتا، اسی طرح اس کے علم محیط میں بھی کوئی اس کے برابر نہیں ہو سکتا، اس لئے حق تعالیٰ کے سوا کسی فرشتہ یا پیغمبر کو غیب کی لاکھوں چیزیں معلوم ہونے کے باوجود عالم الغیب نہیں کہا جا سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ سرور کائنات سید الرسل خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

بَیْنِنَا ؕ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰکِرِیْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذَا جَآءَکَ الَّذِیْنَ

ہم سب میں کیا نہیں ہے اللہ خوب جاننے والا شکر گزاروں کو ۔ اور جب آویں تیرے پاس

یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِہِ

ہماری آیتوں کے ماننے والے تو کہہ دے تو سلام ہے تم پر لکھ لیا ہے تمہارے رب نے اپنے اوپر

الرَّحْمَۃَ ۙ اَنَّہٗ مَنْ عَمِلَ مِنْکُمْ سُوْٓءًۢا بِجَہَالَۃٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ

رحمت کو کہ جو کوئی کرے تم میں سے برائی ناواقفیت سے پھر اس کے بعد توبہ کر لے

بَعْدِہٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّہٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۵۴﴾ وَکَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ

اور نیک ہو جاوے تو بات یہ ہے کہ وہ ہے بخشنے والا مہربان اور اسی طرح ہم تفصیل سے بیان

وَلِتَسْتَبِیْنَ سَبِیْلُ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۵۵﴾

کرتے ہیں آیتوں کو اور تاکہ کھل جاوے طریقہ گنہگاروں کا

ع ۶ ۵ ۱۲

خلاصۂ تفسیر

اور ان لوگوں کو (اپنی مجلس سے) نہ نکالئے جو صبح و شام (یعنی علی الدوام بدوام حق) اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں جس سے صرف اللہ کی رضا ہی کا قصد رکھتے ہیں (اور کوئی غرض جاہ و مال کی نہیں، یعنی ان کی عبادت میں مداومت بھی ہے اور اخلاص بھی، اور اخلاص اگرچہ امر باطنی ہے مگر آثار و علامات سے پہچانا بھی جا سکتا ہے، اور جب تک عدم اخلاص کی کوئی دلیل نہیں، اخلاص ہی کا گمان رکھنا چاہئے) اور ان (کے باطن) کا حساب (اور تفتیش) ذرا بھی آپ کے متعلق نہیں اور (یہ ان کے باطن کی تفتیش کا آپ سے متعلق نہ ہونا ایسا یقینی ہے جیسا کہ) آپ (کے باطن) کا حساب (و تفتیش) ذرا بھی ان کے متعلق نہیں کہ آپ ان کو نکال دیں، (یعنی اگر ان کے باطنی اخلاص کی تفتیش آپ کے ذمہ ہوتی تو اس کی گنجائش تھی کہ جن کے اخلاص ..... کی تحقیق نہ ہو جاتے ان کو الگ کر دیں، مگر وہ آپ کے ذمہ نہیں، اور دوسری کوئی وجہ ان کو نکالنے کے جواز کی موجود نہیں، اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امت کے مربی ہیں، اور مربی کے لئے اپنے ماتحتوں کے احوال کی تفتیش کرنے کا احتمال ہو سکتا تھا، مگر اس کا عکس کہ وہ لوگ اپنے پیغمبر کے باطنی احوال کی تفتیش کریں، اس کا کوئی احتمال ہی نہیں اس لئے وہ قطعاً منفی ہے، اس جگہ محتمل کو متیقن کے ساتھ برابر قرار دے کر اس کی نفی کی گئی تاکہ اس کا منفی ہونا بھی یقینی ہو جاوے) ورنہ (ان کے نکالنے سے) آپ نامناسب

حکم کرنے والوں میں ہو جاویں گے اور (ہم نے جو مومنوں کو غریب، کافروں کو رئیس بنا رکھا ہے جو بادیٔ مقتضائے قیاس سے بعید ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) اسی طور پر ہم نے ان میں سے ایک (یعنی کفار) کو دوسرے (یعنی مومنین) کے ذریعہ آزمائش میں ڈال رکھا ہے (یعنی اس طرز عمل میں امتحان ان کفار کا ہے) تاکہ یہ لوگ (مومنوں کے متعلق) کہا کریں کیا یہی لوگ ہیں کہ ہم سب میں سے (انتخاب کرکے) ان پر اللہ تعالیٰ نے (اپنا) فضل کیا ہے (یعنی اپنے دین اسلام کے لئے ان کو منتخب کیا ہے) کیا یہ بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ حق شناسوں کو خوب جانتا ہے (ان غریب لوگوں نے چونکہ منعم حقیقی کا حق پہچانا، طلب حق میں لگ گئے، دین حق اور قبول عند اللہ سے مشرف کئے گئے، اور ان رؤساء نے ناشکری اور کفر کیا وہ اس نعمت سے محروم رہے) اور جب یہ لوگ آپ کے پاس آئیں جو کہ ہماری آیتوں پر ایمان بھی رکھتے ہیں تو آپ (ان کو بشارت سنانے کے لئے) یوں کہہ دیجئے کہ تم پر سلامتی ہے (یعنی کفار پر جو ہر طرح کی آفات آخرت میں پڑیں گی ان سے تم مامون ہو) اور دوسرے یہ بھی کہ تمہارے رب نے (اپنے فضل وکرم سے) رحمت کرنا (اور تم کو نعمتیں دینا) اپنے ذمہ مقرر کرلیا ہے (یہاں تک) کہ جو شخص تم میں سے کوئی برا کام کر بیٹھے (جو کہ) جہالت سے (ہو جاتا ہے، کیونکہ خلاف حکم کرنا عقلاً جہالت ہے) مگر پھر وہ اس کے بعد توبہ کرلے (اور آئندہ کو اپنے اعمال کی) اصلاح رکھے (اس میں یہ بھی آگیا کہ اگر وہ توبہ ٹوٹ جائے تو پھر توبہ کرلے) تو اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ (اس کے لئے بھی) بڑے مغفرت کرنے والے ہیں (کہ گناہ کی سزا بھی معاف کردیں گے) اور بڑی رحمت کرنے والے ہیں (کہ طرح طرح کی نعمتیں بھی دیں گے) اور (جس طرح ہم نے اس مقام پر مومنین اور کفار کے حال و مآل کی تفصیل کردی) اسی طرح ہم آیات کی (جو کہ دونوں فریق کے حال و مآل پر مشتمل ہوں) تفصیل کرتے رہتے ہیں (تاکہ مومنین کا طریقہ بھی ظاہر ہو جائے) اور تاکہ مجرمین کا طریقہ (بھی) ظاہر ہو جائے (اور حق و باطل کے واضح ہونے سے طالب حق کو معرفتِ حق آسان ہو جائے)۔

معارف و مسائل

نظریہ جاہلیت کا ازالہ اور عزت و ذلت کا اسلامی معیار، اسلام میں امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہیں

جن لوگوں نے انسان ہونے کے باوجود انسانیت کو نہیں پہچانا بلکہ انسان کو دنیا کے مختلف جانوروں میں سے ایک ہوشیار جانور قرار دیا، جس نے دوسرے جانوروں کو اپنا تابع و محکوم بنا کر سب سے خدمت لی، ان کے نزدیک انسان کی تخلیق کا منشا اس کے

سوا ہو ہی کیا سکتا ہے کہ وہ ایک جانور کی طرح کھانے پینے، سونے جاگنے اور دوسرے حیوانی جذبات کو استعمال کرنے ہی کو مقصدِ زندگی سمجھیں، اور جب مقصدِ زندگی صرف یہی ہو تو یہ بھی ظاہر ہے کہ اس دنیا میں اچھے برے، بڑے چھوٹے، باعزت و بے عزت، شریف و رذیل کے پہچاننے کا معیار یہی ہو سکتا ہے کہ جس کے پاس کھانے پینے، پہننے برتنے کا سامان زیادہ ہو وہ کامیاب اور باعزت اور شریف ہے، اور جس کے پاس یہ چیزیں کم ہوں وہ بے عزت، ذلیل اور نامراد و ناکام ہے۔

انصاف کی بات یہ ہے کہ اس عقیدہ و نظریہ پر اخلاق و اعمالِ صالحہ کی کوئی بحث ہی انسان کے شریف اور معزز ہونے میں نہیں آتی، بلکہ وہی عمل صالح اور خلق حسن ہوگا، جس کے ذریعہ یہ حیوانی مقاصد اچھی طرح پورے ہو سکیں۔

اسی لئے تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کے لائے ہوئے دین و مذہب کا پہلا اور آخری سبق یہی ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جو دائمی اور غیر منقطع ہوگی، وہاں کی راحت بھی مکمل اور دائمی ہوگی اور تکلیف و عذاب بھی مکمل اور دائمی، دنیا کی زندگی خود مقصد نہیں، بلکہ دوسری زندگی میں جو سامان کام آنے والا ہے اس کی فراہمی اس چند روزہ زندگی کا اصل مقصد ہے ؎

رہا مرنے کی تیاری میں مصروف
مرا کام اور اس دنیا میں تھا کیا

اور انسان و حیوان میں یہی امتیازی فرق ہے کہ حیوانات کو اگلی زندگی کا کوئی فکر نہیں، بخلاف انسان کے کہ اس کی سب سے بڑی فکر اہلِ عقل و ہوش کے نزدیک دوسری زندگی کی درستی ہے، اسی عقیدہ و نظریہ پر شرافت و رذالت اور عزت و ذلت کا معیار ظاہر ہے کہ زیادہ کھانا پینا یا زیادہ مال و دولت جمع کر لینا نہیں ہوگا، بلکہ اخلاقِ حسنہ اور اعمالِ صالحہ ہوں گے، جن پر آخرت کی عزت کا مدار ہے۔

دنیا جس وقت بھی انبیاء علیہم السلام کی ہدایات اور تعلیمات اور عقیدۂ آخرت سے غافل ہوئی تو اس کا طبعی نتیجہ سامنے آگیا، کہ عزت و دولت اور شرافت و رذالت کا معیار صرف روٹی اور پیٹ رہ گیا، جو اس میں کامیاب ہے وہ شریف و معزز کہلاتا ہے، جو اس میں ناکام یا ادھورا ہے وہ غریب، بے عزت، رذیل و ذلیل سمجھا جاتا ہے۔

اسی لئے ہر زمانہ میں صرف حیاتِ دنیا کی بھول بھلیاں میں پھنسے ہوئے انسانوں نے مالدار کو معزز و شریف اور غریب و فقیر کو بے عزت و رذیل قرار دیا، حضرت نوح علیہ السلام

کی قوم نے ایمان لانے والے غریب لوگوں کو اپنی مجلس سے رذیل کہہ کر یہ اعتراض کیا کہ ہم ان رذیل لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم کوئی پیغام سنائیں تو ان غریب غرباء کو اپنے پاس سے نکال دیجئے، اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ، یعنی یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم آپ پر ایسی حالت میں ایمان لے آئیں جبکہ آپ کے متبعین رذیل قسم کے لوگ ہیں، حضرت نوح علیہ السلام نے ان کے اس دل خراش کلام کا جواب مخصوص پیغمبرانہ انداز میں یہ دیا کہ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰي رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ "یعنی مجھے ان کے اعمال سے پوری طرح واقفیت نہیں کہ یہ فیصلہ کرسکوں کہ وہ رذیل ہیں یا شریف معزز، بلکہ ہر شخص کے عمل کی حقیقت اور اس کا حساب میرے رب ہی کو معلوم ہے، جو دلوں کے بھید سے باخبر ہے"۔

نوح علیہ السلام نے ان جاہل اور متکبر انسانوں کو شرافت و رذالت کی حقیقت سے ناآشنا لوگوں کا رخ ایک واضح حقیقت کی طرف پھیر کر یہ بتلا دیا کہ شریف و رذیل کے الفاظ تم لوگ استعمال کرتے ہو اور ان کی حقیقت سے واقفیت نہیں، بس پیسہ والے کو شریف اور غریب کو رذیل کہنے لگے، حالانکہ شرافت و رذالت کا معیار پیسہ نہیں، بلکہ اعمال و اخلاق ہیں، اس موقع پر حضرت نوح علیہ السلام یہ فرما سکتے تھے کہ اعمال و اخلاق کے معیار پر یہ لوگ تم سے زیادہ شریف و معزز ہیں، لیکن پیغمبرانہ طرز تبلیغ و نصیحت نے اس کی اجازت نہ دی، کہ ایسا کلام کہیں جس سے مخاطب کو اشتعال ہو، اس لئے صرف اتنا فرما دیا کہ رذالت کا مدار تو اعمال و اخلاق پر ہے اور میں ان کے اعمال سے پوری طرح واقف نہیں، اس لئے ان کے شریف یا رذیل ہونے کا فیصلہ نہیں کرسکتا۔

نوح علیہ السلام کے بعد بھی ہر زمانہ میں قوم کے غریب لوگ خواہ وہ اپنے اخلاق و اعمال کے اعتبار سے کتنے ہی شریف اور باعزت ہوں مگر دنیا پرست، نخوت شعار لوگ ان کو حقیر و ذلیل کہتے آئے ہیں، اور یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی للّٰہیت اور اخلاقِ صالحہ کی بناء پر ہر زمانہ میں انبیاء علیہم السلام کی دعوت قبول کرنے میں پہل کی، یہاں تک کہ مذاہب و ملل کی تاریخ پر نظر رکھنے والوں کے نزدیک کسی پیغمبر کی صدق و حقانیت کی ایک دلیل یہ بن گئی کہ ان کے ابتدائی متبعین قوم کے غریب لوگ ہوں، یہی وجہ تھی کہ جب ہرقل شاہ روم کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گرامی نامہ دعوتِ اسلام کے لئے پہونچا اور اس نے آپ کی حقانیت و صدق کی تحقیق کرنا چاہی تو واقف کار لوگوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو سوالات کئے ہیں ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ ان کے اکثر متبعین غریب عوام

ہیں یا قوم کے بڑے لوگ؟ جب اس کو بتلایا گیا کہ غریب لوگ ہیں تو اس نے کہا کہ ہم اتباع الرسل یعنی رسولوں کے ابتدائی متبعین یہی لوگ ہوا کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بھی یہی سوال کھڑا ہوا، مذکورہ آیات میں اسی کا جواب خاص ہدایات کے ساتھ مذکور ہے۔

ابن کثیرؒ نے امام ابن جریرؒ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ کفار قریش کے چند سردار عتبہ، شیبہ ابن ربیعہ اور مطعم بن عدی اور حارث بن نوفل وغیرہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب کے پاس آئے اور کہا آپ کے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات سننے اور ماننے سے ہمارے لئے ایک رکاوٹ یہ بھی ہے کہ ان کے ارد گرد ہر وقت وہ لوگ رہتے ہیں جو یا تو ہمارے غلام تھے، ہم نے ان کو آزاد کر دیا، یا وہ لوگ ہیں جو ہمارے ہی انعام و کرم پر زندگی گذارتے تھے، ان حقیر و ذلیل لوگوں کے ہوتے ہوئے ہم ان کی مجلس میں شریک نہیں ہو سکتے، آپ ان سے کہہ دیں کہ ہمارے آنے کے وقت وہ ان لوگوں کو مجلس سے ہٹا دیا کریں، تو ہم ان کی بات سنیں اور غور کریں۔

ابوطالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی بات نقل کی تو فاروق اعظمؓ نے رائے دی کہ ایسا کرنے میں کیا حرج ہے، چند دنوں کے لئے آپ یہ بھی کر دیکھیں، یہ لوگ تو اپنے بے تکلف محبین ہیں، ان لوگوں کے آنے کے وقت مجلس سے ہٹ جایا کریں گے۔

اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی جس میں سختی کے ساتھ ایسا کرنے سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو منع فرما دیا گیا، نزولِ آیت کے بعد فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو معذرت کرنا پڑی کہ میری رائے غلط تھی۔

اور یہ غریب لوگ جن کے بارے میں یہ گفتگو ہوئی اس وقت حضرت بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ، عمار بن یاسرؓ، سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ، صبیح مولیٰ اسیدؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، مقداد بن عمروؓ، مسعود بن قاریؓ، ذوالشمالینؓ وغیرہ صحابہ کرام تھے جن کی عزت و شرافت کا پروانہ آسمان سے نازل ہوا، اور قرآن میں اسی کے متعلق دوسری جگہ اس کی تاکید ان الفاظ میں آئی، وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ آپ اپنے نفس کو ان لوگوں میں باندھ رکھیں جو صبح و شام یعنی ہر وقت اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں اخلاص کے ساتھ، آپ اپنی نظریں ان کے سوا کسی پر نہ ڈالا

کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی کہ آپ اُن کو سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ سے خطاب فرمائیں، یہاں سلام علیکم کے دو معنی ہوسکتے ہیں، ایک یہ کہ ان کو اللہ جل شانہ کا سلام پہنچا دیجئے، جس میں ان لوگوں کا انتہائی اعزاز و اکرام ہے، اس صورت میں ان غریب مسلمانوں کی دل شکنی کا بہترین تدارک ہوگیا جن کے بارہ میں رؤساء قریش نے مجلس سے ہٹا دینے کی تجویز پیش کی تھی، اور یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ آپ ان لوگوں کو سلامتی کی خوشخبری سُنا دیجئے، کہ اگر ان لوگوں سے عمل میں کوتاہی یا غلطی بھی ہوئی ہے تو وہ معاف کردی جائے گی، اور یہ ہر قسم کی آفات سے سلامت رہیں گے۔

دوسرے جملہ میں کَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ میں اس احسان پر اور مزید احسان انعام کا وعدہ اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ آپ ان مسلمانوں سے فرما دیں کہ تمہارے رب نے رحمت کرنے کو اپنے ذمہ لکھ لیا ہے، اس کے بہت [illegible] اور حکمتیں ہیں، اس جملہ میں اول تو رب استعمال فرما کر مضمون آیت کو مدلل کردیا، کہ اللہ تعالیٰ تمہارا پالنے والا ہے، اور ظاہر ہے کہ کوئی باپ دادا اپنے پالے ہوئے کو ضائع نہیں کیا کرتا، پھر لفظ رب سے جس رحمت کی طرف اشارہ کیا تھا اس کو صراحۃً بھی ذکر فرما دیا اور وہ بھی اس عنوان سے کہ تمہارے رب نے رحمت کرنے کو اپنے ذمہ لکھ لیا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ کسی شریف بھلے انسان سے بھی وعدہ خلافی صادر نہیں ہوتی تو رب العالمین سے کیسے ہوسکتی ہے، خصوصاً جبکہ اس وعدہ کو بصورت معاہدہ لکھ لیا گیا ہو۔

صحیح بخاری، مسلم، مسند احمد میں بروایت ابوہریرہ مذکور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوقات کو پیدا فرمایا، اور ہر ایک کی تقدیر کا فیصلہ فرمایا، تو ایک کتاب میں جو عرش پر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے یہ لکھا کہ اِنَّ رَحْمَتِیْ غَلَبَتْ غَضَبِیْ، ”یعنی میری رحمت میرے غصہ پر غالب ہے“

اور حضرت سلمان فارسی فرماتے ہیں کہ ہم نے تورات میں یہ لکھا دیکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آسمان زمین اور ان کی ساری مخلوقات کو پیدا فرمایا، تو صفت رحمت کے سو حصے کرکے ان میں سے ایک حصہ ساری مخلوقات کو تقسیم کردیا، اور آدمی اور جانور اور دوسری مخلوقات میں جہاں بھی کوئی اثر رحمت کا پایا جاتا ہے وہ اسی حصہ تقسیم شدہ کا اثر ہے، ماں باپ اور اولاد میں، بھائی بہنوں میں، شوہر بیوی میں، رشتہ داروں میں، پڑوسیوں اور دوسرے دوستوں میں جو باہمی ہمدردی و محبت و رحمت کے تعلقات مشاہدہ کئے جاتے ہیں، وہ سب اسی ایک حصہ رحمت کے آثار ہیں، باقی ننانوے حصے رحمت کے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لئے رکھے ہیں۔

نصوص اس پر دلالت کرتی ہیں کہ توبہ کرنے سے ہر گناہ معاف ہوسکتا ہے، خواہ غفلت وجہل کی وجہ سے سرزد ہوا ہو، یا جان بوجھ کر شرارت نفس اور اتباع ہویٰ کی وجہ سے۔

اس جگہ یہ بات خاص طور پر قابل نظر ہے کہ اس آیت میں گنہگاروں سے مغفرت اور رحمت کا جو وعدہ فرمایا گیا ہے وہ دو چیزوں کے ساتھ مشروط ہے، ایک توبہ، دوسرے اصلاح عمل، توبہ کے معنی ہیں گناہ پر ندامت کے، حدیث میں ارشاد ہے اِنَّمَا التَّوْبَةُ النَّدَمُ، یعنی توبہ نام ہے ندامت کا۔

دوسرے آئندہ کے لئے اصلاح عمل، اس اصلاح عمل میں یہ بھی داخل ہے کہ آئندہ اس گناہ کے پاس نہ جانے کا عزم اور پورا اہتمام کرے، اور یہ بھی شامل ہے کہ سابقہ گناہ سے جو حقوق کسی کے ضائع ہوئے ہیں تا بحد استطاعت ان کو ادا کرے، خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد، حقوق اللہ کی مثال نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ فرائض میں کوتاہی کرنا ہے، اور حقوق العباد کی مثال کسی کے مال پر ناجائز قبضہ و تصرف کرنا، کسی کی آبرو پر حملہ کرنا، کسی کو گالی گلوچ کے ذریعہ یا کسی دوسری صورت سے ایذاء پہنچانا ہے۔

اس لئے تکمیل توبہ کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ گذشتہ گناہ پر ندامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرے اور آئندہ کے لئے اپنے عمل کو درست رکھے، اس گناہ کے پاس نہ جائے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جو نمازیں یا روزے غفلت سے ترک ہوگئے ہیں ان کی قضا کرے، جو زکوٰۃ نہیں دی گئی وہ سب ادا کرے، قربانی، صدقۃ الفطر کے واجبات میں کوتاہی ہوئی ہے تو ان کو ادا کرے، حج فرض ہونے کے باوجود ادا نہیں کیا تو اب ادا کرے اور خود نہ کر سکے تو حج بدل کرائے، اور اگر اپنے سامنے حج بدل اور دوسری قضاؤں کا موقع پورا نہ ملے تو وصیت کرے کہ اس کے وارث اس کے ذمہ ماندہ شدہ واجبات کا فدیہ یا حج بدل کا انتظام کرلیں، خلاصہ یہ ہے کہ اصلاح عمل کے لئے صرف آئندہ کا عمل درست کرلینا کافی نہیں، پچھلے فرائض و واجبات کو ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

اسی طرح حقوق العباد میں اگر کسی کا مال ناجائز طور پر لیا ہے تو اس کو واپس کرے، یا اس سے معاف کرائے اور کسی کو ہاتھ یا زبان سے ایذاء پہنچائی ہے تو اس سے معاف کرائے، اور اگر اس سے معاف کرانا اختیار میں نہ ہو، مثلاً وہ مرجائے یا ایسی جگہ چلا جائے جس کا اس کو پتہ معلوم نہیں، تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ اس شخص کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائے مغفرت کرتے رہنے کا التزام کرے، اس سے امید ہے کہ صاحب حق راضی ہوجائے گا، اور یہ شخص سبکدوش ہوجائے گا۔

قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۚ

تو کہہ مجھ کو روکا گیا ہے اس سے کہ بندگی کروں ان کی جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا

قُلْ لَا أَتَّبِعُ أَهْوَاءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ إِذًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ﴿٥٦﴾

تو کہہ میں نہیں چلتا تمہاری خوشی پر بیشک اب تو میں بہک جاؤں گا اور نہ ہوں گا ہدایت پانے والوں میں

قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَكَذَّبْتُمْ بِهِ ۚ مَا عِنْدِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ

تو کہہ دے مجھ کو شہادت پہنچی ہے میرے رب کی اور تم نے اس کو جھٹلایا میرے پاس نہیں جس چیز کی تم جلدی

بِهِ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ يَقُصُّ الْحَقَّ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِينَ ﴿٥٧﴾

کر رہے ہو حکم کسی کا نہیں سوائے اللہ کے بیان کرتا ہے سچی بات اور وہ ہے سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا

قُلْ لَوْ أَنَّ عِنْدِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ لَقُضِيَ الْأَمْرُ بَيْنِي وَ

تو کہہ اگر ہوتی میرے پاس وہ چیز جس کی تم جلدی کر رہے ہو تو فیصلہ ہو چکا ہوتا جھگڑا درمیان میرے اور

بَيْنَكُمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالظَّالِمِينَ ﴿٥٨﴾

درمیان تمہارے اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان مشرکین سے) کہہ دیجئے کہ مجھ کو (حق تعالیٰ کی طرف سے) اس سے ممانعت کی گئی ہے کہ ان (معبودوں) کی عبادت کروں جن کی تم لوگ اللہ (کی توحید) کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو (اور ان کے طریقہ کی گمراہی ظاہر کرنے کے لئے) آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہارے (باطل) خیالات کا اتباع نہ کروں گا، کیونکہ (اگر نعوذ باللہ میں ایسا کروں تو) اس حالت میں بے راہ ہو جاؤں گا اور راہ راست پر چلنے والوں میں نہ رہوں گا، آپ (ان سے یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میرے پاس تو (اس دین اسلام کے حق ہونے پر) ایک دلیل (کافی موجود) ہے جو میرے رب کی طرف سے (مجھ کو ملی) ہے (یعنی قرآن مجید جو کہ میرا معجزہ ہے، جس سے میری تصدیق ہوتی ہے) اور تم (بلا وجہ) اس کی تکذیب کرتے ہو (اور تم جو یہ کہتے ہو کہ اگر دین اسلام حق ہے تو ہمارے انکار پر آسمان سے پتھر برسیں یا کوئی اور عذاب سخت آئے جیسا کہ دوسری جگہ ان الفاظ سے مذکور ہے إِنْ كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ تو اس کا جواب یہ ہے کہ) جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو (یعنی عذاب

پ

دیکھتے ہیں اور تمہاری جان کی بھی حفاظت کرتے ہیں) یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آپہنچتی ہے تو (اس وقت) اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) قبض کر لیتے ہیں اور ذرا کوتاہی نہیں کرتے (کہ جس وقت حفاظت کا حکم تھا حفاظت کرتے رہے جب موت کا حکم ہو گیا تو یہی محافظ روح قبض کرنے والے فرشتوں کے ساتھ مل جاتے ہیں) پھر سب اپنے مالک حقیقی کے پاس لوٹائے جاویں گے خوب سن لو (اس وقت) فیصلہ اللہ ہی کا ہوگا (اور کوئی دخل نہ دے سکے گا) اور وہ بہت جلد حساب لے لے گا۔

معارف و مسائل

گناہوں سے بچنے کا نسخہ اکسیر

تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کا طغرائے امتیاز اور اس کا رکن عظیم عقیدۂ توحید ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ایک مان لیا جانے کا نام توحید نہیں، بلکہ اس کو تمام صفات کمال میں یکتا و بے مثل ماننے اور اس کے سوا کسی مخلوق کو ان صفات کمال میں اس کا سہیم و شریک نہ سمجھنے کو توحید کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کمال، حیات، علم، قدرت، سمع، بصر، ارادہ، مشیت، خلق، رزق وغیرہ وہ ان سب صفات میں ایسا کامل ہے کہ اس کے سوا کوئی مخلوق کسی صفت میں اس کے برابر نہیں ہو سکتی، پھر ان صفات میں بھی دو صفتیں سب سے زیادہ ممتاز ہیں، ایک علم، دوسرے قدرت، اس کا علم بھی تمام موجود و غیر موجود، ظاہر و مخفی، بڑے اور چھوٹے ہر ذرہ ذرہ پر حاوی اور محیط ہے، اور اس کی قدرت بھی ان سب پر پوری پوری محیط ہے۔

مذکورہ دو آیتوں میں انہی دو صفتوں کا بیان ہے، اور یہ دو صفتیں ایسی ہیں کہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کی ان دو صفتوں پر کامل یقین اور اس کے استحضار کی کیفیت پیدا کرلے تو اس سے کوئی جرم و گناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا، ظاہر ہے کہ اگر ایک انسان کو اپنے ہر قول و عمل اور نشست و برخاست میں ہر قدم پر یہ مستحضر رہے کہ ایک علیم و خبیر قادر مطلق مجھے ہر وقت دیکھ رہا ہے، اور میرے ظاہر و باطن اور دل کے ارادہ اور خیال تک سے واقف ہے تو یہ استحضار کبھی اس کا قدم اس قادر مطلق کی نافرمانی کی طرف نہ اٹھنے دے گا، اس لئے یہ دونوں آیتیں انسان کو انسان کامل بنانے اور اس کے اعمال و اخلاق کو درست کرنے اور درست رکھنے میں نسخۂ اکسیر ہیں۔

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا: وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ، لفظ مفاتح جمع ہے، اس کا مفرد مَفتح بفتح میم بھی ہو سکتا ہے، جو خزانہ کے لئے بولا جاتا ہے،

جل شانہ کے سوا کسی مخلوق یا کسی چیز کو یہ علم و قدرت حاصل نہ ہو۔

قرآن کی اصطلاح میں لفظ غیب کے جو معنی (بحوالہ تفسیر مظہری) اوپر بیان کئے گئے ہیں کہ وہ چیزیں جو ابھی وجود میں نہیں آئیں یا آچکی ہیں مگر ابھی تک کسی مخلوق پر ان کا ظہور نہیں ہوا، اگر ان کو پیش نظر رکھا جائے تو مسئلہ غیب پر سطحی نظر میں جو جو شبہات عوام کو پیش آیا کرتے ہیں خود بخود ختم ہو جائیں۔

لیکن عام طور پر لوگ لفظ غیب کے لغوی معنی لیتے ہیں کہ جو چیز ہمارے علم و نظر سے غائب ہو خواہ دوسروں کے نزدیک اس کا علم حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہوں اس کو بھی غیب کہنے لگتے ہیں، اس کے نتیجہ میں طرح طرح کے شبہات سامنے آتے ہیں مثلاً علم نجوم، جفر، رمل، یا ہتھیلی کی لکیروں وغیرہ سے جو آئندہ واقعات کا علم حاصل کیا جاتا ہے، یا کشف و الہام کے ذریعہ کسی شخص کو واقعات آئندہ کا علم ہو جاتا ہے، یا مانسون کا رخ اور اس کی قوت رفتار کو دیکھ کر موسمیات کے ماہرین ہونے والے باد و باراں کے متعلق پیشین گوئیاں کرتے ہیں، اور ان میں بہت سی باتیں صحیح بھی ہو جاتی ہیں، یہ سب چیزیں عوام کی نظر میں علم غیب ہوتی ہیں، اس لئے آیت مذکورہ پر یہ شبہات ہونے لگتے ہیں کہ قرآن کریم نے تو علم غیب کو ذات حق جل شانہ کی خصوصیت بتلایا ہے، اور مشاہدہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

جواب واضح ہے کہ کشف و الہام یا وحی کے ذریعہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بندہ کو کسی آئندہ واقعہ کی اطلاع دیدی تو قرآنی اصطلاح میں وہ علم غیب نہ رہا، اسی طرح اسباب و آلات کے ذریعہ جو علم حاصل کیا جائے وہ بھی اصطلاح قرآنی کے لحاظ سے علم غیب نہیں، جیسے محکمہ موسمیات کی خبریں یا نبض دیکھ کر مریض کے مخفی حالات بتلا دینا، وجہ یہ ہے کہ محکمہ موسمیات کو یا کسی حکیم ڈاکٹر کو ایسی خبریں دینے کا موقع جب ہی ہاتھ آیا جب ان واقعات کا مادہ پیدا ہو کر ظاہر ہو جاتا ہے، فرق اتنا ہے کہ ابھی اس کا ظہور عام نہیں ہوتا آلات کے ذریعہ اہل فن کو ظاہر ہوتا ہے، عوام بے خبر رہتے ہیں، اور جب یہ مادہ قوی ہو جاتا ہے تو اس کا ظہور عام ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ محکمہ موسمیات مہینہ دو مہینہ بعد ہونے والی بارش کی خبر آج نہیں دے سکتا، کیونکہ ابھی اس بارش کا مادہ سامنے نہیں آیا، اسی طرح کوئی حکیم ڈاکٹر سال دو سال پہلے کی کھائی ہوئی، یا دو سال بعد کھائی جانے والی دوا یا غذا وغیرہ کا پتہ آج نبض دیکھ کر نہیں دے سکتا، کیونکہ اس کا کوئی اثر عادۃً نبض میں نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ سب چیزیں وہ ہیں کہ کسی چیز کے آثار و نشانات دیکھ کر اس کے

وجود کی خبر دیدی جاتی ہے، اور جب اس کے آثار و نشانات اور مادہ ظاہر ہو چکا تو اب وہ غیب میں شامل نہ رہا، بلکہ مشاہدہ میں آگیا، البتہ لطیف یا ضعیف ہونے کی وجہ سے عام مشاہدہ میں ابھی نہیں آیا، جب قوت پکڑ لے گا تو عام مشاہدہ میں بھی آجائے گا۔

اس کے علاوہ ان سب چیزوں سے حاصل ہونے والی واقفیت سب کچھ ہونے کے بعد بھی تخمینہ و اندازہ ہی کی حیثیت رکھتی ہے، علم جو یقین کا نام ہے وہ ان میں سے کسی چیز سے کسی کو حاصل نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ ان خبروں کے غلط ہونے کے بے شمار واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔

علم نجوم وغیرہ میں سے جو چیزیں حسابات سے متعلق ہیں ان کا علم تو علم ہے، مگر وہ غیب نہیں، جیسے حساب لگا کر کوئی یہ کہے کہ آج دس بج کر ستائیس منٹ پر آفتاب طلوع ہوگا یا فلاں مہینہ فلاں تاریخ کو چاند گرہن یا سورج گرہن ہوگا، ظاہر ہے کہ یہ ایک مخصوص چیز کی رفتار کا حساب لگا کر وقت کی تعیین کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہم ہوائی جہازوں اور ریلوں کے کسی پورٹ یا اسٹیشن پر پہنچنے کی خبر دیدیتے ہیں، اس کے علاوہ نجوم وغیرہ سے جو خبریں معلوم کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ دھوکے کے سوا کچھ نہیں، سو جھوٹ میں ایک سچ نکل آنا کوئی علم نہیں۔

حمل میں لڑکا ہے یا لڑکی، اس کے بارے میں بھی بہت سے اہل فن کچھ کہا کرتے ہیں، مگر تجربہ شاہد ہے کہ اس کا درجہ بھی وہی تخمینہ و اندازہ کا ہے یقینی نہیں، اور سو میں دو چار کا صحیح ہو جانا ایک طبعی امر ہے، وہ کسی علم و آگہی سے تعلق نہیں رکھتا۔

جب ایکسرے کے آلات ایجاد ہوئے تو بعض لوگوں کا خیال تھا کہ شاید اس کے ذریعہ حمل کا نر یا مادہ ہونا معلوم ہو جایا کرے گا، مگر تجربہ نے ثابت کر دیا کہ ایکسرے کے آلات بھی یہ متعین نہیں کر سکتے کہ حمل میں لڑکا ہے یا لڑکی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو چیز قرآنی اصطلاح میں غیب ہے، اس کا سوائے خدائے قدوس کے کسی کو علم نہیں، اور جن چیزوں کا علم لوگوں کو بعض اسباب و آلات کے ذریعہ عادۃً حاصل ہو جاتا ہے، وہ درحقیقت غیب نہیں، گو ظہور عام نہ ہونے کی وجہ سے اس کو غیب کہتے ہوں۔

اسی طرح کسی رسول و نبی کو بذریعہ وحی یا کسی ولی کو بذریعہ کشف و الہام جو غیب کی کچھ چیزوں کا علم دیدیا گیا تو وہ غیب کی حدود سے نکل گیا، اس کو قرآن میں غیب کی بجائے انباء غیب کہا گیا ہے، جیسا کہ متعدد آیات میں مذکور ہے: تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ، اس لئے آیت مذکورہ میں لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ، یعنی غیب کے

خزانوں کو بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا اس میں کسی شبہ یا استثناء کی گنجائش نہیں۔

اس جملہ میں تو حق جل شانہٗ کی یہ مخصوص صفت بتلائی گئی ہے کہ وہ عالم الغیب ہے، ہر غیب کو جانتا ہے، بعد کے جملوں میں غیب کے بالمقابل علم شہادت یعنی حاضر و موجود چیزوں کے علم کا بیان ہے کہ ان کے علم میں بھی حق جل شانہٗ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا علم محیط ہے کوئی ذرہ اس سے باہر نہیں، ارشاد فرمایا کہ وہی جانتا ہے ہر اس چیز کو جو خشکی میں ہے اور اس چیز کو جو دریا میں ہے، اور کوئی پتہ کسی درخت کا نہیں گرتا جس کا علم اس کو نہ ہو، اسی طرح کوئی دانہ جو زمین کے تاریک حصہ میں مستور ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے، اور ہر تر و خشک میں کل کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے علم میں ہے اور لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ علم کے متعلق دو چیزیں حق تعالیٰ کی خصوصیات میں سے ہیں، جن میں کوئی فرشتہ یا رسول یا کوئی دوسری مخلوق شریک نہیں، ایک علم غیب، دوسرے موجودات کا علم محیط جس سے کوئی ذرہ مخفی نہیں، اسی آیت میں یہی دونوں مخصوص صفات کا بیان ۔۔۔ اس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس سے پہلے جملہ میں پہلی خصوصیت کا بیان ہے وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ، اور بعد کے جملوں میں تمام کائنات و موجودات کے علم محیط کا ذکر اس طرح فرمایا کہ پہلے ارشاد ہوا وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے ہر اس چیز کو جو خشکی میں ہے اور جو دریا میں ہے، مراد اس سے کل کائنات و موجودات ہے، جیسے صبح و شام کہہ کر پورا زمانہ اور مشرق و مغرب کا لفظ بول کر پوری زمین مراد لی جاتی ہے، اسی طرح بر و بحر یعنی خشکی اور دریا بول کر مراد اس سے پورے عالم کی کائنات و موجودات ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ جل شانہٗ کا علم تمام کائنات پر محیط ہے۔

آگے اس کی مزید تشریح و تفصیل اس طرح بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کا تمام کائنات پر احاطہ بھی صرف یہی نہیں کہ بڑی بڑی چیزوں کا اس کو علم ہو، بلکہ ہر چھوٹی سے چھوٹی مخفی سے مخفی چیز بھی اس کے علم میں ہے، فرمایا وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا یعنی سارے جہان میں کسی درخت کا کوئی پتہ نہیں گرتا جو اس کے علم میں نہ ہو، مراد یہ ہے کہ ہر درخت کا ہر پتہ گرنے سے پہلے اور گرنے کے وقت اور گرنے کے بعد اس کے علم میں ہے وہ جانتا ہے کہ ہر پتہ درخت پر لگا ہوا کتنی مرتبہ الٹ پلٹ ہوگا، اور کب اور کہاں گرے گا، اور پھر وہ کس کس حال سے گذرے گا، گرنے کا ذکر شاید اسی لئے کیا گیا ہے کہ اس کے تمام حالات کی طرف اشارہ ہو جائے کیونکہ پتہ کا درخت سے گرنا اس کے نشو و نما اور نباتی زندگی کا آخری حال ہے، آخری حال کا ذکر کر کے تمام حالات کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ یعنی وہ دانہ جو زمین کی گہرائی اور اندھیری میں کہیں پڑا ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے، پہلے درخت کے پتے کا ذکر کیا جو عام نظروں کے سامنے گرتا ہے، اس کے بعد دانہ کا ذکر کیا جو کاشتکار زمین میں ڈالتا ہے، یا خودبخود کہیں زمین کی گہرائی اور اندھیری میں مستور ہو جاتا ہے، اس کے بعد پھر تمام کائنات پر علم باری تعالیٰ کا حاوی ہونا تر اور خشک کے عنوان سے ذکر فرمایا، اور فرمایا کہ یہ سب چیزیں اللہ کے نزدیک کتاب مبین میں لکھی ہوئی ہیں، کتاب مبین سے مراد بعض حضرات مفسرین کے نزدیک لوح محفوظ ہے، اور بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد علم الٰہی ہے، اور اس کو کتاب مبین سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ جیسے لکھی ہوئی چیز محفوظ ہو جاتی ہے، اس میں سہو و نسیان کی راہ نہیں رہتی اسی طرح اللہ جل شانہ کا یہ علم محیط تمام کائنات کے ذرہ ذرہ کا صرف تخمینی نہیں بلکہ یقینی ہے۔

قرآن مجید کی بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں کہ اس طرح کا علم محیط جس سے کائنات کا کوئی ذرہ اور اس کا کوئی حال خارج نہ ہو یہ صرف ذاتِ حق جل شانہ کے ساتھ مخصوص ہے،

سورۂ لقمان میں ہے:

اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ

"یعنی اگر کوئی دانہ رائی کے برابر ہو پھر وہ پتھر کے جگر میں پیوست ہو یا آسمان میں یا زمین میں کہیں ہو اللہ تعالیٰ ان سب کو جمع کرلیں گے، بیشک اللہ تعالیٰ لطیف اور ہر چیز سے خبردار ہے۔"

آیۃ الکرسی میں ہے:

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ

"یعنی اللہ تعالیٰ سب انسانوں کے اگلے اور پچھلے سب حالات سے واقف ہیں اور سارے انسان مل کر اس کے علم میں سے کسی ایک چیز کا بھی احاطہ نہیں کرسکتے بجز اس کے کہ خود اللہ تعالیٰ ہی کسی کو دینا چاہیں۔"

سورۂ یونس میں ہے:

وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ

"یعنی ایک ذرہ کے برابر بھی کوئی چیز زمین و آسمان میں آپ کے رب کے علم سے جدا نہیں ہے۔"

اور سورۂ طلاق میں ہے:

وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۝	"یعنی اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز پر محیط ہے"

اسی طرح بے شمار آیات میں یہ مضمون مختلف عنوانات سے آیا ہوا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ ان آیات میں بڑی وضاحت و صراحت کے ساتھ یہ بیان فرما دیا گیا ہے کہ غیب کا علم (جس کو قرآن میں غیب کہا گیا ہے اور اس کی تفسیر اوپر گذر چکی ہے) یا تمام کائنات کا علم محیط صرف اللہ جل شانہٗ کی مخصوص صفت ہے، ...... کسی فرشتہ یا رسول کے علم کو اسی طرح ہر ذرۂ کائنات پر محیط سمجھنا وہ عیسائیوں کی طرح رسول کو خدا کا درجہ دیدینا ہے اور خدا تعالیٰ کے برابر قرار دیدینا ہے جو بتصریح قرآن کریم شرک ہے، سورۂ شعراء میں شرک کی یہی حقیقت بیان فرمائی گئی ہے:

تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّیْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝	"یعنی قیامت کے روز مشرکین کہیں گے کہ بخدا ہم سخت گمراہی میں تھے کہ تم کو یعنی بتوں کو رب العالمین کے برابر کرتے تھے"

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو اور بالخصوص حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کی ہزاروں لاکھوں چیزوں کا علم عطا فرمایا ہے اور سب فرشتوں اور انبیاء سے زیادہ عطا فرمایا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی برابر کسی کا علم نہیں، نہ ہو سکتا ہے، ورنہ پھر یہ رسول کی تعظیم کا وہ غلو ہوگا جو عیسائیوں نے اختیار کیا، کہ رسول کو خدا کے برابر سمجھ دیا، اسی کا نام شرک ہے، نعوذ باللہ منہ۔

یہاں تک پہلی آیت کا بیان تھا جس میں حق جل شانہٗ کی صفتِ علم کی خصوصیات کا بیان ہے، کہ وہ ہر غیب و شہادت اور ہر ذرہ ذرہ کائنات پر حاوی ہے، دوسری آیت میں اسی طرح حق تعالیٰ کی صفتِ قدرت اور اس کے قادرِ مطلق ہونے کا بیان ہے جو اسی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، ارشاد ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى؛ "یعنی اللہ تعالیٰ ہر رات میں تمہاری روح کو ایک گونہ قبض کر لیتا ہے، اور پھر صبح کو جگا کر اٹھا دیتا ہے، تاکہ تمہاری مقررہ عمر پوری کر دے، اور پھر دن بھر میں تم جو کچھ کرتے ہو وہ سب اس کے علم میں ہے، یہ اللہ تعالیٰ ہی کی قدرتِ کاملہ ہے کہ انسان کے جینے، مرنے اور مر کر دوبارہ زندہ ہونے کا ایک نمونہ ہر روز اس کے

اسی لئے آثار بتاتے حدیث میں نیند کو موت کا بھائی فرمایا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ نیند انسان کے تمام قویٰ کو ایسا ہی معطل کر دیتی ہے جیسے موت۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے نیند اور پھر اس کے بعد بیداری کی مثال پیش فرما کر انسان کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ جس طرح ہر رات اور ہر صبح میں ہر شخص شخصی طور پر مر کر جینے کی ایک مثال کا مشاہدہ کرتا ہے، اسی طرح پورے عالم کی اجتماعی موت اور پھر اجتماعی زندگی کو سمجھ لو، جس کو قیامت کہا جاتا ہے، جو ذات اس پر قادر ہے اس کی قدرت کاملہ سے وہ بھی مستبعد نہیں، اسی لئے آخر آیت میں فرمایا ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ یعنی پھر تم کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تم کو بتلا دے گا جو تم عمل کیا کرتے تھے، اور یہ کہ اعمال کا حساب ہوگا، پھر اس پر جزاء و سزا ہوگی۔

تیسری آیت میں اسی مضمون کی مزید تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں پر ایک قوت قاہرہ رکھتا ہے، جب تک اس کو ان کا زندہ رکھنا منظور ہوتا ہے تو حفاظت کرنے والے فرشتے ان کی حفاظت کے لئے بھیج دیتا ہے، کسی کی مجال نہیں جو اس کو نقصان پہنچا سکے، اور جب کسی بندہ کا مقررہ وقت عمر کا پورا ہو جاتا ہے تو یہی حفاظت کرنے والے فرشتے اس کی موت کا ذریعہ بن جاتے ہیں، اور پھر اس کی موت کے سبب فراہم کرنے میں ذرا کمی نہیں کرتے، اور پھر مر کر بھی معاملہ ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ رُدُّوٓا إِلَى اللّٰهِ یعنی دوبارہ زندہ ہو کر پھر اللہ تعالیٰ کے پاس حاضر کئے جائیں گے، اس جگہ حکم الحاکمین کے سامنے پیشی اور عمر بھر کے حساب کا جب خیال کیا جائے تو کس کی مجال ہے جو پورا اتر سکے، اور عذاب سے بچ نکلے اس لئے اس کے ساتھ ہی ارشاد فرمایا إِلَى اللّٰهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ، یعنی اللہ تعالیٰ صرف حاکم اور احکم الحاکمین ہی نہیں وہ اپنے بندوں کے مولیٰ بھی ہیں جو ہر موقع پر ان کی مدد بھی کرتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا أَلَا لَهُ الْحُكْمُ، بیشک فیصلہ اور حکم صرف اسی کا ہے، یہاں یہ خیال ہو سکتا تھا کہ ایک ذات اور اربوں انسانوں کی پوری پوری عمروں کا حساب نمٹے گا کس طرح؟ اس لئے اس کے بعد فرمایا وَهُوَ أَسْرَعُ الْحَاسِبِينَ، یعنی اللہ تعالیٰ کے کاموں کو اپنے کاموں پر قیاس کرنا جہالت ہے، وہ بہت جلد سب حساب پورا فرما لیں گے۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ

تو کہہ کون تم کو بچا لاتا ہے جنگل کے اندھیروں سے اور دریا کے اندھیروں سے اس وقت میں کہ پکارتے ہو

خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾

تم اس کو گڑگڑا کر اور چپکے سے کہ اگر ہم کو بچا لے اس بلا سے تو البتہ ہم ضرور احسان مانیں گے

قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾

تو کہہ دے اللہ تم کو بچاتا ہے اس سے اور ہر سختی سے پھر بھی تم شرک کرتے ہو

خلاصۂ تفسیر

آپ ان لوگوں سے کہئے کہ وہ کون ہے جو تم کو خشکی اور دریا کی ظلمات (یعنی شدائد) سے اس حالت میں نجات دیدیتا ہے کہ تم اس کو (نجات دینے کے لئے) پکارتے ہو (کبھی) تذلل ظاہر کر کے اور (کبھی) چپکے چپکے (اور یوں کہتے ہو) کہ اے اللہ اگر آپ ہم کو ان (ظلمات) سے اب کی نجات دیدیں تو (پھر) ہم ضرور حق شناسی (پر قائم رہنے) والوں سے ہو جاویں (یعنی آپ کی توحید کے بڑی حق شناسی ہے قائل رہیں، اور اس سوال کا جواب چونکہ متعین ہے اور وہ لوگ بھی کوئی دوسرا جواب نہ دیں گے اس لئے) آپ (ہی) کہہ دیجئے کہ اللہ ہی تم کو ان سے نجات دیتا ہے (جب کبھی نجات ملتی ہے) اور (ان ظلمات مذکورہ کی کیا تخصیص ہے بلکہ) ہر غم سے (وہی نجات دیتا ہے مگر) تم (ایسے ہو کہ) پھر بھی (بعد نجات پانے کے بدستور) شرک کرنے لگتے ہو (جو کہ اعلیٰ درجہ کی ناحق شناسی ہے، اور وعدہ کیا تھا حق شناسی کا، غرض یہ کہ شدائد میں تمہارے اقرار سے توحید کا حق ہونا ثابت ہو جاتا ہے، پھر انکار کب قابلِ التفات ہے)

معارف و مسائل

علم الٰہی اور قدرت مطلقہ کے چند مظاہر پچھلی آیتوں میں اللہ جل شانہ کے علم و قدرت کا کمال اور ان کی بے مثال وسعت بیان کی گئی تھی، مذکورہ آیت میں اسی علم و قدرت کے کچھ آثار اور مظاہر کا بیان ہے،

پہلی آیت میں لفظ ظلمات، ظلمۃ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں اندھیری، ظلمات البر والبحر کے معنی خشکی اور دریا کی اندھیریاں ہے، چونکہ اندھیری کی مختلف قسمیں ہیں، رات کی اندھیری،

سے ہونے والی تدبیریں سب ناکام ہیں بلکہ مصائب میں اضافہ کرتی ہیں، کچھ اس قرآنی علاج پر غور کرے کہ ان مصائب سے نجات کی صرف ایک ہی راہ ہے کہ خدا کی طرف رجوع کیا جائے، مادی تدبیروں کو بھی اسی کی عطا کی ہوئی نعمت کے طور پر استعمال کیا جائے، اس کے سوا سلامتی کی کوئی صورت نہیں۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ

تو کہہ اسی کو قدرت ہے اس پر کہ بھیجے تم پر عذاب اوپر سے یا تمہارے

اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ

پاؤں کے نیچے سے یا بھڑا دے تم کو مختلف فرقے کر کے اور چکھا دے ایک کو لڑائی

بَاْسَ بَعْضٍ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝۶۵

ایک کی، دیکھ کس کس طرح سے ہم بیان کرتے ہیں آیتوں کو تاکہ وہ سمجھ جاویں

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۭ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝۶۶

اور اس کو جھوٹ بتلایا تیری قوم نے حالانکہ وہ حق ہے، تو کہہ دے میں نہیں ہوں تم پر داروغہ

لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۡ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۶۷

ہر ایک خبر کا ایک وقت مقرر ہے اور قریب ہے کہ اس کو جان لو گے

خلاصہ تفسیر

آپ (یہ بھی) کہئے کہ (جس طرح وہ نجات دینے پر قادر ہے اسی طرح) اس پر بھی وہی قادر ہے کہ تم پر (تمہارے کفر و شرک کی وجہ سے) کوئی عذاب تمہارے اوپر سے بھیج دے (جیسے پتھر یا ہوا یا بارش طوفانی) یا تمہارے پاؤں تلے (یعنی زمین) سے (اس سے رفع ہو کر) (جیسے زلزلہ یا غرق ہو جانا) اور ان عذابوں کے سبب قریب تو اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں، کبھی نہ کبھی ایسے ہوں گے خواہ دنیا میں یا آخرت میں، یا تم کو (غرض کے اختلاف سے مختلف) گروہ گروہ کر کے سب کو آپس میں بھڑا دے (یعنی لڑوا دے) اور تمہارے ایک کو دوسرے کی لڑائی (کے ذریعہ مزہ) چکھا دے (اور اس کا سبب قریب فعل اختیاری ہے) اور یا سب آفتیں جمع کر دے، غرض نجات دینا اور عذاب میں مبتلا کرنا دونوں اسی کی قدرت میں ہیں، اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آپ دیکھئے تو سہی ہم کس کس طرح دلائل توحید کو مختلف پہلوؤں سے

میرے بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان کے حکام کے دل ان پر سخت کر دیتا
ہوں وہ ان کو بدترین کا برا عذاب چکھاتے ہیں اس لئے تم حکام پر بددعا کرنے
میں اپنے اوقات ضائع نہ کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اپنے اعمال کی
اصلاح کی فکر میں لگ جاؤ تاکہ تمہارے سب کاموں کو درست کر دے۔

اسی طرح ابوداؤد و نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"جب اللہ تعالیٰ کسی امیر و حاکم کا بھلا چاہتے ہیں تو اس کو اچھا وزیر اور اچھا نائب دیدیتے ہیں کہ اگر امیر سے کچھ بھول ہو جائے تو وہ اس کو یاد دلا دے اور جب امیر صحیح کام کرے تو وہ اس کی مدد کرے، اور جب کسی حاکم و امیر کے لئے کوئی برائی مقدر ہوتی ہے تو برے آدمیوں کو اس کے وزراء و ماتحت بنادیا جاتا ہے۔ (الحدیث)

ان روایات اور آیت مذکورہ کی متذکرہ تفسیر کا حاصل یہ ہوا کہ انسان کو جو تکلیف اپنے حکام کے ہاتھوں پہونچتی ہیں وہ اوپر سے آنے والا عذاب ہے، اور جو اپنے ماتحتوں اور ملازموں کے ذریعہ پہونچتی ہیں وہ نیچے سے آنے والا عذاب ہے، اور یہ سب کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوتے بلکہ ایک قانون الٰہی کے تحت انسان کے اعمال کی سزا ہوتے ہیں۔ حضرت سفیان ثوری نے فرمایا کہ جب مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو میں اس کا اثر اپنے نوکر .... اور اپنی سواری کے گھوڑے اور باربرداری کے گدھے کے مزاج میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ یہ سب میری نافرمانی کرنے لگتے ہیں۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ

خلق را باتو چنیں بدخو کنند
تا ترا ناچار رو آں سو کنند

یعنی اللہ تعالیٰ دنیا میں تمہارے زبردست حکام یا ماتحت ملازموں کے ذریعہ تمہارے خلاف مزاج تکلیف دہ معاملات کا ظاہری عذاب تم پر مسلط کرکے درحقیقت تمہارا رخ اپنی طرف پھیرنا چاہتے ہیں، تاکہ تم ہوشیار ہو جاؤ اور اپنے اعمال کو درست کرکے آخرت کے عذاب اکبر سے بچ جاؤ۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق حکام کا ظلم وجور اوپر سے آنے والا عذاب ہے، اور ماتحت ملازموں کی بے ایمانی، کام چوری، غداری، نیچے سے آنے والا عذاب ہے، اور دونوں کا علاج ایک ہی ہے کہ سب اپنے اپنے اعمال کا

جائزہ لیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور بے راہ روی سے باز آجائیں تو قدرت خود ایسے حالات پیدا کر دے گی کہ یہ مصیبت رفع ہو، ورنہ صرف مادی تدبیروں کے ذریعہ ان کی اصلاح کی امید اپنے نفس کو دھوکہ دینے کے سوا کچھ نہیں، جس کا تجربہ ہر وقت ہو رہا ہے ؎

خویش را دیدیم و رسوائی خویش
امتحانِ ما مکن اے شاہ بیش

اوپر اور نیچے کے عذاب کی جو مختلف تفسیریں آپ نے ابھی سنی ہیں درحقیقت ان میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ لفظ عَذَابًا جو اس آیت میں آیا ہے درحقیقت ان تمام تفسیروں پر حاوی ہے۔ آسمان سے برسنے والے پتھر، خون، آگ، دریائی پانی کا سیلاب اور بالادست حکام کا ظلم و جور یہ سب اوپر سے آنے والے عذاب میں داخل ہیں، اور زمین شق ہو کر کسی قوم کا اس میں دھنس جانا یا پانی زمین سے ابل کر غرق ہو جانا یا ماتحت ملازموں کے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا ہو جانا یہ سب نیچے سے آنے والے عذاب ہیں۔

تیسری قسم عذاب کی جو اس آیت میں ذکر کی گئی ہے وہ یہ ہے اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا یعنی تمہاری مختلف پارٹیاں بن کر آپس میں بھڑ جائیں، اور باہم ایک دوسرے کے لئے عذاب بن جائیں۔ اس میں لفظ يَلْبِسَكُمْ، لبس کے مادہ سے بنا ہے، جس کے اصلی معنی چھپا لینے اور ڈھانپ لینے کے ہیں، اسی معنی سے لباس ان کپڑوں کو کہا جاتا ہے جو انسان کے بدن کو ڈھانپ لے، اور اسی وجہ سے التباس بمعنی شبہ و اشتباہ استعمال ہوتا ہے جہاں کسی کلام کی مراد مستور ہو صاف اور کھلی ہوئی نہ ہو۔

اور لفظ شِيَعًا، شِيْعَةٌ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں کسی کا پیرو اور تابع، قرآن مجید میں ہے وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ" یعنی نوح علیہ السلام کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں ابراہیم علیہ السلام، اسی لئے عرف و محاورہ میں لفظ شیعہ ایسی جماعت کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی خاص غرض کے لئے جمع ہوں، اور اس غرض میں ایک دوسرے کے معاون ہوں جس کا بامحاورہ ترجمہ آجکل کی زبان میں فرقہ یا پارٹی ہے۔

اس لئے آیت کا ترجمہ یہ ہو گیا کہ عذاب کی ایک قسم یہ ہے کہ قوم مختلف پارٹیوں میں بٹ کر آپس میں بھڑ جائے، اسی لئے جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا:

لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ

"یعنی تم میرے بعد پھر کافروں جیسے نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردن

(اخرجہ ابن ابی حاتم عن زید بن اسلم، مظہری) | مارنے لگو"

حضرت سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہے تھے، جب گذر مسجد بنی معاویہ پر ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لے گئے اور دو رکعت نماز پڑھی، ہم نے بھی دو رکعت ادا کی، اس کے بعد آپ دعا میں مشغول ہوگئے اور بہت دیر تک دعا کرتے رہے، پھر کے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے تین چیزوں کا سوال کیا، ایک یہ کہ میری امت کو غرق کرکے ہلاک نہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمالی، دوسرے یہ کہ میری امت کو قحط اور بھوک کے ذریعہ ہلاک نہ کیا جائے یہ بھی قبول فرمالی، تیسری دعا یہ کی کہ میری امت آپس کے جنگ و جدال سے تباہ نہ ہو، مجھے اس دعا سے روک دیا گیا۔ (مظہری بحوالہ البغوی)

اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے، اس میں تین دعاؤں میں سے ایک دعا یہ ہے کہ میری امت پر کسی دشمن کو مسلط نہ فرمادے جو سب کو تباہ و برباد کردے، یہ دعا قبول ہوئی، اور آپس میں نہ بھڑ جانے کی دعا کو منع کردیا گیا۔

ان روایات سے ثابت ہوا کہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر اس قسم کے عذاب تو نہیں آئیں گے جیسے پچھلی امتوں پر آسمان یا زمین سے آئے جس سے ان کی پوری قوم تباہ و برباد ہوگئی، لیکن ایک عذاب دنیا میں اس امت پر بھی آتا رہے گا، وہ عذاب آپس کی جنگ جدال اور فرقوں اور پارٹیوں کا باہم تصادم ہے، اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو فرقوں اور پارٹیوں میں منقسم ہوکر باہمی آویزش اور جنگ و جدال سے منع کرنے میں انتہائی تاکید سے کام لیا ہے، اور ہر موقع پر اس سے ڈرایا ہے کہ تم پر خدا تعالیٰ کا عذاب اس دنیا میں اگر آئے گا تو آپس ہی کی جنگ و جدال کے ذریعہ آئے گا۔

سورۂ ہود کی ایک آیت میں یہ مضمون اور بھی زیادہ وضاحت سے آیا ہے:

وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ (ہود)	"یہ لوگ ہمیشہ آپس میں اختلاف ہی کرتے رہیں گے بجز ان لوگوں کے جن پر اللہ تعالیٰ نے رحمت فرمائی"

اس سے واضح ہوا کہ جو لوگ آپس میں بلا وجہ شرعی اختلاف کرتے ہیں وہ رحمت خداوندی سے محروم یا بعید ہیں۔

ایک آیت میں ارشاد ہے: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا

دوسری آیت میں ارشاد ہے: وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا

ان تمام آیات و روایات کا حاصل یہ ہے کہ اختلاف پرستی اور مذموم عصبیت آج بھی دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے مسلمانوں کی پستی و بربادی کے سبب بن گیا ہے تو گزشتہ مصائب کا سبب یہی آپس کا اختلاف اور تشتت نظر آئے گا، ہماری بد عملیوں کے نتیجے میں یہ عذاب ہم پر مسلط ہو گیا کہ وہ قوم جس کا مرکز توحید کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ تھا، جس کے ماننے والے دنیا کے کسی خطے میں ہوں کسی زبان کے بولنے والے ہوں کسی رنگ کا ہو کسی نسل و نسب سے تعلق ہو سب بھائی بھائی تھے، کوہ و دریا کی دشوار گذار منازل ان کی وحدت میں حائل نہ تھیں، نسب و خاندان، رنگ و زبان کا تفاوت ان کی راہ میں رکاوٹ نہ تھا ان کی قومی وحدت صرف اس کلمہ سے وابستہ تھی، عربی، مصری، شامی، ترکی، ہندی، چینی، کی تقسیم صرف شناخت و تعارف کے لئے تھی، اور کچھ نہیں، بقول اقبال مرحوم ؎

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر اس کا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمرقند

آج دوسری قوموں کی دسیسہ کاریوں اور مسلسل کوششوں نے پھر ان کو نسلی اور وطنی اور لسانی قومیتوں میں بانٹ دیا اور پھر ان میں سے بھی ہر ایک قوم و جماعت اپنے اندر کی تشتت اور انتشار کا شکار ہو کر مختلف پارٹیوں میں بٹ گئی، وہ قوم جس کا شعار غیروں سے بھی عفو و درگذر اور ایثار تھا وہ جھگڑوں سے بچنے کے لئے اپنے بڑے سے بڑے حق کو چھوڑ دیتی تھی آج اس کے بہت سے افراد ذاتی حقیر و ذلیل خواہشات کے پیچھے بڑے سے بڑے تعلق کو قربان کر دیتے ہیں، یہی وہ خانہ جنگی و باہمی اختلاف ہے جو قوم و **ملت کے لئے منحوس اور اس دنیا میں نقد عذاب ہے۔**

ہاں اس جگہ یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ وہ اختلاف جس کو قرآن میں عذاب الٰہی اور رحمت خداوندی سے محرومی فرمایا گیا ہے وہ وہ اختلاف ہے جو اصول اور عقائد میں ہو یا نفسانی اغراض و اہواء کی وجہ سے ہو، اس میں وہ اختلاف رائے داخل نہیں جو قرآن و سنت کے تسلیم شدہ اصول اجتہاد کے ماتحت فروعی مسائل میں فقہاء امت کے اندر قرن اول سے صحابہ و تابعین میں ہوتا چلا آیا ہے، جس میں فریقین کی حجت قرآن و سنت اور اجماع سے ہے، اور ہر ایک کی نیت قرآن و سنت کے احکام کی تعمیل ہے، مگر قرآن و سنت کے مجمل یا مبہم الفاظ کی تعبیر اور ان سے جزوی، فروعی مسائل کے استخراج میں اجتہاد اور رائے کا اختلاف ہے، ایسے ہی اختلاف کو ایک حدیث میں رحمت فرمایا گیا ہے۔

جامع صغیر میں بحوالہ نصر مقدسی و بیہقی و امام الحرمین یہ روایت نقل کی ہے کہ:

اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ "میری امت کا اختلاف رحمت ہے"، امت محمدیہ کی خصوصیت اس لئے بتلائی گئی کہ اس امت کے علماء حق اور فقہاء محققین میں جو اختلاف ہوگا وہ ہمیشہ اصول قرآن و سنت کے ماتحت ہوگا، اور صدق نیت و للّٰہیت سے ہوگا، کسی نفسانی غرض جاہ و مال وغیرہ کے اختلاف کی محرک نہ ہوگی، اس لئے وہ کسی جنگ و جدل کا سبب بھی نہ بنے گا، بلکہ علامہ عبدالرؤف مناوی شارح جامع صغیر کی تحقیق کے مطابق فقہاء امت کے مختلف مسالک کا وہ درجہ ہوگا جو زمانہ سابق میں انبیاء علیہم السلام کی مختلف شرائع کا تھا کہ مختلف ہونے کے باوجود سب کی سب اللہ ہی کے احکام تھے، اسی طرح مجتہدین امت کے مختلف مسالک اصول قرآن و سنت کے ماتحت ہونے کی وجہ سے سب کے سب احکام خدا اور رسول ﷺ ہی کہلائیں گے۔

اس اجتہادی اختلاف کی مثال خصوصیات میں ایسی ہے جیسے شہر کی بڑی سڑکوں کو چلنے والوں کی آسانی کے لئے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، ایک حصہ پر بسیں چلتی ہیں دوسرے پر دوسری گاڑیاں یا ٹرام اسی طرح سائیکل سواروں اور پیدل چلنے والوں کے لئے روڈ کا علیحدہ ایک حصہ ہوتا ہے، ایک روڈ کی کئی حصوں میں یہ تقسیم بھی اگرچہ ظاہری طور پر ایک اختلاف کی صورت ہے، مگر چونکہ سب کا رخ ایک ہی سمت ہے اور ہر ایک پر چلنے والا ایک ہی منزل مقصود پر پہنچے گا، اس لئے رستوں کا یہ اختلاف بجائے مضر ہونے کے مفید اور چلنے والوں کے لئے وسعت و رحمت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ائمہ مجتہدین اور فقہاء امت کا اس پر اتفاق ہے کہ ان میں سے کسی کا مسلک باطل نہیں، اور جو لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں ان کو دوسروں کے نزدیک گنہگار کہنا جائز نہیں، ائمہ مجتہدین اور فقہاء امت کے مذاہب کے اختلاف کا حاصل اس سے زیادہ نہیں کہ ایک مجتہد نے جو مسلک اختیار کیا ہے وہ اس کے نزدیک راجح ہے، مگر اس کے مقابل دوسرے مجتہد کے مسلک کو بھی وہ باطل نہیں کہتے، بلکہ ایک دوسرے کا پورا احترام کرتے ہیں، فقہاء صحابہ و تابعین اور ائمہ اربعہ کے بے شمار حالات و واقعات اس پر شاہد ہیں کہ فقہی مسلک بہت سے مسائل میں مختلف ہونے اور علمی بحثیں جاری رہنے کے باوجود ایک دوسرے کا مکمل اعتقاد و احترام کرتے تھے، جنگ و جدل اور خصومت و عداوت کا وہاں کوئی احتمال ہی نہ تھا، مذاہب فقہاء کے متبعین اور مقلدین میں بھی جہاں تک علم و دیانت ہے ان کے بھی باہمی معاملات ایسے ہی رہے۔

یہ اختلاف ہے جو رحمت ہی رحمت اور لوگوں کے لئے وسعت و سہولت کا ذریعہ

فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَمَا عَلَى

الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ

يَتَّقُوْنَ ۝ وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ

الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ

لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ

عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ

لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَ

نُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ

الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۖ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ

اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۗ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۗ وَ

اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ

توحید پر ایمان کی ظاہری علامت ہے، اور یہ حکم ہوا ہے کہ اس سے یعنی اللہ سے ڈرو (یعنی مخالفت نہ کرو جس میں سب سے بڑھ کر شرک ہے) اور وہی اللہ ہے جس کے پاس تم سب (قیامت کے دن قبروں سے نکل کر حساب کے لئے) جمع کئے جاؤ گے (وہاں مشرکین کو اپنے شرک کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا) اور وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو با فائدہ پیدا کیا (جس میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے خالق کے وجود اور توحید پر استدلال کیا جائے، پس یہ بھی توحید کی ایک دلیل ہے) اور (اوپر جو تُحْشَرُوْنَ میں حشر یعنی قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے کی خبر دی ہے اس کو بھی کچھ مستبعد مت سمجھو کیونکہ وہ قدرتِ الٰہیہ کے سامنے اس قدر آسان ہے کہ) جس وقت اللہ تعالیٰ اتنا کہہ دے گا کہ (حشر) تو ہو جا بس وہ (حشر فوراً) ہو پڑے گا (اس کا کہنا اثر سے خالی نہیں جاتا) اور (حشر کے روز) جبکہ صور میں (بحکم الٰہی دوسری بار فرشتہ کی) پھونک ماری جائے گی، ساری حکومت (حقیقتاً بھی ظاہراً بھی) خاص اسی اللہ کی ہوگی (اور وہ اپنی حکومت سے موحدین و مشرکین کا فیصلہ کرے گا) وہ (اللہ) جاننے والا ہے پوشیدہ چیزوں کا اور ظاہر چیزوں کا (پس مشرکین کے اعمال و احوال کا بھی اس کو علم ہے) اور وہی ہے بڑی حکمت والا (اس لئے مناسب مناسب جزاء ہر ایک کو دے گا) اور وہی ہے پوری خبر رکھنے والا (اس لئے کسی امر کا اخفاء اس سے ممکن نہیں)۔

معارف و مسائل

اہل باطل کی مجلسوں سے پرہیز کا حکم

آیات مذکورہ میں مسلمانوں کو ایک اہم اصولی ہدایت دی گئی ہے کہ جس کام کو خود کرنا گناہ ہے اس کے کرنے والوں کی مجلس میں شریک رہنا بھی گناہ ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہئے جس کی تفصیل یہ ہے کہ:

پہلی آیت میں لفظ یَخُوْضُوْنَ، خوض سے بنا ہے جس کے اصلی معنی پانی میں اترنے اور اس میں گذرنے کے ہیں، اور لغو و فضول کاموں میں داخل ہونے کو بھی خوض کہا جاتا ہے، قرآن کریم میں یہ لفظ عموماً اسی معنی میں استعمال ہوا ہے وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ اور فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ وغیرہ آیات اس کی شاہد ہیں۔

اس لئے خوض فی الآیات کا ترجمہ اس جگہ عیب جوئی یا جھگڑنے کا کیا گیا ہے، یعنی جب آپ اُن لوگوں کو دیکھیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات میں محض لہو و لعب اور استہزاء و تمسخر کے لئے دخل دیتے ہیں اور عیب جوئی کرتے ہیں تو آپ اُن سے [illegible] کیجئے۔

ہو سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً ان کو تنبیہ بذریعہ وحی ہو جاتی ہے جس سے وہ بھول پر قائم نہیں رہتے، اس لئے بالآخر ان کی تعلیمات بھول و نسیان کے شبہ سے پاک ہو جاتی ہیں۔

بہرحال آیت کے اس جملہ سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص بھول و نسیان سے کسی غلطی میں مبتلا ہو جائے تو وہ معاف ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں ارشاد ہے:

رُفِعَ عَنْ اُمَّتِی الْخَطَأُ وَالنِّسْیَانُ وَمَا اسْتُکْرِھُوْا عَلَیْہِ	"یعنی میری امت سے خطاء و بھول کا اور اس کام کا گناہ معاف کر دیا گیا ہے جو کسی نے زبردستی اس سے کرا دیا ہو۔"

امام جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ "اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو ہر ایسی مجلس سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہئے جس میں اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا شریعت اسلام کے خلاف باتیں ہو رہی ہوں، اور اس کو بند کرنا یا کرانا یا کم از کم حق بات کا اظہار کرنا اس کے قبضہ و اختیار میں نہ ہو، ہاں اگر ایسی مجلس میں بہ نیت اصلاح شریک ہو اور ان لوگوں کو حق بات کی تلقین کرے تو مضائقہ نہیں، اور آخر آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ یاد آ جانے کے بعد ظالم قوم کے ساتھ نہ بیٹھو، اس سے امام جصاص نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ ایسے ظالم بے دین اور بیہودہ دہن لوگوں کی مجلس میں شرکت کرنا مطلقاً گناہ ہے خواہ وہ اس وقت کسی ناجائز گفتگو میں مشغول ہوں یا نہ ہوں، کیونکہ ایسے لوگوں کو ایسی بیہودہ گفتگو شروع کرتے ہوئے دیر کیا لگتی ہے، وجہ استدلال کی یہ ہے کہ اس میں مطلقاً ظالموں کے ساتھ بیٹھنے کو منع فرمایا گیا ہے، اس میں یہ شرط نہیں کہ وہ اس وقت بھی ظلم کرنے میں مشغول ہوں۔

قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں بھی یہی مضمون واضح طور پر بیان ہوا ہے، فرمایا: وَلَا تَرْکَنُوْٓا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ، یعنی ظالم لوگوں کے ساتھ میل جول اور نشست نہ رکھو ورنہ تمہیں بھی جہنم کی آگ سے پالا پڑے گا۔

جب آیت مذکورہ نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اگر ان کی مجلس میں جانے کی مطلقاً ممانعت رہی تو ہم مسجد حرام میں نماز و طواف سے بھی محروم ہو جائیں گے، کیونکہ وہ لوگ تو ہمیشہ وہاں بیٹھے رہتے ہیں، اور وہ تو حجت اور فضول بحث سے بچتے کب ہیں، اور ان کا مشغلہ ہی عیب جوئی اور بدگوئی ہے، اس پر دوسری آیت اس کے بعد نازل ہوئی، وَمَا عَلَی الَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِھِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّلٰکِنْ ذِکْرٰی لَعَلَّھُمْ یَتَّقُوْنَ، یعنی جو لوگ احتیاط رکھنے والے

میں وہ اگر اپنے کام سے جو حرام ہے باز نہ آئیں تو ان شریر لوگوں کے اعمال کی ان پر کوئی ذمہ داری نہیں ہاں اتنی بات ان کے ذمہ ہے کہ حق بات ان کو پہنچا دیں کہ شاید وہ اس سے نصیحت حاصل کرکے صحیح راستہ پر آجائیں۔

تیسری آیت میں بھی تقریباً اسی مضمون کی مزید تاکید اس طرح ارشاد فرمائی گئی ہے۔ وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا اس میں لفظ ذَرْ، وَذْر سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز سے ناراض ہو کر اس کو چھوڑ دینا، معنی آیت کے یہ ہیں کہ آپ ان لوگوں کو چھوڑ دیجئے جنھوں نے اپنے دین کو لہو و لعب یعنی مشغلہ اور کھیل بنا رکھا ہے، اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ جو دین حق یعنی اسلام ان کے لئے بھیجا گیا ہے، اس کو لہو و لعب بنا رکھا ہے، اس کا استہزاء و تمسخر کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ انھوں نے اصل دین کو چھوڑ کر اپنا دین و مذہب ہی لہو و لعب کو بنا لیا ہے، دونوں معنی کا حاصل تقریباً ایک ہی ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا، یعنی ان کو دنیا کی چند روزہ زندگی نے غرور اور دھوکہ میں ڈال رکھا ہے، یہ ان کے مرض کا اصل سبب بیان فرما دیا کہ ان کی اس ساری سرکشی اور نافرمانی کا اصل سبب یہ ہے کہ دنیا ہی کی چند روزہ زندگی پر مفتون ہیں، اور آخرت کو بھلائے بیٹھے ہیں، اگر آخرت اور قیامت کا اعتقاد ہوتا تو ہرگز وہ یہ حرکتیں نہ کرتے۔

آخر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو دو حکم دیئے گئے ہیں، اوّل یہ کہ ایسے لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کریں جن کا بیان مذکورہ جملہ میں آچکا ہے، دوسرے یہ کہ صرف ان لوگوں سے کنارہ کشی اور اعراض ہی کافی نہیں، بلکہ تبلیغی طور پر یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن کے ذریعہ ان کو نصیحت بھی کرتے رہیں اور خدا تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتے بھی رہیں۔

آخر آیت میں اس عذاب کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی کہ اگر ان کی یہی حالت رہی تو اپنے کردار بد کے جال میں خود پھنس جائیں گے، آیت میں اس جگہ اَنْ تُبْسَلَ کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کے معنی قید ہو جانے اور پھنس جانے کے ہیں۔

چونکہ دنیا میں انسان اس کا خوگر ہے کہ اگر کبھی کوئی غلطی یا جرم کسی پر کر بیٹھتا ہے اور اس کی سزا اس کے سامنے آگئی تو سزا سے بچنے کے لئے تین قسم کے ذرائع اختیار کرتا ہے، کبھی اپنی جماعت اور جتھے کا زور اس کے خلاف استعمال کرکے اپنے جرم کی پاداش سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، اور اگر اس سے عاجز ہوگیا تو بڑے لوگوں کی سفارش سے کام لیتا ہے، اور یہ بھی نہ چلی تو پھر یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو سزا سے بچانے کے لئے کچھ مال خرچ کرکے

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتلا دیا کہ خدا کے مجرم کے لئے سزا سے بچانے والا نہ کوئی دوست عزیز ہو سکتا ہے، نہ کسی کی سفارش بغیر اللہ تعالیٰ کی اجازت کے چل سکتی ہے، اور نہ کوئی مال قبول کیا جا سکتا ہے، بلکہ اگر سارے جہان کا مال بھی اس کے قبضہ میں ہو اور وہ اس سب مال کو سزا سے بچنے کا فدیہ بنانا چاہے تب بھی یہ فدیہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا۔

آخر آیت میں فرمایا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ، یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اعمال بد کی سزا میں پکڑے گئے ہیں، ان کو پینے کے لئے جہنم کا کھولتا ہوا پانی ملے گا جس کے متعلق دوسری آیت میں ہے کہ وہ ان کی آنتوں کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دے گا، اور اس پانی کے علاوہ دوسرے بھی دردناک قسم کے عذاب ہوں گے ان کے کفر و انکار کے بدلے میں۔

اس آخری آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ آخرت سے غافل صرف دنیا کی زندگی پر مگن ہیں، ان کی صحبت و مجالست بھی انسان کے لئے مہلک ہے اس کا انجام یہ ہے کہ ان کی صحبت میں رہنے والا بھی اس عذاب کا شکار ہوگا جس میں وہ مبتلا ہیں۔

ان تینوں آیتوں کا اصل مسئلہ انسان کو بُرے ماحول اور بُری صحبت سے بچانا ہے جو انسان کے لئے سمِ قاتل ہے، قرآن و حدیث کی بے شمار نصوص کے علاوہ مشاہدہ اور تجربہ اس کا گواہ ہے کہ انسان کو تمام بُرائیوں اور جرائم میں مبتلا کرنے والی چیز اس کی بُری سوسائٹی اور بُرا ماحول ہے جس میں پھنسنے کے بعد انسان اول تو خلافِ ضمیر اور خلافِ طبع بُرائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور پھر جب عادت پڑ جاتی ہے تو یہ بُرائی کا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے بلکہ بُرائی کو بھلائی اور بھلائی کو بُرائی سمجھنے لگتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کوئی شخص اول گناہ میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے اور جیسے سفید کپڑے میں ایک سیاہ نقطہ ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے اس کو بھی گناہ سے دل میں ناگواری پیدا ہوتی ہے، لیکن جب ایک کے بعد دوسرا اور تیسرا گناہ کرتا چلا جاتا ہے اور پچھلے گناہ سے توبہ نہیں کرتا تو یکے بعد دیگرے سیاہ نقطے لگتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ دل کی نورانی لوح بالکل سیاہ ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو بھلے بُرے کی تمیز نہیں رہتی، قرآن مجید میں اسی کو لفظ ران سے تعبیر فرمایا ہے، كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ، "یعنی ان کے دلوں میں ان کے عملِ بد کی وجہ سے زنگ لگ گیا کہ اب صلاحیت ہی مفقود ہوگئی"۔

اور جہاں تک غور کیا جاتا ہے انسان کو اس حالت پر پہونچانے والی چیز اکثر اس کا غلط

ماحول اور بُری صحبت ہوتی ہے، نعوذ باللہ منہ۔ اس لئے بچوں کے سرپرستوں کا فرض ہے کہ بچوں کو ایسے ماحول اور سوسائٹی سے بچانے میں پوری کوشش کریں۔

اگلی تین آیتوں میں بھی شرک کے ابطال اور توحید و آخرت کے اثبات کا مضمون ہے جو ترجمہ سے ظاہر ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ

اور یاد کر جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ آزر کو تو کیوں مانتا ہے بتوں کو خدا،

اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ

میں دیکھتا ہوں کہ تو اور تیری قوم صریح گمراہ ہیں، اور اسی طرح ہم دکھانے لگے

اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ

ابراہیم کو عجائبات آسمانوں اور زمین کے اور تاکہ اس کو

الْمُوْقِنِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ

یقین آجاوے، پھر جب اندھیرا کر لیا اس پر رات نے دیکھا اس نے ایک ستارہ بولا

هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿۷۶﴾ فَلَمَّا

یہ ہے رب میرا، پھر جب وہ غائب ہو گیا تو بولا میں پسند نہیں کرتا غائب ہو جانے والوں کو، پھر جب

رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ

دیکھا چاند چمکتا ہوا بولا یہ ہے رب میرا پھر جب وہ غائب ہو گیا بولا اگر نہ ہدایت

يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّاۗلِّيْنَ ﴿۷۷﴾ فَلَمَّا رَاَ

کرے گا مجھ کو رب میرا تو بیشک میں رہوں گا گمراہ لوگوں میں، پھر جب دیکھا

الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ

سورج جھلکتا ہوا بولا یہی ہے رب میرا یہ سب سے بڑا ہے، پھر جب وہ غائب ہو گیا بولا

يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾ اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ

اے میری قوم میں بیزار ہوں ان سے جن کو تم شریک کرتے ہو، میں نے متوجہ کر لیا اپنے منہ کو اسی کی طرف

لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۷۹﴾ۚ

جس نے بنائے آسمان اور زمین سب سے یکسو ہو کر اور میں نہیں ہوں شرک کرنے والا

امتوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ بھی ان کے نقش قدم پر چلیں، ارشاد ہے: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰۗؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ، یعنی امت محمدیہ کے لئے اسوۂ حسنہ اور قابل اقتداء ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا یہ عمل کہ انھوں نے اپنی نسبی اور وطنی برادری سے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمہارے غلط معبودوں سے بری ہیں اور ہمارے تمہارے درمیان بغض و عداوت کی دیوار اس وقت تک حائل ہے جب تک تم ایک اللہ کی عبادت اختیار نہ کرلو۔

معلوم ہوا کہ یہ دو قومی نظریہ جس نے پاکستان بنوایا ہے، اس کا اعلان سب سے پہلے حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ہے، امت محمدیہ اور دوسری تمام امتوں نے جب ہدایت یہی طریقہ اختیار کیا، اور عام طور پر مسلمانوں میں قومیت اسلام معروف ہوگئی، حجۃ الوداع کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک قافلہ ملا، آپ نے پوچھا کہ تم کس قوم سے ہو تو جواب دیا نَحْنُ قَوْمٌ مُّسْلِمُوْنَ، یعنی کہ اس میں عرب کے سابقہ دستور کے مطابق کسی قبیلہ یا خاندان کا نام لینے کے بجائے مُسْلِمُوْن کہہ کر اس حقیقی قومیت کو بتلا دیا جو دنیا سے لے کر آخرت تک چلنے والی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس جگہ اپنے باپ سے خطاب کے وقت تو برادری کی نسبت ان کی طرف کرکے اپنی بیزاری کا اعلان فرمایا اور جس جگہ قوم سے اپنی بیزاری اور قطع تعلق کا اعلان کرنا تھا وہاں اپنی طرف منسوب کرکے خطاب کیا، جیسے اگلی آیت میں ہے يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ، یعنی اے میری قوم، میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں اس میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ نسب اور وطن کے لحاظ سے تم میری قوم ہو، لیکن تمہارے مشرکانہ افعال نے مجھے تمہاری برادری سے قطع تعلق کرنے پر مجبور کردیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی برادری اور ان کے باپ دوہرے شرک میں مبتلا تھے کہ بتوں کی بھی پرستش کرتے تھے اور ستاروں کی بھی، اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہی دونوں مسئلوں پر اپنے باپ اور اپنی قوم سے مناظرہ کیا۔

پہلے بت پرستی کا ضلالت و گمراہی ہونا ذکر فرمایا، اگلی آیت میں ستاروں کا قابل عبادت نہ ہونا بیان فرمایا، اور اس سے پہلے ایک آیت میں بطور تمہید کے حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی ایک خاص شان اور علم و بصیرت میں اعلیٰ مقام کا ذکر اس طرح فرمایا: وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ، یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کی مخلوقات کو اس طرح دکھلا دیا کہ ان کو سب چیزوں کی حقیقت واشگاف طور پر معلوم ہوجائے، اور ان کو یقین مکمل ہوجائے اسی کا نتیجہ تھا جو

اس کے بعد اس حقیقت کو بتلا دیا کہ میرا اور تمہارا رب (پالنے والا) ان تمام مخلوقات میں سے کوئی نہیں ہو سکتا جو خود اپنے وجود میں دوسرے کی محتاج ہیں اور ہر وقت ان کے عروج و نزول اور طلوع و غروب کے تغیرات میں گھری ہوئی ہیں، بلکہ ہمارا سب کا رب وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان میں پیدا ہونے والی تمام مخلوقات کو پیدا کیا ہے، اس لئے میں نے اپنا رخ تمہارے سب خود تراشیدہ بتوں اور تغیرات و تاثرات میں گھرے ہوئے ستاروں سے پھیر کر صرف ایک خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی طرف کر لیا ہے، اور میں تمہاری طرح مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

اس واقعہ مناظرہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیغمبرانہ حکمت و موعظت سے کام لے کر پہلی ہی گفتگو میں ان کی نجوم پرستی کو غلط یا گمراہی نہیں فرمایا بلکہ ایک ایسا انداز قائم کیا، جس سے ہر ذی عقل انسان کا قلب و دماغ خود متاثر ہو کر حقیقت کو پہچان لے، ہاں بت پرستی کے خلاف بات کرنے میں اول ہی شدت اختیار فرمائی، اور اپنے باپ اور پوری قوم کا گمراہی پر ہونا صاف طور پر بیان کر دیا، وجہ یہ تھی کہ بت پرستی کا نامعقول گمراہی ہونا بالکل واضح اور کھلا ہوا تھا، بخلاف نجوم پرستی کے کہ اس کی گمراہی اتنی واضح اور جلی نہیں تھی۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نجوم پرستی کے خلاف اپنی قوم کے سامنے جو استدلال بیان فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ جو چیز تغیر پذیر ہو اور اس کے حالات ادلتے بدلتے رہتے ہوں، اور وہ اپنی حرکات میں کسی دوسری طاقت کے تابع ہو وہ ہرگز اس لائق نہیں کہ اس کو اپنا رب قرار دیں۔ اس استدلال میں ستاروں کے طلوع غروب اور درمیانی تمام حالات سے استدلال کیا جا سکتا تھا، کہ وہ اپنی حرکات میں خود مختار نہیں کسی کے حکم کے تابع ایک خاص روش پر چل رہے ہیں، لیکن حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے ان تمام حالات و کیفیات میں سے استدلال کے لئے ان ستاروں کے غروب کو پیش کیا، کیونکہ ان کا غروب عوام کی نظروں میں ایک طرح سے ان کا زوال سمجھا جاتا ہے، اور انبیاء علیہم السلام کا عام طرز استدلال وہ ہوتا ہے جو عوام کے ذہنوں پر اثر انداز ہو، وہ فلسفیانہ حقائق کے پیچھے زیادہ نہیں پڑتے، بلکہ عام ذہنوں کے مطابق خطاب فرماتے ہیں، اس لئے ان ستاروں کی بے بسی اور بے اختیاری ثابت کرنے کے لئے ان کے غروب کو پیش کیا، ورنہ ان کے بے بس اور بے قدرت ہونے پر تو طلوع سے بھی استدلال ہو سکتا تھا، اور اس کے بعد غروب سے پہلے تک جتنے تغیرات پیش آتے ہیں ان سے بھی اس پر دلیل پکڑی جا سکتی ہے۔

مبلغین اسلام کے لئے چند ہدایات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس طرز مناظرہ سے علماء و مبلغین کے لئے چند اہم ہدایات حاصل ہوتی ہیں: اوّل یہ کہ قوموں کی تبلیغ و اصلاح میں

(دی ہوئی) حجت تھی وہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ان کی قوم کے مقابلہ میں دی تھی (جب ہماری
دی ہوئی تھی تو یقیناً اعلیٰ درجہ کی تھی اور ابراہیم علیہ السلام کی کیا تخصیص ہے ہم تو جس کو چاہتے
ہیں (علمی وعملی) مرتبوں میں بڑھا دیتے ہیں (چنانچہ سب انبیاء کو یہ رفعت درجات عطا فرمائی) بیشک
آپ کا رب بڑے علم والا بڑی حکمت والا ہے (کہ ہر ایک کا حال اور استعداد جانتا ہے اور ہر ایک
کے مناسب اس کو کمال عطا فرماتا ہے) اور ہم نے جیسے ابراہیم علیہ السلام کو کمال ذاتی علم
وعمل دیا اسی طرح کمال اضافی بھی دیا کہ ان کے اصول اور فروع سے بہتوں کو کمال دیا چنانچہ
ہم نے ان کو (ایک بیٹا) اسحاق دیا اور (ایک پوتا) یعقوب (دیا اور اس سے دوسری اولاد کی
نفی نہیں ہوتی) اور دونوں میں سے ہر ایک کو (طریق حق کی) ہم نے ہدایت کی اور
(ابراہیم سے) پہلے زمانہ میں ہم نے نوح (علیہ السلام) کو (جن کا ابراہیم علیہ السلام کے اجداد
میں ہونا مشہور ہے اور اصل کی فضیلت فرع میں کسی قدر مؤثر ہوتی ہے طریق حق کی ہدایت کی
اور ان (ابراہیم علیہ السلام) کی اولاد (مذکور یعنی اسحاق) کی ذریت میں سے (اخیر تک جتنے مذکور ہیں
سب کو طریق حق کی ہدایت کی یعنی) داؤد (علیہ السلام) کو اور (ان کے صاحبزادہ) سلیمان
(علیہ السلام) کو اور ایوب (علیہ السلام) کو اور یوسف علیہ السلام کو اور موسیٰ
(علیہ السلام) کو اور ہارون (علیہ السلام) کو (طریق حق کی ہدایت کی) اور (جب یہ ہدایت
پر چلے تو) ہم نے ان کو جزائے خیر بھی دی (یعنی ثواب و زیادہ قرب کے) اور جس طرح نیک کاموں
پر ان کو جزا دی اسی طرح (ہماری عادت ہے کہ) ہم نیک کام کرنے والوں کو (مناسب
جزا) دیا کرتے ہیں اور نیز (ہم نے طریق حق کی ہدایت کی) زکریا (علیہ السلام) کو اور (ان کے
صاحبزادہ) یحییٰ (علیہ السلام) کو اور عیسیٰ (علیہ السلام) کو اور الیاس (علیہ السلام) کو
اور یہ سب (حضرات) پورے شائستہ لوگوں میں تھے اور نیز (ہم نے طریق حق کی ہدایت
کی) اسمٰعیل (علیہ السلام) کو اور یسع (علیہ السلام) کو اور یونس (علیہ السلام) کو اور لوط (علیہ السلام)
کو اور (ان میں سے) ہر ایک کو (ان کے زمانہ کے) تمام جہان والوں پر (نبوت سے) ہم نے فضیلت
دی اور نیز ان (حضرات مذکورین) کے کچھ باپ دادوں کو اور کچھ اولاد کو اور کچھ بھائیوں کو
(طریق حق کی ہم نے ہدایت کی) اور ہم نے ان (سب) کو راہ راست (یعنی دین حق) کی ہدایت
کی اور وہ (دین جس کی ان سب کو ہدایت ہوئی تھی) اللہ کی (جانب سے جو) ہدایت (ہوتی) ہے
وہ یہی (دین) ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کی ہدایت (یعنی منزل پر پہنچانے
کی صورت میں) کرتا ہے (اپنے جناب میں جو لوگ موجود ہیں ان کو بھی اسی کی ہدایت اس معنی سے
ہوئی کہ ان کو صحیح راستہ دکھلا دیا، پھر منزل پر پہنچنا یا نہ پہنچنا ان کا کام ہے، مگر ان میں سے

بعض نے اس کو چھوڑ کر شرک اختیار کرلیا ۔ اور شرک اس قدر ناپسند چیز ہے کہ غیر نبی تو کس شمار میں ہیں اگر فرضاً یہ حضرات (انبیاء مذکورین) بھی نعوذ باللہ شرک کرتے تو ان کے یہ (نیک) اعمال کیے کرتے تھے ان سب کارائیگاں ہوجاتے (آگے مسئلہ نبوت کی طرف اشارہ ہے کہ) یہ (جتنے مذکور ہوئے) ایسے تھے کہ ہم نے ان کے مجموعہ کو کتاب (آسمانی) اور حکمت (کے علوم) اور نبوت عطا کی تھی (تو نبوت امر عجیب نہیں جو یہ کافر لوگ آپ کے منکر ہو رہے ہیں، کیونکہ نظائر موجود ہیں) سو اگر (نظیر موجود ہونے پر بھی) یہ لوگ آپ کی نبوت کا انکار کریں تو آپ غم نہ کیجئے کیونکہ ہم نے اس کے ماننے کے لئے ایسے بہت لوگ مقرر کردیئے ہیں (یعنی مہاجرین وانصار) جو اس کے منکر نہیں ہیں۔

معارف ومسائل

آیاتِ مذکورہ سے پہلی آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مناظرہ اپنے باپ آزر اور پوری قوم نمرود کے ساتھ مذکور تھا جس میں ان کی بت پرستی اور نجوم پرستی کے خلاف یقینی شہادتیں پیش کرنے کے بعد آیت مذکورہ میں اپنی قوم کو خطاب فرمایا کہ تم مجھے اپنے بتوں سے ڈراتے ہو کہ میں ان کا انکار کروں گا تو یہ مجھے برباد کردیں گے، حالانکہ نہ بتوں میں اس کی قدرت ہے اور نہ میں نے کوئی کام ایسا کیا ہے جس کے نتیجہ میں مجھے کوئی مصیبت پہنچے بلکہ ڈرنا تمہیں چاہئے کہ تم نے جرم بھی ایسا سخت کیا ہے کہ اللہ کی مخلوق بلکہ مخلوق کی مصنوعات کو خدا کا شریک اور برابر کردیا، اور پھر خدا تعالیٰ کا علیم وخبیر اور قادرِ مطلق ہونا بھی کسی عقل والے سے مخفی نہیں تو اب تم خود سوچ کر بتلاؤ کہ امن واطمینان کا مستحق کون ہوا اور ڈرنا کس کو چاہئے؟

ان آیات میں سے پہلی آیت میں یہ مضمون ارشاد فرمایا کہ عذاب سے مامون ومطمئن صرف وہی لوگ ہوسکتے ہیں جو اللہ پر ایمان لائیں، اور پھر اپنے ایمان میں کسی ظلم کی ملاوٹ نہ کریں، حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام سہم گئے، اور عرض کیا یا رسول اللہؐ ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے کوئی ظلم اپنی جان پر بذریعہ گناہ کے نہیں کیا، اور اس آیت میں عذاب سے مامون ہونے کی یہ شرط ہے کہ ایمان کے ساتھ کوئی ظلم نہ کیا ہو تو پھر ہماری نجات کی کیا سبیل ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم آیت کا صحیح مفہوم نہیں سمجھے، آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے: إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ، اس لئے مراد آیت کی یہ ہے کہ جو شخص ایمان لائے اور پھر اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات

بے عنایاتِ حق و خاصانِ حق
گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

آخر آیت میں فرمایا نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ یعنی ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کر دیتے ہیں، اس میں اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو پورے عالم میں اور قیامت تک آنے والی نسلوں میں فضل و عزت و تقدس عطا ہوا کہ یہودی نصرانی مسلمان بت پرست وغیرہ سب کے سب ان کے تقدس کے قائل اور ان کی تعظیم کرتے چلے آتے ہیں، یہ بھی ہمارا ہی فضل و انعام ہے، کسی کے کسب و اکتساب کا اس میں دخل نہیں۔

اس کے بعد کی تین آیتوں میں سترہ انبیاء علیہم السلام کی فہرست شمار کی گئی ہے جن میں بعض حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آباء و اجداد ہیں، اور اکثر ان کی اولاد ہیں، اور بعض ان کے بھائی بھتیجے ہیں، ان آیتوں میں ایک طرف تو ان حضرات کا ہدایت پر ہونا، صالحین ہونا، صراط مستقیم پر ہونا بیان فرمایا گیا ہے، اور یہ بتلایا گیا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے دین کی نصرت کے لئے منتخب و مقبول فرمایا ہے، اور دوسری طرف یہ جتلا دیا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کی رضا کے لئے اپنے باپ اور برادری اور وطن کو چھوڑ دیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آخرت کے درجات عالیہ اور بے مثل راحتوں سے پہلے دنیا میں بھی ان کو اپنی برادری سے بہتر برادری اور وطن سے بہتر وطن عطا فرمایا، اور یہ شرف عظیم عطا فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد قیامت تک جتنے انبیاء و رسل مبعوث فرمائے گئے وہ سب ان کی اولاد میں ہیں، ایک شاخ جو حضرت اسحٰق علیہ السلام سے چلی اس میں تمام انبیاء بنی اسرائیل آئے اور دوسری شاخ جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے چلی اس میں سید الاولین والآخرین نبی الانبیاء خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے، اور یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں ہیں۔
اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگرچہ عزت و ذلت اور نجات و عذاب کا اصل مدار انسان کے اپنے ذاتی اعمال پر ہے، لیکن آباء و اجداد میں کسی نبی، ولی کا ہونا یا اولاد میں علماء صلحاء کا ہونا بھی ایک بڑی نعمت ہے، اور اس سے بھی انسان کو فائدہ پہونچتا ہے۔

ان سترہ انبیاء علیہم السلام میں جن کی فہرست آیات مذکورہ میں دی گئی ہے ایک حضرت نوح علیہ السلام تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جد امجد ہیں، باقی سب کو ان کی ذریت فرمایا ہے، وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ الآیۃ، اس میں ایک اشکال تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہو سکتا ہے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دختری اولاد میں سے ہیں، یعنی پوتے نہیں نواسے ہیں، تو ان کو ذریت کہنا کیسے صحیح

ہوگا، اس کا جواب حافظ ابن کثیر نے یہ دیا ہے کہ لفظ ذریت پوتوں اور نواسوں دونوں کو شامل ہے، اور اسی سے استدلال کیا کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت میں داخل ہیں۔

دوسرا اشکال حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق ہے کہ وہ اولاد میں نہیں بلکہ بھتیجے ہیں لیکن اس کا جواب بھی واضح ہے کہ عرف میں چچا کو باپ اور بھتیجے کو بیٹا کہنا بہت ہی متعارف ہے۔

آیات مذکورہ میں حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر انعامات الٰہیہ بیان فرما کر ایک طرف تو یہ قانون قدرت بتلا دیا گیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی یاد میں اپنی محبوب چیزوں کو قربان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں بھی اس سے بہتر چیزیں عطا فرما دیتے ہیں، دوسری طرف مشرکین مکہ کو یہ داستان سنا کر اس طرف ہدایت کرنا مقصود ہے کہ تم لوگ اگر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہیں مانتے تو دیکھو کہ تمہارے سب بڑے مقتدا اور مانے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کا پورا خاندان وہ سب یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ قابل عبادت صرف ایک ذات حق تعالیٰ ہے، اس کے ساتھ کسی کو عبادت میں شریک کرنا یا اس کی مخصوص صفات کا ساجھی بتلانا کفر و گمراہی ہے، **تم لوگ خود اپنے مسلمات کی رو سے بھی ملزم ہو۔**

اگلی آیت میں یہی مضمون ارشاد فرمایا گیا اور اس کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے ارشاد فرمایا کہ: فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هَٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ، یعنی اگر آپ کے یہ مخاطب آپ کی بات نہیں مانتے اور تمام انبیاء سابقین کی ہدایت پیش کر دینے کے باوجود انکار ہی پر تلے ہوئے ہیں، تو آپ غم نہ کریں، کیونکہ ہم نے آپ کی دعوت و ہدایت کو ماننے اور اپنانے کے لئے ایک بڑی قوم کو مقرر کر رکھا ہے، وہ کفر و انکار کے پاس نہ جائیں گے۔ اس میں جملہ صحابہ کرام جو اس وقت موجود تھے مہاجرین و انصار سبھی داخل ہیں، اور قیامت تک آنے والے مسلمان بھی، اور یہ آیت ان سب لوگوں کے لئے مایۂ فخر ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قوم مومنین میں ذکر فرمایا ہے۔ اللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُمْ وَاحْشُرْنَا فِیْ زُمْرَتِھِمْ

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۖ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ ۗ قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ

یہ وہ لوگ تھے جن کو ہدایت کی اللہ نے سو تو چل ان کے طریقہ پر، تو کہہ دے میں نہیں مانگتا تم سے

عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ ﴿٩٠﴾ وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ

اس پر کچھ مزدوری، یہ تو محض نصیحت ہے جہان کے لوگوں کو۔ اور نہیں پہچانا انھوں نے اللہ کو

حَقَّ قَدْرِهِ إِذْ قَالُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ بَشَرٍ مِنْ شَيْءٍ ۗ قُلْ

پورا پہچاننا جب کہنے لگے کہ نہیں اتاری اللہ نے کسی انسان پر کوئی چیز، پوچھ تو

ع ١٠ / ١٦

مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى

کس نے اتاری وہ کتاب جو موسیٰ لے کر آیا تھا روشن تھی اور ہدایت تھی

لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ

لوگوں کے واسطے جس کو تم نے ورق ورق کر کے دکھلایا اور بہت سی باتوں کو تم نے چھپا رکھا

وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ

اور تم کو سکھلا دیں جن کو نہ جانتے تھے تم اور نہ تمہارے باپ دادے تو کہہ دے کہ اللہ نے اتاری پھر

ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ۝ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ

چھوڑ دے ان کو اپنی خرافات میں کھیلتے رہیں اور یہ قرآن کتاب ہے کہ ہم نے اتاری برکت والی

مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ۭ

تصدیق کرنے والی ان کتابوں کی جو اس سے پہلے تھیں اور تاکہ تو ڈراوے مکہ والوں کو اور اس کے آس پاس والوں

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰي صَلَاتِهِمْ

کو اور جن کو یقین ہے آخرت کا وہ اس پر یقین لاتے ہیں اور وہ ہیں اپنی نماز سے

يُحَافِظُوْنَ ۝۹۲ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰي عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ

خبردار اور اس سے زیادہ ظالم کون جو باندھے اللہ پر بہتان یا

قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ

کہے مجھ پر وحی اتری اور اس پر وحی نہیں اتری کچھ بھی اور جو کہے کہ میں بھی اتارتا ہوں مثل

مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ تَرٰٓي اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَ

اس کے جو اللہ نے اتارا اور اگر تو دیکھے جس وقت کہ ظالم ہوں موت کی سختیوں میں اور

الْمَلٰۗىِٕكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اَلْيَوْمَ

فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہیں کہ نکالو اپنی جانیں آج تم کو

تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ غَيْرَ

بدلے میں ملے گا ذلت کا عذاب اس سبب سے کہ تم کہتے تھے اللہ پر جھوٹی

الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۹۳ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا

باتیں اور اس کی آیتوں سے تکبر کرتے تھے اور البتہ تم ہمارے پاس آگئے

فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُم مَّا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ

ایک ایک ہو کر جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تم کو پہلی بار اور چھوڑ آئے تم جو کچھ اسباب ہم نے تم کو دیا تھا

ظُهُورِكُمْ ۖ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَكُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ

اپنی پیٹھ کے پیچھے اور ہم نہیں دیکھتے تمہارے ساتھ سفارش والوں کو جن کو تم بتلایا کرتے تھے کہ

فِيكُمْ شُرَكَاءُ ۚ لَقَد تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنكُم مَّا كُنتُمْ

ان کا تم میں ساجھا ہے البتہ منقطع ہو گیا تمہارا علاقہ اور جاتا رہا جو دعوے کہ تم

تَزْعُمُونَ ﴿٩٤﴾

کیا کرتے تھے

خلاصۂ تفسیر

(اور ہم جو تذکیر کرنے کو اور صبر کرنے کو کہتے ہیں تو وجہ یہ ہے کہ سب انبیاء ایسے کیے گئے چنانچہ) یہ حضرات مذکورین ایسے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے (اس صبر کی) ہدایت کی تھی سو (اس باب میں) آپ بھی انہی کے طریق پر چلئے، اور چونکہ آپ کو بھی اس کی ہدایت کی گئی ہے، کیونکہ ان سے آپ کو نفع نہ کوئی ضرر جس کی وجہ سے غم ورنج ہو اور اس مضمون کے ظاہر کرنے کے واسطے ان سے تبلیغ کے وقت آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس (تبلیغ قرآن) پر کچھ معاوضہ نہیں چاہتا (جس کے نہ ملنے سے نفع اور نہ ملنے سے ضرر ہو، بے غرض نصیحت کرتا ہوں) یہ قرآن تو صرف تمام جہان والوں کے واسطے ایک نصیحت ہے، (جس کو ماننے سے تمہارا ہی نفع اور نہ ماننے سے تمہارا ہی نقصان ہے) اور ان (منکر) لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسی قدر پہچاننا واجب تھی، ویسی قدر نہ پہچانی جبکہ (غصہ میں بھر کر) یوں کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی چیز (یعنی کوئی کتاب الٰہی) نازل نہیں کی، یہ کہنا ناقدر شناسی اس لئے ہے کہ اس سے مسئلہ نبوت کا انکار لازم آتا ہے، اور منکر نبوت کا منکر اللہ تعالیٰ کی تکذیب کرتا ہے، اور تصدیق حق واجب ہے، پس اس میں قدر شناسی واجب میں اخلال ہوا، یہ تو تحقیقی جواب تھا، اور الزامی مسکت جواب دینے کے لئے آپ (ان سے) یوں کہئے کہ (یہ تو بتلاؤ کہ) وہ کتاب کس نے نازل کی ہے جس کو موسیٰ علیہ السلام لاتے تھے (یعنی توریت) جس کو تم بھی مانتے ہو، جس کی یہ کیفیت ہے کہ وہ (خود مثل) نور (کے واضح) ہے اور (جن کی ہدایت کے لئے وہ آئی تھی ان) لوگوں کے لئے وہ (بوجہ بیان شرائع کے ذریعہ) ہدایت ہے جس کو تم نے (اپنی اغراض نفسانیہ کے واسطے) متفرق اوراق میں رکھ چھوڑا ہے جن

یہ تو ان کے ماننے نہ ماننے کی فکر نہ کیجئے جو اپنا بھلا چاہیں گے مان لیں گے، جو نہ چاہیں گے نہ بچیں گے آپ اپنا کام کیجئے) اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے (اور منصب نبوت یا نفس نبوت کا منکر ہو، جیسا اوپر بعض کا قول آیا ہے، مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ اور بعض کا قول تھا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا) یا یوں کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے، حالانکہ اس کے پاس کسی بات کی بھی وحی نہیں آئی (جیسے مسیلمہ وغیرہ) اور (اسی طرح اس سے بھی زیادہ ظالم کون ہوگا) جو شخص یوں کہے کہ جیسا کلام اللہ تعالیٰ نے (حسب دعویٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نازل کیا ہے، اسی طرح کا میں بھی لا کر دکھلا دیتا ہوں (جیسا نضر یا عبداللہ کو کہتا تھا، غرض یہ سب لوگ بڑے ظالم ہیں) اور (ظالموں کا حال یہ ہے کہ) اگر آپ (ان کو) اس وقت دیکھیں (تو بڑا ہولناک منظر دکھلائی دے) جبکہ یہ ظالم لوگ (جن کا ذکر ہوا) موت کی روحانی سختیوں میں گرفتار ہوں گے اور (موت کے) فرشتے (جو ملک الموت کے اعوان ہیں ان کی روح نکالنے کے واسطے ان کی طرف) اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے (اور شدت کے ظاہر کرنے کو یوں کہتے جاتے ہوں گے کہ) ہاں (جلدی) اپنی جانیں نکالو (کہاں بچتے پھرتے تھے دیکھو آج مرنے کے ساتھ ہی) تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی (یعنی جس میں تکلیف جسمانی بھی ہو اور ذلت روحانی بھی ہو) اس سبب سے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ذمہ جھوٹی جھوٹی باتیں بکتے تھے (جیسے مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اور اُوْحِيَ اِلَيَّ اور سَاُنْزِلُ وغیرہا) اور تم اللہ تعالیٰ کی آیات (کے قبول کرنے) سے (جو کہ ذریعہ ہدایت تھیں) تکبر کرتے تھے۔

(یہ کیفیت تو موت کے وقت ہوگی) اور (جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ فرما دیں گے) تم ہمارے پاس (بلا یار و مددگار کے) تنہا تنہا (ہو کر) آگئے (وہ اس حالت سے آئے) جس طرح ہم نے اول بار (دنیا میں) تم کو پیدا کیا تھا (کہ نہ بدن پر کپڑا نہ پاؤں میں جوتا) اور جو کچھ ہم نے تم کو (دنیا میں ساز و سامان) دیا تھا (جس پر تم بھولے بیٹھے تھے) اس کو اپنے پیچھے ہی چھوڑ آئے (ساتھ کچھ نہ لا سکے، مطلب یہ کہ مال و دولت کے بھروسہ پر نہ رہنا یہ سب یہاں ہی رہ جاوے گا) اور (تم میں جو بعض کو اپنے باطل معبودوں کی شفاعت کا بھروسہ تھا سو) ہم تو تمہارے ہمراہ (اس وقت) تمہارے ان شفاعت کرنے والوں کو نہیں دیکھتے (جس سے ثابت ہوا کہ واقع میں بھی تمہارے ساتھ نہیں ہیں) جن کی نسبت تم دعویٰ رکھتے تھے کہ وہ تمہارے معاملہ میں (ہمارے) شریک ہیں (کہ تمہارا جو معاملہ عبادت ہمارے ساتھ ہوتا تھا وہی ان کے ساتھ ہوتا تھا) واقعی تمہارے (اور ان کے) آپس میں تو قطع تعلق ہوگیا کہ آج تم ان سے بیزار اور وہ تم سے بیزار، شفاعت کیا کریں گے) اور وہ (تمہارا دعویٰ، جو دعویٰ کرتے تھے) سب تم سے گیا گذرا ہوا (کچھ کام کا نہ نکلا تو اب پوری پوری مصیبت پڑے گی)۔

معارف ومسائل

پچھلی آیات میں حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام پر اللہ کے عظیم الشان انعامات اور ان کے بلند درجات کا ذکر تھا جن میں پوری نسل آدم علیہ السلام کو عموماً اور اہل مکہ و عرب کو خصوصاً عملی صورت میں یہ دکھلانا مقصود تھا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت کو اپنا مقصدِ زندگی ٹھہرا لے اور اس کے لئے اپنی محبوب چیزوں کی قربانی پیش کرے جیسے حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش کی کہ ماں باپ اور قوم و وطن سب کو اللہ کے لئے چھوڑ دیا پھر بناءِ بیت اللہ کی عظیم خدمت کے لئے ملک شام کے سبزہ زاروں کو چھوڑ کر مکہ کا ریگستان اختیار کیا، بیوی اور بچے کو جنگل میں چھوڑ کر چلے جانے کا حکم ہوا تو فوری تعمیل کی، اکلوتے محبوب بیٹے کی قربانی کا حکم ہوا تو اپنے حدِ اختیار تک اس کی مکمل تعمیل کر دکھائی، ایسے اطاعت گذاروں کا اصل بدلہ تو بعد موت کے بعد جنت ہی میں ملے گا، لیکن دنیا میں بھی حق تعالیٰ ان کو وہ مرتبہ اور دولت عطا فرماتے ہیں جس کے سامنے ساری دنیا کی دولتیں ماند پڑ جاتی ہیں۔

حضرت خلیل اللہ نے اپنی قوم و برادری کو اللہ کے لئے چھوڑا تو اس کے بدلہ میں ان کو انبیاء علیہم السلام کی ایک جماعت ملی جو ہمیشہ ان کی اولاد ہی میں ہوتی اور شامی وطن کو چھوڑا تو اللہ کا گھر اور بلد امین اور ارض مقدس جیسی ممتاز نصیب ہوا، ان کی قوم نے ان کو ذلیل کرنا چاہا تو اس کے بدلہ میں ان کو ساری دنیا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کا امام اور پیشوا بنا دیا کہ دنیا کی مختلف اقوام و مذاہب آپس کے بڑے بڑے اختلاف کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعظیم و تکریم پر متفق چلے آتے ہیں۔

اس سلسلہ میں سترہ انبیاء علیہم السلام کی فہرست شمار کی گئی تھی جن میں سے بیشتر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد و ذریت میں داخل ہیں، اور یہ بتلایا گیا تھا کہ یہ سب وہ بزرگترین ہستیاں ہیں جن کو حق تعالیٰ نے سارے عالم کے انسانوں میں سے اپنے دین کی خدمت کے لئے منتخب فرمایا اور ان کو سیدھا راستہ دکھلایا ہے۔

مذکور الصدر آیات میں سے پہلی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرما کر اہل مکہ کو سنایا گیا ہے کہ کسی قوم کے آباء و اجداد محض باپ دادا ہونے کی حیثیت سے قابل تقلید نہیں ہو سکتے کہ ان کے ہر قول و فعل کو قابلِ اتباع سمجھا جائے، جیسا کہ عموماً عرب اور اہلِ مکہ کا خیال تھا، بلکہ تقلید و اتباع کے لئے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہم جس کی پیروی کرتے ہیں وہ خود بھی ہدایت کے صحیح راستہ پر ہے یا نہیں، اس لئے

انبیاء علیہم السلام کی ایک مختصر فہرست شمار کر کے فرمایا گیا کہ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُ، یعنی یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے، پھر فرمایا فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ، یعنی آپ بھی ان کی ہدایت اور طریق کار کو اختیار فرماویں۔

اس میں ایک ہدایت تو عام ہے اور تمام امت کو ہے کہ تقلید آبائی کی رسم پرستی کو چھوڑیں اور خدا تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ بزرگوں کا اتباع کریں۔

دوسری ہدایت خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے کہ آپ بھی انہی انبیاء سابقین کا طریق اختیار فرمائیں۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں فروعی اور جزوی اختلافات بھی ہوتے رہتے ہیں اور ملت اسلام میں بھی ان سے مختلف بہت سے احکام نازل ہوئے ہیں تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء سابقین کے طریق پر چلنے اور عمل کرنے کا کیا مطلب ہوا؟ دوسری آیات اور روایات حدیث سے متعلق نظر اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تمام فروعی اور جزوی احکام میں انبیاء سابقین کا طریق کار اختیار کرنے کا حکم نہیں بلکہ اصول دین، توحید، رسالت آخرت میں ان کا طریق اختیار کرنا مقصود ہے جو کسی پیغمبر کی شریعت میں ادل بدل نہیں ہوئے، آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء علیہم السلام کا یہی ایک عقیدہ اور طریقہ رہا ہے، باقی فروعی احکام جن میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ان میں بھی طریقہ کا اشتراک رہا اور جن میں حالات کے بدلنے کی وجہ سے بتقاضائے وقت و حکمت کوئی دوسرا حکم دیا گیا اس کی تعمیل کی گئی۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب تک آپ کو بذریعہ وحی کوئی خاص ہدایت نہ آتی تھی تو آپ فروعی معاملات میں بھی پچھلے انبیاء علیہم السلام کے طریقہ کار پر چلتے تھے (مظہری وغیرہ)

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصیت کے ساتھ ایک ایسے اعلان کا حکم دیا گیا جس کا اعلان تمام انبیاء سابقین بھی کرتے چلے آئے ہیں، وہ یہ کہ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ، یعنی میں تمہاری زندگی سنوارنے کے لئے جو ہدایات تمہیں دیتا ہوں اس پر تم سے کوئی فیس اور معاوضہ نہیں لیتا، تم اس کو مان لو تو میرا کوئی نفع نہیں اور نہ مانو تو کوئی نقصان نہیں، یہ تو تمام دنیا جہان کے لوگوں کے لئے نصیحت و خیر خواہی کا پیغام ہے، تعلیم و تبلیغ پر کوئی معاوضہ نہ لینا تمام انبیاء علیہم السلام میں ہمیشہ مشترک چلا آیا ہے اور تبلیغ کے مؤثر ہونے میں اس کا بڑا دخل ہے۔

دوسری آیت اُن لوگوں کے جواب میں آئی ہے جنھوں نے یہ کہہ دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی بشر پر کوئی کتاب نازل ہی نہیں فرمائی، یہ کتابوں اور رسولوں کا قصہ شروع سے غلط ہے۔ اس کے کہنے والے اگر مکہ کے بت پرست ہیں جیسا کہ ابن کثیر نے فرمایا تو معاملہ ظاہر ہے کہ وہ کسی کتاب اور نبی کے قائل نہ تھے، اور اگر یہودی ہیں جیسا کہ دوسرے مفسرین نے اختیار فرمایا اور آیت کا سلسلہ کلام بظاہر اس کی تائید میں ہے تو یہودی کا ایسا کہنا محض غصہ اور جھنجھلاہٹ کا نتیجہ تھا جو خود اُن کے بھی مذہب کے خلاف تھی، امام بغوی کی ایک روایت میں ہے کہ اسی لئے یہود بھی اس شخص سے ناراض ہوگئے جس نے یہ بات کہی تھی اور اسی غلطی کی وجہ سے اس کو مذہبی پیشوائی کے عہدہ سے ہٹادیا تھا۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ جن لوگوں نے یہ بیہودہ کلمہ کہا انھوں نے حق تعالیٰ کو پہچاننے کی طرح نہیں پہچانا، ورنہ یہ گستاخانہ کلمہ ان کے منہ سے نہ نکلتا۔ آپ ان لوگوں سے جو مطلق آسمانی کتابوں کا انکار کرتے ہیں یہ کہہ دیجئے کہ اگر بات یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی کتاب نہیں بھیجی تو یہ بتلاؤ کہ یہ تورات جس کو تم بھی مانتے ہو اور اسی کی وجہ سے قوم کے چودھری بنے بیٹھے ہو یہ کس نے نازل کی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی جتلادیا کہ تم وہ ٹیڑھے چلنے والے ہو کہ جس کتاب تورات کو تم آسمانی کتاب کہتے اور مانتے ہو اس کے ساتھ بھی تمہارا یہ معاملہ ہے کہ تم نے اس کو بندھی ہوئی کتاب کے بجائے متفرق اوراق میں کر چھوڑا ہے، تاکہ جب تمہارا جی چاہے کسی ورق کو درمیان سے نکال دو، اور اس کے مضمون سے انکار کردو، جیسے تورات کی وہ آیات جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات اور صفات کے متعلق تھیں ان کو تم نے نکال دیا ہے، آیت کے آخری جملہ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ کا یہی مطلب ہے، قراطیس، قرطاس کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ورق کا۔

اس کے بعد انہی لوگوں کو مخاطب کرکے فرمایا وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَاۗؤُكُمْ، یعنی قرآن کے ذریعہ تمہیں تورات وانجیل سے زائد بھی وہ علم دیا گیا ہے جس کی نہ تمہیں اس سے پہلے خبر تھی، نہ تمہارے باپ دادوں کو۔

آخر آیت میں فرمایا: قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ، یعنی اس سوال کا جواب کہ جب اللہ نے کوئی کتاب ہی نہیں بھیجی تو تورات کس نے نازل کی وہ تو کیا دیں گے، آپ ہی فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی نازل فرمائی ہے، اور جب اُن پر حجت تمام ہوگئی تو آپ کا کام ختم ہوگیا، اب وہ جس لہو و لعب میں کھوئے ہیں، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے۔

ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف نازل ہونے والی کتابوں کے بارے میں اُن پر حجت تمام

کرنے کے بعد تیسری آیت میں ارشاد فرمایا: وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا، یعنی جس طرح تورات کا خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونا تمہیں بھی مسلم ہے اسی طرح یہ قرآن بھی ہم نے نازل کیا ہے اور اس کے حق و صدق ہونے کے واسطے ان کے لئے یہ شہادت کافی ہے کہ قرآن ان سب چیزوں کی تصدیق کرتا ہے جو تورات وانجیل میں نازل ہوئی ہیں، اور تورات و انجیل کے بعد اس کے نازل کرنے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ یہ دونوں کتابیں تو بنی اسرائیل کے لئے بھیجی گئی تھیں ان کی دوسری شاخ بنی اسمٰعیل جو عرب کہلاتے ہیں اور ام القریٰ یعنی مکہ اور اس کے گرد رہتے ہیں، ان کی ہدایت کے لئے کوئی خاص پیغمبر اور کتاب اب تک نہ آئی تھی اب یہ قرآن ان کے لئے خصوصاً اور پورے عالم کے لئے عموماً نازل کیا گیا ہے۔ مکہ معظمہ کو قرآن کریم نے ام القریٰ فرمایا، یعنی تمام شہروں اور بستیوں کی جڑ اور بنیاد، اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخی روایات کے مطابق ابتداء آفرینش میں پیدائش زمین کی ابتداء یہیں سے ہوئی ہے، نیز یہ کہ سارے عالم کا قبلہ عبادت میں مرکز توجہ یہی ہے (مظہری)، اُمَّ الْقُرٰى کے ساتھ وَمَنْ حَوْلَهَا فرمایا، یعنی مکہ کے تمام اطراف جس میں پورا عالم مشرق و مغرب اور جنوب و شمال داخل ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا: وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ، یعنی جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن پر بھی ایمان لاتے ہیں اور اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں، اس میں یہود و مشرکین کی ایک مشترک بیماری پر تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ بے فکری کہ جس کو چاہا مانا جس کو چاہا رد کر دیا، اور اس کے خلاف محاذ بنا لیا، یہ اس مرض کا اثر ہے کہ وہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، جس شخص کو آخرت اور یوم احتساب پر ایمان ہوگا اس کو خوف خدا ضرور اس طرف متوجہ کرے گا، کہ دلائل میں غور کرے، اور حق بات کو قبول کرنے میں آبائی رسوم جاہلیت کی پروا نہ کرے۔

اور اگر غور کیا جائے تو آخرت سے بے فکری ہی اُم الامراض ہے، کفر و شرک بھی اسی کا نتیجہ ہوتا ہے اور سارے گناہ و معاصی بھی، آخرت پر یقین رکھنے والے سے اگر کبھی کوئی غلطی اور گناہ سرزد بھی ہو جاتا ہے تو اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے، اور بالآخر توبہ کر کے آگے کے لئے گناہ سے بچنے کا عزم کرتا ہے، اور درحقیقت خوف خدا اور فکر آخرت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو انسان بناتی اور جرائم سے باز رکھتی ہے، اسی لئے قرآن کریم کی کوئی سورت بلکہ کوئی رکوع بھی شاید اس سے خالی نہیں کہ جس میں فکر آخرت کی طرف متوجہ نہ کیا گیا ہو، اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ هُمُوْمَنَا هَمًّا وَّاحِدًا هَمَّ الْاٰخِرَةِ

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ ۖ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ﴿٩٥﴾ فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿٩٦﴾ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٩٧﴾ وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ﴿٩٨﴾

خلاصۂ تفسیر

بیشک اللہ تعالیٰ پھاڑنے والا ہے دانہ کو اور گٹھلیوں کو (یعنی زمین میں دبانے کے بعد جو دانہ یا گٹھلی پھوٹتی ہے یہ اللہ ہی کا کام ہے) وہ جاندار (چیز) کو بے جان (چیز) سے نکال لاتا ہے (جیسے نطفہ سے آدمی پیدا ہوتا ہے) اور وہ بے جان (چیز) کو جاندار (چیز) سے نکالنے والا ہے (جیسے آدمی کے بدن سے نطفہ برآمد ہوتا ہے)، اللہ یہ ہے (جس کی ایسی قدرت ہے، سو تم (اس کی عبادت چھوڑ کر) کہاں (غیر اللہ کی عبادت کی طرف) الٹے چلے جا رہے ہو، وہ (اللہ تعالیٰ) صبح (صادق) کا (رات میں سے) نکالنے والا ہے (یعنی رات ختم ہو جاتی ہے اور صبح صادق ظاہر ہوتی ہے)، اور اس نے رات کو راحت کی چیز بنائی ہے (کہ سب تھکے تھکائے سو کر آرام پاتے ہیں) اور سورج اور چاند (کی رفتار) کو حساب سے رکھا ہے (یعنی ان کی رفتار منضبط ہے جس سے اوقات کے انضباط میں سہولت ہو) یہ (کہ حساب سے انکی

رفتار پر) ٹھہری ہوئی بات ہے ایسی ذات کی جو کہ قادر (مطلق) ہے (کہ اس طرح حرکت پیدا
کرنے پر اس کو قدرت ہے اور بڑے علم والا ہے (کہ اس رفتار کی مصلحتیں اور حکمتیں جانتا تھا
اس لئے اس خاص طرح پر ٹھہرادیا) اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تمہارے (فائدہ کے) لئے
ستاروں کو پیدا کیا (اور وہ فائدہ یہ ہے) تاکہ تم ان کے ذریعہ سے (رات کے) اندھیروں میں
خشکی میں بھی اور دریا میں بھی راستہ معلوم کرسکو، بیشک ہم نے (یہ) دلائل (توحید و انعام کے)
خوب کھول کھول کر بیان کردیئے ہیں (اگرچہ پہنچیں گے سب کو مگر نفع) ان (ہی) لوگوں کیلئے
(ہوں گے) جو (بھلے برے کی کچھ) خبر رکھتے ہیں (کیونکہ غور ایسے ہی لوگ کیا کرتے ہیں) اور وہ
(اللہ) ایسا ہے جس نے تم (سب) کو (اصل میں) ایک شخص سے (کہ آدم علیہ السلام ہیں)
پیدا کیا پھر (آگے توالد و تناسل کا اس طرح سلسلہ جاری چلا آرہا ہے کہ تم میں سے ہر شخص
کے لئے (مادہ میں) ایک جگہ زیادہ رہنے کی ہے (یعنی ماں کا رحم) اور ایک جگہ چندے
رہنے کی (یعنی باپ کی پشت لقولہ تعالیٰ مِن بَینِ الصُّلب) بیشک ہم نے (یہ) دلائل (بھی
توحید و انعام کے) خوب کھول کھول کر بیان کردیئے ہیں (عام طور پر مگر ان کا نفع بھی مثل
سابق) ان (ہی) لوگوں کے لئے (ہوگا) جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں (یہ تفصیل ہوگئی یُخْرِجُ
الْحَيَّ الخ کی)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں کفار و مشرکین کی ہٹ دھرمی اور حقائق و نتائج سے غفلت کا تذکرہ
تھا، اور ان سب خرابیوں کی اصل بنیاد خدا تعالیٰ اور اس کے بے مثال علم و قدرت سے
بے خبری ہے، اس لئے مذکورہ چار آیات میں حق تعالیٰ نے غافل انسان کے اس روگ کا
علاج اس طرح فرمایا ہے کہ اپنے وسیع علم و عظیم قدرت کے چند نمونے اور انسان پر اپنے
انعامات و احسانات کا ایک سلسلہ ذکر فرمایا، جن میں ادنیٰ غور کرنے سے ہر سلیم الفطرت
انسان خالقِ کائنات کی عظمت اور بے مثل قدرت کا اور اس بات کا قائل ہوئے بغیر
نہیں رہ سکتا کہ یہ عظیم الشان کارنامے ساری کائنات میں سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کی قدرت
میں نہیں۔

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى، یعنی اللہ تعالیٰ
پھاڑنے والا ہے دانہ کو اور گٹھلیوں کو، اس میں قدرت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ بتلایا گیا
ہے کہ خشک دانہ اور خشک گٹھلی کو پھاڑ کر اس کے اندر سے ہرا بھرا درخت نکال دینا صرف

اسی ذات پاک کا فعل ہے جو خالق کائنات ہے، انسان کے کسی عمل کو اس میں کوئی دخل نہیں، کاشتکار کی ساری کوششوں کا حاصل اس سے زائد نہیں ہوتا کہ دانہ اور گٹھلی کے اندر سے جو نازک کونپل قدرت خداوندی نے نکالی ہے اس کی راہ سے موانع اور مضر چیزوں کو دور کرنے، زمین کو ہل وغیرہ کے ذریعہ نرم کرنا پھر کھاد پانی دینا، ان سب اعمال کا اثر زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ نکلنے والی نازک کونپل کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے، باقی اصل کام کہ دانہ اور گٹھلی پھٹ کر اس میں سے درخت کی کونپل نکلے اور پھر اس میں رنگ برنگ کے عجیب و غریب پتے اور پھر ایسے پھل پھول لگیں کہ انسان کی عقل و دماغ اس کا ایک پتہ یا ایک پنکھڑی بنانے سے عاجز ہے، اس میں ظاہر ہے کہ کسی انسانی عمل کو دخل نہیں، اسی لئے قرآن میں دوسری جگہ ارشاد فرمایا: أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ ءَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُونَ، یعنی کیا تم ان دانوں کو نہیں دیکھتے جن کو تم مٹی میں ڈال دیتے ہو کہ ان کو تم نے بویا اور بنایا ہے یا ہم نے۔

دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ یعنی اللہ تعالیٰ ہی بے جان چیزوں میں سے جاندار چیزوں کو پیدا کرتا ہے، بے جان سے مراد نطفہ یا انڈا ہے جس سے انسان اور حیوانات کی تخلیق ہوتی ہے، اسی طرح جانداروں سے بے جان چیزیں نکال دیتا ہے، یعنی جاندار چیزوں کے مادی نطفہ اور انڈا کہ وہ جاندار چیزوں سے نکلتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَأَنّٰى تُؤْفَكُونَ، یعنی یہ سب کام صرف ایک اللہ تعالیٰ کے کئے اور بنائے ہوتے ہیں، پھر یہ جانتے بوجھتے ہوئے تم کس طرف بہکے چلے جارہے ہو کہ خود تراشیدہ بتوں کو اپنا مشکل کشا اور حاجت روا معبود کہنے لگے۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے فَالِقُ الْإِصْبَاحِ، فالق کے معنی پھاڑنے والا، اور اصباح کے معنی یہاں وقت صبح کے ہیں، فالق الاصباح کے معنی ہیں پھاڑنے والا صبح کا، یعنی گہری اندھیری کی چادر کو پھاڑ کر صبح کا نکالنے والا، یہ بھی ان افعال و اعمال میں سے ہے جس میں جن و بشر اور ساری کائنات کی قوتیں ہیچ ہیں، ہر آنکھوں والا دیکھ کر یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ رات کی اندھیری کے بعد صبح کی روشنی پیدا کرنے والا نہ کوئی انسان ہو سکتا ہے نہ فرشتہ، نہ کوئی دوسری مخلوق بلکہ یہ صرف اس مافوق الادراک ہستی کا کام ہے جو سارے جہان کی پیدا کرنے والی ہے۔

مخلوقات کے آرام کے لئے رات کی قدرتی اندھیری تعیین ایک عظیم نعمت ہے

اس کے بعد ارشاد فرمایا: وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا، لفظ سکن سکون سے مشتق ہے، ہر ایسی چیز کو سکن

سونے کا کوئی ایک وقت مقرر کرنا چاہتے تو وہ اس میں دشواریاں کتنی ہوتیں، ثانیاً اگر سارے انسان کسی معاہدہ کے پابند ہو کر ایک معین وقت سویا کرتے تو جو نوکروں کو اس معاہدہ کا پابند کون بناتا، ورنہ وہ کھلے پھرتے تو سونے والے انسانوں اور ان کے سامانوں کا کیا حشر ہوتا؟ یہ اللہ جل شانہ ہی کی قدرت قاہرہ ہے جس نے جبری طور پر ہر انسان اور ہر جانور پر ایک معین وقت میں نیند مسلط کر کے ان بین الاقوامی معاہدوں کی ضرورت سے بے نیاز کر دیا، فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

شمسی اور قمری حساب | ارشاد فرمایا والشمس والقمر حسبانا، حسبان بالضم مصدر ہے، حساب کرنے اور شمار کرنے کے معنی میں آتا ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آفتاب و ماہتاب کے طلوع و غروب اور ان کی رفتار کو ایک خاص حساب سے رکھا ہے جس کے ذریعہ انسان سالوں، مہینوں، دنوں اور گھنٹوں کا بلکہ منٹوں اور سیکنڈوں کا حساب بآسانی لگا سکتا ہے۔

یہ اللہ جل شانہ کی قدرت قاہرہ کا عمل ہے کہ ان عظیم الشان نورانی کروں اور ان کی حرکات کو ایسے مستحکم اور مضبوط انداز سے رکھا ہے کہ ہزاروں سال گزر جانے پر بھی ان میں کبھی ایک منٹ یا ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا، ان کی مشینری کو نہ کسی ورکشاپ کی ضرورت پڑتی ہے نہ پرزے گھسنے اور بدلنے کی کوئی صورت پیش آتی ہے، یہ دونوں نور کے کرے اپنے اپنے دائرہ میں ایک معین رفتار کے ساتھ چل رہے ہیں، لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ، ہزاروں سال میں بھی ان کی رفتار میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا، افسوس یہ قدرت کے مستحکم اور غیر متبدل نظام ہی سے انسان دھوکہ کھا گیا کہ انہی چیزوں کو مستقل بالذات معبود و مقصود بنا بیٹھا، اگر ان کا یہ نظام کبھی کبھی ٹوٹا کرتا، ان کی مشینری درست کرنے کے لئے کچھ دنوں یا گھنٹوں کے وقفے ہوا کرتے تو انسان سمجھ لیتا کہ یہ مشینیں خود بخود نہیں چل رہی ہیں، ان کا کوئی چلانے والا اور بنانے والا ہے، مگر ان کی روشنی حقیقت پر بدستوری ان کروں کے غیر متبدل اور مستحکم نظام نے انسان کی نظروں کو خیرہ کر دیا اور اپنی ذات تک لگا لیا یہاں تک کہ وہ اس کو بھول بیٹھا کہ ؎

کوئی محبوب ہے اس پردۂ زنگاری میں

آسمانی کتابیں اور انبیاء ورسل اس کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنے ہی کے لئے نازل ہوئے۔

قرآن کریم کے اس ارشاد نے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ سالوں اور مہینوں کا حساب شمسی بھی ہو سکتا ہے اور قمری بھی، دونوں ہی اللہ جل شانہ کے انعامات ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ عام ان پڑھ دنیا کی سہولت اور ان کو حساب کتاب کی الجھن سے بچانے کے لئے

وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ

اور کھجور کے گابھے میں سے پھل کے گچھے جھکے ہوئے اور باغ انگور کے

وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى

اور زیتون کے اور انار کے آپس میں ملتے جلتے اور جدا جدا بھی دیکھو ہر ایک

ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۹۹

درخت کے پھل کو جب وہ پھل لاتا ہے اور اس کے پکنے کو ان چیزوں میں نشانیاں ہیں واسطے ایمان والوں کے

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَ

اور ٹھہراتے ہیں شریک اللہ کے جنوں کو حالانکہ اس نے ان کو پیدا کیا ہے اور تراشتے ہیں اس کے واسطے بیٹے اور

بَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝۱۰۰ بَدِيْعُ

بیٹیاں جہالت سے وہ پاک ہے اور بہت دور ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں نئی طرح پر

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ

بنانے والا آسمان اور زمین کا کیونکر ہو سکتا ہے اس کے بیٹا حالانکہ اس کی کوئی

صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۱۰۱ ذٰلِكُمُ

عورت نہیں اور اس نے بنائی ہر چیز اور وہ ہر چیز سے واقف ہے یہ اللہ

اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ

تمہارا رب ہے نہیں کوئی معبود سوا اس کے پیدا کرنے والا ہر چیز کا سو تم اسی کی عبادت کرو

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝۱۰۲

اور وہ ہر چیز پر کارساز ہے

خلاصۂ تفسیر

اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے آسمان (کی طرف) سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس (ایک ہی پانی) کے ذریعہ سے ہر قسم کے (رنگ برنگ) نباتات کو (زمین سے) نکالا (ایک ہی پانی ایک ہی مٹی سے اتنی مختلف قسم کی نباتات جن کے رنگ و بو، ذائقہ فوائد جدا مختلف ہیں کس قدر عجیب کرشمہ قدرت ہے) پھر ہم نے اس (کونپل) سے (جو اول زمین سے نکلتی ہے، جس کو بعض نباتات میں سوئی یا کھونٹی کہتے ہیں وہ رنگ میں زرد ہوتی ہے)

منجانب اللہ یہ کہئے کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اب بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے
حق بینی کے ذرائع (یعنی توحید و رسالت کے حق ہونے کے دلائل عقلیہ و نقلیہ) پہنچ چکے ہیں سو
جو شخص ان کے ذریعہ سے حق کو دیکھ لے گا وہ اپنا فائدہ کرے گا، اور جو شخص اندھا رہے گا وہ
اپنا نقصان کرے گا اور میں تمہارا (یعنی تمہارے اعمال کا) نگران نہیں ہوں (یعنی جیسا نگرانی کرنے
والے کے ذمہ ہوتا ہے کہ ناشائستہ حرکت نہ کرنے دے، یہ میرے ذمہ نہیں، میرا کام صرف تبلیغ
ہے، اور دیکھئے ہم اسی طرح (عمدہ) طور پر دلائل کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ آپ
سب کو پہنچا دیں) اور تاکہ یہ (منکرین تعصب سے) یوں کہیں کہ آپ نے کسی سے (ان مضامین کو)
پڑھ لیا ہے (مطلب یہ کہ ان پر دلائل واضح ہو کر ہم تو اس طرح وضاحت کر کے حق کو ثابت
کرتے تھے اور تم کج بحثی سے بہتان تراشتے تھے) اور تاکہ ہم اس (قرآن کے مضامین) کو دانشمندوں
کے لئے خوب ظاہر کر دیں (یعنی قرآن کے نازل کرنے کے تین فائدے ہیں ایک یہ کہ آپ کو اجر
تبلیغ ملے، دوسرے یہ کہ منکرین پر زیادہ حجت قائم ہو، تیسرے یہ کہ دانشمند و طالبان حق کو حق ظاہر
ہو جاوے، پس آپ دیکھئے کہ کون مانتا ہے اور کون نہیں مانتا، خود اس طریق پر چلتے رہئے جس
کی وحی آپ کے رب کی طرف سے آپ کے پاس آئی ہے اور اس طریق میں بڑی چیز یہ اعتقاد ہے، اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں اور
طریق میں تبلیغ کا حکم بھی داخل ہے) اور (اس پر قائم رہ کر) مشرکین کی طرف خیال نہ کیجئے (کہ افسوس، انھوں نے
قبول کیوں نہ کیا) اور (وجہ خیال نہ کرنے کی یہ ہے کہ) اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو یہ شرک نہ
کرتے (مگر ان لوگوں کی بدعنوانیوں سے اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ان کو سزا دیں، اس لئے ایسا
ہی سامان جمع کر دیا، پھر ان کو آپ کیا مسلمان بنا سکتے ہیں، اور آپ اس فکر میں پڑیں ہی کیوں)
ہم نے آپ کو ان (کے اعمال) کا نگران نہیں بنایا اور نہ آپ (ان اعمال پر عذاب دینے کے
ہماری طرف سے) مختار ہیں، پس جب آپ کے متعلق نہ ان کے جرائم کی تفتیش ہے اور نہ ان کی
سزا کا حکم ہے، پھر آپ کو کیوں تشویش ہے)۔

معارف ومسائل

سورۂ انعام کی ان پانچ آیات میں سے پہلی آیت میں ابصار بصر کی جمع ہے، جس کے معنی
ہیں نگاہ اور دیکھنے کی قوت، اور ادراک کے معنی پالینا، پکڑ لینا، احاطہ کرلینا ہیں، حضرت ابن عباسؓ
نے اس جگہ ادراک کی تفسیر احاطہ کرلینا بیان فرمائی ہے (بحر محیط)۔

معنی آیت کے یہ ہوگئے کہ ساری مخلوقات جن وانس و ملائکہ اور تمام حیوانات کی
نگاہیں مل کر بھی اللہ جل شانہ کو اس طرح نہیں دیکھ سکتیں کہ یہ نگاہیں اس کی ذات کا احاطہ

کرلیں، اور اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کی نگاہوں کو پوری طرح دیکھتے ہیں اور ان کا دیکھنا ان سب پر محیط ہے، اس مختصر آیت میں حق تعالیٰ کی دو مخصوص صفتوں کا ذکر ہے، اول یہ کہ ساری کائنات میں کسی کی نگاہ بلکہ سب کی نگاہیں مل کر بھی اس کی ذات کا احاطہ نہیں کرسکتیں۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر جہان کے سارے انسان اور جنات اور فرشتے اور شیطان جب سے پیدا ہوئے، اور جب تک پیدا ہوتے رہیں گے وہ سب کے سب مل کر ایک صف میں کھڑے ہو جائیں تو سب مل کر بھی اس کی ذات کا اپنی نگاہ میں احاطہ نہیں کرسکتے۔ (مظہری بحوالہ ابن ابی حاتم)

اور یہ خاص صفت حق جل وعلا شانہ کی ہی ہوسکتی ہے ورنہ نگاہ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی قوت بخشی ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے جانور کی چھوٹی سے چھوٹی آنکھ دنیا کے بڑے سے بڑے کرّے کو دیکھ سکتی اور نگاہ سے اس کا احاطہ کرسکتی ہے۔ آفتاب و ماہتاب کتنے بڑے بڑے کرّے ہیں کہ زمین اور ساری دنیا کی ان کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے، مگر ہر انسان بلکہ چھوٹے سے چھوٹے جانور کی آنکھ ان کرّوں کو اس طرح دیکھتی ہے کہ نگاہ میں ان کا احاطہ ہو جاتا ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ نگاہ تو انسانی حواس میں سے ایک حاسّہ ہے، جس سے صرف محسوس چیزوں کا علم حاصل ہوسکتا ہے، حق تعالیٰ کی ذات پاک تو عقل و وہم کے احاطہ سے بھی بالاتر ہے، اس کا علم اس حاسّہ بصر سے کیسے حاصل ہو ؎

تو دل میں آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے

حق تعالیٰ کی ذات و صفات غیر محدود ہیں، اور انسانی حواس اور عقل و خیال سب محدود چیزیں ہیں، ظاہر ہے کہ ایک غیر محدود کسی محدود چیز میں نہیں سما سکتا، اسی لئے دنیا کے عقلاء و فلاسفر جنہوں نے عقلی دلائل سے خالق کائنات کا پتہ لگانے اور اس کی ذات و صفات کے ادراک کے لئے اپنی عمریں بحث و تحقیق میں صرف کیں، اور صوفیائے کرام جنہوں نے کشف و شہود کے راستہ سے اس میدان کی سیاحت کی، سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ اس کی ذات و صفات کی حقیقت کو نہ کسی نے پایا نہ پا سکتا ہے، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ؎

دُور بینانِ بارگاہِ الست ✽ غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

اور حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ؎

چو شبہا نشستم دریں سیر گم
کہ حیرت گرفت آستینم کہ قم

رؤیت باری تعالیٰ کا مسئلہ انسان کو حق تعالیٰ کی زیارت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں تمام علماء اہلسنت و جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ اس عالم دنیا میں حق تعالیٰ کی ذات کا مشاہدہ اور زیارت نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ درخواست کی کہ رَبِّ اَرِنِیْ "اے میرے پروردگار مجھے اپنی زیارت کرا دیجئے" تو جواب میں ارشاد ہوا کہ لَنْ تَرٰىنِیْ "آپ ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے"۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب یہ جواب ملا ہے تو پھر اور کسی جن و بشر کی کیا مجال ہے، البتہ آخرت میں مومنین کو حق تعالیٰ کی زیارت ہونا صحیح و قوی احادیث متواترہ سے ثابت ہے، اور خود قرآن کریم میں موجود ہے:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝

"قیامت کے روز بہت سے چہرے ترو تازہ بشاش بشاش ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے"

البتہ کفار و منکرین اس روز بھی سزا کے طور پر حق تعالیٰ کی رؤیت سے مشرف نہ ہوں گے جیسا کہ قرآن کریم کی ایک آیت میں ہے:

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝

"یعنی کفار اس روز اپنے رب کی زیارت سے محجوب و محروم ہوں گے"

اور آخرت میں حق تعالیٰ کی زیارت مختلف مقامات پر ہوگی، عرصۂ محشر میں بھی، اور جنت میں پہونچنے کے بعد بھی، اور اہل جنت کے لئے ساری نعمتوں سے بڑی نعمت حق تعالیٰ کی زیارت ہوگی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے تو حق تعالیٰ اُن سے فرمائیں گے کہ جو نعمتیں جنت میں مل چکی ہیں اُن سے زائد اور کچھ چاہیے تو بتلاؤ کہ ہم وہ بھی دیدیں، یہ لوگ عرض کریں گے، یا اللہ! آپ نے ہمیں دوزخ سے نجات دی، جنت میں داخل فرمایا، اس سے زیادہ ہم اور کیا چاہیں؟ اُس وقت حجاب درمیان سے اُٹھا دیا جائے گا، اور سب کو اللہ تعالیٰ کی زیارت ہوگی، اور جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہوگی، یہ حدیث صحیح مسلم میں حضرت صہیبؓ سے منقول ہے۔

اور صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات چاند کی چاندنی میں تشریف فرما تھے، اور صحابۂ کرامؓ کا مجمع تھا، آپؐ نے چاند کی طرف نظر فرمائی

اور پھر فرمایا کہ آخرت میں تم اپنے رب کو ایسی طرح عیاناً دیکھو گے جیسے اس چاند کو دیکھ رہے ہو۔

ترمذی اور مسند احمد کی ایک حدیث میں بروایت ابن عمرؓ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو جنت میں خاص درجہ عطا فرمائیں گے، اُن کو روزانہ صبح و شام حق تعالیٰ کی زیارت نصیب ہوگی۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں کسی کو حق تعالیٰ کی زیارت نہیں ہو سکتی اور آخرت میں سب اہلِ جنت کو ہوگی، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو شب معراج میں زیارت ہوئی وہ بھی درحقیقت عالم آخرت ہی کی زیارت ہے، جیسا شیخ محی الدین ابن عربی نے فرمایا کہ دنیا صرف اس جہان کا نام ہے جو آسمانوں کے اندر محصور ہے، آسمانوں سے اوپر آخرت کا مقام ہے، وہاں پہنچ کر جو زیارت ہوئی اس کو دنیا کی زیارت نہیں کہا جاسکتا۔

اب سوال یہ رہتا ہے کہ جب آیت قرآن لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ سے یہ معلوم ہوا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی رؤیت نہیں ہو سکتی تو پھر قیامت میں کیسے ہوگی؟ اس کا جواب کھلا ہوا یہ ہے کہ آیت قرآن کے یہ معنی نہیں کہ انسان کے لئے حق تعالیٰ کی رؤیت و زیارت ممکن نہیں، بلکہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ انسانی نگاہ اس کی ذات کا احاطہ نہیں کر سکتی کیونکہ اس کی ذات غیر محدود اور انسان کی نظر محدود ہے۔

قیامت میں بھی جو زیارت ہوگی وہ اس طرح ہوگی کہ نظر احاطہ نہیں کر سکے گی، اور دنیا میں انسان اور اس کی نظر میں اتنی قوت نہیں جو اس طرح کی رؤیت کو بھی برداشت کر سکے، اس لئے دنیا میں رؤیت مطلقاً نہیں ہو سکتی، اور آخرت میں قوت پیدا ہو جائے گی، تو رؤیت زیارت ہو سکے گی، مگر نظر میں ذات حق کا احاطہ اُس وقت بھی نہ ہو سکے گا۔

دوسری صفت حق تعالیٰ شانہٗ کی اس آیت میں یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کی نظر ساری کائنات پر محیط ہے، دنیا کا کوئی ذرہ اس کی نظر سے چھپا ہوا نہیں، یہ علم مطلق اور احاطہ علمی بھی حق تعالیٰ شانہٗ کی ہی خصوصیت ہے، اس کے سوا کسی مخلوق کو تمام اشیاء کائنات اور ذرہ ذرہ کا علم نہ کبھی .... حاصل ہوا نہ ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ مخصوص صفت ہے رب العزت جل شانہٗ کی۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ، لطیف عربی لغت کے اعتبار سے دو معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، ایک معنی مہربان، دوسرے بمقابل کثیف یعنی وہ چیز جو حواس کے ذریعہ محسوس و معلوم نہیں کی جاسکتی۔

اور خبیر کے معنی ہیں باخبر، معنی اس جملہ کے یہ ہوگئے کہ اللہ تعالیٰ لطیف ہیں اس لئے حواس کے ذریعہ ان کا ادراک نہیں کیا جاسکتا، اور خبیر ہیں، اس لئے ساری کائنات کا کوئی ذرہ ان کے علم و خبر سے باہر نہیں، اور اگر لطیف کے معنی اس جگہ مہربان کے لئے جاویں تو اشارہ اس طرف

ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اگرچہ ہمارے ہر قول و فعل بلکہ ارادہ اور خیال سے بھی باخبر ہیں جس کا اقتضاء یہ تھا کہ ہم ہر گناہ پر پکڑے جایا کرتے، مگر چونکہ وہ لطیف و مہربان بھی ہیں، اس لئے ہر گناہ پر مواخذہ نہیں فرماتے۔

دوسری آیت میں لفظ بصائر، بصیرت کی جمع ہے جس کے معنی ہیں عقل و دانش یعنی وہ قوت جس کے ذریعہ انسان غیر محسوس چیزوں کا علم حاصل کرسکتا ہے۔ بصائر سے مراد آیت میں وہ دلائل اور ذرائع ہیں جن سے انسان حق اور حقیقت کو معلوم کر سکے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس حق بینی کے ذرائع و وسائل پہونچ چکے ہیں، یعنی قرآن آیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آئے، آپ کے معجزات آئے، آپ کے اخلاق و معاملات و تعلیمات مشاہدہ میں آئیں یہ سب حق بینی کے ذرائع ہیں۔

تو جو شخص ان ذرائع سے کام لے کر صاحب بصیرت بن گیا، اس نے اپنا نفع حاصل کر لیا اور جو ان ذرائع کو چھوڑ کر حق سے اندھا رہا تو اپنا ہی نقصان کیا۔

آخر آیت میں فرمایا کہ "میں تمہارا نگراں نہیں" یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ذمہ دار نہیں کہ لوگوں کو زبردستی کرکے ناشائستہ کاموں سے روک ہی دیں، جیسے نگراں اور محافظ کا کام ہوتا ہے، بلکہ رسول کا منصبی فریضہ صرف احکام کا پہونچا دینا اور سمجھا دینا ہے، پھر کوئی اپنے اختیار سے ان کا اتباع کرے یا نہ کرے یہ اس کی ذمہ داری ہے۔

تو یہ رسالت پر جو واضح دلائل پچھلی آیات میں بیان ہو چکے ہیں، تیسری آیت میں ان کی طرف اشارہ کرکے فرمایا گیا: كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ، یعنی ہم اسی طرح دلائل کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا، وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ جس کا حاصل یہ ہے کہ سارا ہدایت کا سامان معجزات اور دلائل، بے مثل کتاب قرآن اور ایک اُمّی محض کی زبان مبارک سے ایسے علوم و حقائق کا اظہار جن سے ساری دنیا کے فلاسفر اور حکماء عاجز ہیں، ایسا بلیغ کلام جس میں قیامت تک آنے والے جن و بشر کو چیلنج کیا گیا کہ اس کی ایک چھوٹی سی سورت جیسا کلام کوئی بنا کے تو لائے اور ساری دنیا اس سے عاجز رہی، یہ سب حق بینی کا سامان ایسا تھا کہ ہر ہٹ دھرم منکر کو بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر گر جانا چاہئے تھا، لیکن جن لوگوں کی طبیعت میں زیغ اور کجی تھی، وہ یہ کہنے لگے کہ دَرَسْتَ یعنی یہ علوم تو آپ نے کسی سے پڑھ لئے ہیں۔

ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ، جس کا حاصل یہ ہے کہ دانشمند

جن کی سمجھ درست اور فہم سلیم ہے ان کے لئے یہ بیان نافع و مفید ثابت ہوا، خلاصہ یہ ہے کہ سامانِ ہدایت تو سب کے سامنے رکھا گیا مگر کج فہموں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا، سلیم الفہم لوگ اس کے ذریعہ دنیا کے رہبر بن گئے۔

چوتھی آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے کہ آپ یہ نہ دیکھئے کہ کون مانتا ہے اور کون نہیں مانتا، آپ خود اس طریق پر چلتے رہئے جس طریق پر چلنے کے لئے آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے وحی نازل ہوئی ہے، جس میں بڑی چیز یہ عقیدہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں، نیز اسی وحی میں تبلیغ کا حکم بھی داخل ہے، اس پر قائم رہ کر مشرکین کی طرف خیال نہ کیجئے کہ افسوس انہوں نے کیوں قبول نہ کیا۔

پانچویں آیت میں اس کی وجہ یہ بتلائی گئی کہ اگر اللہ تعالیٰ کو تکوینی طور پر یہ منظور ہوتا کہ سب انسان مسلمان ہو جائیں تو یہ شرک نہ کرتے، لیکن ان کی بد عنوانیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا کہ ان کو زبردستی مسلمان بنائے تو ایسا ہی سامان جمع کر دیا، پھر آپ ان کو کیسے مسلمان بنا سکتے ہیں، اور آپ اس فکر میں پڑیں کیوں، ہم نے آپ کو ان کے اعمال کا نگران نہیں بنایا، اور نہ آپ ان اعمال پر عذاب دینے کے ہماری طرف سے مختار ہیں، اس لئے آپ کو ان کے اعمال سے تشویش نہ ہونی چاہئے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ

اور تم لوگ برا نہ کہو ان کو جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا پس وہ برا کہنے لگیں گے اللہ کو

عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ

بے ادبی سے بدون سمجھے اسی طرح ہم نے مزین کر دیا ہر ایک فرقہ کی نظر میں ان کے اعمال کو، پھر ان سب

رَبِّهِمْ مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٠٨﴾ وَأَقْسَمُوا

کو اپنے رب کے پاس پہنچنا ہے تب وہ جتلا دے گا ان کو جو کچھ وہ کرتے تھے اور وہ قسمیں کھاتے ہیں

بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاءَتْهُمْ آيَةٌ لَيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۚ

اللہ کی تاکید سے کہ اگر آوے ان کے پاس کوئی نشانی تو البتہ اس پر ایمان لاویں گے تو

قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ ۖ وَمَا يُشْعِرُكُمْ أَنَّهَا إِذَا جَاءَتْ

تو کہہ دے کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور تم کو اے مسلمانو کیا خبر ہے کہ جب نشانیاں آویں گی تو

لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٠٩﴾ وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا

یہ لوگ ایمان لے ہی آویں گے اور ہم الٹ دیں گے ان کے دل اور ان کی آنکھیں جیسے کہ

لَمْ يُؤْمِنُوا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١١٠﴾

ایمان نہیں لائے اس پر پہلی بار اور ہم چھوڑے رکھیں گے ان کو ان کی سرکشی میں بہکتے ہوئے

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ

اور اگر ہم اتاریں ان پر فرشتے اور باتیں کریں ان سے

الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ

مردے اور زندہ کریں ہم ہر چیز کو ان کے سامنے تو بھی یہ لوگ ہرگز ایمان لانے والے نہیں

اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿١١١﴾ وَكَذٰلِكَ

مگر یہ کہ چاہے اللہ لیکن ان میں اکثر جاہل ہیں ، اور اسی طرح

جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ

کر دیا ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن شریر آدمیوں کو اور جنوں کو ، جو کہ سکھلاتے ہیں

بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ

ایک دوسرے کو ملمع کی ہوئی باتیں فریب دینے کے لئے ، اور اگر تیرا رب چاہتا

مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿١١٢﴾ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ

تو وہ لوگ یہ کام نہ کرتے سو تو چھوڑ دے وہ جانیں اور ان کا جھوٹ ، اور اس لئے کہ مائل ہوں ان ملمع

الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا

کی باتوں کی طرف ان لوگوں کے دل جن کو یقین نہیں آخرت کا ، اور وہ اس کو بھی پسند کریں اور کئے جاویں

هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿١١٣﴾

جو کچھ برے کام کر رہے ہیں

خلاصۂ تفسیر

اور (اے مسلمانو) دشنام مت دو ان (معبودان باطلہ) کو جن کی یہ (مشرک) لوگ خدا (کی توحید) کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں کیونکہ (تمہارے ایسا کرنے سے) پھر وہ براہ جہل حد سے گذر کر (یعنی غصہ میں آکر) اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کریں گے (اور اس کا تعجب نہ کیا جانے کہ ایسی گستاخی کرنیوالوں کو ساتھ کے ساتھ سزا کیوں نہیں مل جاتی کیونکہ) ہم نے (دنیا میں تو) اسی طرح (جیسا ہو رہا ہے) ہر طریقہ والوں کو ان کا عمل (بھلا ہو یا برا ہو) مرغوب بنا رکھا ہے (یعنی ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں

اس واقعہ اور اس پر قرآنی ہدایت نے ایک بڑے علم کا دروازہ کھول دیا، اور چند اصولی مسائل اس سے نکل آئے۔

کسی گناہ کا سبب بننا بھی گناہ ہے، مثلاً یہ کہ جو کام اپنی ذات کے اعتبار سے جائز بلکہ کسی درجہ میں محمود بھی ہو مگر اس کے کرنے سے کوئی فساد لازم آتا ہو یا اس کے نتیجہ میں لوگ مبتلائے معصیت ہوتے ہوں وہ کام بھی ممنوع ہو جاتا ہے کیونکہ معبودات باطلہ یعنی بتوں کو بُرا کہنا اگرچہ جائز تو ضرور ہے، اور دینی غیرت کے تقاضہ سے کہا جائے تو شاید اپنی ذات میں ثواب اور محمود بھی ہو، مگر چونکہ اس کے نتیجہ میں یہ اندیشہ ہوگیا کہ لوگ اللہ جل شانہٗ کو بُرا کہیں گے تو بتوں کو بُرا کہنے والے اس بے ادبی کا سبب بن جائیں گے اس لئے اس جائز کام کو بھی منع کر دیا گیا۔

اس کی ایک اور مثال بھی حدیث میں مذکور آئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی نہ دے، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ تو کسی شخص سے ممکن ہی نہیں کہ اپنے ماں باپ کو گالی دے، فرمایا کہ ہاں انسان خود تو ان کو گالی نہیں دیتا، لیکن جب وہ کسی دوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دے اور اس کے نتیجہ میں وہ دوسرا اس کے ماں باپ کو گالی دے، تو اس گالی دلوانے کا سبب یہ بیٹا بنا، تو یہ بھی ایسا ہی ہے جیسے اس نے خود گالی دی۔

اسی معاملہ کی ایک دوسری مثال عہدِ رسالت میں یہ پیش آئی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ بیت اللہ شریف زمانۂ جاہلیت کے کسی حادثہ میں منہدم ہوگیا تھا تو قریش مکہ نے بعثت و نبوت سے پہلے اس کی تعمیر کرائی، اس تعمیر میں چند چیزیں بناءِ ابراہیمی کے خلاف ہوگئیں، ایک تو یہ کہ جس حصہ کو حطیم کہا جاتا ہے یہ بھی بیت اللہ کا جزء ہے، تعمیر میں اس کو سرمایہ کم ہونے کی بناء پر چھوڑ دیا، دوسرے بیت اللہ شریف کے دو دروازے شرقی اور غربی تھے، ایک داخل ہونے کے لئے دوسرا باہر نکلنے کے لئے، اہلِ جاہلیت نے غربی دروازہ بند کر کے صرف ایک کر دیا، اور وہ بھی سطحِ زمین سے بلند کر دیا، تاکہ بیت اللہ شریف میں داخلہ صرف ان کی مرضی و اجازت سے ہو سکے، ہر شخص بے محابا نہ جا سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ بیت اللہ کی موجودہ تعمیر کو منہدم کر کے حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعمیر کے بالکل مطابق بنا دوں، مگر خطرہ یہ ہے کہ تمہاری قوم یعنی عام عرب ابھی ابھی مسلمان ہوئے ہیں، بیت اللہ کو منہدم کرنے سے کہیں ان کے دلوں میں کچھ شبہات نہ پیدا ہو جائیں، اس

دوسرے فریق کو اس کا پورا حق ہے کہ ان دلائل اور شہادتوں پر جرح کرکے ان کو غلط ثابت کرے، لیکن ان پیش کردہ شہادتوں پر کوئی جرح نہ کریں اور یہ مطالبہ کریں کہ ہم تو دوسری شہادتیں چاہتے ہیں، یہ ایسا ہوگا جیسے عدالت میں کوئی مدعا علیہ مدعی کے پیش کردہ گواہوں پر تو کوئی جرح نہ کرے، مگر یہ کہے کہ میں ان گواہوں کی شہادت نہیں مانتا، بلکہ فلاں معین شخص کی گواہی پر بات مانوں گا، اس کو کوئی عدالت قابل سماعت نہ سمجھے گی۔

اسی طرح نبوت و رسالت پر جب شہادت آیات اور معجزات ظاہر ہوجانے کے بعد جب تک ان معجزات کو غلط ثابت نہ کریں ان کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ ہم تو فلاں قسم کا معجزہ دیکھیں گے تب ایمان لائیں گے۔

اس کے بعد آخر آیات تک مسلمانوں کو فہمائش اور خطاب ہے کہ تمہارا کام دین حق پر خود قائم رہنا اور دوسروں کو صحیح طریقہ سے پہنچا دینا ہے، پھر بھی اگر وہ ہٹ دھرمی کرنے لگیں تو ان کی فکر میں پڑنا نہیں چاہئے، کیونکہ زبردستی کسی کو مسلمان بنانا نہیں، اگر زبردستی بنانا ہوتا تو اللہ تعالیٰ سے زیادہ زبردست کون ہے، وہ خود ہی سب کو مسلمان بنا دیتے، اور ان آیات میں مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے یہ بھی بتلا دیا گیا کہ اگر ہم ان کے مانگے ہوئے معجزات کو بھی بالکل ان کے دل خواہ طریق پر ظاہر کردیں یہ جب بھی ایمان نہ لائیں گے، کیونکہ ان کا انکار کسی غلط فہمی یا ناواقفیت کی وجہ سے نہیں، بلکہ ضد و عناد اور ہٹ دھرمی سے ہے، جس کا علاج کسی معجزات سے نہیں ہوسکتا، آخری آیت وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰۗىِٕكَةَ میں اسی مضمون کا بیان ہے کہ اگر ہم ان لوگوں کے فرمائشی معجزات سب دکھلا دیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ فرشتوں سے ان کی ملاقات اور مُردوں سے گفتگو کرا دیں، جب بھی وہ ماننے والے نہیں، بعد کی دو آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ لوگ اگر آپ سے عداوت کرتے ہیں تو کچھ تعجب کی بات نہیں، پچھلے تمام انبیاء کے بھی دشمن ہوتے چلے آئے ہیں، آپ اس سے دلگیر نہ ہوں۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ

سو کیا اب اللہ کے سوا کسی اور کو منصف بناؤں حالانکہ اسی نے اتاری تم پر کتاب

مُفَصَّلًا ۭ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ

واضح اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ نازل ہوئی ہے

مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ وَتَمَّتْ

تیرے رب کی طرف سے ٹھیک سو تو مت ہو شک کرنے والوں میں سے اور تیرے رب کی

تنبیہ: اس آیت میں ہے کہ آپ کبھی شک نہ کیا کریں، جس کا کبھی سوال ہی نہ تھا، معلوم ہوا کہ یہاں اگرچہ لفظاً
میں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، لیکن درحقیقت سنانا دوسروں کو مقصود ہے، اور آپ
کی طرف منسوب کرنے سے مبالغہ اور تاکید زیادہ منظور ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا
کہا گیا تو دوسروں کی کیا ہستی ہے جو کوئی شک کر سکیں۔

دوسری آیت میں قرآن کریم کی دو امتیازی صفت کا بیان ہے جو قرآن کے کلام
الٰہی ہونے کا کافی ثبوت ہیں، ارشاد ہے وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ
لِكَلِمٰتِهٖ، یعنی کامل ہے کلام آپ کے رب کا سچائی اور انصاف اور اعتدال کے اعتبار سے
اس کے کلام کو کوئی بدلنے والا نہیں۔

لفظ تمّت میں کامل ہونے کا بیان ہے، اور کلمۃ ربک سے مراد قرآن ہے (کذا فی البحر المحیط
عن قتادۃ) قرآن کے کل مضامین دو قسم کے ہیں، ایک وہ جن میں تاریخ عالم کے عبرت آموز واقعات
وحالات اور نیک عمل پر وعدہ اور بُرے عمل پر سزا کی وعید بیان کی گئی ہے، دوسرے وہ
جن میں انسان کی صلاح وفلاح کے لئے احکام بیان کئے گئے ہیں، ان دونوں قسموں کے متعلق
قرآن مجید کی یہ دو صفتیں بیان فرمائیں، صِدْقًا وَّعَدْلًا، صدق کا تعلق پہلی قسم سے ہے،
یعنی جتنے واقعات وحالات یا وعدے وعید قرآن میں بیان کئے گئے ہیں وہ سب سچے اور صحیح ہیں،
ان میں کسی غلطی کا امکان نہیں، اور عدل کا تعلق دوسری قسم یعنی احکام سے ہے، جس کا
مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کے تمام احکام عدل پر مبنی ہیں، اور لفظ عدل کا مفہوم
دو معنی کو شامل ہے، ایک انصاف جس میں کسی پر ظلم اور حق تلفی نہ ہو، دوسرے اعتدال
کہ نہ بالکل انسان کی نفسانی خواہشات کے تابع ہوں، اور نہ ایسے جن کو انسانی جذبات
اور اس کے فطری تقاضے برداشت نہ کر سکیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام احکام الٰہیہ
انصاف اور اعتدال پر مبنی ہیں نہ ان میں کسی پر ظلم ہے، اور نہ ان میں ایسی شدت اور تکلیف ہے
جس کو انسان برداشت نہ کر سکے، جیسے دوسری جگہ ارشاد ہے، لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا
وُسْعَهَا، یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت وطاقت سے زیادہ کسی عمل کی تکلیف
نہیں دیتے، اس کے ساتھ ہی اس آیت میں لفظ تمّت لا کر یہ بھی بتلا دیا گیا ہے، کہ
قرآن کریم میں ... صدق وعدل کی صفت موجود ہیں، بلکہ وہ ان صفات میں ہر حیثیت
سے کامل و مکمل ہے۔

اور یہ بات کہ تمام قرآنی احکام تمام اقوام دنیا کے لئے اور قیامت تک آنیوالی
نسلوں اور بدلنے والے حالات کے لئے انصاف پر بھی مبنی ہوں اور اعتدال پر بھی، یہ اگر

ذرا بھی غور کیا جائے تو صرف احکامِ خداوندی ہی میں ہوسکتا ہے دنیا کی کوئی قانون ساز اسمبلی تمام موجودہ اور آئندہ پیش آنے والے حالات کا اندازہ نہیں لگا سکتی ہے اور نہ ان سب حالات کی رعایت کرکے کوئی قانون بنا سکتی ہے، ہر ایک قوم اپنے ملک اور اپنی قوم کے بھی صرف موجودہ حالات کے پیش نظر قانون بناتی ہے، اور ان قوانین میں بھی تجربہ کرنے کے بعد بہت سی چیزیں عدل و اعتدال کے خلاف محسوس ہوتی ہیں، تو ان کو بدلنا پڑتا ہے، دوسری قوموں اور دوسرے ملکوں یا آئندہ حالات کی پوری رعایت کرکے ایسا قانون وضع کرنا جو ہر قوم ہر ملک ہر حال میں عدل و اعتدال کی صفت سے موصوف ہو، یہ انسانی فکر و نظر سے بالاتر ہے، صرف حق جل وعلا شانہ کے ہی کلام میں ہوسکتا ہے اس لئے یہ پانچویں صفت قرآن کریم کی کہ اس میں بیان کئے ہوئے گذشتہ اور آئندہ کے تمام واقعات اور وعدہ وعید سب سچے ہیں ان میں خلاف واقع ہونے کا کوئی شبہ نہیں ہوسکتا، اور اس کے بیان کئے ہوئے تمام احکام پوری دنیا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے عدل و اعتدال سے موصوف ہیں ان میں کسی پر ظلم ہے نہ اعتدال و میانہ روی سے دور، تو یہ بات خود قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا مکمل ثبوت ہے۔

چھٹی صفت یہ بیان فرمائی لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ، یعنی اللہ تعالیٰ کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں، بدلنے کی ایک صورت تو یہ ہوسکتی ہے کہ کوئی اس میں غلطی ثابت کرے اس لئے بدلا جائے، دوسری یہ کہ کوئی دشمن زبردستی اس کو بدل ڈالے، اللہ تعالیٰ کا کلام ان سب چیزوں سے بالاتر ہے کیونکہ اس نے خود وعدہ فرمایا ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ، یعنی ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں، کہ کسی کی مجال نہیں کہ اللہ کی حفاظت کو توڑ کر اس میں کوئی تغیر و تبدل کرسکے، چنانچہ چودہ سو برس اس پر گذر چکے ہیں، ہر قرن اور ہر زمانے میں قرآن کے مخالف اس کے ماننے والوں کی نسبت تعداد میں بھی زیادہ رہے ہیں، قوت میں بھی، مگر کسی کی مجال نہیں ہوسکی کہ قرآن کے ایک زیر زبر میں فرق پیدا کرسکے، اور بدلنے کی ایک تیسری صورت یہ بھی ہوسکتی تھی کہ خود حق تعالیٰ کی طرف سے اس کو منسوخ کرکے بدل دیا جائے، اسی لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آخری پیغمبر اور قرآن آخری کتاب ہے، اس کے بعد نسخ کا کوئی احتمال نہیں، جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیات میں یہ مضمون اور بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ آیا ہے۔

آخر آیت میں فرمایا وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ یعنی اللہ جل شانہ ان تمام گفتگوؤں کو

اسی طرح دوسروں کے لئے نفع رسانی کے معیار سے تو تمام جمادات اور نباتات کا فائدہ بظاہر انسان سے بھی آگے نظر آتا ہے، کہ ان کے گوشت کھال، ہڈی، پٹھے اور درختوں کی جڑ سے لیکر شاخوں، پتوں تک ہر چیز مخلوق کے لئے کار آمد اور ان کی ضروریات زندگی پیدا کرنے میں بے شمار فوائد کی حامل ہے، بخلاف انسان کے کہ اس کا گوشت کسی کے کام آتا ہے نہ کھال، نہ بال نہ ہڈی نہ پٹھے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان حالات میں پھر حضرت انسان کس بنا پر مخدوم کائنات اور افضل المخلوقات ٹھہرے ہیں، اب حقیقت شناسی کی منزل قریب آپہنچی، ذرا سا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان ساری چیزوں کے عقل و شعور کی رسائی صرف موجودہ زندگی کے وقتی اور ہنگامی نفع نقصان تک ہے، اور اسی زندگی میں وہ دوسروں کے لئے فائدہ بخش نظر آتی ہے، اس دنیا کی زندگی سے پہلے کیا تھا، اور بعد میں کیا آنے والا ہے، اس میدان میں جمادات نباتات تو کیا کسی بڑے سے بڑے ہوشیار جانور کی عقل و شعور بھی کام نہیں دیتی، اور نہ اس میدان میں ان میں سے کوئی چیز کسی کے لئے کار آمد یا مفید ہو سکتی ہے، بس یہی وہ میدان ہے جس میں مخدوم کائنات اور افضل المخلوقات انسان کو کام کرنا ہے، اور یہیں سے اس کا امتیاز دوسری مخلوقات سے واضح ہو سکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان کا مقصد زندگی یہ ہے کہ عالم کی ابتداء و انتہاء کو سامنے رکھ کر سب کے نتائج اور عواقب پر نظر ڈالے اور یہ تحقیق کرے کہ مجموعی اعتبار سے کیا چیز نافع اور مفید ہے اور کونسی چیز مضر اور تکلیف دہ ہے، پھر اس بصیرت کے ساتھ خود اپنے لئے بھی مفید چیزوں کو حاصل کرنا اور مضر چیزوں سے بچنا اور دوسروں کو بھی ان مفید چیزوں کی طرف دعوت دینا اور بُری چیزوں سے بچانے کا اہتمام کرنا ہے، تاکہ دائمی راحت و سکون اور اطمینان کی زندگی حاصل ہو سکے، اور جب انسان کا مقصد زندگی اور کمال انسانی کا یہ معیار فائدہ خود حاصل کرنا اور دوسروں کو پہونچانا ہے، تو اب قرآن کی یہ تمثیل حقیقت بنکر سامنے آجاتی ہے کہ زندہ صرف وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے، اور عالم کی ابتداء و انتہاء اور اس میں مجموعی اعتبار سے نفع و نقصان کو وحی الٰہی کی روشنی میں پہچانے کیونکہ نری عقل انسانی نے نہ کبھی اس میدان کو سر کیا ہے نہ کر سکتی ہے، بڑے بڑے عقلاء و حکماء اور فیلسوفانِ عالم نے انجام کار اس کا اقرار کیا ہے، مولانا رومی نے خوب فرمایا ہے ؎

زیرکانِ موشگافانِ دہی
کردہ ہر خرطوم خطِ الٰہی

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكَابِرَ مُجْرِمِيهَا لِيَمْكُرُوا فِيهَا

اور اسی طرح رکھے ہیں ہم نے ہر بستی میں گنہگاروں کے سردار کہ حیلے کیا کریں وہاں

وَمَا يَمْكُرُونَ إِلَّا بِأَنفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿١٢٣﴾ وَإِذَا جَاءَتْهُمْ

اور جو حیلے کرتے ہیں سو اپنی ہی جان پر اور نہیں سوچتے۔ اور جب آتی ہے ان کے پاس

آيَةٌ قَالُوا لَن نُّؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ

کوئی آیت تو کہتے ہیں کہ ہم ہرگز نہ مانیں گے جب تک کہ نہ دیا جاوے ہم کو جیسا کچھ دیا گیا ہے

اللَّهِ ۘ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ۗ سَيُصِيبُ الَّذِينَ

اللہ کے رسولوں کو، اللہ خوب جانتا ہے اس موقع کو جہاں بھیجے اپنے پیغام، عنقریب پہنچے گی

وقف لازم

أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِندَ اللَّهِ وَعَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا كَانُوا

گنہگاروں کو ذلت اللہ کے یہاں اور عذاب سخت اس وجہ سے کہ وہ

يَمْكُرُونَ ﴿١٢٤﴾ فَمَن يُرِدِ اللَّهُ أَن يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ

مکر کرتے تھے۔ سو جس کو اللہ چاہتا ہے کہ ہدایت کرے تو کھول دیتا ہے اس کے سینہ کو

لِلْإِسْلَامِ ۖ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا

واسطے قبول کرنے اسلام کے، اور جس کو چاہتا ہے کہ گمراہ کرے کر دیتا ہے اس کے سینہ کو تنگ

حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ ۚ كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ

بے نہایت تنگ گویا وہ زور سے چڑھتا ہے آسمان پر، اسی طرح ڈالے گا اللہ

الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٢٥﴾

عذاب کو ایمان نہ لانے والوں پر

خلاصۂ تفسیر

اور یہ کوئی نئی بات نہیں، جس طرح مکہ کے رؤساء ان جرائم کے مرتکب ہو رہے ہیں اور ان کے اثر سے دوسرے لوگ شامل ہو جاتے ہیں، اسی طرح ہم نے (پہلی امتوں میں بھی) ہر بستی میں وہاں کے رئیسوں ہی کو (زیادہ) جرم کا مرتکب بنایا (پھر ان کے اثر سے اور عوام بھی ان سے مل گئے) تاکہ وہ لوگ وہاں (دین کو ضرر پہنچانے کے لئے) شرارتیں کیا کریں، (جس سے ان کا مستحق سزا ہونا خوب ثابت ہو جاوے) اور وہ لوگ (گو اپنے خیال میں

ہوتا ہے جو حقیقت اور انجام سے غافل انسان کی نظر میں اُن بُرے اعمال ہی کو مزین کر دیتا ہے، اور دنیا کے بڑے بڑے ہوشیار اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں اس کا بیان ہے کہ اسی امتحان و آزمائش کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ ابتداء عالم سے یوں ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ ہر بستی کے رئیس و مالدار اور بڑے لوگ جو حقیقت و انجام سے غافل چند روزہ زندگی کی لذتوں میں مست ہو کر جرائم کے مرتکب ہوا کرتے ہیں، اور عوام کی عادت یہ ہوتی ہے کہ بڑے لوگوں کے پیچھے چلنے اور ان کی نقل اتارنے ہی کو اپنی سعادت اور کامیابی سمجھتے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب علماء و مشائخ جو اُن کو ان کے بُرے اعمال سے روکنا اور ان کے انجام کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں یہ بڑے لوگ ان کے خلاف طرح طرح کی شرارتیں کیا کرتے ہیں، جو ظاہر میں تو ان بزرگوں کے خلاف شرارتیں اور سازشیں اور ان کی دل آزاری کا سامان ہوتا ہے، لیکن انجام کے اعتبار سے ان سب کا وبال خود انہی کی طرف لوٹتا ہے، اور اکثر دنیا میں بھی اس کا ظہور ہو جاتا ہے۔

اس ارشاد میں مسلمانوں کو اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ دنیا کے بڑوں اور رئیسوں مالداروں کی ریس نہ کریں ان کے پیچھے چلنے کی عادت چھوڑیں، انجام بینی کو شعار بنائیں اور بھلے بُرے کو خود پہچانیں۔

نیز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دینا مقصود ہے کہ رؤسائے قریش جو آپ کی مخالفت پر لگے ہوئے ہیں اس سے آپ دل گیر نہ ہوں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں، پچھلے انبیاء علیہم السلام کو بھی ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا ہے، اور انجام کار وہ رسوا اور ذلیل ہوئے اور اللہ کا کلمہ بلند ہوا۔

دوسری آیت میں انہی قریشی سرداروں کی ایک ایسی گفتگو کا ذکر ہے جو حق کے مقابلہ میں محض ہٹ دھرمی اور استہزاء و تمسخر کے انداز میں تھی، پھر اس کا جواب دیا گیا۔

امام بغوی نے بروایت قتادہ نقل کیا ہے کہ قریش کے سب سے بڑے سردار ابوجہل نے ایک مرتبہ کہا کہ بنو عبد مناف (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان) سے ہم نے ہر محاذ پر مقابلہ کیا، جس میں کبھی ہم ان سے پیچھے نہیں رہے، لیکن اب وہ یوں کہتے ہیں کہ تم شرافت و بزرگی میں ہمارا مقابلہ اس لئے نہیں کر سکتے کہ ہمارے خاندان میں ایک نبی آئے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے، پھر کہا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ ہم کبھی ان کا اتباع نہ کریں گے، جب تک خود ہمارے پاس ایسی ہی وحی نہ آنے لگے، جیسی اُن کے پاس آتی ہے، آیت مذکورہ میں وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى

اسلام میں داخل ہوگئے، اور جو نہ ہوئے تو ذلیل وخوار ہو کر ہلاک ہوئے، ابوجہل، ابولہب وغیرہ قریشی سرداروں کا حال دنیا کے سامنے آگیا، اور فتح مکہ نے ان سب کی کمریں توڑ دیں۔

دین میں شرح صدر اور اس کی علامات

تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت پانے والوں اور گمراہی پر جمے رہنے والوں کے کچھ حالات اور علامات بتلائی گئی ہیں، ارشاد فرمایا: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ، یعنی جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہتے ہیں اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں"

حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرح صدر یعنی سینہ اسلام کے لئے کھول دینے کی تفسیر دریافت کی، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مومن کے دل میں ایک روشنی ڈال دیتے ہیں جس سے اس کا دل حق بات کو دیکھنے سمجھنے اور قبول کرنے کے لئے کھل جاتا ہے، حق بات کو آسانی سے قبول کرنے لگتا ہے اور خلافِ حق سے نفرت اور وحشت ہونے لگتی ہے، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ کیا اس کی کوئی علامت بھی ہے جس سے وہ شخص پہچانا جائے جس کو شرح صدر حاصل ہوگیا ہے؟ فرمایا ہاں! علامت یہ ہے کہ اس شخص کی ساری رغبت آخرت اور اس کی نعمتوں کی طرف ہو جاتی ہے، دنیا کی بے جا خواہشات اور فانی لذتوں سے گھبراتا ہے، اور موت کے آنے سے پہلے موت کی تیاری کرنے لگتا ہے، پھر فرمایا وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ، یعنی جس شخص کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں رکھنا چاہتے ہیں اس کا دل تنگ اور سخت تنگ کر دیتے ہیں، اس کو حق بات کا قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا ایسا دشوار ہوتا ہے جیسے کسی انسان کا آسمان میں چڑھنا۔

امام تفسیر کلبی نے فرمایا کہ "اس کا دل تنگ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس میں حق اور بھلائی کے لئے کوئی رستہ نہیں رہتا" یہ مضمون حضرت فاروق اعظمؓ سے بھی منقول ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جب اللہ کا ذکر سنتا ہے تو اس کو وحشت ہونے لگتی ہے، اور جب کفر و شرک کی باتیں سنتا ہے تو ان میں دل لگتا ہے۔

صحابہ کرام کو دین میں شرح صدر حاصل تھا، اس لئے شکوک و شبہات بہت کم پیش آئے

یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جن کو حق تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت، اور بلا واسطہ شاگردی کے لئے منتخب فرمایا تھا ان کو اسلامی احکام میں شبہات اور وساوس کم سے کم پیش آئے، ساری عمر میں صحابہ کرام نے جو سوالات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے سامنے پیش کئے گئے وہ گتنے چیدہ تھے، وجہ یہ تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و ہیبت کا نقش ان کے دلوں میں بیٹھ گیا تھا، جس کے سبب ان کو شرح صدر کا مقام حاصل تھا ان کے قلوب خود بخود حق و باطل کا معیار بن گئے تھے، حق کو آسانی کے ساتھ فوراً قبول کرتے اور باطل ان کے دلوں میں راہ نہ پاتا تھا، پھر جب جوں جوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے دوری ہوتی چلی گئی شکوک و شبہات نے راہ پائی شرائع کی، عقائد کے اختلافات پیدا ہونے شروع ہوئے۔

شکوک و شبہات کے دور کرنے کا اصل ذریعہ بحث و مباحثہ نہیں بلکہ شرح صدر کی تحصیل کرنا ہے | اور آج پوری دنیا ان شکوک و شبہات کے گھیرے میں پھنسی ہوئی ہے اور بحث و مباحثہ کی راہ سے اس کو حل کرنا چاہتی ہے جو اس کا صحیح راستہ نہیں ہے

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

راستہ وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف امت نے اختیار فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کے انعامات کا استحضار کر کے اس کی عظمت و ہیبت دل میں پیدا کی جائے، تو شبہات خود بخود کافور ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ خود قرآن کریم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا مانگنے کی تلقین فرمائی ہے کہ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ، یعنی اے میرے پروردگار میرا سینہ کھول دے۔ آخر آیت میں فرمایا کَذٰلِکَ یَجْعَلُ اللّٰہُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ ایمان نہ لانے والوں پر پھٹکار ڈال دیتا ہے، اور حق بات ان کے دل میں نہیں اترتی، اور ہر برائی اور بیہودگی کی طرف دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں۔

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ
اور یہ راستہ ہے تیرے رب کا سیدھا ہم نے واضح کر دیں نشانیاں غور

يَّذَّكَّرُوْنَ ۝ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ
کرنے والوں کے واسطے ان کے لئے ہے سلامتی کا گھر اپنے رب کے ہاں اور وہ ان کا مددگار ہے

بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ
بسبب ان کے اعمال کے اور جس دن جمع کرے گا ان سب کو فرمائے گا اے جماعت

الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰۗؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ
جنات کی تم نے بہت کچھ تابع کر لئے اپنے آدمیوں میں سے، اور کہیں گے ان کے دوستدار آدمیوں میں سے

رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ۭ
اے رب ہمارے کام نکالا ہم میں ایک نے دوسرے سے اور ہم پہنچے اپنے اس وعدہ کو جو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا

قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭاِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

حکمت والا خبردار ہے

خلاصۂ تفسیر

ہاں، مگر خدا ہی کو نکالنا منظور ہو تو دوسری بات ہے لیکن یہ یقینی ہے کہ خدا کبھی نہیں چاہے گا اس کو ہمیشہ رکھو)، بیشک آپ کا رب بڑی حکمت والا اور بڑا علم والا ہے (علم سے سب کے جرائم معلوم کرتا ہے اور حکمت سے مناسب سزا دیتا ہے)۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا، یعنی "یہ راستہ تیرے رب کا ہے سیدھا"۔ اس میں لفظ ھٰذا سے بقول ابن مسعودؓ قرآن کی طرف اور بقول ابن عباسؓ اسلام کی طرف اشارہ ہے (روح)، معنی یہ ہیں کہ یہ قرآن یا شریعتِ اسلام جو آپ کو دی گئی ہے یہ راستہ آپ کے رب کا ہے، یعنی ایسا راستہ ہے جس کو آپ کے پروردگار نے اپنی حکمت بالغہ سے تجویز فرمایا اور اس کو پسند کیا ہے، اس میں راستہ کی اضافت و نسبت پروردگار کی طرف کرکے اس طرف اشارہ فرما دیا کہ قرآن اور اسلام کا جو دستور العمل آپ کو دیا گیا ہے اس پر عمل کرنا کچھ اللہ تعالیٰ کے فائدہ کے لئے نہیں بلکہ عمل کرنے والوں کے فائدہ کے لئے شانِ پروردگاری کے تقاضہ کی بناء پر ہے اس کے ذریعہ انسان کی ایسی تربیت کرنا مقصود ہے جو اس کی دائمی فلاح و بہبود کی ضامن ہو۔

پھر اس میں لفظ رب کی نسبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرکے آپ پر ایک خاص لطف و عنایت کا اظہار فرمایا گیا ہے کہ آپ کے پروردگار نے یہ راستہ تجویز فرمایا ہے، اس نسبت کا لطف اہل ذوق ہی محسوس کرسکتے ہیں کہ ایک بندہ کو اپنے رب اور معبود کی طرف کوئی ادنیٰ نسبت حاصل ہو جانا بھی اس کے لئے انتہائی فخر کی چیز ہے، اور اگر رب الارباب اور معبود کائنات اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کرے کہ میں تیرا ہوں تو اس کی قسمت کا کیا کہنا، حضرت حسن نظامیؒ اسی مقام سے فرماتے ہیں ؎

بندہ حسن بصد زبان گفت کہ بندۂ توام ؎ تو بزبانِ خود بگو کہ بندہ نواز کیستی

اس کے بعد اس قرآنی راستہ کا یہ حال لفظ مُسْتَقِيْمًا سے بیان کیا گیا کہ یہ راستہ سیدھا راستہ ہے، اس میں بھی مستقیم کو صراط کی صفت کے طور پر لانے کے بجائے حال کے طریقہ سے ذکر کرکے اس طرف اشارہ کردیا کہ جو راستہ پروردگار عالم کا تجویز کیا ہوا ہے، اس میں بجز مستقیم اور سیدھا ہونے کے اور کوئی احتمال ہو ہی نہیں سکتا (روح و بحر)

اس کے بعد فرمایا قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ، یعنی ہم نے نصیحت قبول کرنے والوں کے واسطے ان آیتوں کو صاف صاف بیان کردیا ہے۔

صرف حق جل شانہٗ کی صفت غنی ہے کہ کامل مستغنی اور بے نیازی کے باوجود وہ ذوالرحمۃ یعنی رحمت والا ہے، اس جگہ ذوالرحمۃ کے بجائے اگر رحیم یا رحمٰن کا لفظ لایا جاتا تب بھی مقصودِ کلام ادا ہو جاتا، لیکن غنی ہونے کے ساتھ صفتِ رحمت کے جوڑ کی خاص اہمیت ظاہر کرنے کے لئے عنوان ذوالرحمۃ کا اختیار فرمایا گیا کہ وہ غنی اور مکمل بے نیاز ہونے کے باوجود صفتِ رحمت بھی مکمل رکھتا ہے، اور یہی صفت رسولوں اور کتابوں کے بھیجنے کا اصل سبب ہے۔

اس کے بعد یہ بھی بتلا دیا کہ جس طرح اس کی رحمت عام اور تام ہے اسی طرح اس کی قدرت ہر چیز پر مکمل اور حاوی ہے، اگر وہ چاہے تو تم سب کو ایک آن میں فنا کر سکتا ہے، اور ساری مخلوق کے فنا کر دینے سے بھی اس کے کارخانۂ قدرت میں ادنیٰ سا فرق نہیں آتا، بلکہ اگر وہ چاہے تو موجودہ ساری کائنات کو فنا کر کے ان کی جگہ دوسری مخلوق اسی طرح اسی آن میں پیدا کر کے کھڑی کر دے، جس کی ایک نظیر انسان کے ہر دور میں اس کے سامنے رہتی ہے کہ آج جو کروڑوں انسان زمین کے چپہ چپہ پر آباد اور زندگی کے تمام شعبوں کے مختلف کاروبار کو چلا رہے ہیں، اگر آج سے ایک سال پیچھے کی طرف غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت بھی یہ دنیا اسی طرح آباد تھی اور سب کام چل رہے تھے، مگر موجودہ آباد کرنے والوں اور کام چلانے والوں میں سے کوئی نہ تھا، ایک دوسری قوم تھی جو آج زیر زمین ہے، اور جس کا آج نام و نشان بھی نہیں ملتا، اور موجودہ دنیا اسی پہلی قوم کی نسل سے پیدا کی گئی ہے، ارشاد ہے:

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَاۗءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ، یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو تم سب کو لے جائیں، لے جانے سے مراد ایسا فنا کر دینا ہے کہ نام و نشان تک گم ہو جائے، اور اسی لئے یہاں ہلاک کرنے یا مار دینے کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ یہی ارشاد فرمایا جس میں فنا محض اور بے نام و نشان کر دینے کی طرف اشارہ ہے۔

اس آیت میں حق جل شانہٗ کے غنی اور بے نیاز ہونے کا، پھر صاحبِ رحمت ہونے کا، اور پھر قدرتِ کاملہ کے مالک ہونے کا بیان کرنے کے بعد دوسری آیت میں نافرمانوں اور حکم نہ ماننے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ:

اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو جس عذاب سے ڈرایا ہے وہ ضرور آنے والا ہے، اور تم سب مل کر بھی خدائی عذاب کو نہیں ٹال سکتے۔

تیسری آیت میں پھر ان کو غفلت سے چونکانے کا ایک دوسرا طریقہ اختیار کر کے ارشاد فرمایا:

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ، جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ ان

حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ۭ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ۭ
یہاں تک کہ انہوں نے چکھا ہمارا عذاب، تو کہہ کچھ علم بھی ہے تمہارے پاس کہ اس کو ہمارے آگے ظاہر کرو

اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝ قُلْ
تم تو نرے خیال پر چلتے ہو اور صرف اٹکلیں ہی دوڑاتے ہو۔ تو کہہ دے

فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَاۗءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ قُلْ
پس اللہ کا الزام پورا ہوا، سو اگر وہ چاہتا تو ہدایت کر دیتا تم سب کو۔ تو کہہ

هَلُمَّ شُهَدَاۗءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ
لاؤ اپنے گواہ جو گواہی دیں کہ اللہ نے حرام کیا ہے ان چیزوں کو

فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَ الَّذِيْنَ
پھر اگر وہ ایسی گواہی دیں تو تو اعتبار نہ کر ان کا اور مت چل خواہشوں پر ان کی جنہوں نے

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ
جھٹلایا ہماری باتوں کو اور جو یقین نہیں کرتے آخرت کا اور وہ اپنے

بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۝
رب کے برابر کرتے ہیں اوروں کو

ع ۱۸

خلاصۂ تفسیر

یہ مشرکین یوں کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو (بطور رضا کے یہ امر) منظور ہوتا کہ ہم شرک اور تحریم نہ کریں یعنی اللہ تعالیٰ ہمارے عدم شرک و عدم تحریم کو پسند کرتے اور شرک و تحریم کو ناپسند کرتے تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا (شرک کرتے) اور نہ ہم (اور نہ ہمارے بزرگ) کسی چیز کو (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) حرام کہہ سکتے (جس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس شرک و تحریم سے ناراض نہیں، اللہ تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ یہ استدلال ان کا بس ایسا ہے کہ مستلزم تکذیب رسل کو ہے یعنی یہ لوگ رسول کی تکذیب کر رہے ہیں، اور جس طرح یہ کر رہے ہیں) اسی طرح جو کافر لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں انھوں نے بھی (رسولوں کی) تکذیب کی تھی یہاں تک کہ انھوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھا (خواہ دنیا میں جیسا اکثر کفار سابقین پر نزول عذاب ہوا اور یا مرنے کے بعد تو ظاہر ہی ہے اور یہ اشارہ ہے اس طرف کہ ان لوگوں کے کفریات کے مقابلہ

میں صرف قولی جواب اور مناظرہ پر اکتفا نہ کیا جاوے گا، بلکہ مثل کفار سابقین عملی سزا بھی دی
جاوے گی، خواہ دنیا میں بھی یا صرف آخرت میں، آگے دوسرے جواب دینے کے لئے ارشاد ہے کہ
آپ (ان سے) کہئے کہ کیا تمہارے پاس اس مقدمہ پر کہ صدور کی قدرت دینا مستلزم رضا کو
کوئی دلیل ہے، اگر ہے، تو اس کو ہمارے روبرو ظاہر کرو، حاصل یہ ہے کہ دلیل وغیرہ کچھ بھی نہیں)
تم لوگ محض خیالی باتوں پر چلتے ہو اور تم بالکل اٹکل سے باتیں کرتے ہو (اور دونوں جواب دے کر)
آپ (ان سے) کہئے کہ بس (دونوں جوابوں سے معلوم ہوگیا کہ) پوری حجت اللہ ہی کی رہی (اور تمہاری
حجت باطل ہوگئی) پھر (اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ تم سب ہدایت پاجاتے مگر اس کی توفیق خدا ہی کی طرف
سے ہے) اگر وہ چاہتا تو تم سب کو راہ راست پر لے آتا (مگر حق تعالیٰ کی بہت سی حکمتیں ہیں
کسی کو توفیق دی کسی کو نہیں دی، البتہ قدرت اور استطاعت اختیاریہ و ارادہ سب کے لئے عام ہے)۔
آگے دلیل نقلی کے مطالبہ کے لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ آپ (ان سے) کہئے کہ (اپنی دلیل عقلی کا حال
تو تم کو معلوم ہوا، اچھا اب کوئی دلیل نقلی پیش کرو، سو) اپنے گواہوں کو لاؤ جو اس بات پر
(باقاعدہ) شہادت دیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان (مذکورہ) چیزوں کو حرام کردیا ہے، (باقاعدہ شہادت وہ
ہے جو مبنی مشاہدہ پر یا ایسی دلیل قطعی پر جو قوت یقین میں برابر ہو مشاہدہ کے جیسا کہ اَمْ
كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰكُمُ اس طرف مشیر ہے) پھر اگر (اتفاق سے کسی کو فرضی جھوٹے
گواہ بنا کر لے آویں اور) وہ (گواہ) اس کی گواہی بھی دیدیں تو (چونکہ وہ شہادت یقیناً
بے قاعدہ اور محض سخن سازی ہوگی، کیونکہ مشاہدہ بھی مفقود اور مشاہدہ کا مماثل بھی مفقود
اس لئے) آپ اس شہادت کی سماعت نہ فرمایئے، اور (جب ان کا مکذب ہونا جیسا کہ آخر
اور کذالک کذب الذین من قبلہم دال ہے اور منکر آخرت ہونا جیسا بہت سی آیات دال ہیں اور مشرک
ہونا جیسا اشرکنا دال ہے، ثابت ہوگیا تو اے مخاطب) ایسے لوگوں کے باطل خیالات کا (جن کا
بطلان بھی ثابت ہوچکا) اتباع مت کرنا جو ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں اور جو آخرت
پر ایمان نہیں رکھتے (اور اسی سبب سے نڈر ہوکر حق کی تلاش نہیں کرتے) اور وہ (استحقاق معبودیت
میں اپنے رب کے برابر دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں (یعنی شرک کرتے ہیں)۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ

تو کہہ تم آؤ میں سنا دوں جو حرام کیا ہے تم پر تمہارے رب نے کہ شریک نہ کرو اس کے

شَيْـــًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ

ساتھ کسی چیز کو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور مار نہ ڈالو اپنی اولاد کو

متعلق قرآن کا فیصلہ یہ کہ اس کی معافی نہیں، اس کے سوا دوسرے گناہوں کی معافی مختلف اسباب سے ہو سکتی ہے، اسی لئے حدیث میں بروایت حضرت عبادہ بن صامتؓ و حضرت ابوالدرداءؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو ساجھی نہ قرار دو، اگرچہ تمہارے ٹکڑے کر دیئے جائیں، یا تمہیں سولی پر چڑھا دیا جائے، یا تمہیں زندہ جلا دیا جائے۔

دوسرا گناہ: والدین سے بدسلوکی ہے

اس کے بعد دوسری چیز یہ ارشاد فرمائی: وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا، یعنی والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ اور حسن سلوک کرو، مقصود تو اس جگہ یہ ہے کہ والدین کی نافرمانی نہ کرو، ان کو ایذا نہ پہنچاؤ، مگر حکیمانہ انداز سے بیان اس طرح کیا گیا کہ والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو، جس میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ والدین کے حق میں صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ ان کی نافرمانی نہ کرو اور ایذاء نہ پہنچاؤ، بلکہ حسن سلوک اور نیازمندانہ برتاؤ کے ذریعہ ان کو راضی رکھنا و خوش کرنا فرض ہے، جس کو بیان دوسری جگہ قرآن کریم میں اس طرح آیا ہے: وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ "یعنی ان کے سامنے اپنے بازو نیازمندانہ طور پر پست کرو"۔

اس آیت میں والدین کو ایذاء پہنچانے اور تکلیف دینے کو شرک کے بعد دوسرے نمبر کا جرم قرار دیا ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں ان کی اطاعت و راحت رسانی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر ارشاد فرمایا ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

"اور آپ کے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو"

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا:

اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ

"یعنی میرا شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا، پھر میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے"

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے افضل و محبوب عمل کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا نماز کو اس کے وقت (مستحب) میں پڑھنا، فرماتے ہیں کہ میں نے پھر سوال کیا کہ اس کے بعد کونسا عمل افضل ہے؟ تو فرمایا "والدین کے ساتھ حسن سلوک"، پھر پوچھا کہ اس کے بعد کونسا عمل ہے؟ فرمایا: "اللہ کے راستہ میں جہاد"۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

تین مرتبہ فرمایا رَغِمَ اَنفُهٗ، رَغِمَ اَنفُهٗ، رَغِمَ اَنفُهٗ، یعنی ذلیل ہوگیا، ذلیل ہوگیا، ذلیل ہوگیا، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ کون ذلیل ہوگیا؟ فرمایا وہ شخص جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے ایک کو بڑھاپے کے زمانہ میں پایا، پھر وہ جنت میں داخل نہ ہوا۔

مطلب یہ ہے کہ بڑھاپے کے زمانہ میں والدین کی خدمت سے جنت کا ملنا یقینی ہے، جو محروم و ذلیل ہے وہ شخص جس نے ایسی سستی جنت کو ہاتھ سے کھو دیا، اس لئے کہ والدین جو اولاد سے طبعی طور پر خود ہی بہت محبت رکھتے ہیں وہ ذرا سی خدمت سے بہت خوش ہو جاتے ہیں ان کا خوش رکھنا کوئی بڑے عمل کا محتاج نہیں، اور بڑھاپے کی قید اس لئے کہ جس وقت والدین تندرست اور قوی ہیں، اور اپنی ضروریات خود پوری کرتے ہیں بلکہ اولاد کی بھی مالی و جانی امداد کر دیتے ہیں، اس وقت تو نہ وہ اولاد کی خدمت کے محتاج ہیں نہ ان کی خدمت کا کوئی خاص وزن ہے، قابل قدر خدمت اس وقت ہی ہو سکتی ہے جبکہ وہ بڑھاپے کی وجہ سے محتاج ہوں۔

تیسرا حرام قتل اولاد تیسری چیز جس کا حرام ہونا ان آیات میں بیان ہوا ہے وہ قتل اولاد ہے، اور مناسبت یہ ہے کہ اس سے پہلے ماں باپ کے حق کا بیان تھا جو اولاد کے ذمہ ہے اور اس میں اولاد کے حق کا بیان ہے جو ماں باپ کے ذمہ ہے، اولاد کے ساتھ بدسلوکی کا بدترین درجہ وہ تھا جو جاہلیت میں اس کو زندہ درگور کرنے یا قتل کرنے کا جاری تھا، اس آیت میں اس سے روکا گیا ارشاد فرمایا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ یعنی افلاس کی وجہ سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، ہم تم کو بھی رزق دیں گے اور ان کو بھی۔

جاہلیت کے زمانہ میں یہ بھی سنگدلی کی بدترین رسم چل پڑی تھی کہ جس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو اس عار کے خوف سے کہ کسی کو داماد بنانا پڑے گا زندہ کو گڑھے میں دفن کر دیتے تھے، اور بعض اوقات اس خوف سے کہ اولاد کے لئے ضروریات زندگی کھانے پینے کا سامان جمع کرنے میں دقت پیش آئے گی یہ سنگدل لوگ اپنے بچوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیتے تھے، قرآن کریم نے اس رسم کو مٹایا، اور رشد و ہدایت کے طور پر اس میں ان کے اس ذہنی مرض کا بھی علاج کر دیا جس کے سبب وہ اس بدترین جرم کے مرتکب ہوتے تھے کہ بچوں کو کھانا کہاں سے کھلائیں گے، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتلا دیا کہ کھلانے اور رزق پہنچانے کے اصل ذمہ دار تم نہیں، یہ کام براہ راست حق تعالیٰ کا ہے، تم خود اپنے رزق اور کھانے پینے میں بھی اسی کے محتاج ہو، وہ دیتا ہے تو تم بچوں کو بھی دیتے ہو، وہ اگر تمہیں نہ دے تو تمہاری کیا مجال ہے کہ ایک دانہ گیہوں یا چاول کا خود پیدا کر لو، جس کے اندر سے بیج کو ایک کونپل کی صورت میں زمین کو چیر پھاڑ کر نکالنا پھر اس کو درخت کی صورت دینا، پھر اس پر پھل پھول لگانا کس کا کام ہے؟

تاکہ تم سمجھو۔"

چوتھا حکم یتیم کا مال ناجائز طور پر کھانا

دوسری آیت میں چوتھا حکم یتیم کا مال ناجائز طور پر کھانے کی حرمت کے متعلق ارشاد فرمایا: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۔

"یعنی یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو مستحسن ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جائے" اس میں یتیموں کے اولیاء اور اوصیاء کو خطاب ہے کہ وہ ان کے مال کو ایک آگ سمجھیں اور ناجائز طور پر اُس کے کھانے اور لینے کے پاس بھی نہ جائیں جیسا کہ دوسری ایک آیت میں انہی الفاظ کے ساتھ آیا ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں۔

البتہ یتیم کے مال کی حفاظت کرنا اور کسی ایسی جائز تجارت یا کاروبار میں لگا کر بڑھانا جس میں نقصان کا خطرہ عادۃً نہ ہو، یہ طریقہ مستحسن و ضروری ہے، یتیموں کے ولی کو ایسا کرنا چاہئے۔

اس کے بعد مال یتیم کی حفاظت کی ذمہ داری کی حد بتلادی حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ، یعنی یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہونچ جائے تو ولی کی ذمہ داری ختم ہوگئی اس کا مال اس کے سپرد کر دیا جائے۔

لفظ اشد کے اصلی معنی قوت کے ہیں اور اس کی ابتداء جمہور علماء کے نزدیک بالغ ہوجانے سے ہوجاتی ہے، جس وقت بچے میں آثار بلوغ پائے جائیں یا اس کی عمر پندرہ سال کی پوری ہو جائے، **اس وقت اس کو شرعاً بالغ قرار دیا جائے گا۔**

البتہ بالغ ہوجانے کے بعد یہ دیکھا جائے گا کہ اس میں اپنے مال کی حفاظت اور صحیح مصرف میں خرچ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے یا نہیں، اگر صلاحیت دیکھی جائے تو بالغ ہوتے ہی اس کا مال اس کے سپرد کر دیا جائے، اور اگر یہ صلاحیت ابھی اس میں موجود نہیں تو پچیس سال کی عمر تک مال کی حفاظت ولی کے ذمہ ہے، اس درمیان میں جس وقت بھی اس کو مال کی حفاظت اور کاروبار کی لیاقت پیدا ہوجائے تو مال اس کو دیا جاسکتا ہے، اور اگر پچیس سال تک بھی اس میں یہ صلاحیت پیدا نہ ہو تو پھر امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کا مال بہرحال اس کو دیدیا جائے، بشرطیکہ اس کی یہ عدم صلاحیت دیوانگی اور جنون کی حد تک نہ پہونچی ہو، اور بعض ائمہ کے نزدیک اس وقت بھی مال اس کو سپرد نہ کیا جائے، بلکہ قاضی شرعی اس کے مال کی حفاظت کسی ذمہ دار آدمی کے سپرد کردے۔

یہ مضمون قرآن مجید کی ایک دوسری آیت سے ماخوذ ہے جس میں فرمایا ہے: فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ، یعنی یتیم بچوں میں بالغ ہونے کے بعد اگر تم یہ صلاحیت دیکھو کہ وہ اپنے مال کی خود حفاظت کرسکتے ہیں اور کسی کاروبار میں لگا سکتے ہیں تو ان کا مال ان کے سپرد کردو، اس آیت نے بتلا دیا کہ صرف بالغ ہونا مال سپرد کرنے کے لئے کافی

متعلق ابوداؤد اور ابن ماجہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ:

"جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے، تین مرتبہ فرمایا اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ یعنی بت پرستی کے گندہ عقیدہ سے بچو اور جھوٹ بولنے سے، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناتے ہوئے"

اسی طرح حق کے خلاف فیصلہ کرنے کے بارے میں ابوداؤد نے بروایت حضرت بریدہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ:

"قاضی یعنی عدالت کا فیصلہ کرنے والے تین قسم کے ہیں، ان میں سے ایک جنت میں جائے گا، اور دو جہنم میں، جس نے معاملہ کی تحقیق شریعت کے موافق کر کے حق کو پہچانا، پھر حق کے مطابق فیصلہ کیا وہ جنتی ہے اور جس نے تحقیق کر کے حق بات کو پا لیا مگر جان بوجھ کر فیصلہ اس کے خلاف کیا وہ دوزخی ہے، اور اسی طرح وہ قاضی جس کو علم نہ ہو یا تحقیق اور غور و فکر میں کمی کی اور جہالت سے کوئی فیصلہ دیدیا وہ بھی جہنم میں جائے گا"

قرآن مجید کی دوسری آیات میں اسی مضمون کو اور بھی زیادہ وضاحت اور تاکید سے بیان فرمایا گیا کہ شہادت یا فیصلہ میں کسی کی دوستی، قرابت، یا تعلق کا یا دشمنی اور مخالفت کا کوئی اثر نہ ہونا چاہئے، جیسے ایک جگہ ارشاد ہے: وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ، یعنی حق بات اگرچہ خود تمہارے خلاف یا والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے خلاف ہو اس کے کہنے میں رکاوٹ نہ ہونی چاہئے"

اسی طرح ایک دوسری آیت میں حکم ہے: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا، یعنی کسی قوم کی دشمنی تمہیں انصاف کے خلاف گواہی دینے یا فیصلہ کرنے پر آمادہ نہ کر دے" اور گواہی اور فیصلہ کے علاوہ آپس کی گفتگوؤں میں حق و انصاف قائم رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں جھوٹ نہ بولے، کسی کی غیبت نہ کرے، ایسی بات نہ بولے جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچے، یا کسی کو جانی یا مالی نقصان پہنچے۔

نواں حکم اللہ کے عہد کو پورا کرنا، یعنی عہد شکنی کا حرام ہونا

نواں حکم اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرنے اور عہد شکنی سے بچنے کا ہے، ارشاد فرمایا، وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا، یعنی اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرو، اللہ کے عہد سے مراد وہ عہد بھی ہو سکتا ہے جو ازل میں ہر انسان سے لیا گیا جس میں سب انسانوں سے کہا گیا تھا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ "کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟"

سب نے جواب دیا تھا بَلٰی یعنی بیشک آپ ہمارے رب ہیں، اور رب و پروردگار ہونے کا مقتضٰی یہی ہے
کہ پروردگار کے ہر حکم کی اتباع کریں، جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان کو سارے کاموں
سے مقدم اور اہم جانیں، اور جن کاموں سے منع فرمایا ہے ان کے پاس بھی نہ جائیں، اور ان کے
شبہات سے بھی بچتے رہیں، خلاصہ اس عہد کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت کریں۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خاص خاص عہد جن کا ذکر قرآن کے مختلف مواقع میں فرمایا
گیا ہے، مراد ہوں، اور منجملہ ان کے یہ تین آیتیں بھی ہیں جن کی تفسیر آپ دیکھ رہے ہیں (جن میں
دس احکام تاکید کے ساتھ بیان فرمائے گئے ہیں)۔

علماء نے فرمایا کہ اس عہد میں نذر و منت کو پورا کرنا بھی داخل ہے جو ایک انسان اپنی
طرف سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتا ہے کہ فلاں کام کروں گا یا نہیں کروں گا، (قرآن مجید کی ایک
دوسری آیت میں اس کی صراحۃً بھی ذکر فرمایا ہے یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ، یعنی اللہ کے نیک بندے
اپنی منتوں کو پورا کیا کرتے ہیں"

(خلاصہ یہ ہے کہ یہ نواں حکم شمار میں تو نواں حکم ہے، مگر حقیقت کے اعتبار سے تمام احکام
شرعیہ واجبات اور ممنوعات سب پر حاوی ہے)۔

اس دوسری آیت کے آخر میں فرمایا ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ، یعنی
ان کاموں کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔

تیسری آیت میں دسواں حکم مذکور ہے وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا
تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ، یعنی یہ دین محمدی میرا سیدھا راستہ ہے، سو اس راہ
پر چلو، اور دوسری راہوں پر مت چلو، کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی"۔

اس میں لفظ ہٰذا کا اشارہ دین اسلام یا قرآن کی طرف ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سورہ
انعام کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ اس میں بھی پورے اصولِ اسلام، توحید، رسالت اور اصول احکام
شرعیہ مذکور ہیں (اور مستقیماً، دین کے اس راستہ کی صفت ہے جس کو نحوی ترکیب میں بصورت
حال ذکر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ دینِ اسلام کے لئے مستقیم ہونا لازمی وصف ہے
اس کے بعد فرمایا فَاتَّبِعُوْهُ یعنی جب یہ معلوم ہو گیا کہ دینِ اسلام میرا راستہ ہے اور وہی مستقیم
اور سیدھا راستہ ہے تو اب منزل مقصود کا سیدھا راستہ ہاتھ آ گیا، اس لئے صرف اسی راستہ پر چلو)۔

پھر فرمایا وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ، سُبُل، سبیل کی جمع ہے، اس
کے معنی بھی راستہ کے ہیں، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے اور اس کی رضا حاصل کرنے کا اصلی راستہ
تو ایک ہی ہے لیکن دنیا میں لوگوں نے اپنے اپنے خیالات سے مختلف راستے بنا رکھے ہیں، تم ان

راستوں میں سے کسی راستہ پر نہ چلو، کیونکہ یہ راستے حقیقت میں خدا تعالیٰ تک پہونچنے کے نہیں ہیں، اس لئے جو ان راستوں پر چلے گا وہ اللہ کے راستہ سے دُور جا پڑے گا۔

تفسیر مظہری میں فرمایا ہے کہ قرآن کریم نازل کرنے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجنے کا منشاء تو یہ ہے کہ لوگ اپنے خیالات اور اپنے ارادوں اور تجویزوں کو قرآن وسنت کے تابع کریں، اور اپنی زندگیوں کو ان کے سانچہ میں ڈھالیں، لیکن ہو یہ رہا ہے کہ لوگوں نے قرآن و سنت کو اپنے خیالات اور تجویزات کے سانچہ میں ڈھالنے کی ٹھان لی، جو آیت یا حدیث اپنے منشاء کے خلاف نظر آئی اس کو تاویلیں کرکے اپنی خواہش کے مطابق بنالی، یہیں سے دوسری گمراہ کن راہیں پیدا ہوتی ہیں، جو بدعات اور شبہات کی راہیں ہیں، انھی سے بچنے کے لئے اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے۔

مسند دارمی میں بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سیدھا خط کھینچا اور فرمایا کہ یہ اللہ کا راستہ ہے، پھر اس کے داہنے بائیں اور خطوط کھینچے اور فرمایا کہ یہ سُبُل ہیں، (یعنی وہ راستے جن پر چلنے سے اس آیت میں منع فرمایا ہے) اور فرمایا کہ ان میں سے ہر راستہ پر ایک شیطان مسلط ہے، جو لوگوں کو سیدھے راستہ سے ہٹا کر اس طرف بلاتا ہے، اور اس کے بعد آپ نے استدلال کے طور پر اس آیت کو تلاوت فرمایا۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کا تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم احتیاط رکھو۔

تینوں آیتوں کی تفسیر اور ان میں بیان کئے ہوئے دس اصول محرمات کا بیان پورا ہوگیا، آخر میں قرآن کریم کے اس اسلوب بیان پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے، کہ اس جگہ دس احکام بیان کئے تھے، ان کو آجکل کی کتب قانون کی طرح دس دفعات میں نہیں لکھ دیا، بلکہ پہلے پانچ حکم بیان کرنے کے بعد فرمایا ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ، اور پھر اور چار حکم بیان فرمانے کے بعد پھر اسی جملہ کو دوبارہ اس فرق کے ساتھ ذکر کیا کہ تَعْقِلُوْنَ کے بجائے تَذَكَّرُوْنَ فرمایا، اور پھر آخری حکم ایک مستقل آیت میں بیان فرماکر پھر اُسی جملہ کا اعادہ اس فرق کے ساتھ کیا کہ تَذَكَّرُوْنَ کے بجائے تَتَّقُوْنَ فرمایا۔

قرآن کریم کے اس حکیمانہ اسلوب بیان میں بہت سی حکمتیں ہیں۔

اوّل یہ کہ قرآن کریم عام دنیا کے قوانین کی طرح محض حاکمانہ قانون نہیں، بلکہ مربیانہ قانون ہے، اسی لئے ہر قانون کے ساتھ اس کو آسان کرنے کی تدبیر بھی بتلائی جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اور فکرِ آخرت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو قانون کی پابندی پر خلوت و جلوت

میں پورا کرنے والا ہے، اسی لئے تینوں آیتوں کے آخر میں ایسے کلمات لائے گئے جن سے انسان کا رُخ مادی دنیا سے پھر کر اللہ تعالیٰ اور آخرت کی طرف ہو جائے۔

پہلی آیت میں جو پانچ احکام بیان کئے گئے ہیں شرک سے بچنا، والدین کی نافرمانی سے بچنا، قتلِ اولاد سے بچنا، بے حیائی کے کاموں سے بچنا، کسی کا ناحق خون کرنے سے بچنا، ان کے آخر میں تو لفظ تَعْقِلُوْنَ استعمال فرمایا، کیونکہ زمانۂ جاہلیت والے ان چیزوں کو کوئی عیب ہی نہ جانتے تھے، اس لئے اشارہ کیا گیا کہ آبائی رسموں اور جذبوں کو چھوڑ کر عقل سے کام لو۔

دوسری آیت میں چار احکام بیان ہوئے ہیں، یعنی مالِ یتیم کو ناحق نہ کھانا، ناپ تول میں کمی نہ کرنا، بات کہنے میں حق و صدق کا لحاظ رکھنا اور اللہ کے عہد کو پورا کرنا۔

یہ چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے ضروری ہونے کو تو یہ جاہل بھی جانتے تھے، اور ان میں کچھ لوگ عمل بھی کرتے تھے، مگر اکثر ان میں غفلت برتی جاتی تھی، اور غفلت کا علاج ہے تذکرہ، یعنی خدا و آخرت کی یاد، اس لئے اس آیت کے آخر میں لفظ تَذَکَّرُوْنَ فرمایا۔

تیسری آیت میں صراطِ مستقیم کو تسلیم کرنے اور اس کے خلاف دوسری راہوں سے بچنے کی ہدایت ہے، اور صرف خوفِ خدا ہی ایسی چیز ہے جو انسان کو اپنے خیالات و خواہشات سے باز رکھنے کا صحیح ذریعہ بن سکتی ہے، اس لئے اس کے آخر میں لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ارشاد فرمایا۔

اور تینوں جگہ لفظ وصیت کا لایا گیا، جو تاکیدی حکم کو کہا جاتا ہے، اسی لئے بعض صحابہ کرام نے فرمایا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مُہر کیا ہوا وصیت نامہ دیکھنا چاہے وہ یہ تین آیتیں پڑھ لے۔

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا

پھر دی ہم نے موسیٰ کو کتاب واسطے پورا کرنے نعمت کے نیک کام والوں پر اور واسطے

لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

تفصیل ہر شے کے اور ہدایت اور رحمت کے لئے تاکہ وہ لوگ اپنے رب کے ملنے کا یقین کریں،

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ

اور ایک یہ کتاب ہے کہ ہم نے اتاری برکت والی سو اس پر چلو اور ڈرتے رہو تاکہ تم پر

تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰي طَاۗىِٕفَتَيْنِ

رحمت ہو، اس واسطے کہ کبھی تم کہنے لگو کہ کتاب جو اتری تھی سو انہی دو فرقوں پر

۱۹ ع

کمال حاصل کرکے ثواب کے مستحق ہوتے سو اب دیکھو، اب تمہارے پاس کوئی عذر نہیں رہا، تمہارے پاس بھی تمہارے رب کے پاس سے ایک کتاب روشن کے احکام واضح ہیں اور وہ موجب راہنمائی کا ذریعہ ہے، اور خدا کی رحمت ہے، آچکی ہے سو (ایسی کافی شافی کتاب آنے کے بعد) اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو ہماری ان آیتوں کو جھوٹا بتلادے اور (دوسروں کو بھی) اس سے روکے، ہم ابھی (آخرت میں) ان لوگوں کو جو کہ ہماری آیتوں سے روکتے ہیں ان کو اس روکنے کے سبب سخت سزا دیں گے (یعنی اس روکنے سے بڑھی ورنہ صرف تکذیب بھی موجب سزا ہے)۔

معارف و مسائل

وجہ غفلت یہ نہیں کہ تورات و انجیل لغت عرب میں نہ تھی، کیونکہ ترجمہ کے ذریعہ مضامین کی اطلاع ممکن اور بسہولت تھی، بلکہ وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب نے اہل عرب کی تعلیم و توحید کا کبھی اہتمام نہیں کیا، اور اتفاقاً کان میں کوئی مضمون پڑجانا اور تنبہ میں کم مؤثر ہے، گو اس قدر تنبہ پر طلب و تامل واجب ہو جاتا ہے، اور اسی بناء پر ترک توحید پر عذاب ممکن تھا، اور اس سے عموم بعثت موسویہ و عیسویہ کا شبہ لازم نہیں آتا، کیونکہ اختصاص اس عموم کا ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باعتبار مجموعہ اصول و فروع کے ہے، ورنہ اصول میں سب انبیاء کا اتباع سب خلائق پر واجب ہے، پس اس بناء پر عذاب صحیح ہوتا، لیکن یہ عذر بادی النظر میں پیش کیا جاسکتا تھا، اب اس کی بھی گنجائش نہ رہی اور حجت تامہ ہوگئی۔

اور دوسرا قول لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ کے متعلق ایک سوال وجواب باعتبار حیثیت اہل فترت کے سورۂ مائدہ کے رکوع سوم کے آخر میں گذر چکا ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ
کاہے کی راہ دیکھتے ہیں لوگ مگر یہی کہ ان پر آئیں فرشتے یا آئے تیرا رب

اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا
یا آئے کوئی نشانی تیرے رب کی جس دن آئے گی نشانی تیرے رب کی کام نہ

يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ
آئے گا کسی کے اس کا ایمان لانا جو کہ پہلے سے ایمان نہ لایا تھا یا اپنے ایمان

فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ۭ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝
میں کچھ نیکی نہ کی تھی تو کہہ دے تم راہ دیکھو ہم بھی راہ دیکھتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

یہ لوگ (جو کہ باوجود نزول کتاب و بینات و وضوح حق کے بھی ایمان نہیں لاتے تو یہ ایمان لانے کے لئے) صرف اس امر کے منتظر معلوم ہوتے ہیں (یعنی ایسا توقف کر رہے ہیں جیسے کوئی انتظار کر رہا ہو) کہ ان کے پاس فرشتے آویں یا ان کے پاس آپ کا رب آوے (جیسا قیامت میں حساب کے وقت واقع ہوگا) یا آپ کے رب کی کوئی بڑی نشانی (منجملہ قیامت کی نشانیوں کے) آوے (مراد اس بڑی نشانی سے آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا ہے، مطلب یہ ہوا کہ کیا ایمان لانے میں قیامت کے وقوع یا قرب کا انتظار ہے سو ان کے متعلق سن رکھیں کہ) جس روز آپ کے رب کی ایک بڑی نشانی (مذکور) آپہنچے گی (اس روز) کسی ایسے شخص کا ایمان اس کے کام نہ آوے گا جو پہلے سے ایمان نہیں رکھتا ہو (بلکہ اس روز ایمان لایا ہو) یا (ایمان تو پہلے سے بھی رکھتا ہو لیکن) اس نے اپنے ایمان میں کوئی نیک عمل نہ کیا ہو (بلکہ اعمال بد و گناہ میں مبتلا ہو، وہ اس روز ان سے توبہ کرکے عمل نیک شروع کرے تو اس کی توبہ قبول نہ ہوگی اور اس سے قبل اگر معاصی سے توبہ کرتا تو ایمان والے کی برکت سے توبہ قبول ہو جاتی، تو قبول توبہ منجملہ منافع ایمان کے ہے، اس وقت ایمان نے یہ نفع نہ دیا، پس جب علامت قیامت مانع ہوگئی قبول ایمان و توبہ سے تو خاص وقوع قیامت تو بدرجہ اولیٰ مانع ہوگا، پھر انتظار کا ہے کا، اور اگر اس توبیخ پر بھی ایمان نہ لاویں تو) آپ (بطور تہدید بلیغ کے یہ) فرما دیجئے کہ (خیر بہتر) تم (ان امور کے) منتظر رہو (اور مسلمان نہیں ہوتے تو مت ہو) ہم بھی (ان امور کے) منتظر ہیں (اس وقت تم پر مصیبت پڑے گی اور ہم مومن انشاء اللہ تعالیٰ ناجی ہوں گے)۔

معارف و مسائل

سورۂ انعام کا اکثر حصہ اہل مکہ اور مشرکین عرب کے عقائد اور اعمال کی اصلاح اور ان کے شبہات اور سوالات کے جواب میں نازل ہوا ہے۔

آیت مذکورہ اور سورت کی پچھلی آیات میں مکہ اور عرب کے باشندوں پر واضح کر دیا گیا کہ تم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات و بینات دیکھ چکے، پچھلی کتابوں اور پہلے انبیاء کی پیشینگوئیاں آپ کے متعلق سن چکے، اور ایک امی شخص کی زبان سے قرآن کی آیات بینات سن چکے جو بجائے خود ایک مستقل معجزہ بن کر آیا، سب حق و صدق کی راہیں تمہارے سامنے کھل چکیں، اور خدا تعالیٰ کی حجت تم پر تمام ہو چکی، اب ایمان لانے میں کس چیز کا انتظار ہے۔

قرآن مجید کی بے شمار آیات میں مذکور ہے کہ اہل دوزخ دوزخ میں پہونچ کر فریاد کریں گے، اور بڑے بڑے وعدے کریں گے کہ اگر ہمیں اب دنیا میں دوبارہ لوٹا دیا جائے تو ہم ایمان اور عمل صالح کے سوا کچھ نہ کریں گے، مگر سب کا جواب یہی ہوگا کہ ایمان و عمل کا وقت ختم ہوچکا، اور اب جو **کچھ کہہ رہے ہو مجبور ہو کر کہہ رہے ہو اس کا اعتبار نہیں۔**

اسی آیت کی تفسیر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ جس وقت قیامت کی آخری نشانیوں میں یہ نشانی ظاہر ہوگی کہ آفتاب مشرق کے بجائے مغرب کی جانب سے طلوع ہوگا، تو اس کو دیکھتے ہی سارے جہان کے کافر ایمان کا کلمہ پڑھنے لگیں گے اور سارے نافرمان فرمانبردار بن جائیں گے، لیکن اس وقت کا ایمان اور توبہ قابل قبول نہ ہوگا (بغوی بسندہ **عن ابی ہریرۃؓ**)

اس آیت میں اتنی بات تو قرآنی تصریح سے معلوم ہوگئی کہ بعض نشانیاں ایسی واقع ہوں گی جن کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا، کسی کافر یا فاسق کی توبہ قبول نہ ہوگی، لیکن قرآن کریم نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی کہ وہ کونسی نشانی ہے۔

صحیح بخاری میں اس آیت کی تفسیر میں بروایت ابوہریرہؓ یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ **صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:**

> ”قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک یہ واقعہ پیش نہ آجائے کہ آفتاب مغرب کی طرف سے طلوع ہو، جب لوگ یہ نشانی دیکھیں گے تو سب ایمان لے آئیں گے، یہی وہ وقت ہوگا جس کے متعلق قرآن میں یہ ارشاد ہے کہ اس وقت **کسی نفس کو ایمان لانا نفع نہیں دے گا۔**“

اسی تفسیر صحیح مسلم میں بروایت حذیفہ ابن اسیدؓ اس طرح نقل کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام علامات قیامت کا تذکرہ آپس میں کر رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، اس وقت آپ نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو، آفتاب کا جانب مغرب سے نکلنا، اور ایک خاص قسم کا دھواں، اور دابۃ الارض اور یاجوج ماجوج کا نکلنا، حضرت عیسیٰؑ کا نازل ہونا، دجال کا نکلنا، اور تین جگہ خسوف یعنی زمین کا دھنس جانا، ایک مشرق میں، ایک مغرب میں، ایک جزیرۃ العرب میں، اور ایک آگ جو عدن کے قعر سے نکلے گی اور لوگوں کو آگے آگے ہنکا کر لے چلے گی۔

اور مسند احمد میں بروایت ابن عمرؓ منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان آیات میں سب سے پہلے مغرب کی طرف سے طلوع آفتاب اور دابۃ الارض کا نکلنا واقع ہوگا۔

الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ

اُن میں سے کسی کی موت آجائے تو کہتا ہو کہ میں اب توبہ کرتا ہوں"

اور اسی کی تشریح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ تَوْبَةَ الْعَبْدِ تُقْبَلُ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ۔

"یعنی بندہ کی توبہ اُس وقت تک قبول ہوتی رہتی ہے جب تک اس کی رُوح حلق میں آکر غرغرۂ موت کی صورت پیدا نہ ہوجائے"

اس سے معلوم ہوا کہ نزع رُوح کے وقت جب سانس آخری ہو اُس وقت بھی چونکہ فرشتے موت کے سامنے آجاتے ہیں اُس وقت بھی توبہ قبول نہیں ہوتی، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال بھی اللہ کی طرف سے ایک علامت و نشانی ہے، اس لئے آیتِ مذکورہ میں بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ میں یہ موت کا وقت بھی داخل ہے، جیسا کہ تفسیر بحر محیط میں بعض علماء کا یہ قول نقل بھی کیا ہے، اور بعض بزرگوں نے فرمایا ہے: مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ، یعنی جو شخص مرگیا اس کی قیامت تو اسی وقت قائم ہوگئی، کیونکہ دارالعمل ختم ہوا اور جزاء و سزاء اعمال کا کچھ نمونہ قبر ہی سے شروع ہوگیا، صائب نے اسی مضمون کو نظم کیا ہے ؎

توبہ با نفسِ بازپسیں دست نداد ؎ بخیہ دیر رسیدی در محمل بستند

یہاں عربی زبان کے اعتبار سے یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ اس آیت میں پہلے فرمایا اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ اور پھر اسی جملہ کا اعادہ کرکے فرمایا يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا، اس میں ضمیر سے کام لے کر کلام کو مختصر نہیں کیا گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کلمہ میں جو بَعْضُ آیات مذکور ہیں وہ اور ہیں اور دوسرے کلمہ کی بَعْضُ آیات اس سے مختلف ہیں، اس سے اس تفصیل کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے جو ابھی آپ نے بروایت حذیفہ بن اُسید ؓ سنی ہے کہ قیامت کی دس نشانیاں بہت اہم ہیں، ان میں سے آخری نشانی مغرب سے طلوعِ آفتاب کی جو انقطاعِ توبہ کی علامت ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ، اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے، کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اللہ کی ساری حجتیں پوری ہوجانے کے بعد بھی اگر تمہیں موت یا قیامت کا انتظار ہے تو یہ انتظار کرتے رہو، ہم بھی اسی کا انتظار کریں گے کہ تمہارے ساتھ تمہارے رب کا کیا معاملہ ہوتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي

جنہوں نے راہیں نکالیں اپنے دین میں اور ہو گئے بہت سے فرقے، تجھ کو ان سے کچھ

شَيْءٍ ۚ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (۱۵۹)

سروکار نہیں، ان کا کام اللہ ہی کے حوالے ہے پھر وہی جتلاوے گا ان کو جو کچھ وہ کرتے تھے

مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۖ وَمَن جَاءَ

جو کوئی لاتا ہے ایک نیکی تو اس کے لئے ہے اس کا دس گنا اور جو کوئی لاتا ہے

بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۱۶۰)

ایک برائی سو سزا پاوے گا اسی کے برابر اور ان پر ظلم نہ ہوگا

خلاصۂ تفسیر

بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو (جس کے وہ مکلف ہیں) جدا جدا کر دیا (یعنی دین حق کو تمام مقبول نہیں کیا خواہ سب کو چھوڑ دیا یا بعض کو اور طریقے شرک و کفر و بدعت کے اختیار کرلئے) اور (مختلف) گروہ گروہ بن گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں (یعنی آپ ان سے بری ہیں، آپ پر کوئی الزام نہیں) بس (وہ خود اپنے نیک و بد کے ذمہ دار ہیں اور) ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے (وہ دیکھ بھال رہے ہیں) پھر (قیامت میں) ان کو ان کا کیا ہوا جتلا دیں گے (اور حجت تمام کرکے مستحق عذاب ظاہر کردیں گے) جو شخص نیک کام کرے گا اس کو (اقل درجہ) اس کے دس حصے ملیں گے (یعنی ایسا سمجھا جاوے گا کہ گویا وہ نیکی دس بار کی اور نیز ایک نیکی پر جس قدر ثواب ملتا اب دس حصے ویسے ثواب کے ملیں گے) اور جو شخص برا کام کرے گا سو اس کو اس کے برابر ہی سزا ملے گی (زیادہ نہ ملے گی) اور ان لوگوں پر ظلم نہ ہوگا (کہ کوئی نیکی درج نہ ہو یا کوئی بدی زیادہ کرکے لکھ لی جاوے)۔

معارف ومسائل

سورۂ انعام کا بیشتر حصہ مشرکین مکہ کے خطاب اور ان کے سوال و جواب کے متعلق آیا ہے جس میں ان کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کا سیدھا راستہ صرف قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں منحصر ہے، جس طرح آپ سے پہلے انبیاء کے زمانہ میں ان کا اور ان کی کتب و شریعت کا اتباع مدار نجات تھا، اب صرف آپ کی اور آپ کی شریعت

کی پیروی میں نجات ہے عقل سے کام لو اور اس سیدھے راستے کو چھوڑ کر دائیں بائیں کے غلط راستوں کو اختیار نہ کرو، ورنہ وہ راستے تمہیں خدا تعالیٰ سے دور کر دیں گے۔

مذکورہ آیت سے پہلی آیت میں عام خطاب تھا جس میں مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب داخل ہیں، ان سب کو خطاب کر کے اللہ کے سیدھے راستے سے منحرف ہونے والوں کا انجام بد بیان کیا گیا تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپ کا ان غلط راستوں پر چلنے والوں سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے، پھر ان میں غلط راستے وہ بھی ہیں جو صراط مستقیم سے بالکل مخالف جانب لے جانے والے ہیں، جیسے مشرکین اور اہل کتاب کے راستے، اور وہ راستے بھی ہیں جو مخالف جانب میں تو نہیں مگر سیدھے راستے سے ہٹا کر دائیں بائیں لے جانے والے ہیں، وہ شبہات اور بدعات کے راستے ہیں، وہ بھی انسان کو گمراہی میں ڈال دیتے ہیں۔

ارشاد فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ "یعنی وہ لوگ جنہوں نے راہیں نکالیں اپنے دین میں اور ہو گئے بہت سے فرقے، تجھ کو ان سے کچھ سروکار نہیں، ان کا کام اللہ ہی کے حوالے ہے، پھر وہی جتلا دے گا ان کو جو کچھ وہ کرتے تھے"۔

اس آیت میں غلط راستوں پر پڑنے والوں کے متعلق اول تو یہ بتلا دیا کہ اللہ کا رسول ان سے بری ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا کوئی تعلق نہیں، پھر ان کو یہ وعید شدید سنائی کہ ان کا معاملہ بس خدا تعالیٰ کے حوالے ہے وہی ان کو قیامت کے روز سزا دیں گے۔

دین میں تفریق ڈالنا اور فرقے بن جانا جو اس آیت میں مذکور ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ اصول دین کے اتباع کو چھوڑ کر اپنے خیالات اور خواہشات کے مطابق یا شیطانی مکر و تلبیس میں مبتلا ہو کر دین میں کچھ نئی چیزیں بڑھا دے یا بعض چیزوں کو چھوڑ دے۔

دین میں بدعت پیدا کرنے پر وعید شدید

تفسیر مظہری میں ہے کہ اس میں پچھلی امتوں کے لوگ بھی داخل ہیں جنہوں نے اپنے اصول دین کو ترک کر کے اپنی طرف سے کچھ چیزیں ملا دی تھیں اور اس امت کے اہل بدعت بھی جو دین میں اپنی طرف سے بے بنیاد چیزوں کو شامل کرتے رہتے ہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اس مضمون کو اس طرح واضح فرمایا ہے کہ:-

"میری امت کو بھی وہی حالات پیش آویں گے جو بنی اسرائیل کو پیش آئے، جس طرح کی بداعمالیوں میں وہ مبتلا ہوئے میری امت کے لوگ بھی مبتلا ہوں گے، بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے، میری امت کے تہتر فرقے موجود ہوں گے جن میں سے ایک فرقہ کے علاوہ سب دوزخ میں جائیں گے، صحابہ کرام نے

بتلایا کہ وہ نجات پانے والا فرقہ وہ ہے جو فرمایا مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ،
یعنی وہ جماعت جو میرے طریقہ پر اور میرے صحابہ کے طریقہ پر چلے گی وہ نجات پائے گی
(اس روایت کو ترمذی اور ابوداؤد نے بروایت ابن عمرؓ نقل کیا ہے)۔

اور طبرانی نے بسند معتبر حضرت فاروق اعظمؓ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اس آیت میں جن فرقوں کا ذکر ہے وہ اہل بدعت اور اپنی خواہشات و خیالات کے تابع نئے طریقے ایجاد کرنے والے ہیں، یہی مضمون حضرت ابوہریرہؓ سے صحیح سند کے ساتھ منقول ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں نئے نئے طریقے اپنی طرف سے ایجاد کرنے کو بڑی تاکید کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

امام احمد، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ نے بروایت عرباض بن ساریہؓ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بہت اختلافات دیکھیں گے، اس لئے میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ تم میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے پکڑے رہو اسی کے مطابق ہر کام میں عمل کرو، نئے نئے طریقوں سے بچتے رہو، کیونکہ دین میں نئی پیدا کی ہوئی ہر چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر جدا ہو گیا اس نے اسلام کا قلادہ اپنی گردن سے نکال دیا (رواہ ابوداؤد و احمد)

تفسیر مظہری میں ہے کہ جماعت سے مراد اس حدیث میں جماعت صحابہ ہے، وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا، اور آپ کو قرآن عطا فرمایا، اور قرآن کے علاوہ دوسری وحی عطا فرمائی جس کو حدیث یا سنت کہا جاتا ہے، پھر قرآن میں بہت سی آیات مشکل یا مجمل یا مبہم ہیں ان کی تفسیر و بیان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے ذریعہ بیان کرنے کا وعدہ فرمایا، ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ کا یہی مطلب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے مشکلات اور مبہمات کی تفسیر اور اپنی سنت کی تفصیلات ... اپنے بلاواسطہ شاگردوں یعنی صحابہ کرام کو اپنے قول و عمل کے ذریعہ سکھلائیں، اس لئے جمہور صحابہ کا عمل پوری شریعت اسلامیہ کا بیان و تفسیر ہے۔

اس لئے مسلمان کی سعادت اسی میں ہے کہ ہر کام میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرے، اور جس آیت یا حدیث کی مراد میں اشتباہ ہو اس میں اس کو

اختیار کرے جس کو جمہور صحابہ کرام نے اختیار فرمایا ہو۔

اسی مقدس اصول کو نظر انداز کر دینے سے اسلام میں مختلف فرقے پیدا ہوگئے کہ تعامل صحابہ اور تفسیراتِ صحابہ کو نظر انداز کرکے اپنی طرف سے جو جی میں آیا اس کو قرآن و سنت کا مفہوم قرار دیدیا، یہی وہ گمراہی کے راستے ہیں جن سے قرآن کریم نے بار بار روکا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر بڑی تاکید کے ساتھ منع فرمایا، اور اس کے خلاف کرنے والوں پر لعنت فرمائی۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چھ آدمیوں پر میں لعنت کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ بھی ان پر لعنت کرے، ایک وہ شخص جس نے کتاب اللہ میں اپنی طرف سے کچھ بڑھا دیا (یعنی خواہ کچھ الفاظ بڑھا دیے یا معنی میں ایسی زیادتی کردی جو تفسیر صحابہ کے خلاف ہے) دوسرے وہ شخص جو تقدیر الٰہی کا منکر ہوگیا، تیسرے وہ شخص جو امت پر زبردستی مسلط ہوجائے تاکہ عزت دیدے اس شخص کو جس کو اللہ نے ذلیل کیا ہے اور ذلت دیدے اس شخص کو جس کو اللہ نے عزت دی ہے، چوتھے وہ شخص جس نے اللہ کے حرام کو حلال سمجھا، یعنی حرم مکہ میں قتل و قتال کیا یا شکار کھیلا، پانچویں وہ شخص جس نے میری عترت و اولاد کی بے حرمتی کی، چھٹے وہ شخص جس نے میری سنت کو چھوڑ دیا۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔

پچھلی آیت میں اس کا بیان تھا کہ صراطِ مستقیم سے منحرف ہونے والوں کو روزِ قیامت میں اللہ **تعالیٰ ہی ان کے اعمال کی سزا دیں گے۔**

اس آیت میں آخرت کی جزاء و سزاء کا کریمانہ ضابطہ اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جو شخص ایک نیک کام کرے گا اس کو دس گنا بدلہ دیا جائے گا، اور جو ایک گناہ کرے گا اس کا بدلہ صرف **ایک گناہ کی برابر دیا جائے گا۔**

صحیح بخاری اور مسلم، نسائی اور مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا رب عز وجل رحیم ہے، جو شخص کسی نیک کام کا صرف ارادہ کرے اس کے لئے ایک نیکی لکھ لی جاتی ہے، خواہ عمل کرنے کی نوبت بھی نہ آئے، پھر جب وہ اس نیک کام کو کرلے، تو دس نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جاتی ہیں، اور جو شخص کسی گناہ کا ارادہ کرے، مگر پھر اس پر عمل نہ کرے تو اس کے لئے بھی ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے، اور گناہ کا عمل بھی کرے تو ایک گناہ لکھ دیا جاتا ہے، یا اس کو بھی مٹا دیا جاتا ہے، اس عفو و کرم کے ہوتے ہوئے اللہ کے دربار میں وہی شخص ہلاک ہوسکتا ہے جس نے ہلاک ہونے ہی کی ٹھان رکھی ہے (ابن کثیر)

ایک حدیث قدسی میں بروایت ابو ذرؓ ارشاد ہے۔

"جو شخص ایک نیکی کرتا ہے اس کو دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے، اور اس سے بھی زیادہ، اور جو شخص ایک گناہ کرتا ہے تو اس کی سزا صرف ایک ہی گناہ کی برابر ملے گی یا میں اس کو بھی معاف کردونگا اور جو شخص اتنے گناہ کرکے میرے پاس آئے جن سے ساری زمین بھر جائے اور مغفرت کا طالب ہو تو میں اتنی ہی مغفرت سے اس کے ساتھ معاملہ کروں گا اور جو شخص میری طرف ایک بالشت قریب ہوتا ہے میں ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہوں اور جو شخص ایک ہاتھ میری طرف آتا ہے میں اس کی طرف بقدر ایک باع کے آتا ہوں (باع کہتے ہیں دونوں ہاتھوں کے پھیلاؤ کو) اور جو شخص میری طرف جھپٹ کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں"

ان روایات حدیث سے معلوم ہوا کہ نیکی کی جزاء میں دس تک کی زیادتی جو اس آیت میں مذکور ہے وہ اقل حد کا بیان ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم سے اس سے زیادہ بھی دے سکتے ہیں اور دیں گے، جیسا کہ دوسری روایت سے ستر گنا یا سات سو گنا تک ثابت ہوتا ہے۔

اس آیت کے الفاظ میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہاں لفظ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فرمایا، عَمِلَ بِالْحَسَنَةِ نہیں فرمایا، تفسیر بحر محیط میں ہے کہ اس سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ محض کسی نیک یا بدکام کرلینے پر یہ جزاء و سزا نہیں دی جائے گی، بلکہ جزاء و سزا کے لئے موت کے وقت تک اس عمل نیک یا بد عمل کا قائم رہنا شرط ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی نیک عمل کیا، لیکن پھر اس کے کسی گناہ کی شامت سے وہ عمل حبط اور ضائع ہوگیا تو وہ اس عمل پر جزاء کا مستحق نہیں رہا، جیسے معاذ اللہ کفر و شرک تو سارے ہی اعمال صالحہ کو برباد کردیتا ہے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے گناہ ایسے ہیں جو بعض اعمالِ صالحہ کو باطل اور بے اثر کردیتے ہیں، جیسے قرآن کریم میں ہے لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى، یعنی تم اپنے صدقے کو احسان جتلا کر یا ایذا پہونچا کر باطل اور ضائع نہ کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ صدقہ کا عمل صالح احسان جتانے یا ایذا پہنچانے سے باطل اور ضائع ہوجاتا ہے، اسی طرح حدیث میں ہے کہ مسجد میں بیٹھ کر دنیا کی باتیں کرنا نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا لیتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مسجد میں جو اعمالِ صالحہ نوافل اور تسبیح وغیرہ کے کئے ہیں وہ دنیا کی باتیں کرنے سے ضائع ہوجاتے ہیں۔

اسی طرح برے اعمال سے اگر توبہ کرلی تو وہ گناہ نامۂ اعمال سے مٹا دیا جاتا ہے، موت کے وقت تک باقی نہیں رہتا، اس لئے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ "جو کوئی عمل کرے نیک یا بد تو اس کو جزاء یا سزا ملے گی" بلکہ یوں فرمایا کہ "جو شخص ہمارے پاس لائے گا نیک عمل تو دس گنا

ثواب دیگا اور اپنے پاس سے دیگا، برا عمل تو ایک ہی عمل کی سزا پائے گا، اللہ تعالیٰ کے پاس لانا کسی وقت ہوگا جب یہ عمل آخر تک قائم اور باقی رہے، نیک عمل کو ضائع کرنے والی کوئی چیز پیش نہ آوے اور بُرے عمل سے توبہ و استغفار نہ کرے۔

آخر آیت میں فرمایا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ، یعنی اس عدالت عالیہ میں اس کا امکان نہیں کہ کسی پر ظلم ہوسکے، نہ کسی کے نیک عمل کے بدلے میں کمی کا امکان ہے، نہ کسی کے بُرے عمل میں اس سے زائد سزا کا احتمال ہے۔

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِلَّةَ
تو کہہ دے مجھ کو سجھائی میرے رب نے راہ سیدھی دین صحیح ملت ابراہیم
إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۱۶۱) قُلْ إِنَّ
کی جو ایک طرف کا تھا اور نہ تھا شرک کرنے والوں میں تو کہہ میری
صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۱۶۲)
نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا اللہ ہی کے لئے ہے جو پالنے والا سارے جہان کا ہے،
لَا شَرِيكَ لَهُ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ (۱۶۳)
کوئی نہیں اس کا شریک اور یہی مجھ کو حکم ہوا اور میں سب سے پہلے فرمانبردار ہوں،
قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِي رَبًّا وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۚ وَلَا تَكْسِبُ
تو کہہ کیا اب میں اللہ کے سوا تلاش کروں کوئی رب اور وہی ہے رب ہر چیز کا اور جو کوئی گناہ کرتا ہے
كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ ثُمَّ
سو وہ اس کے ذمہ پر ہے، اور بوجھ نہ اٹھائے گا ایک شخص دوسرے کا پھر
إِلَىٰ رَبِّكُمْ مَرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (۱۶۴)
تمہارے رب کے پاس ہی سب کو لوٹ کر جانا ہے، سو وہ جتلا دیگا جس بات میں تم جھگڑتے تھے،
وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ
اور اسی نے تم کو نائب کیا ہے زمین میں اور بلند کر دیئے تم میں درجے ایک
بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ
کے ایک پر تاکہ آزمائے تم کو اپنے دیئے ہوئے حکموں میں، تیرا رب جلد

ع ۲۰ / ۱۱

الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٦٥﴾
عذاب کرنے والا ہے اور وہی بخشنے والا مہربان ہے

خلاصۂ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو میرے رب نے ایک سیدھا رستہ وحی کے ذریعہ سے بتلا دیا ہے کہ وہ ایک دین ہے مضبوط بوجہ ثبوت بدلائل کے مستحکم (ہے) جو طریقہ ہے ابراہیم (علیہ السلام) کا جس میں ذرا کجی نہیں اور وہ ابراہیم شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے (اور) آپ (اس دین مذکور کی مزید تفصیل کے لئے) فرما دیجئے کہ (اس دین کا حاصل یہ ہے کہ) بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادات اور میرا جینا اور مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کے لئے ہے جو مالک ہے سارے جہان کا، اس کا (مستحق عبادت یا تصرفات ربوبیت میں) کوئی شریک نہیں، اور مجھ کو اسی (دین مذکور پر رہنے) کا حکم ہوا ہے اور (حکم کے موافق) میں (اس دین والوں میں) سب ماننے والوں سے پہلا ماننے والا ہوں، آپ (ان باطل کی طرف بلانے والوں سے) فرما دیجئے کہ کیا (بعد وضوح حقیقت توحید و اسلام کے تمہارے کہنے سے) میں خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کو رب بنانے کے لئے تلاش کروں (یعنی نعوذ باللہ شرک اختیار کرلوں) حالانکہ وہ مالک ہے ہر چیز کا (اور سب چیزیں اس کی مملوک ہیں اور مملوک شریک مالک نہیں ہو سکتا) اور (تم جو کہتے ہو کہ تمہارا گناہ ہمارے سر سو یہ محض لغویات ہے کہ کرنے والا پاک صاف رہے اور صرف دوسرا گنہگار ہو جاوے، بلکہ بات یہ ہے کہ) جو شخص بھی کوئی عمل کرتا ہے وہ اسی پر رہتا ہے، اور کوئی دوسرے کا بوجھ (گناہ کا) نہ اٹھاوے گا (بلکہ سب اپنی اپنی بھگتیں گے) پھر (سب کے عمل کر چکنے کے بعد) تم سب کو اپنے رب کے پاس جانا ہوگا، پھر وہ تم کو جتلا دیں گے جس جس چیز میں تم اختلاف کرتے تھے (کہ کوئی کسی دین کو حق بتلاتا تھا اور کوئی کسی کو، وہاں عملی اطلاع سے فیصلہ کر دیا جاوے گا، کہ اہل حق کو نجات اور اہل باطل کو سزا ہوگی) اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں صاحب اختیار بنایا (اس نعمت میں تو سب شریک ہیں) اور ایک کا دوسرے پر (مختلف چیزوں میں) رتبہ بڑھایا، (اس نعمت میں تفاضل ہے) تاکہ (ان نعمتوں سے) تم کو (ظاہراً) آزماوے ان چیزوں میں جو کہ (حکم مذکورہ سے) تم کو دی ہیں (آزمانا یہ کہ کون ان نعمتوں کی قدر کر کے منعم کی اطاعت کرتا ہے اور کون بے قدری کر کے اطاعت نہیں کرتا، پس جتنے مطیع ہوتے، جتنے نافرمان ہوئے اور دونوں کے ساتھ مناسب معاملہ کیا جاوے گا کیونکہ) بالیقین آپ کا رب جلد سزا دینے والا (بھی) ہے، اور بالیقین وہ واقعی بڑی مغفرت کرنے والا، مہربانی کرنے والا (بھی) ہے۔

دلیں، نافرمانوں کے لئے عذاب ہو اور فرمانبرداروں کے لئے رحمت ہو اور نافرمانی سے فرمانبرداری کی طرف آنے والوں کے لئے مغفرت ہے، جس کا یقین پر ضرور ہوا کہ دین حق کے موافق اطاعت، خشیت کریں، اور باطل اور مخالفتِ حق سے باز آویں) ؛

معارف ومسائل

سورۂ انعام کی آخری چھ آیتیں میں جن لوگوں نے دین حق میں افراط و تفریط اور کمی بیشی کرکے مختلف دین بنالئے تھے، اور خود مختلف گروہوں اور فرقوں میں بٹ گئے تھے، ان کے مقابلہ پر ان میں سے پہلی تین آیتوں میں دین حق کی تصویر اس کے بنیادی اصول اور بعض اہم فروع و جزئیات بیان کئے گئے ہیں، پہلی دو آیتوں میں اصول کا بیان ہے اور تیسری آیت میں ان کے اہم فروع کا ذکر ہے، اور دونوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے یہ ارشاد ہوا ہے کہ آپ ان لوگوں کو یہ بات پہونچادیں۔

پہلی آیت میں ارشاد ہے، قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ”یعنی آپ کہہ دیجئے کہ مجھے میرے رب نے ایک سیدھا راستہ بتادیا ہے“، اس میں اشارہ فرمادیا کہ میں نے تمہاری طرح اپنے خیالات یا آبائی رسوم کے تابع یہ راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ میرے رب نے مجھے یہ راستہ بتایا ہے، اور لفظ رب سے اس طرف بھی اشارہ کردیا کہ اس کی شان ربوبیت کا تقاضا ہی کہ وہ صحیح راستہ بتائے، تم بھی اگر چاہو تو اس کی طرف ہدایت کے سامان تمہارے لئے بھی موجود ہیں۔

دوسری آیت میں فرمایا دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○ اس میں لفظ قیم مصدر ہے قیام کے معنی میں، اور مراد اس سے قائم رہنے والا مستحکم ہے، یعنی یہ دین مستحکم ہے جو اللہ کی طرف سے آئی ہوئی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے، کسی کے شخصی خیالات نہیں، اور کوئی نیا دین و مذہب بھی نہیں جس میں کسی کو شبہ ہوسکے، بلکہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام کا یہی دین ہے، خصوصیت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام اس لئے ذکر فرمایا کہ دنیا کے ہر مذہب والے ان کی عظمت و امامت کے قائل ہیں، موجودہ فرقوں میں سے یہود، نصاریٰ، مشرکین عرب آپس میں کتنے ہی مختلف ہوں مگر ابراہیم علیہ السلام کی بزرگی و امامت پر سب ہی متفق ہیں، یہی وہ مقام امامت ہے جو اللہ تعالیٰ نے خصوصی انعام کے طور پر ان کو دیا ہے اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ

پھر ان میں سے ہر فرقہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ ہم دین ابراہیمی پر قائم ہیں، اور ہمارا مذہب ہی ملت ابراہیم ہے، ان کے اس مغالطہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام تو غیر اللہ کی عبادت سے پرہیز کرنے والے اور شرک سے نفرت کرنے والے

تھے، اور یہی ان کا سب سے بڑا شرک بن کر رہے، جب لوگ جگہ جگہ شرک میں مبتلا ہو گئے تو یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو، نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور مشرکین عرب نے ہزاروں پتھروں کو خدائی کا شریک مان لیا، تو پھر کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں رہا کہ وہ ملت ابراہیمی کا پابند ہے، ہاں یہ حق صرف مسلمان کو پہونچتا ہے جو شرک وکفر سے بیزار ہے۔

تیسری آیت میں فرمایا قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ اس میں لفظ "نسک" کے معنی قربانی کے بھی آتے ہیں، اور حج کے ہر فعل کو بھی نسک کہتے ہیں، اعمال حج کو مناسک کہا جاتا ہے، اور یہ لفظ مطلق عبادت کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے، اسی لئے ناسک کو عابد بولا جاتا ہے، اس جگہ ان میں سے ہر ایک معنی مراد لئے جا سکتے ہیں، اور مفسرین صحابہ و تابعین سے یہ سب تفسیریں منقول بھی ہیں، مگر مطلق عبادت کے معنی اس جگہ زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں، معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ میری نماز اور میری تمام عبادات اور میری پوری زندگی اور پھر موت یہ سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔

اس میں فروع اعمال میں سے اول نماز کا ذکر کیا کیونکہ وہ تمام اعمال صالحہ کی روح اور دین کا عمود ہے، اس کے بعد تمام اعمال و عبادات کا اجمالی ذکر فرمایا، اور پھر اس سے ترقی کر کے پوری زندگی کے اعمال واحوال کا ذکر کیا، اور آخر میں موت کا، ان سب کا ذکر کر کے فرمایا کہ ہماری یہ سب چیزیں صرف اللہ رب العالمین کے لئے ہیں جس کا کوئی شریک نہیں، اور یہی ایمان کامل اور خلوص کامل کا نتیجہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے ہر حال میں اور ہر کام میں اس کو پیش نظر رکھے کہ میرا اور تمام جہان کا ایک رب ہے، میں اس کا بندہ اور ہر وقت اس کی نظر میں ہوں، میرا قلب، دماغ، آنکھ، کان، زبان اور ہاتھ پیر، قلم اور قدم اس کی مرضی کے خلاف نہ اٹھنا چاہئے، یہ وہ مراقبہ ہے کہ اگر انسان اس کو اپنے دل و دماغ میں مستحضر کر لے تو صحیح معنی میں انسان اور کامل انسان ہو جائے، اور گناہ و معصیت اور جرائم کا اس کے آس پاس بھی گذر نہ ہو۔

تفسیر درمنثور میں اس آیت کے تحت میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری فرمایا کرتے تھے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ ہر مسلمان اس آیت کو بار بار پڑھا کرے اور اس کو وظیفہ زندگی بنالے۔

اس آیت میں نماز اور تمام عبادات کا اللہ کے لئے ہونا تو ظاہر ہے کہ ان میں شرک یا ریا یا کسی دنیوی منفعت کا دخل نہ ہونا چاہئے، مگر زندگی اور موت کا اللہ کے لئے ہونا، اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری موت و حیات اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، تو میری زندگی کے اعمال و عبادات بھی اسی کے لئے ہونا لازم ہے، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جتنے اعمال زندگی سے

واستے ہیں وہ بھی صرف اللہ کے لئے ہیں، جیسے نماز روزہ اور لوگوں کے ساتھ معاشرت کے حقوق و فرائض وغیرہ اور جو اعمال موت سے متعلق ہیں جیسے وصیت اور اپنے بعد کے لئے جو ہر انسان کوئی نظام چھوڑتا اور سوچتا ہے، وہ سب اللہ رب العالمین کے لئے اور اسی کے احکام کے تابع ہے۔

پھر فرمایا وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ، یعنی مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی قول و قرار اور اخلاص کامل کا حکم دیا گیا ہے، اور میں سب سے پہلا فرمانبردار مسلمان ہوں، مراد یہ ہے کہ اس امت میں سب سے پہلا مسلمان میں ہوں، کیونکہ ہر امت کا پہلا مسلمان خود وہ نبی یا رسول ہوتا ہے جس پر وحی شریعت نازل کی جاتی ہے۔

اور پہلا مسلمان ہونے سے اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ مخلوقات میں سب سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک پیدا کیا گیا ہے، اس کے بعد تمام آسمان و زمین اور مخلوقات وجود میں آئے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں ارشاد ہے: أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ تَعَالیٰ نُوْرِيْ (روح المعانی)

کسی کے گناہ کا بار دوسرا نہیں اٹھا سکتا

پانچویں آیت میں مشرکین مکہ ولید بن مغیرہ وغیرہ کی اس بات کا جواب ہے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمانوں سے کہا کرتے تھے کہ تم ہمارے دین میں واپس آجاؤ، تو تمہارے سارے گناہوں کا بار ہم اٹھا لیں گے، اس پر فرمایا قُلْ أَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْغِي رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے کہ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ کیا تم مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ تمہاری طرح میں بھی اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کرلوں، حالانکہ وہی سارے جہان اور ساری کائنات کا رب ہے، اس گمراہی کی مجھ سے کوئی امید نہ رکھو، باقی تمہارا یہ کہنا کہ ہم تمہارے گناہوں کا بار اٹھا لیں گے، یہ خود ایک حماقت ہے، گناہ تو جو شخص کرے گا اسی کے نامۂ عمل میں لکھا جائے گا، اور وہی اس کی سزا کا مستحق ہوگا، تمہارے اس کہنے سے وہ گناہ تمہاری طرف کیسے منتقل ہو سکتا ہے، اور اگر یہ خیال ہو کہ حساب اور نامۂ اعمال میں تو انہی کے رہے گا لیکن میدان حشر میں اس پر جو سزا مرتب ہوگی وہ ہم بھگت لیں گے، تو اس خیال کو بھی اس آیت کے اگلے جملہ نے رد کر دیا، فرمایا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى، یعنی قیامت کے روز کوئی شخص دوسرے کا بار گناہ نہیں اٹھائے گا۔

اس آیت نے مشرکین کے بیہودہ قول کا جواب تو دیا ہی ہے، عام مسلمانوں کو یہ ضابطہ بھی بتلا دیا کہ قیامت کے معاملہ کو دنیا پر قیاس نہ کرو کہ یہاں کوئی شخص جرم کرکے کسی دوسرے کے سر ڈال سکتا ہے، خصوصاً جبکہ دوسرا خود رضامند بھی ہو، مگر عدالت الٰہیہ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں، وہاں ایک کے گناہ میں دوسرا ہرگز نہیں پکڑا جا سکتا، اسی آیت سے استدلال فرما کر

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ولد الزنا پر والدین کے جرم کا کوئی اثر نہیں ہوگا، یہ حدیث حاکم نے بسند صحیح حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے۔

اور ایک میت کے جنازہ پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کسی کو روتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ زندوں کے رونے سے مُردہ کو عذاب ہوتا ہے، ابن ابی مُلیکہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ قول حضرت عائشہؓ کے سامنے نقل کیا تو انھوں نے فرمایا کہ تم ایک ایسے شخص کا یہ قول نقل کر رہے ہو جو نہ کبھی جھوٹ بولتا ہے اور نہ اُن کی ثقاہت میں کوئی شبہ کیا جاسکتا ہے، مگر کبھی سننے میں بھی غلطی ہوجاتی ہے، اس معاملہ میں تو قرآن کا ناطق فیصلہ تمہارے لئے کافی ہے، وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى، "یعنی ایک گناہ دوسرے پر نہیں پڑسکتا، تو کسی زندہ آدمی کے رونے سے مردہ بے قصور کس طرح عذاب میں ہوسکتا ہے (درمنثور)

آخر آیت میں ارشاد فرمایا کہ پھر تم سب کو بالآخر اپنے رب ہی کے پاس جانا ہے، جہاں تمہارے سارے اختلافات کا فیصلہ سُنا دیا جائے گا، مطلب یہ ہے کہ زبان آوری اور کج بحثی سے باز آؤ، اپنے انجام کی فکر کرو۔

پانچویں اور چھٹی آیت میں ایک جامع نصیحت پر سورۂ انعام کو ختم کیا گیا ہے، اور وہ عہد ماضی کی تاریخ اور پچھلی قوموں کی سرگذشت کو ان کے سامنے لاکر اپنے مستقبل کی طرف متوجہ فرمایا گیا ہے، وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ

اس میں لفظ خلائف، خلیفہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں کسی کا قائم مقام اور جانشین، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہی تم کو تم سے پہلی قوموں کی جگہ پر آباد کیا ہے، کوئی مکان زمین جس کو آج تم اپنی ملکیت کہتے ہو اور سمجھتے ہو ایسا نہیں جو کل تمہیں جیسے دوسرے انسانوں کی ملکیت میں نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے ان کو ہٹا کر تمہیں ان کی جگہ بٹھایا ہے، اور پھر یہ بات بھی ہر وقت قابل غور ہے کہ تم میں بھی سب آدمی یکساں نہیں، کوئی مفلس ہے کوئی مالدار، کوئی ذلیل ہے کوئی عزت دار، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر مالداری اور عزت خود انسان کے اختیار میں ہوتی تو کونسا انسان مفلسی اور ذلت کو اختیار کرتا، یہ درجات کا تفاوت بھی تمہیں اس کی خبر دے رہا ہے کہ اختیار کسی اور ہستی کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہے مفلس کردے جس کو چاہے مالدار، جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلت۔

آخر آیت میں فرمایا لِّيَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ یعنی تمہیں دوسرے لوگوں کی جگہ بٹھانے اور ان کے مال جائداد کا مالک بنا دینے اور پھر عزت و دولت کے اعتبار سے مختلف درجات میں رکھنے سے مقصود یہ ہے کہ تمہاری آزمائش کریں، اور اس کا امتحان لیں کہ جو نعمتیں پچھلے لوگوں کو ہٹا کر

تمہارے سپرد کی گئی ہیں، ان میں تمہارا عمل کیا ہوتا ہے، شکرگذاری اور فرمانبرداری کا، یا ناشکری اور نافرمانی کا؟

چھٹی آیت میں ان دونوں حالتوں کا انجام اس طرح بتلا دیا: اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ یعنی آپ کا رب نافرمانوں پر جلد عذاب بھیجنے والا ہے، اور فرمانبرداروں کے لئے غفور و رحیم ہے۔

سورۂ انعام کا شروع حمد سے ہوا اور ختم مغفرت پر، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حمد کی توفیق اور مغفرت سے سرفراز فرما دیں۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۂ انعام مکمل ایک ہی دفعہ نازل ہوئی اور اس شان کے ساتھ نازل ہوئی کہ ستر ہزار فرشتے اس کے جلو میں تسبیح پڑھتے ہوئے آئے، اسی لئے حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ سورۂ انعام قرآن کریم کی افضل و اعلیٰ سورتوں میں سے ہے۔

بعض روایات میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ یہ سورۃ جس مریض پر پڑھی جائے اللہ تعالیٰ اس کو شفاء دیتے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

سورۃ الاعراف

سُورَةُ الْأَعْرَافِ

سُوْرَةُ الْاَعْرَافِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَتَانِ وَّسِتُّ اٰيَاتٍ وَّاَرْبَعَةٌ وَّعِشْرُوْنَ رُكُوْعًا

سورۂ اعراف مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی دو سو چھ آیتیں اور چوبیس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓصٓ ﴿۱﴾ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ

یہ کتاب اتری ہے تیری طرف سو چاہیے کہ تیرے جی میں تنگی نہ ہو اس کے پہنچانے

مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ

سے تاکہ ڈرائے تو اس سے اور نصیحت ہو ایمان والوں کو، چلو اسی پر جو اترا تم پر

اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا

تمہارے رب کی طرف سے اور نہ چلو اس کے سوا اور رفیقوں کے پیچھے، تم بہت

مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳﴾ وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا

کم دھیان کرتے ہو، اور کتنی بستیاں ہم نے ہلاک کردیں کہ پہنچا ان پر ہمارا عذاب

بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ﴿۴﴾ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ

راتوں رات یا دوپہر کو سوتے ہوئے، پھر یہی تھی ان کی پکار جس وقت کہ آیا ان پر

بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵﴾ فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ

ہمارا عذاب کہ کہنے لگے کہ بیشک ہم ہی تھے گنہگار، سو ہم کو ضرور پوچھنا ہے ان سے

اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶﴾ فَلَنَقُصَّنَّ

جن کے پاس رسول بھیجے گئے تھے اور ہم کو ضرور پوچھنا ہے رسولوں سے، پھر ہم ان کو احوال

عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ﴿۷﴾

سنا دیں گے اپنے علم سے اور ہم کہیں غائب نہ تھے

خلاصۂ مضامین سورۃ

تمام سورۃ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں زیادہ تر مضامین معاد (آخرت) اور رسالت سے متعلق ہیں، اور پہلی دو آیتیں تو بطور تمہید کے ہیں نبوت کا، اور آیت نمبر ۶ فلنسئلن میں معاد و آخرت کی تحقیق کا مضمون ہے، اور رکوع سوم کے نصف سے رکوع ششم کے ختم تک بالکل آخرت کی بحث ہے، پھر رکوع ہشتم سے اکیسویں رکوع تک وہ معاملات مذکور ہیں جو انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں سے ہوئے ہیں، جو سب مسئلہ رسالت سے متعلق ہیں اور ان قصص میں ساتھ ساتھ منکرین رسالت کی سزاؤں کا بھی ذکر آیا ہے، تاکہ منکرین موجودین کو عبرت حاصل ہو، اور رکوع بائیس کے نصف سے تئیسیں کے ختم تک پھر معاد کی بحث ہے، صرف ساتویں اور بائیسویں رکوع کے شروع میں اور آخری رکوع چوبیس کے آخر حصہ میں توحید پر بحث ہے، باقی بہت کم حصہ سورۃ کا ایسا ہے جس میں جزوی فروعی احکام بمناسبت مقام مذکور ہیں (از بیان القرآن)

خلاصۂ تفسیر

المص (اس کے معنی تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک راز ہے جس پر امت کو اطلاع نہیں دی گئی بلکہ اس کی جستجو کو بھی منع کیا گیا) کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْکَ (یہ قرآن) ایک کتاب ہے جو اللہ کی جانب سے آپ کے پاس اس لئے بھیجی گئی ہے کہ آپ اس کے ذریعہ (لوگوں کو عذاب الٰہی سے) ڈرائیں، سو آپ کے دل میں کسی کے نہ ماننے سے بالکل تنگی نہ ہونی چاہئے، کیونکہ کسی کے نہ ماننے سے آپ کے اصل مقصد بعثت میں جو کہ حق بات پہنچا دینا ہے کوئی خلل نہیں آتا، پھر آپ کیوں دل تنگ ہوں) اور یہ قرآن خصوصیت کے ساتھ نصیحت ہے ایمان والوں کے لئے (آگے عام امت کو خطاب ہے کہ جب قرآن کا منزل من اللہ ہونا ثابت ہو گیا تو) تم لوگ اس کتاب کا اتباع کرو جو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے آئی ہے (اتباع کتاب یہ ہے کہ اس کی دل سے تصدیق بھی کرو اور اس پر عمل بھی) اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر (جس نے تمہاری ہدایت کے لئے قرآن نازل کیا) دوسرے رفیقوں کا اتباع مت کرو (جو تم کو گمراہ کرتے ہیں جیسے شیاطین الجن والانس مگر باوجود اس مشفقانہ فہمائش کے) تم لوگ بہت ہی کم نصیحت مانتے ہو، اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ان کو ہم نے (ان کے رہنے والوں کو ان کے کفر و تکذیب کی بنا پر) تباہ و برباد کر دیا اور ان پر ہمارا عذاب (یا تو) رات کے وقت پہنچا جب وہ سوتے اور آرام کرنے کا

وقت ہو، یہ بستی حسب عادت رات یا دوپہر کو سوتے ہوں یا گروہ دوپہر کے وقت آرام میں تھے، یعنی کسی کو کسی وقت کسی کو کسی وقت، سو جس وقت ان پر ہمارا عذاب آیا اس وقت ان کے منہ سے بجز اس کے اور کوئی بات نہ نکلتی تھی کہ واقعی ہم ظالم اور خطاوار تھے (یعنی ایسے وقت اقرار کیا جب کہ تدارک کا وقت گذر چکا تھا، یہ تو دنیوی عذاب ہوا) پھر اس کے بعد آخرت کے عذاب کا سامان ہوگا کہ قیامت میں ہم ان لوگوں سے (بھی) ضرور پوچھیں گے جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے تھے (کہ تم نے پیغمبروں کا کہنا مانا یا نہیں) اور ہم پیغمبروں سے ضرور پوچھیں گے (کہ تمہاری امتوں نے تمہارا کہنا مانا یا نہیں؟ یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ، اور دونوں سوالوں سے مقصود کفار کو زجر و تنبیہ ہوگی، پھر چونکہ ہم پوری خبر رکھتے ہیں خود ہی (سب کے رو برو ان کے سب حال کو) بیان کر دیں گے، اور ہم (عمل کے وقت اور جگہ سے) غائب تو نہ تھے۔

معارف و مسائل

پوری سورۂ اعراف پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۃ کے مضامین زیادہ تر معاد اور آخرت اور نبوت و رسالت کے متعلق ہیں، چنانچہ ابتداء سورۃ سے چھٹے رکوع تک تقریباً مضمون معاد و آخرت کا بیان ہوا ہے، پھر آٹھویں رکوع سے اکیسویں رکوع تک انبیاء سابقین کے حالات اور ان کی امتوں کے واقعات، ان کی جزاء و سزاء اور ان پر آنے والے عذابوں کا مفصل تذکرہ ہے۔

فَلَا یَکُنْ فِیْ صَدْرِکَ حَرَجٌ، پہلی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرما کر یہ ارشاد کیا گیا ہے کہ یہ قرآن اللہ کی کتاب ہے جو آپ کے پاس بھیجی گئی ہے آپ کو اس کی وجہ سے دل تنگ نہ ہونا چاہئے، دل تنگی سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم اور اس کے احکام کی تبلیغ میں آپ کو کسی کا خوف مانع نہ ہونا چاہئے کہ لوگ اس کو جھٹلا دیں گے اور آپ کو ایذاء دیں گے، (کذا روی عن ابی العالیۃ، مظہری)

اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جس نے آپ پر یہ کتاب نازل فرمائی ہے اس نے آپ کی امداد و حفاظت کا بھی انتظام کر دیا ہے، اس لئے آپ کیوں دل تنگ ہوں، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ دل تنگی سے مراد یہ ہے کہ قرآن اور احکام اسلام سن کر بھی جو لوگ مسلمان نہ ہوتے تھے تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بوجہ شفقت کے شاق ہوتا تھا، اسی کو دل تنگی سے تعبیر کیا گیا، اور یہ بتلا دیا گیا ہے کہ آپ کا فرض منصبی صرف تبلیغ و دعوت کا ہے، جب آپ نے یہ کام کر لیا تو اب یہ ذمہ داری آپ کی نہیں کہ کون مسلمان ہوا کون

خلاصۂ تفسیر

(اس روز یعنی قیامت کے دن اعمال وعقائد کا وزن واقع ہونے والا ہے تاکہ عام طور پر ہر ایک کی حالت ظاہر ہو جائے، پھر (وزن کے بعد) جس شخص کا پلہ (ایمان کا) بھاری ہوگا (یعنی وہ مومن ہوگا) سو ایسے لوگ تو کامیاب ہوں گے (یعنی نجات پائیں گے) اور جس شخص کا پلہ (ایمان کا) ہلکا ہوگا (یعنی وہ کافر ہوگا) تو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنا نقصان کر لیا بسبب اس کے کہ ہماری آیتوں کی حق تلفی کیا کرتے تھے، اور بیشک ہم نے تم کو زمین پر رہنے کی جگہ دی اور ہم نے تمہارے لئے اس (زمین) میں سامان زندگی پیدا کیا (جس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ تم اس کے شکریہ میں فرمانبردار و طاعت شعار ہوتے، لیکن) تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو (مراد اس سے عدم طاعت ہے اور کم اس لئے فرمایا کہ تھوڑے بہت نیک کام تو اکثر لوگ کر ہی لیتے ہیں، لیکن بوجہ ایمان نہ ہونے کے وہ قابل اعتبار نہیں)

معارف و مسائل

پہلی آیت میں ارشاد ہے وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ، یعنی بھلے برے اعمال کا وزن ہونا اس دن حق و صحیح ہے، اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ لوگ اس بات سے دھوکہ نہ کھائیں کہ وزن اور تول تو ان چیزوں کا ہوا کرتا ہے جن میں کوئی بوجھ اور ثقل ہو، انسان کے اعمال خواہ اچھے ہوں یا برے ان کا کوئی جسم اور جرم ہی نہیں جس کا تول ہو سکے، پھر اعمال کا وزن کیسے ہوگا، کیونکہ اول تو مالک الملک قادر مطلق ہر چیز پر قادر ہے، یہ کیا ضروری ہے کہ جس چیز کو ہم نہ تول سکیں حق تعالیٰ بھی نہ تول سکیں، اس کے علاوہ آج کل تو دنیا میں وزن تولنے کے لئے نئے نئے آلات ایجاد ہو چکے ہیں جن میں نہ ترازو کی ضرورت ہے نہ اس کے پلڑوں کی، نہ ڈنڈی کی اور کانٹے کی، آج تو ان نئے آلات کے ذریعہ وہ چیزیں بھی تولی جاتی ہیں جن کے تولنے کا آج سے پہلے کسی کو تصور بھی نہ تھا، ہوا تولی جاتی ہے، برقی رو تولی

آسمان کے قلابے ملاتے ہیں، مگر حق تعالیٰ کی مشیئت سے جن کا صحیح انکشاف آخرت میں ہونے والا ہے یہ لوگ بالکل بے خبر ہیں۔

آیت مذکورہ میں اسی لئے اہتمام کر کے یہ فرمایا گیا وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ، تاکہ یہ ظاہر بین انسان آخرت میں وزن اعمال سے انکار نہ کر بیٹھے جو قرآن کریم سے ثابت اور پوری امت مسلمہ کا عقیدہ ہے۔

قرآن مجید میں بروز قیامت وزن اعمال ہونے کا مسئلہ بہت سی آیات میں مختلف عنوانوں سے آیا ہے اور روایات حدیث ۔ ۔ اس کی تفصیلات بے شمار ہیں۔

وزن اعمال کے متعلق ایک شبہ اور جواب

وزن اعمال کے متعلق جو تفصیلی بیان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں آیا ہے اس میں ایک بات تو یہ قابل غور ہے کہ متعدد روایات حدیث میں آیا ہے کہ محشر کی میزان عدل میں سب سے بڑا وزن کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا ہوگا، جس پلّے میں یہ کلمہ ہوگا وہ سب پر بھاری رہے گا۔

ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، بیہقی اور حاکم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں میری امت کا ایک آدمی ساری مخلوق کے سامنے لایا جائے گا اور اس کے ننانوے نامۂ اعمال لائے جاویں گے، اور ان میں سے ہر نامۂ اعمال اتنا طویل ہوگا کہ جہاں تک اس کی نظر پہنچتی ہے، اور یہ سب نامۂ اعمال برائیوں اور گناہوں سے لبریز ہوں گے، اس شخص سے پوچھا جائے گا کہ ان نامہائے اعمال میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب صحیح ہے یا نامۂ اعمال لکھنے والے فرشتوں نے تم پر کچھ ظلم کیا ہے اور خلاف واقعہ کوئی بات لکھ دی ہے، وہ اقرار کرے گا کہ اے میرے پروردگار! جو کچھ لکھا ہے سب صحیح ہے، اور دل میں گھبرائے گا کہ اب میری نجات کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اس وقت حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ آج کسی پر ظلم نہیں ہوگا، ان تمام گناہوں کے مقابلہ میں تمہاری ایک نیکی کا پرچہ بھی ہمارے پاس موجود ہے جس میں تمہارا کلمہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ لکھا ہوا ہے، وہ عرض کرے گا کہ اے پروردگار، اتنے بڑے سیاہ نامۂ اعمال کے مقابلہ میں یہ چھوٹا سا پرچہ کیا وزن رکھے گا، اس وقت ارشاد ہوگا کہ تم پر ظلم نہیں ہوگا، اور ایک پلّہ میں وہ سب گناہوں سے بھرے ہوئے نامہائے اعمال رکھے جائیں گے، دوسرے میں یہ کلمۂ ایمان کا پرچہ رکھا جائے گا تو اس کلمہ کا پلّہ بھاری ہو جائے گا اور سارے گناہوں کا پلّہ ہلکا ہو جائے گا، اس واقعہ کو بیان کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے نام کے مقابلہ میں کوئی چیز بھاری نہیں ہو سکتی۔ (مظہری)

اور مسند بزار اور مستدرک حاکم میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نوح علیہ السلام کی وفات کا وقت آیا تو اپنے لڑکوں کو جمع کر کے فرمایا کہ میں تمہیں کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ اگر ساتوں آسمان اور زمین ایک پلہ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ دوسرے پلہ میں رکھ دیا جائے تو کلمہ کا پلہ ہی بھاری رہے گا۔ اسی مضمون کی روایت حدیث حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہم سے معتبر سندوں کے ساتھ کتب حدیث میں منقول ہیں۔ (مظہری)

ان روایات کا مقتضا تو یہ ہے کہ مومن کا پلہ ہمیشہ بھاری ہی رہے گا، خواہ وہ کتنے بھی گناہ کرے، لیکن قرآن مجید کی دوسری آیات اور بہت سی روایات حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان کی حسنات اور سیئات کو تولا جائے گا کسی کی حسنات کا پلہ بھاری ہوگا، کسی کے گناہوں کا، جس کی حسنات کا پلہ بھاری رہے گا وہ نجات پائے گا جس کی سیئات اور گناہوں کا پلہ بھاری ہوگا اس کو عذاب ہوگا۔

مثلاً قرآن مجید کی ایک آیت میں ہے:۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۝

"یعنی ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو قائم کریں گے جس میں کسی شخص پر ادنیٰ ظلم نہیں ہوگا جو بھلائی یا برائی ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی کسی نے کی ہو وہ سب میزانِ عمل میں رکھی جائے گی اور ہم حساب کے لئے کافی ہیں"

اور سورۂ قارعہ میں ہے:۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۔

"یعنی جس کا نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا وہ عمدہ عیش میں رہے گا، اور جس کا نیکی کا ہلکا ہوگا اس کا مقام دوزخ ہوگا"

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ان آیات کی تفسیر میں فرمایا کہ جس مومن کا پلہ حسنات کا بھاری ہوگا وہ اپنے اعمال کے ساتھ جنت میں اور جس کا پلہ گناہوں کا بھاری ہوگا وہ اپنے اعمال کے ساتھ جہنم میں بھیج دیا جائے گا (رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ مظہری)

اور ابو داؤد میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ منقول ہے کہ اگر کسی بندہ کے فرائض میں

کوئی کمی پائی جائے گی تو رب العالمین کا ارشاد ہوگا کہ دیکھو اس بندہ کے کچھ نوافل بھی ہیں یا نہیں، اگر نوافل موجود ہیں تو فرضوں کی کمی کو نفلوں سے پورا کر دیا جائے گا۔ (مظہری)

ان تمام آیات و روایات کا حاصل یہ ہے کہ مومن مسلمان کا پلہ کبھی بھاری کبھی ہلکا ہوگا، اس لئے بعض علماء تفسیر نے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں وزن دو مرتبہ ہوگا، اول کفر و ایمان کا وزن ہوگا جس کے ذریعہ مومن و کافر کا امتیاز کیا جائے گا، اس وزن میں جس کے نامہ اعمال میں صرف کلمہ ایمان بھی ہو اس کا پلہ بھاری ہو جائے گا، اور وہ کافروں کے گروہ سے الگ کر دیا جائے گا، پھر دوسرا وزن نیک و بد اعمال کا ہوگا اس میں کسی مسلمان کی نیکیاں کسی کی برائیاں بھاری ہوں گی، اور اس کے مطابق اس کو جزاء و سزاء ملے گی، اس طرح تمام آیات اور روایات کا مضمون اپنی اپنی جگہ درست اور مربوط ہو جاتا ہے (بیان القرآن)

وزن اعمال کس طرح ہوگا بخاری و مسلم میں بروایت ابوہریرہؓ یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز بعض موٹے فربہ آدمی آئیں گے جن کا وزن، اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کی برابر بھی نہ ہوگا، اور اس کی شہادت میں آپ نے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی، فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا، یعنی قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن قرار نہ دیں گے (مظہری)

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مناقب میں یہ حدیث آئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کی ٹانگیں ظاہر میں کتنی پتلی ہیں لیکن قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ قیامت کی میزان عدل میں ان کا وزن اُحد پہاڑ سے بھی زیادہ ہوگا۔

اور حضرت ابوہریرہؓ کی وہ حدیث جس پر امام بخاری نے اپنی کتاب کو ختم کیا ہے، اس میں یہ ہے کہ دو کلمے ایسے ہیں جو زبان پر بہت ہلکے ہیں مگر میزان عمل میں بہت بھاری ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہیں، اور وہ کلمے یہ ہیں: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ

اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے، کہ سُبحَانَ اللہ کہنے سے میزانِ عمل کا آدھا پلہ بھر جاتا ہے، اور اَلحَمدُ لِلّٰہ سے باقی آدھا پورا ہو جاتا ہے۔

اور ابوداؤد، ترمذی، ابن حبان نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابوالدرداءؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میزانِ عمل میں حُسنِ خلق کی برابر کوئی عمل وزنی نہیں ہوگا۔

اور حضرت ابوذر غفاریؓ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمھیں ایسے دو کام بتاتا ہوں جن پر عمل کرنا انسان کے لئے کچھ بھاری نہیں، اور میزانِ عمل میں وہ سب سے زیادہ بھاری ہوں گے، ایک حُسنِ خلق، دوسرے زیادہ خاموش رہنا، یعنی بلاضرورت کلام نہ کرنا۔

اور امام احمد نے کتاب الزہد میں بروایت حضرت حازمؒ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مرتبہ جبرئیل امین تشریف لائے تو وہاں کوئی شخص خوفِ خدا تعالیٰ سے رو رہا تھا، تو جبرئیل امین نے فرمایا کہ انسان کے تمام اعمال کا تو وزن ہوگا مگر خدا و آخرت کے خوف سے رونا ایسا عمل ہے جس کو تولا نہ جائے گا، بلکہ ایک آنسو بھی جہنم کی بڑی سے بڑی آگ کو بجھا دے گا (مظہری)

ایک حدیث میں ہے کہ میدانِ حشر میں ایک شخص حاضر ہوگا، جب اس کا نامۂ اعمال سامنے آئے گا تو وہ اپنے نیک اعمال کو بہت کم پاکر گھبرا جائے گا کہ اچانک ایک چیز بادل کی طرح اٹھ کر آئیگی اور اس کے نیک اعمال کے پلڑے میں گر جائے گی، اور اس کو بتلایا جائے گا کہ یہ تیرے اس عمل کا ثمرہ ہے جو تو دنیا میں لوگوں کو دین کے احکام و مسائل بتلاتا اور سکھاتا تھا، اور یہ تیری تعلیم کا سلسلہ آگے چلا تو جس جس شخص نے اس پر عمل کیا ان سب کے عمل میں تیرا حصہ بھی لگا دیا گیا (مظہری عن ابن المبارک)

طبرانی نے بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص جنازہ کے ساتھ قبرستان تک جائے اس کی میزانِ عمل میں دو قیراط رکھ دی جائیں گی، اور دوسری روایات میں ہے کہ اس قیراط کا وزن احد پہاڑ کی برابر ہوگا۔

طبرانی نے بروایت جابرؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کی میزان عمل میں سب سے پہلے جو عمل رکھا جائے گا وہ اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنے اور انکی ضروریات پورا کرنے کا نیک عمل ہے۔

اور امام ذہبیؒ نے حضرت عمران بن حصینؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن علماء کی روشنائی جس سے انھوں نے علم دین اور احکامِ دین لکھے ہیں اور شہیدوں کے خون کو تولا جائے گا تو علماء کی روشنائی کا وزن شہیدوں کے خون کے وزن سے بڑھ جائے گا۔

اس طرح کی روایات حدیث قیامت کے وزنِ اعمال کے سلسلہ میں بہت ہیں، یہاں چند کو اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ ان سے خاص خاص اعمال کی فضیلت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے

ان تمام روایات حدیث سے وزنِ اعمال کی کیفیت مختلف معلوم ہوتی ہے، بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل کرنے والے ... انسان تولے جائیں گے، وہ اپنے اپنے عمل کے اعتبار سے ہلکے بھاری ہوں گے، اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نامۂ اعمال تولے جائیں گے، اور بعض سے ثابت ہوتا ہے کہ خود اعمال مجسم ہو جائیں گے وہ تولے جائیں گے، امام تفسیر ابن کثیرؒ نے یہ سب روایات نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ ہو سکتا ہے کہ وزن مختلف صورتوں سے کئی مرتبہ کیا جائے اور ظاہر ہے کہ پوری حقیقت ان معاملات کی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، اور عمل کرنے کے لئے

اس حقیقت کا جاننا ضروری بھی نہیں صرف اتنی بات کافی ہے کہ جس کے اعمال کا وزن ہوگا، نیک اعمال کو ہلکا پائے گا تو عذاب کے مستحق ہوں گے، یہ دوسری بات ہے کہ حق تعالیٰ کسی کو خود اپنے فضل و کرم سے یا کسی نبی ولی کی شفاعت سے معاف فرمادیں اور عذاب سے نجات ہوجائے۔

جن روایات میں یہ مذکور ہے کہ بعض لوگوں کو صرف کلمہ ایمان کی بدولت نجات ہوجائے گی اور سب گناہ اس کے مقابلہ میں معاف ہوجائیں گے یہ اسی استثنائی صورت سے متعلق ہیں جو عام ضابطہ سے الگ مخصوص فضل و کرم کا مظہر ہے۔

ان دونوں آیتوں میں جن کی تفسیر ابھی بیان ہوئی، گناہگاروں کو میدان حشر کی رسوائی اور عذاب الٰہی سے ڈرایا گیا تھا، تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر فرما کر حق کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کی ترغیب اس طرح دی گئی کہ ہم نے تم کو زمین پر پوری قدرت اور تصرف مالکانہ عطا کیا اور پھر اس میں تمہارے لئے سامان معیشت حاصل کرنے کے ہزاروں راستے کھول دیئے، گویا رب العالمین نے زمین کو انسان کی تمام ضروریات سے لے کر تفریحی سامان تک کا عظیم الشان گودام بنا دیا ہے، اور تمام انسانی ضروریات کو اس کے اندر پیدا فرما دیا ہے، اب انسان کا کام صرف اتنا ہے کہ اس گودام سے اپنی ضروریات کو نکالنے اور ان کے استعمال کرنے کے طریقوں کو سیکھے، انسان کے ہر علم و فن اور سائنس کی ترقی سے نئی نئی ایجادات کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ خالق کائنات کی پیدا کی ہوئی چیزیں جو زمین کے گودام میں محفوظ ہیں، ان کو سلیقہ کے ساتھ نکالے اور صحیح طریقہ سے استعمال کرے، بیوقوف اور بدسلیقہ آدمی جو اس گودام سے نکالنے کا طریقہ نہیں جانتا، یا پھر نکال کر اس کے استعمال کا طریقہ نہیں سمجھتا وہ ان کے منافع سے محروم رہتا ہے، سمجھدار انسان دونوں چیزوں کو سمجھ کر اس سے نفع اٹھاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ساری ضروریات انسانی حق تعالیٰ نے زمین میں ودیعت رکھ دی ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر وقت ہر حال میں حق تعالیٰ کا شکر گذار ہو مگر وہ غفلت میں پڑ کر اپنے خالق و مالک کے احسانات کو بھول جاتا ہے، اور انہی اشیاء میں الجھ کر رہ جاتا ہے، اسی لئے آخر آیت میں بطور شکایت کے ارشاد فرمایا: قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ "یعنی تم لوگ بہت کم شکر ادا کرتے ہو"

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا

اور ہم نے تم کو پیدا کیا پھر صورتیں بنائیں تمہاری پھر حکم کیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو

لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ⑪

آدم کو تو سجدہ کیا سب نے مگر ابلیس نہ تھا سجدہ والوں میں۔

سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا، حق تعالیٰ نے فرمایا تو جو سجدہ نہیں کرتا تجھ کو اس سے کونسا امر مانع ہے، جب کہ میں (خود) تجھ کو سجدہ کا حکم دے چکا، کہنے لگا: وہ امر مانع یہ ہے کہ آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا، اور اس (آدم) کو آپ نے خاک سے پیدا کیا ہے (یہ شیطانی استدلال کا پہلا مقدمہ ہے، اور دوسرا مقدمہ جس کا ذکر نہیں کیا وہ یہ ہے کہ آگ بوجہ نورانی ہونے کے خاک سے افضل ہے، تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ افضل کی فرع اور اولاد بھی غیر افضل کی فرع سے افضل ہوتی ہے، چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ افضل کا سجدہ کرنا غیر افضل کو نامناسب ہے، ان چاروں مقدمات کو ملا کر شیطان نے اپنے سجدہ نہ کرنے کی یہ دلیل بنائی کہ میں افضل ہوں اس لئے غیر افضل کو سجدہ نہیں کیا، مگر پہلے مقدمہ کے سوا سارے ہی مقدمات غلط ہیں، اور پہلا مقدمہ بھی عام انسانوں کے حق میں اس معنی سے صحیح ہے کہ انسان کی تخلیق میں جزو غالب مٹی کا ہے، باقی مقدماتِ دلیل کا غلط ہونا ظاہر ہوا ہے، کیونکہ آگ کا خاک پر افضل ہونا ایک جزوی فضیلت تو ہوسکتی ہے، کلی طور پر اس کو افضل کہنا دعویٰ بے دلیل ہے، اسی طرح افضل کی فرع اور اولاد کا افضل ہونا بھی مشکوک ہے، ہزاروں واقعات اس کے خلاف سامنے آتے ہیں، کہ نیک کی اولاد بد اور بد کی اولاد نیک ہو جاتی ہے، اسی طرح یہ بھی غلط ہے، کہ افضل کو مفضول کے لئے سجدہ نامناسب ہے، بعض اوقات مصالح کا تقاضا اس کے خلاف ہونا مشاہد ہے)

حق تعالیٰ نے فرمایا (جب تو ایسا نافرمان ہے) تو آسمان سے نیچے اتر، تجھ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تو تکبر کرے، (خصوصاً آسمان میں رہ کر جہاں سب فرمانبرداروں ہی کا مقام ہے) تو (یہاں سے) نکل (دور ہو) بے شک تو (اس تکبر کی وجہ سے) ذلیلوں میں شمار ہونے لگا، وہ کہنے لگا مجھ کو مہلت دیجئے قیامت کے دن تک، اللہ تعالیٰ نے فرمایا تجھ کو مہلت دی گئی، وہ کہنے لگا کہ بسبب اس کے کہ آپ نے مجھ کو (بحکم تکوینی) گمراہ کیا ہے میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ان (کے یعنی آدم اور اولادِ آدم کی رہزنی کرنے) کے لئے آپ کی سیدھی راہ پر (جو کہ دین حق ہے) جاکر بیٹھ جاؤں گا پھر ان پر (ہر چہار طرف سے) حملہ کروں گا ان کے آگے سے بھی پیچھے سے بھی اور ان کی داہنی جانب سے بھی اور بائیں جانب سے بھی (یعنی ان کے بہکانے میں کوشش کا کوئی پہلو باقی نہ چھوڑوں گا تاکہ وہ آپ کی عبادت نہ کرنے پاویں) اور (میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوں گا، چنانچہ) آپ ان میں سے اکثروں کو (آپ کی نعمتوں کا) احسان ماننے والا نہ پاویں گے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہاں (آسمان) سے ذلیل و خوار ہو کر نکل جا (اور تو جو اولادِ آدم کو بہکانے کو کہتا ہے تو جو تیرا جی چاہے کرے میں سب سے بے نیاز ہوں نہ کسی کے راہِ راست پر آنے سے میرا کوئی فائدہ ہے نہ گمراہ ہونے سے کوئی نقصان) جو شخص ان میں سے تیرا کہنا مانے گا میں ضرور تم سے (یعنی ابلیس

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ کا ظہور ہوگا، اس دعاء کی بناء پر ابلیس اس وقت بھی زندہ رہتا، اس لئے اس کی ایک دعاء کو یوم بعث تک کی مہلت کے بجائے یَوْمِ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ تک کی مہلت سے تبدیل کرکے قبول کیا گیا، جس کا اثر یہ ہوگا کہ جس وقت سارے عالم پر موت طاری ہوگی، اس وقت ابلیس کو بھی موت آئے گی، پھر جب سب دوبارہ زندہ ہوں گے تو وہ بھی زندہ ہوجائے گا۔

اس تحقیق سے وہ شبہ بھی رفع ہوگیا جو آیت كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ سے اس دعاء کے متعلق پیدا ہوتا ہے کہ بظاہر دونوں میں تعارض ہوگیا۔

لیکن حاصل اس تحقیق کا یہ ہے کہ یوم البعث اور یوم الوقت المعلوم دو الگ الگ دن ہیں، ابلیس نے یوم البعث تک کی مہلت مانگی تھی وہ پوری قبول نہ ہوئی، اس کو بدل کر یوم الوقت المعلوم تک کی مہلت دی گئی، سیدی حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے بیان القرآن میں ترجیح اس کو دی ہے کہ درحقیقت یہ دونوں ایک ہی دن ہیں، بعد نفخۂ اولیٰ کے وقت سے دخولِ جنت و نار تک ایک طویل دن ہوگا، اس کے مختلف حصوں میں مختلف واقعات ہوں گے، انہی واقعات مختلفہ کی بناء پر اس دن کی ہر واقعہ کی طرف نسبت کرسکتے ہیں، مثلاً اس کو یوم نفخ صور و یوم فناء بھی کہہ سکتے ہیں، اور یوم بعث اور یوم جزاء بھی، اس سے سب اشکالات رفع ہوگئے، فللّٰہ الحمد۔

کیا کافر کی دعاء بھی قبول ہوسکتی ہے

یہ سوال اس سے پیدا ہوتا ہے کہ آیتِ قرآن وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کافر کی دعاء قبول نہیں ہوتی مگر اس واقعہ ابلیس اور آیت مذکورہ سے قبولیتِ دعاء کا اشکال ظاہر ہے، جواب یہ ہے کہ دنیا میں تو کافر کی دعاء بھی قبول ہوسکتی ہے، یہاں تک کہ ابلیس جیسے اکفر کی دعاء بھی قبول ہوگئی، مگر آخرت میں کافر کی دعاء قبول نہ ہوگی، اور آیت مذکورہ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ آخرت کے متعلق ہے دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

واقعہ آدمؑ و ابلیس کے مختلف الفاظ

قرآن مجید میں یہ قصہ کئی جگہ آیا ہے، اور ہر جگہ اس سوال وجواب کے الفاظ مختلف ہیں، حالانکہ واقعہ ایک ہی ہے، وجہ یہ ہے کہ اصل واقعہ میں تو سب جگہ ایک ہی مضمون ہے اور نقلِ الفاظ ہر جگہ بعینہ ضروری نہیں، روایت بالمعنیٰ بھی ہوسکتی ہے، اتحادِ مضمون ومفہوم کے بعد اختلافِ الفاظ قابلِ نظر نہیں۔

ابلیس کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ بارگاہِ عزت وجلال میں ایسی بیباکانہ گفتگو کی

رب العزت جل شانہ کی بارگاہِ قدس میں فرشتوں اور رسولوں کو بھی ہیبت وجلال کی بناء پر مجال دم زدنی نہیں تھی، ابلیس کو ایسی جرأت کیسے ہوگئی، علماء نے فرمایا کہ یہ قہر الٰہی کا انتہائی سخت مظہر

تو اب وہ ممانعت باقی نہ رہی اور ان دونوں کے روبرو اس بات پر قسم کھائی کہ یقین جانئے میں آپ دونوں کا دل سے خیر خواہ ہوں تو ایسی باتیں بنا کر ان دونوں کو فریب سے نیچے لے آیا، (نیچے لانا باعتبار حالت اور رائے کے بھی تھا کہ اپنی رائے عالی کو چھوڑ کر اس دشمن کی رائے پر مائل ہوگئے، اور مقام کے اعتبار سے بھی کہ جنت سے سفل کی طرف اتارے گئے) پس ان دونوں نے جو درخت کو چکھا فوراً دونوں کا مستور بدن ایک دوسرے کے سامنے کھل گیا، (یعنی جنت کا لباس اتر پڑا) اور دونوں شرما گئے اور بدن چھپانے کے لئے دونوں اپنے (بدن کے) اوپر جنت کے (درختوں کے) پتے جوڑ جوڑ کر رکھنے لگے اور اس وقت ان کے رب نے ان کو پکارا، کیا میں تم دونوں کو اس درخت (کے کھانے) سے ممانعت نہ کر چکا تھا اور یہ نہ کہہ چکا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے، (اس کے بہکانے سے بچتے رہنا) دونوں کہنے لگے کہ اے ہمارے رب ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا کہ پوری احتیاط و تامل سے کام نہ لیا اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہم تباہ خسارہ میں پڑ جاویں گے، حق تعالیٰ نے (آدم و حوا علیہما السلام سے) فرمایا کہ (جنت سے نیچے زمین پر) ایسی حالت میں جاؤ کہ تم (یعنی تمہاری اولاد) باہم بعضے بعضوں کے دشمن رہو گے اور تمہارے واسطے زمین میں رہنے کی جگہ (تجویز کی گئی) ہے اور (سامان معیشت سے) نفع حاصل کرنا (تجویز ہوا) ہے، ایک وقت خاص تک (یعنی موت کے وقت تک) اور یہ بھی فرمایا کہ تم کو وہاں ہی زندگی بسر کرنا ہے اور وہاں ہی مرنا ہے اور اسی میں سے (قیامت کے روز) پھر پیدا ہو کر نکلنا ہے۔

معارف و مسائل

حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا جو قصہ آیات مذکورہ میں آیا ہے بعینہ یہ سب واقعہ سورۂ بقرہ کے چوتھے رکوع میں پوری تفصیل کے ساتھ آچکا ہے اور اس کے متعلق جس قدر سوالات و شبہات ہوسکتے ہیں ان سب کا تفصیلی جواب اور پوری تشریح مع دیگر فوائد کے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں صفحہ ۱۸۱ سے صفحہ ۱۴۴ تک لکھ دیا گیا ہے، ضرورت ہو تو وہاں دیکھ لیجئے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ

اے اولاد آدم کی ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمہاری شرمگاہیں اور اتارے

وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ

آرائش کے کپڑے اور لباس پرہیزگاری کا وہ سب سے بہتر ہے یہ نشانیاں ہیں اللہ کی قدرت کی

سامان ہو جائے گا کیونکہ ہم شیطانوں کو ان لوگوں کا رفیق بنا دیتے ہیں جو ایمان نہیں رکھتے (اگر بالکل ایمان نہیں تو پوری طرح شیطان اس پر مسلط ہو جاتا ہے، اور اگر ایمان تو ہے مگر کامل نہیں تو اسی قدر کم درجہ کا تسلط ہوتا ہے، بخلاف مومن کامل کے کہ اس پر شیطان کا بالکل قابو نہیں چلتا جیسا کہ قرآن کریم کی ایک آیت میں ہے: اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ)

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلے ایک پورے رکوع میں حضرت آدم علیہ السلام و شیطان رجیم کا واقعہ بیان فرمایا گیا تھا جس میں شیطانی اغواء کا پہلا اثر یہ ہوا تھا کہ آدم و حوا علیہما السلام کا جنتی لباس اتر گیا اور وہ ننگے رہ گئے، اور پتوں سے اپنے ستر کو چھپانے لگے۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے تمام اولاد آدم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ تمہارا لباس قدرت کی ایک عظیم نعمت ہے اس کی قدر کرو، یہاں خطاب صرف مسلمانوں کو نہیں، بلکہ پوری اولاد آدم کو ہے، اس میں اشارہ ہے کہ ستر پوشی اور لباس انسان کی فطری خواہش اور ضرورت ہے، بغیر امتیاز کسی مذہب و ملت کے سب ہی اس کے پابند ہیں، پھر اس کی تفصیل **میں تین قسم کے لباسوں کا ذکر فرمایا،**

اول لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ اس میں یواری مواراۃ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں چھپانے کے، اور سوآت سوءۃ کی جمع ہے، ان اعضاء انسانی کو سوءۃ کہا جاتا ہے جن کے کھلنے کو انسان فطرۃ برا اور قابل شرم سمجھتا ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہاری صلاح و فلاح کے لئے ایک ایسا لباس اتارا ہے جس سے تم اپنے قابل شرم اعضاء کو چھپا سکو۔

اس کے بعد فرمایا وَرِيْشًا، ریش اس لباس کو کہا جاتا ہے جو آدمی زینت و جمال کے لئے استعمال کرتا ہے، مراد یہ ہے کہ صرف ستر چھپانے کے لئے تو مختصر سا لباس کافی ہوتا ہے، مگر ہم نے تمہیں اس سے زیادہ لباس اس لئے عطا کیا کہ تم اس کے ذریعہ زینت و جمال حاصل کر سکو اور اپنی **ہیئت کو شائستہ بنا سکو۔**

اس جگہ قرآن کریم نے اَنْزَلْنَا یعنی اتارنے کا لفظ استعمال فرمایا ہے، مراد اس سے عطا کرنا ہے، یہ ضروری نہیں کہ آسمان سے بنا بنایا اترا ہو جیسے دوسری جگہ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ کا لفظ آیا ہے، یعنی ہم نے لوہا اتارا، جو سب کے سامنے زمین سے نکلتا ہے، البتہ دونوں جگہ لفظ اَنْزَلْنَا فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ جس طرح آسمان سے اترنے والی چیزوں میں کسی انسانی تدبیر اور صنعت کو دخل نہیں ہوتا اسی طرح لباس کا اصل مادہ جو روئی یا اون وغیرہ ہے اس میں کسی انسانی

تدبیر کو ذرہ برابر دخل نہیں، وہ محض قدرت حق تعالیٰ کا عطیہ ہیں، البتہ ان چیزوں سے اپنی راحت و آرام اور مزاج کے مناسب سردی گرمی سے بچنے کے لئے لباس بنا لینے میں انسانی صنعت گری کام کرتی ہے، اور وہ صنعت بھی حق تعالیٰ ہی کی بتلائی اور سکھائی ہوئی ہے، اس لئے حقیقت شناس نگاہ میں یہ سب حق تعالیٰ ہی کا ایسا عطیہ ہے جیسے آسمان سے اُتارا گیا ہو۔

لباس کے دو فائدے

اس میں لباس کے دو فائدے بتلائے گئے، ایک ستر پوشی، دوسرے سردی گرمی سے حفاظت اور آرائش بدن، اور پہلے فائدہ کو مقدم کرکے اس طرف اشارہ کر دیا کہ انسانی لباس کا اصل مقصد ستر پوشی ہے، اور یہی اس کا عام جانوروں سے امتیاز ہے، کہ جانوروں کا لباس جو قدرتی طور پر اُن کے بدن کا جزء بنا دیا گیا ہے اس کا کام صرف سردی گرمی سے حفاظت یا زینت ہے، ستر پوشی کا اس میں اتنا اہتمام نہیں، البتہ اعضاء مخصوصہ کی وضع ان کے بدن میں اس طرح رکھ دی ہے کہ بالکل کھلے نہ رہیں، کہیں اُن پر دُم کا پردہ کہیں دوسری طرح کا۔

اور حضرت آدم و حوا اور اغواء شیطانی کا واقعہ بیان کرنے کے بعد لباس کے ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے لئے ننگا ہونا اور قابل شرم اعضاء کا دوسروں کے سامنے کھلنا انتہائی ذلت و رسوائی اور بے حیائی کی علامت اور طرح طرح کے شر و فساد کا مقدمہ ہے۔

انسان پر شیطان کا پہلا حملہ اس کو ننگا کرنے کی صورت میں ہوا آج بھی شیطانی تہذیب انسان کو برہنہ یا نیم برہنہ کرنے میں لگی ہوئی ہے

اور یہی وجہ ہے کہ شیطان کا سب سے پہلا حملہ انسان کے خلاف اس راہ سے ہوا کہ اس کا لباس اُتر گیا، اور آج بھی شیطان اپنے شاگردوں کے ذریعے جب انسان کو گمراہ کرنا چاہتا ہے تو تہذیب و شائستگی کا نام لیکر سب سے پہلے اس کو برہنہ یا نیم برہنہ کرکے عام سڑکوں اور گلیوں میں کھڑا کر دیتا ہے اور شیطان نے جس کا نام ترقی رکھ دیا ہے وہ تو عورت کو شرم و حیاء سے محروم کرکے منظر عام پر نیم برہنہ حالت میں لے آنے کے بغیر حاصل ہی نہیں ہوتی۔

ایمان کے بعد سب سے پہلا فرض ستر پوشی ہے

شیطان نے انسان کے اس کمزور پہلو کو بھانپ کر پہلا حملہ انسان کی ستر پوشی پر کیا تو شریعت اسلام جو انسان کی ہر صلاح و فلاح کی کفیل ہے، اس نے ستر پوشی کا اہتمام اتنا کیا کہ ایمان کے بعد سب سے پہلا فرض ستر پوشی کو قرار دیا، نماز، روزہ وغیرہ سب اس کے بعد ہے۔

حضرت فاروق اعظم فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی شخص نیا لباس پہنے تو اس کو چاہئے کہ لباس پہننے کے وقت یہ دعا پڑھے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ کَسَانِیْ	یعنی شکر اس ذات کا جس نے مجھے لباس دیا

سے چھپا کر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس عمل کی چادر اڑھا کر اعلان کر دیتے ہیں نیک عمل ہو تو نیکی کا اور بُرا عمل ہو تو بُرائی کا۔ چادر اڑھانے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح بدن پر ڈالی ہوئی چادر سب کے سامنے ہوتی ہے، انسان کا عمل کتنا ہی پوشیدہ ہو اس کے ثمرات و آثار اس کے چہرے اور بدن پر اللہ تعالیٰ ظاہر کر دیتے ہیں، اور اس ارشاد کی سند میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی، وَرِيشًا ۚ وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ ۚ ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ

ظاہری لباس کا بھی اصل لباس التقویٰ کے لفظ سے اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ مقصد تقویٰ حاصل کرنا ہے ظاہری لباس کے ذریعہ ستر پوشی و زینت و تجمل سب کا اصل مقصد تقویٰ اور خوفِ خدا تعالیٰ ہے جس کا ظہور اس کے لباس میں بھی اس طرح ہونا چاہئے کہ اس میں پوری ستر پوشی ہو کہ قابلِ شرم اعضاء کا پورا پردہ ہو، وہ ننگے بھی نہ رہیں، اور لباس بدن پر ایسا چست بھی نہ ہو جس میں یہ اعضاء مثل ننگے کے نظر آئیں، نیز اس لباس میں فخر و غرور کا انداز بھی نہ ہو بلکہ تواضع کے آثار ہوں، اسراف بیجا بھی نہ ہو، ضرورت کے موافق کپڑا استعمال کیا جائے، عورتوں کے لئے مردانہ اور مردوں کے لئے زنانہ لباس بھی نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض و مکروہ ہے، لباس میں کسی دوسری قوم کی نقالی بھی نہ ہو جو اپنی قوم و ملت سے غداری اور اعراض کی علامت ہے، اس کے ساتھ ہی اخلاق و اعمال کی درستی بھی ہو جو لباس کا اصل مقصد ہے۔ آخر آیت میں فرمایا ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ، یعنی انسان کو لباس کی یہ تینوں قسمیں عطا فرمانا اللہ جل شانہ کی آیاتِ قدرت میں سے ہے تاکہ لوگ اس سے سبق حاصل کریں۔

دوسری آیت میں پھر تمام اولادِ آدم کو خطاب کر کے تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ اپنے ہر حال اور ہر کام میں مکرِ شیطانی سے بچتے رہو، ایسا نہ ہو کہ وہ تم کو پھر کسی فتنہ میں مبتلا کر دے، جیسا تمہارے ماں باپ حضرت آدم و حوا کو اس نے جنت سے نکلوایا، اور ان کا لباس اتروا کر ان کے ستر کھلنے کا سبب بنا، وہ تمہارا قدیم دشمن ہے، اس کی دشمنی کا ہمیشہ ہر وقت خیال رکھو۔

آخر آیت میں فرمایا إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۗ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ، اس میں لفظ قبیل کے معنی جماعت اور جتھے کے ہیں، جو جماعت ایک خاندان کی شریک ہو اس کو قبیلہ کہتے ہیں، اور عام جماعتوں کو قبیل کہا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ شیطان تمہارا ایسا دشمن ہے کہ وہ اور اس کے ساتھی تو تم کو دیکھتے ہیں، تم ان کو نہیں دیکھتے، اس لئے ان کا مکر و فریب تم پر چل جانے کے زیادہ امکانات ہیں۔

لیکن دوسری آیت میں یہ بھی بتلا دیا گیا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے اور مکر شیطانی سے ہوشیار رہنے والے ہیں، ان کے لئے شیطان کا جال نہایت کمزور ہے۔

اور اسی آیت کے آخر میں یہ بھی فرمایا کہ ہم نے شیاطین کو ان کا سرپرست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں رکھتے، اس میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ ایمان والوں کے لئے اس کے جال سے بچنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔

بعض حضرات سلف نے فرمایا کہ یہ دشمن جو ہمیں دیکھتا ہے اور ہم اس کو نہیں دیکھ سکتے اس کا علاج ہمارے لئے یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجائیں جو ان شیاطین کو اور ان کی نقل و حرکت کو دیکھتا ہے اور شیطان اس کو نہیں دیکھ سکتا۔

اور یہ ارشاد کہ انسان شیاطین کو نہیں دیکھ سکتا عادت اور عام حالات کے اعتبار سے ہے، خرق عادت کے طور پر کوئی انسان کبھی ان کو دیکھ لے یہ اس کے منافی نہیں، جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جنات کا آنا اور سوالات کرنا اور اسلام قبول کرنا وغیرہ صحیح روایات حدیث میں مذکور ہے (روح)

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا

اور جب کرتے ہیں کوئی برا کام تو کہتے ہیں کہ ہم نے دیکھا اسی طرح کرتے اپنے باپ دادوں کو اور اللہ نے

بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا

بھی ہم کو یہی حکم کیا ہے، تو کہہ دے کہ اللہ حکم نہیں کرتا برے کام کا، کیوں لگاتے ہو اللہ کے ذمہ وہ باتیں

لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۸﴾ قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ ۖ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ

جو تم کو معلوم نہیں، تو کہہ دے کہ میرے رب نے حکم دیا ہے انصاف کا، اور سیدھے کرو اپنے منہ

عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ كَمَا بَدَأَكُمْ

ہر نماز کے وقت اور پکارو اس کو خالص اس کے فرمانبردار ہو کر، جیسا تم کو پہلے پیدا کیا

تَعُودُونَ ﴿۲۹﴾ فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ ۗ

دوسری بار بھی پیدا ہوگے، ایک فرقہ کو ہدایت کی اور ایک فرقہ پر مقرر ہو چکی گمراہی،

إِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ

انھوں نے بنایا شیطانوں کو رفیق اللہ کو چھوڑ کر اور سمجھتے ہیں کہ

أَنَّهُم مُّهْتَدُونَ ﴿۳۰﴾ يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ

وہ ہدایت پر ہیں، اے اولاد آدم کی لے لو اپنی آرائش ہر نماز کے

مَسْجِدٍ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴿۳۱﴾

وقت اور کھاؤ اور پیو اور بے جا خرچ نہ کرو اس کو خوش نہیں آتے بیجا خرچ کرنے والے

ع ۳ ۱۰

خلاصۂ تفسیر

اور وہ لوگ جب کوئی فحش کام کرتے ہیں، یعنی ایسا کام جس کی برائی کھلی ہوئی ہو اور انسانی فطرت اس کو برا سمجھتی ہو جیسے ننگے ہو کر طواف کرنا، تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو اسی طریق پر پایا ہے اور نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ نے بھی ہم کو یہی بتلایا ہے، (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جاہلانہ استدلال کے جواب میں) آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ فحش کام کی کبھی تعلیم نہیں دیتا، کیا (تم یہ دعویٰ کرکے) خدا کے ذمہ ایسی باتیں لگاتے ہو جس کی تم کوئی سند نہیں رکھتے، آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (تم نے جن فحش و غلط کاموں کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے وہ تو غلط ہے اب وہ بات سنو جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے واقعی طور پر دیا ہے وہ یہ ہے کہ) میرے رب نے تو حکم دیا ہے انصاف کرنے کا، اور یہ کہ تم ہر سجدہ (یعنی عبادت) کے وقت اپنا رخ سیدھا (اللہ کی طرف) رکھا کرو (یعنی کسی مخلوق کو اس کی عبادت میں شریک نہ کرو) اور اللہ کی عبادت اس طور پر کرو کہ اس عبادت کو خالص اللہ ہی کے واسطے رکھا کرو (اس مختصر جملہ میں تمام مامورات شرعیہ اجمالاً آگئے، قسط میں حقوق العباد، وجوہ میں اعمال و طاعت، مخلصین میں عقائد) تم کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح شروع میں پیدا کیا تھا اسی طرح تم (ایک وقت) پھر دوبارہ پیدا ہوگے بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے (دنیا میں) ہدایت کی ہے (ان کو اس وقت جزا ملے گی) اور بعض پر گمراہی کا ثبوت ہوچکا ہے (ان کو سزا ملے گی) ان لوگوں نے شیطانوں کو اپنا رفیق بنالیا، اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور (باوجود اس کے پھر اپنی نسبت) خیال رکھتے ہیں کہ وہ راست پر ہیں، اے اولادِ آدم تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت (نماز کے لئے ہو یا طواف کے لئے) اپنا لباس پہن لیا کرو اور (جس طرح ترکِ لباس گناہ تھا، ایسے ہی حلال چیزوں کے کھانے پینے کو ناجائز سمجھنا بھی بڑا گناہ ہے، اس لئے حلال چیزوں کو) خوب کھاؤ اور پیو اور حدِ شرعی سے مت نکلو، بیشک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے حد سے نکل جانے والوں کو۔

معارف و مسائل

اسلام سے پہلے جاہلیت عرب کے زمانہ میں شیطان نے لوگوں کو جن شرمناک اور بیہودہ رسموں میں مبتلا کر رکھا تھا ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ قریش کے سوا کوئی شخص بیت اللہ کا طواف اپنے کپڑوں میں نہیں کر سکتا تھا، بلکہ یا وہ کسی قریشی سے اس کا لباس عاریت کے طور پر مانگے یا پھر ننگا طواف کرے۔

اور ظاہر ہے کہ سارے عرب کے لوگوں کو قریش کے لوگ کہاں تک کپڑے دے سکتے تھے، اس لئے ہوتا یہی تھا کہ یہ لوگ ننگے ہی طواف کرتے تھے، مرد بھی عورتیں بھی، اور عورتیں عموماً رات کے اندھیرے میں طواف کرتی تھیں، اور اپنے اس فعل کی شیطانی حکمت یہ بیان کرتے تھے کہ جن کپڑوں میں ہم نے گناہ کئے ہیں انہی کپڑوں میں بیت اللہ کے گرد طواف کرنا خلاف ادب ہے، اور یہ عقل کے اندھے یہ نہ سمجھتے تھے کہ ننگا طواف کرنا اس سے زیادہ خلاف ادب اور خلافِ انسانیت ہے) صرف قریش کا قبیلہ بوجہ خدامِ حرم ہونے کے اس خرابی کے قانون سے مستثنیٰ سمجھا جاتا تھا۔

آیت مذکورہ میں پہلی آیت اسی بیہودہ رسم کو مٹانے اور اس کی خرابی کو بتلانے کے لئے نازل ہوئی ہے، اس آیت میں فرمایا کہ جب یہ لوگ کوئی فحش کام کرتے تھے تو جو لوگ ان کو اس فحش کام سے منع کرتے تو ان کا جواب یہ ہوتا تھا کہ ہمارے باپ دادا اور بڑے بوڑھے یونہی کرتے آئے ہیں، ان کے طریقہ کو چھوڑنا عار اور شرم کی بات ہے، اور یہ بھی کہتے تھے کہ ہمیں اللہ نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔ (ابن کثیر)

اس آیت میں فحش کام سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک یہی ننگا طواف ہے، اور دراصل یہ لفظ فحش، فحشاء، فاحشہ ہر ایسے برے کام کو کہا جاتا ہے جس کی برائی انتہا کو پہنچی ہوئی ہو، اور عقل و فہم اور فطرت سلیمہ کے نزدیک بالکل واضح اور کھلی ہوئی ہو (مظہری) اور اس درجہ میں حسن و قبح کا عقلی ہونا سب کے نزدیک مسلّم ہے (روح)

پھر ان لوگوں نے اس بیہودہ رسم کے جواز کے لئے دو دلیلیں پیش کیں، ایک تقلید آبائی کہ باپ دادوں کے طریقہ کو قائم رکھنا ہی خیر اور بھلائی ہے، اس کا جواب تو بالکل واضح اور کھلا ہوا تھا کہ جاہل باپ دادوں کا اتباع کوئی معقول چیز نہیں، ذرا سی عقل و ہوش رکھنے والا انسان بھی اس کو سمجھ سکتا ہے، کہ کسی طریقہ کے جواز کی یہ کوئی دلیل نہیں ہو سکتی کہ باپ دادا ایسا کرتے تھے، کیونکہ اگر کسی طریقہ اور کسی عمل کی صحت اور جواز کے لئے باپ دادوں کا طریقہ ہونا کافی سمجھا جاوے تو دنیا میں مختلف لوگوں کے باپ دادا مختلف اور متضاد طریقوں پر عمل کیا کرتے تھے اس دلیل سے تو دنیا بھر کے سارے گمراہ کن طریقے جائز اور صحیح قرار پاتے ہیں، غرض ان جاہلوں کی یہ دلیل کچھ قابل توجہ نہ تھی، اس لئے یہاں قرآن کریم نے اس کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور دوسری روایت میں اس کا بھی جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر باپ دادا کوئی جہالت کا کام کریں تو وہ کس طرح قابلِ تقلید و اتباع ہو سکتا ہے۔

دوسری دلیل ان لوگوں نے اپنے ننگے طواف کے جواز پر یہ پیش کی کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی حکم دیا ہے یہ سراسر بہتان اور حق تعالیٰ کے حکم کے خلاف اس کی طرف ایک غلط

حکم کو منسوب کرتا ہے، اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا، قُلْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ، یعنی آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کبھی کسی فحش کام کا حکم نہیں دیا کرتے، کیونکہ ایسا حکم دینا حکمت اور شانِ قدوسی کے خلاف ہے، پھر ان لوگوں کے اس بہتان و افتراء علی اللہ اور باطل خیال کو پوری طرح رد کرنے کے لئے ان لوگوں کو اس طرح تنبیہ کی گئی، اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی کیا تم لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی چیزوں کو منسوب کرتے ہو جس کا تم کو علم نہیں، یعنی جس کے یقین کرنے کے لئے تمہارے پاس کوئی حجت نہیں، اور ظاہر ہے کہ بلا تحقیق کسی شخص کی طرف بھی کسی کام کو منسوب کرنا انتہائی دلیری اور ظلم ہے تو اللہ جل شانہ کی طرف کسی نقل کی ایسی غلط نسبت کرنا کتنا بڑا جرم اور ظلم ہوگا، حضرات مجتہدین آیاتِ قرآنی سے بذریعہ اجتہاد جو احکام نکالتے اور بیان کرتے ہیں وہ اس میں داخل نہیں، کیونکہ ان کا استخراج قرآن کے الفاظ و ارشادات سے ایک حجت کے ماتحت ہوتا ہے۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف ننگے طواف کے جائز کرنے کی غلط نسبت کرنے والے جاہلوں سے آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ قسط کا حکم دیا کرتے ہیں، قسط کے اصلی معنی انصاف و اعتدال کے ہیں، اور اس جگہ قسط سے مراد وہ عمل ہے جو افراط و تفریط سے خالی ہو، یعنی نہ اس میں کوتاہی ہو اور نہ مقررہ حد سے تجاوز ہو، جیسا کہ تمام احکام شرعیہ کا یہی حال ہے، اس لئے لفظ قسط کے مفہوم میں تمام عبادات اور طاعات اور عام احکام شرعیہ داخل ہیں (روح المعانی)

اس آیت میں قسط یعنی انصاف و اعتدال کا حکم بیان کرنے کے بعد ان لوگوں کی گمراہی اور بے راہی کے مناسب احکام شرعیہ سے دو حکم خصوصیت کے ساتھ بیان فرمائے گئے، ایک اَقِیْمُوْا وُجُوْھَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ، اور دوسرا اُدْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ پہلا حکم انسان کے ظاہری اعمال سے متعلق ہے، اور دوسرا اس کے قلب اور باطن سے تعلق رکھتا ہے، پہلے حکم میں لفظ مسجد اکثر مفسرین کے نزدیک بمعنی سجدہ و عبادت آیا ہے، اور معنی یہ ہیں کہ ہر عبادت و نماز کے وقت اپنا رُخ سیدھا رکھا کرو، اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ نماز کے وقت اپنا رُخ سیدھا ٹھیک قبلہ کی طرف کرنے کا اہتمام کرو، اور رُخ سیدھا کرنے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اپنے ہر قول و فعل اور ہر عمل میں اپنا رُخ اپنے رب کے حکم کے تابع رکھو، اس سے اِدھر اُدھر نہ ہونے پاوے، اس معنی کے لحاظ سے یہ حکم صرف نماز کے لئے خاص نہیں، بلکہ تمام عبادات و معاملات پر حاوی ہے۔

اور دوسرے حکم کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس طرح پکارو کہ عبادت خالص اسی کی ہو

اس میں کسی دوسرے کی شرکت کسی حیثیت سے نہ ہو، یہاں تک کہ شرکِ خفی یعنی ریا، نمود سے بھی پاک ہو۔

ان دونوں حکموں کو ساتھ ذکر کرنے سے اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ انسان پر لازم ہے کہ اپنے ظاہر و باطن دونوں کو احکامِ شریعت کے مطابق درست کرے، نہ صرف ظاہری اطاعت بغیر اخلاص کے کافی ہے، اور نہ محض اخلاصِ باطنی بغیر ظاہری اتباعِ شریعت کے کافی ہو سکتا ہے، بلکہ ہر شخص پر لازم ہے کہ اپنے ظاہر کو بھی شریعت کے مطابق درست کرے اور باطن کو بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خالص رکھے۔ اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوتی ہے جو شریعت و طریقت کو مختلف طریقے سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ طریقت کے مطابق باطن کو درست کر لینا کافی ہے گو شریعت کے خلاف کرتے رہیں یہ کھلی گمراہی ہے۔

آخرِ آیت میں ارشاد فرمایا کَمَا بَدَاَکُمۡ تَعُوۡدُوۡنَ، یعنی اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمہیں اول پیدا فرمایا تھا اسی طرح قیامت کے روز دوبارہ تمہیں زندہ کر کے کھڑا کر دیں گے۔ اس کی قدرتِ کاملہ کے آگے یہ کوئی مشکل چیز نہیں، اور شاید اسی آسانی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے یُعِیۡدُکُمۡ کے بجائے تَعُوۡدُوۡنَ فرمایا کہ دوبارہ پیدا ہونے کے لئے کسی خاص عمل و سعی کی ضرورت نہیں (روح)

اس جملہ کو اس جگہ لانے کی ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ احکامِ شرعیہ پر پوری طرح قائم رہنا انسان کے لئے آسان ہو جائے، کیونکہ فکرِ آخرت اور قیامت اور اس میں اپنے بُرے اعمال کی جزاء و سزا کا تصور ہی وہ چیز ہے جو انسان کے لئے ہر مشکل کو آسان اور ہر تکلیف کو راحت بنا سکتی ہے، اور تجربہ شاہد ہے کہ جب تک انسان پر یہ خوف مسلط نہ ہو نہ کوئی وعظ و پند اس کو سیدھا کر سکتا ہے، اور نہ کسی قانون کی پابندی اس کو جرائم سے روک سکتی ہے۔

تیسری آیت میں فرمایا کہ جن لوگوں کو تو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ہے اور بعض پر گمراہی کا ثبوت ہو چکا ہے، کیونکہ ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا رفیق اور دوست بنا لیا، اور یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ راہ پر ہیں۔

مراد یہ ہے کہ گو اللہ جل شانہٗ کی ہدایت عام تھی مگر ان لوگوں نے اس ہدایت سے مُنہ موڑا اور شیطانوں کا اتباع کرنے لگے، اور ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ یہ اپنی بیماری ہی کو صحت اور گمراہی کو ہدایت خیال کرنے لگے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ احکامِ شرعیہ سے جہل اور ناواقفیت کوئی عذر نہیں، ایک شخص اگر غلط راستہ کو صحیح سمجھ کر پورے اخلاص کے ساتھ اختیار کر لے تو وہ اللہ کے نزدیک معذور نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو ہوش و حواس اور عقل و دانش اسی لئے دی ہے کہ وہ اس سے

کام لے کر کھرے کھوٹے اور غلط صحیح کو پہچانے، پھر اس کو صرف اس کی عقل و دانش پر نہیں چھوڑا، اپنے انبیاء بھیجے، کتابیں نازل فرمائیں جن کے ذریعے صحیح و غلط اور حق و باطل کو خوب کھول کر واضح کر دیا۔

اگر کسی شخص کو اس پر شبہ ہو کہ ایک شخص جو واقع میں اپنے کو حق پر سمجھتا ہو گو غلطی پر ہو پھر اس پر کیا الزام ہے، وہ معذور ہونا چاہئے، کیونکہ اس کو اپنی غلطی کی اطلاع ہی نہیں۔ تو جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو عقل و ہوش بھی اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم عطا فرما دی ہیں جن کے ذریعے کم از کم اس کو اپنے اختیار کئے ہوئے طریقہ کے خلاف کا احتمال اور تردد ضرور ہو جانا چاہئے، اب اس کا قصور یہ ہے کہ اس نے ان چیزوں کی طرف کوئی دھیان نہ دیا، اور جس غلط طریقہ کو اختیار کر لیا تھا اس پر جما رہا۔

البتہ جو شخص طلب حق میں اپنی پوری کوشش خرچ کر چکا، اور پھر بھی اس کی نظر صحیح راستہ اور حق بات کی طرف نہ پہونچی وہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معذور ہو، جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ میں فرمایا ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

چوتھی آیت میں ارشاد فرمایا: اے اولاد آدم! تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو اور خوب کھاؤ اور پیو اور حد سے نہ نکلو، بیشک اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ زمانہ جاہلیت کے عرب جیسا کہ بیت اللہ کا طواف ننگے ہو کر کرنے کو صحیح عبادت اور بیت اللہ کا احترام سمجھتے تھے اسی طرح ان میں یہ رسم بھی تھی کہ ایام حج میں کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے، صرف اتنا کھاتے تھے جس سے سانس چلتا رہے، خصوصاً گھی، دودھ اور پاکیزہ غذاؤں سے بالکل اجتناب کرتے تھے (ابن جریر)

ان کے اس بیہودہ طریقہ کار کے خلاف یہ آیت نازل ہوئی جس نے بتلایا کہ ننگے ہو کر طواف کرنا بے حیائی اور سخت بے ادبی ہے، اس سے اجتناب کریں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی پاکیزہ غذاؤں سے بلاوجہ اجتناب کرنا بھی کوئی دین کی بات نہیں بلکہ اس کی حلال کی ہوئی چیزوں کو اپنے اوپر حرام ٹھہرانا گستاخی اور عبادت میں حد سے تجاوز کرنا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتے، اس لئے ایام حج میں خوب کھاؤ پیو ہاں اسراف نہ کرو، حلال غذاؤں سے بالکل اجتناب کرنا بھی اسراف میں داخل ہے، اور حج کے اصل مقاصد ذکر اللہ سے غافل ہو کر کھانے پینے ہی میں مشغول رہنا بھی اسراف میں داخل ہے۔

یہ آیت اگرچہ جاہلیت عرب کی ایک خاص رسم عریانی کو مٹانے کے لئے نازل ہوئی ہے جس کو وہ طواف کے وقت بیت اللہ کی تعظیم کے نام پر کیا کرتے تھے، لیکن ائمہ تفسیر اور

فقہاء امت کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی حکم کے کسی خاص واقعہ میں نازل ہونے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ حکم اسی واقعہ کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے جو جو چیزیں ان الفاظ کے **عموم میں شامل ہوتی ہیں سب پر یہی حکم عائد ہوتا ہے۔**

نماز میں ستر پوشی فرض ہے اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی

اسی لئے اس آیت سے جمہور صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین نے یہ حکم نکالا ہے کہ اس آیت کی رو سے جس طرح ننگے طواف کو منع کیا گیا ہے، اسی طرح ننگے نماز پڑھنا بھی حرام اور باطل ہے، کیونکہ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اَلطَّوَافُ بِالْبَيْتِ صَلٰوةٌ، اس کے علاوہ خود اسی آیت میں جبکہ لفظ مسجد سے جمہور مفسرین کے نزدیک سجدہ ہے، تو بحالت سجدہ عریانی کی ممانعت خود آیت میں صراحت سے آجاتی ہے اور جب سجدہ میں ممنوع ہوئی تو رکوع اور قیام و قعود اور نماز کے تمام افعال میں اس کا لازم ہونا ظاہر ہے۔

پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اور بھی واضح کر دیا، ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ کسی بالغ عورت کی نماز بغیر دوپٹے کے جائز نہیں (ترمذی)۔

اور نماز کے علاوہ دوسرے حالات میں بھی ستر پوشی کا فرض ہونا دوسری آیات و روایات سے ثابت ہے جن میں سے ایک آیت اسی سورت میں گذر چکی ہے، یعنی يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ

خلاصہ یہ ہے کہ ستر پوشی انسان کے لئے پہلا انسانی اور اسلامی فرض ہے جو ہر حالت میں اس پر **لازم ہے نماز اور طواف میں بدرجۂ اولیٰ فرض ہے۔**

نماز کے لئے اچھا لباس

دوسرا مسئلہ اس آیت میں یہ ہے کہ لباس کو لفظ زینت سے تعبیر کر کے اس طرف بھی اشارہ فرما دیا گیا کہ نماز میں افضل و اولیٰ یہ ہے کہ صرف ستر پوشی پر کفایت نہ کی جائے بلکہ اپنی وسعت کے مطابق لباس زینت اختیار کیا جائے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ نماز کے وقت اپنا سب سے بہتر لباس پہنتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جمال کو پسند فرماتے ہیں اس لئے میں اپنے رب کے لئے زینت و جمال اختیار کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:
خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ

معلوم ہوا کہ اس آیت سے جیسا کہ نماز میں ستر پوشی کا فرض ہونا ثابت ہوتا ہے اسی طرح بقدر استطاعت صاف ستھرا اچھا لباس اختیار کرنے کی فضیلت اور استحباب بھی ثابت ہوتا ہے۔

نماز میں لباس کے متعلق چند مسائل

تیسرا مسئلہ اس جگہ یہ ہے کہ ستر جس کا چھپانا انسان پر ہر حال میں اور خصوصاً نماز و طواف میں فرض ہے، اس کی حد کیا ہے؟ قرآن کریم نے اجمالاً ستر پوشی کا حکم دے کر اس کی تفصیلات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کیا، آپ نے تفصیل کے

آسانی میسر ہو اس کو ترک کرے تو یہ سنت کے خلاف ہے، ہاں حسب عادت نہ ہو تو یہ تکلف نہ کرے کہ کسی کسی طرح اچھی ہی حاصل کرے خواہ قرض لینا پڑے یا اس کی فکر میں پڑے یا آپ کو کسی دوسری مشکل میں مبتلا کرنے کی نوبت آئے۔

اسی طرح عمدہ نفیس لباس یا عمدہ غذا میسر آئے تو یہ تکلف نہ کرے کہ اس کو رد کرے یا ٹھکرا دے یا اس کے استعمال سے پرہیز کرے جس طرح عمدہ لباس اور غذا کی جستجو تکلف ہے اسی طرح عمدہ کو خراب کرنا یا اس کو چھوڑ کر گھٹیا استعمال کرنا بھی تکلف و مذموم ہے۔

آیت کے آخری جملہ میں اس کی ایک خاص حکمت یہ بتلائی گئی ہے کہ دنیا کی تمام نعمتیں نفیس اور عمدہ لباس، پاکیزہ اور عمدہ غذائیں اصل میں تو صرف مومنین ہی کے لئے پیدا کی گئی ہیں، دوسرے لوگ ان کے طفیل میں ان کو پاتے ہیں، کیونکہ یہ دنیا دار العمل ہے دار الجزاء نہیں، یہاں کھرے کھوٹے اور اچھے برے کا امتیاز دنیا کی نعمتوں میں نہیں کیا جا سکتا بلکہ رب العالمین دنیا کی نعمتوں کا یہ دسترخوان عام یہاں سب کے لئے یکساں بچھا ہوا ہے، بلکہ دنیا میں عادۃ اللہ یہ ہے کہ اگر مومن و فرمانبردار بندوں سے طاعت شعاری میں کچھ کمی ہو جاتی ہے تو دوسرے لوگ ان پر غالب آ کر دنیوی نعمتوں کے خزانوں پر قابض ہو جاتے ہیں، اور یہ فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

مگر یہ قانون صرف اسی دار العمل دنیا کے اندر ہے، دار آخرت میں ساری نعمتیں اور راحتیں صرف اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اطاعت شعار بندوں کے لئے مخصوص ہوں گی، یہی معنی ہیں آیت کے اس جملہ کے قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ، یعنی آپ کہہ دیجئے کہ دنیا کی سب نعمتیں حیات دنیا میں بھی دراصل مومنین ہی کا حق ہیں اور قیامت کے دن تو خالص انہی کے ساتھ مخصوص ہوں گی۔

اور حضرت عبداللہ بن عباس نے اس جملہ کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ دنیا کی ساری نعمتیں اور راحتیں اس خاص کیفیت کے ساتھ کہ وہ آخرت میں وبال نہ بنیں صرف فرمانبردار مومنین کا حصہ ہے، بخلاف کفار و فجار کے کہ گو دنیا میں نعمتیں ان کو بھی ملتی ہیں بلکہ زیادہ ملتی ہیں، مگر ان کی یہ نعمتیں آخرت میں وبال جان اور عذاب دائمی بننے والی ہیں، اس لئے نتیجہ کے اعتبار سے ان کے لئے یہ کوئی عزت و راحت کی چیز نہ ہوئی۔

اور بعض حضرات مفسرین نے اس کے یہ معنی قرار دیئے کہ دنیا میں ساری نعمتوں اور راحتوں کے ساتھ محنت و مشقت اور پھر زوال کا خطرہ اور پھر طرح طرح کے رنج و غم لگے ہوئے ہیں، خالص نعمت اور خالص راحت کا یہاں وجود ہی نہیں، البتہ قیامت میں جب ان کو یہ نعمتیں ملیں گی وہ خالص ہو کر ملیں گی، نہ ان کے ساتھ کوئی محنت و مشقت ہوگی اور نہ ان کے زوال یا نقصان کا کوئی خطرہ، اور نہ ان کے

كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى

جھٹلاوے اس کے حکموں کو وہ لوگ ہیں کہ ملے گا ان کو جو ان کا حصہ لکھا ہوا ہے کتاب میں، یہاں تک

اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ

کہ جب پہنچیں ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے ان کی جان لینے کو تو کہیں کیا ہوئے وہ جن کو تم پکارا کرتے تھے

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا

سوائے اللہ کے، بولیں گے وہ ہم سے کھوئے گئے اور اقرار کریں گے اپنے اوپر کہ بیشک وہ

كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ

کافر تھے، فرمائے گا داخل ہو جاؤ ہمراہ اور امتوں کے جو تم سے پہلے ہو چکی ہیں جن اور

وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا

آدمیوں میں سے دوزخ کے اندر، جب داخل ہوگی ایک امت تو لعنت کرے گی دوسری امت کو، یہاں تک کہ

فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا

جب گر چکیں گے اس میں سارے تو کہیں گے ان کے پچھلے پہلوں کو اے رب ہمارے ہم کو انہی نے گمراہ کیا،

فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا

سو تو ان کو دے دونا عذاب آگ کا، فرمائے گا کہ دونوں کو دوگنا ہے لیکن تم

تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا

نہیں جانتے، اور کہیں گے ان کے پہلے پچھلوں کو پس کچھ نہ ہوئی تم کو ہم پر

مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾

بڑائی، اب چکھو عذاب بسبب اپنی کمائی کے

ع ۴ / ۸ / ۱۱

خلاصۂ تفسیر

(ہم نے عالم ارواح ہی میں کہہ دیا تھا) اے اولاد آدم کی اگر تمہارے پاس پیغمبر آویں جو تم ہی میں سے ہوں گے جو میرے احکام تم سے بیان کریں گے سو (ان کے آنے پر) جو شخص (تم میں ان آیات کی تکذیب سے) پرہیز رکھے اور (اعمال کی) درستی کرے (مراد یہ کہ کامل اتباع کرے) سو ان لوگوں پر (آخرت میں) نہ کچھ اندیشہ (کی بات واقع ہونے والی) ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جو لوگ (تم میں سے) ہمارے ان احکام کو جھوٹا بتا دیں گے اور ان (کے قبول کرنے) سے

تکبر کریں گے وہ لوگ دوزخ (میں رہنے) والے ہوں گے، (اور) وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (جب تکذیب کرنے والوں کا مستحق وعید شدید ہونا اجمالاً معلوم ہو گیا سو اب تفصیل سنو کہ) اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے (یعنی جو بات خدا کی کہی ہوئی نہ ہو اس کو خدا کی کہی ہوئی کہے) یا اس کی آیتوں کو جھوٹا بتلاوے (یعنی جو بات خدا کی کہی ہوئی ہو اس کو بے کہی بتلاوے) ان لوگوں کے نصیب کا جو کچھ (رزق اور عمر) ہے وہ تو ان کو (دنیا میں) مل جاوے گا (لیکن آخرت میں مصیبت ہی مصیبت ہے) یہاں تک کہ (برزخ میں مرنے کے وقت تو ان کی یہ حالت ہوگی کہ) جب ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی جان قبض کرنے آویں گے تو (ان سے) کہیں گے کہ (کہو) وہ کہاں گئے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کیا کرتے تھے (اب اس مصیبت میں کیوں نہیں کام آتے) وہ (کفار) کہیں گے کہ ہم سے سب غائب ہو گئے (اور واقعی کوئی کام نہ آیا) اور (اس وقت) اپنے کافر ہونے کا اقرار کرنے لگیں گے (لیکن اس وقت کا اقرار محض بے کار ہوگا اور بعض آیات میں ایسے ہی سوال و جواب کا وقوع قیامت میں بھی مذکور ہے سو دونوں وقتوں میں ہونا ممکن ہے اور قیامت میں ان کا یہ حال ہوگا کہ) اللہ تعالیٰ فرماوے گا کہ جو فرقے کفار کے تم سے پہلے گذر چکے ہیں جنات میں سے بھی اور آدمیوں میں سے بھی ان کے ساتھ تم بھی دوزخ میں جاؤ (چنانچہ اگلے پچھلے سب کفار اس میں داخل ہوں گے، اور یہ کیفیت واقع ہوگی کہ) جس وقت بھی کوئی جماعت (کفار کی) داخل (دوزخ) ہوگی اپنی جیسی دوسری جماعت کو بھی (جو اس جیسے کافر ہوں گے اور ان سے پہلے دوزخ میں جا چکے ہوں گے) لعنت کرے گی (یعنی باہم ہمدردی نہ ہوگی بلکہ بوجہ انکشاف حقائق کے ہر شخص دوسرے کو بری نظر سے دیکھے گا اور برا کہے گا) یہاں تک کہ جب اس (دوزخ) میں سب جمع ہو جاویں گے تو اس وقت پچھلے لوگ (جو بعد میں داخل ہوئے ہوں گے اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو کفر میں دوسروں کے تابع تھے) پہلے (داخل ہونے والے) لوگوں کی نسبت (یعنی ان لوگوں کی نسبت جو بوجہ رئیس و پیشوائے کفر ہونے کے دوزخ میں پہلے داخل ہوں گے یوں) کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ان لوگوں نے گمراہ کیا تھا سو ان کو دوزخ کا عذاب (ہم سے) دوگنا دیجئے، (اللہ تعالیٰ) ارشاد فرمائیں گے کہ (ان کو دوگنا ہونے سے تم کو کونسی تسلی و راحت ہو جاوے گی بلکہ چونکہ تمہارا عذاب بھی ہمیشہ آناً فاناً بڑھتا جاوے گا، اس لئے تمہارا عذاب بھی ان کے دوگنے عذاب ہی جیسا ہو گیا پس اس حساب سے) سب ہی کا (عذاب) دوگنا ہے لیکن (ابھی) تم کو (پوری) خبر نہیں کیونکہ ابھی تو عذاب کی ابتداء ہی ہے، اس تزاید کو دیکھا نہیں اس لئے ایسی باتیں بنا رہے ہو جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کے تضعیف عذاب کو اپنے لئے موجب شفاء غیظ و باعث تسلی سمجھتے ہو) اور پہلے (داخل ہونے والے) لوگ پچھلے (داخل ہونے والے) لوگوں سے (خدا تعالیٰ کے اس جواب سے مطلع ہو کر) کہیں گے (کہ جب سب کی سزا کی یہ حالت ہے) تو پھر تم کو ہم پر (تخفیف عذاب کے بارے میں) کوئی فوقیت نہیں (کیونکہ

تحقیق ... کے مقابلہ میں عذاب ... کا مزہ چکھتے رہو۔

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ

بیشک جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور ان کے مقابلہ میں تکبر کیا نہ کھولے جائیں گے ان کے لئے

أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي

دروازے آسمان کے اور نہ داخل ہوں گے جنت میں یہاں تک کہ گھس جاوے اونٹ سوئی

سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ﴿٤٠﴾ لَهُم مِّن جَهَنَّمَ

کے ناکے میں اور یوں ہم بدلہ دیتے ہیں گنہگاروں کو ان کے واسطے دوزخ کا بچھونا

مِهَادٌ وَمِن فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿٤١﴾

ہے اور اوپر سے اوڑھنا اور یہی ہم سزا دیتے ہیں ظالموں کو

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا

اور جو ایمان لائے اور کیں نیکیاں ہم بوجھ نہیں رکھتے کسی پر مگر اس کی طاقت کے موافق

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٤٢﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِي

وہی ہیں جنت میں رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے اور نکال لیں گے ہم جو کچھ

صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ ۖ وَقَالُوا الْحَمْدُ

ان کے دلوں میں خفگی تھی بہتی ہوں گی ان کے نیچے نہریں اور وہ کہیں گے شکر

لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا

اللہ کا جس نے ہم کو یہاں تک پہنچا دیا اور ہم نہ تھے راہ پانے والے اگر نہ ہدایت کرتا ہم کو

اللَّهُ ۖ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۖ وَنُودُوا أَن تِلْكُمُ

اللہ بیشک لائے تھے رسول ہمارے رب کے سچی بات اور آواز آئے گی کہ یہ جنت

الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾

ہے وارث ہوئے تم اس کے بدلے میں اپنے اعمال کے

الثلثة

خلاصۂ تفسیر

یہ حالت تو کفار کے دخول نار کی ہوئی، اب حضرات اہل جنت کی کیفیت سنو کہ جو لوگ ہماری

سے سرکشی کرے اس کے لئے جہنم کا دائمی عذاب مقرر ہے، مذکور الصدر آیات میں اسی صورت واقعہ کا اظہار ہے کہ اس دنیا میں آنے کے بعد انسانوں کے مختلف گروہوں نے اختیار کی کہ بعض نے عہد میثاق کو بھلا دیا اور اس کی خلاف ورزی کی اور بعض اس پر قائم رہے، اور اس کے مطابق عمل صالح انجام دیئے، ان دونوں فریقوں کے انجام اور عذاب وثواب کا بیان ان چار آیات میں ہے۔

پہلی اور دوسری آیت میں عہد شکنی کرنے والے منکرین ومجرمین کا ذکر ہے، اور آخری دو آیتوں میں **عہد پورا کرنے والے مؤمنین ومتقین کا۔**

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا اور ہماری ہدایات اور آیات کے مقابلہ میں تکبر کے ساتھ پیش آئے ان کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے۔

تفسیر بحر محیط میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کی یہ تفسیر نقل کی ہے کہ نہ ان لوگوں کے اعمال کے لئے آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے نہ ان کی دعاؤں کیلئے، مطلب یہ ہے کہ ان کی دعا قبول نہ کی جائے گی اور ان کے اعمال اس مقام پر جانے سے روک دیئے جائیں گے جہاں اللہ کے نیک بندوں کے اعمال محفوظ رکھے جاتے ہیں جس کا نام قرآن کریم نے سورۂ مطففین میں علیین بتلایا ہے، اور قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں بھی اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے، جس میں ارشاد ہے: اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ۔ یعنی انسان کے کلمات طیبات اللہ تعالیٰ کے پاس لے جائے جاتے ہیں، اور ان کا نیک عمل ان کو اٹھاتا ہے، یعنی انسان کے اعمال صالحہ اس کا سبب بنتے ہیں کہ اس کے کلمات طیبات حق تعالیٰ کی بارگاہ **خاص میں پہونچائے جاتے ہیں۔**

اور ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور دوسرے صحابۂ کرام سے اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی ہے کہ منکرین وکفار کی ارواح کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے، یہ روحیں نیچے پھینک دی جائیں گی اور اس مضمون کی تائید حضرت براء بن عازبؓ کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور امام احمد نے مفصل نقل کیا ہے جس کا اختصار یہ ہے کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی انصاری صحابی کے جنازہ میں تشریف لے گئے، ابھی قبر کی تیاری میں کچھ دیر تھی تو ایک جگہ بیٹھ گئے، اور صحابہ کرام آپ کے گرد خاموش بیٹھ گئے، آپ نے سر مبارک اٹھا کر فرمایا کہ مؤمن بندہ کے لئے جب موت کا وقت آتا ہے تو آسمان سے سفید چمکتے ہوئے چہروں والے فرشتے آتے ہیں جن کے ساتھ جنت کا کفن اور خوشبو ہوتی ہے، اور وہ مرنے والے کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں، پھر فرشتہ موت عزرائیل علیہ السلام آتے ہیں، اور اس کی روح کو خطاب کرتے ہیں کہ اے نفس مطمئنہ رب کی مغفرت اور خوشنودی کے لئے نکل، اس وقت اس کی روح اس طرح

بدن سے آسانی نکل جاتی ہے جیسے کسی مشکیزہ کا دہانہ کھول دیا جائے تو اس کا پانی نکل جاتا ہے، اس کی روح کو فرشتہ موت اپنے ہاتھ میں لے کر ان فرشتوں کے حوالہ کر دیتا ہے، یہ فرشتے اس کو لیکر چلتے ہیں جہاں کہیں کوئی فرشتوں کا گروہ ملتا ہے وہ پوچھتے ہیں یہ پاک روح کس کی ہے، یہ حضرات اس کا نام اور لقب لیتے ہیں جو عزت و احترام کے لئے اس کے واسطے دنیا میں استعمال کیا جاتا تھا، اور کہتے ہیں کہ یہ فلاں ابن فلاں ہے، یہاں تک کہ یہ فرشتے روح کو لے کر پہلے آسمان پر پہونچتے ہیں اور دروازہ کھلواتے ہیں، دروازہ کھولا جاتا ہے یہاں سے فرشتے بھی ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ ساتویں آسمان پر پہونچتے ہیں، اس وقت حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے کا اعمال نامہ علیین میں لکھو، اور اس کو واپس کر دو، یہ روح پھر لوٹ کر قبر میں آتی ہے، اور قبر میں حساب لینے والے فرشتے آکر اس کو بٹھاتے اور سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے اور تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ تعالیٰ ہے اور دین اسلام ہے، پھر سوال ہوتا ہے کہ یہ بزرگ جو تمہارے لئے بھیجے گئے ہیں کون ہیں؟ وہ کہتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اس وقت ایک آسمانی ندا آتی ہے کہ میرا بندہ سچا ہے، اس کے لئے جنت کا فرش بچھا دو، اور جنت کا لباس پہنا دو اور جنت کی طرف اس کا دروازہ کھول دو، اس دروازہ سے اس کو جنت کی خوشبوئیں اور ہوائیں آنے لگتی ہیں، اور اس کا نیک عمل ایک حسین صورت میں اس کے پاس اس کو مانوس کرنے کے لئے آجاتا ہے۔

اس کے بالمقابل کافر و منکر کا جب وقت موت آتا ہے تو آسمان سے سیاہ رنگ مہیب صورت فرشتے خراب قسم کا ٹاٹ لے کر آتے ہیں اور بالمقابل بیٹھ جاتے ہیں، پھر فرشتہ موت اس کی روح اس طرح نکالتا ہے جیسے کوئی خاردار شاخ گیلی اون میں لپٹی ہوئی ہو اس میں سے کھینچی جائے یہ روح نکلتی ہے تو اس کی بدبو مردار جانور کی بدبو سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے، فرشتے اس کو لے کر چلتے ہیں، راستہ میں جو دوسرے فرشتے ملتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ یہ کس کی خبیث روح ہے، یہ حضرات اس وقت اس کا وہ برے سے برا نام و لقب ذکر کرتے ہیں جن کے ساتھ وہ دنیا میں پکارا جاتا تھا کہ یہ فلاں بن فلاں ہے، یہاں تک کہ سب سے پہلے آسمان پر پہونچ کر دروازہ کھولنے کے لئے کہتے ہیں تو اس کے لئے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جاتا، بلکہ حکم یہ ہوتا ہے کہ اس بندہ کا اعمال نامہ سجین میں لکھو جہاں نافرمان بندوں کے اعمال نامے رکھے جاتے ہیں، اور اس روح کو پھینک دیا جاتا ہے، وہ بدن میں دوبارہ آتی ہے فرشتے اس کو بٹھا کر اس سے بھی وہی سوالات کرتے ہیں جو مومن بندہ سے کئے تھے یہ سب کا جواب یہ دیتا ہے هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِيْ، یعنی میں کچھ نہیں جانتا، اس کے لئے جہنم کا فرش، جہنم کا لباس دے دیا جاتا ہے، اور جہنم کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے جس سے اس کو جہنم کی آنچ اور گرمی پہونچتی رہتی ہے اور اس کی قبر اس پر تنگ کر دی جاتی ہے، نعوذ باللہ منہ

ذلت کی مصیبت دیکھ کر اپنی راحت و نعمت کی قدر زیادہ ہوگی۔ اور جو لوگ دنیا میں دینداروں پر ہنسا کرتے تھے اور ان کو ستایا کرتے تھے اور یہ کوئی انتقام نہ لیتے تھے آج ان لوگوں کو ذلت و خواری میں سخت عذاب میں مبتلا دیکھیں گے تو یہ ہنسیں گے کہ ان کے عمل کی ان کو سزا مل گئی، قرآن کریم میں یہی مضمون سورۂ مطففین میں اس طرح ارشاد ہوا ہے فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ۝ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ ۝ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝

اہل جہنم کو ان کی گمراہی پر تنبیہ اور ان کے احمقانہ کلمات پر ملامت فرشتوں کی طرف سے بھی ہوگی وہ ان کو مخاطب کر کے کہیں گے هٰذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ ۝ أَفَسِحْرٌ هٰذَا أَمْ أَنْتُمْ لَا تُبْصِرُونَ ۝ یعنی یہ ہے وہ آگ جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے اب دیکھو کہ کیا یہ جادو ہے یا تمہیں نظر نہیں آتا؟

اسی طرح آیات مذکورہ میں پہلی آیت میں ہے کہ اہل جنت اہل جہنم سے سوال کریں گے کہ ہمارے رب نے ہم سے جن نعمتوں اور راحتوں کا وعدہ کیا تھا ہم نے تو ان کو بالکل سچا اور پورا پایا تم بتلاؤ کہ تمہیں جس عذاب سے ڈرایا گیا تھا وہ بھی تمہارے سامنے آگیا یا نہیں، وہ اقرار کریں گے کہ بیشک ہم نے بھی اس کا مشاہدہ کرلیا۔

ان کے اس سوال و جواب کی تائید میں اللہ جل شانہ کی طرف سے کوئی فرشتہ یہ منادی کرے گا کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت اور پھٹکار ظالموں پر جو لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے تھے، اور یہ چاہتے تھے کہ ان کا راستہ بھی سیدھا نہ رہے، اور وہ آخرت کا انکار کیا کرتے تھے۔

اہل اعراف کون لوگ ہیں جنت و دوزخ والوں کے باہمی مکالمات کے ضمن میں ایک اور بات تیسری آیت میں یہ بتلائی گئی کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو جہنم سے تو نجات پاگئے مگر ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے، البتہ اس کے امیدوار ہیں کہ وہ بھی جنت میں داخل ہوجائیں، ان لوگوں کو اہل اعراف کہا جاتا ہے۔

اعراف کیا چیز ہے اس کی تشریح سورۂ حدید کی آیات سے ہوتی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں لوگوں کے تین گروہ ہوں گے، ایک کھلے کافر و مشرک ان کو تو پل صراط پر چلنے کی نوبت ہی نہ آئے گی، پہلے ہی جہنم کے دروازوں سے اس میں دھکیل دیئے جائیں گے، دوسرے مومنین ان کے ساتھ نور ایمان کی روشنی ہوگی تیسرے منافقین، یہ چونکہ دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ لگے رہے وہاں بھی شروع میں ساتھ لگے رہیں گے، اور پل صراط پر چلنا شروع ہوں گے، اس وقت ایک سخت اندھیری سب کو ڈھانپ لے گی، مومنین اپنے نور ایمان کی مدد سے آگے بڑھ جائیں گے اور منافقین پکار کر ان کو کہیں گے کہ ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی تمہاری روشنی سے فائدہ اٹھائیں، اس پر

رب کے پیغمبر (دنیا میں) سچی سچی باتیں لے کر آئے تھے (مگر ہم سے حماقت ہوئی) سو اب کیا کوئی ہمارا سفارشی ہے کہ وہ ہماری سفارش کردے یا کیا ہم پھر (دنیا میں) واپس بھیجے جاسکتے ہیں، تاکہ ہم لوگ (پھر دنیا میں جاکر) ان اعمال بد کے جن کو ہم کیا کرتے تھے برخلاف دوسرے اعمال (نیک) کریں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اب کوئی صورت نجات کی نہیں، بے شک ان لوگوں نے اپنے کو (کفر کرکے) خسارے میں ڈال دیا اور یہ جو جو باتیں تراشتے تھے (اس وقت) سب گم ہوگیا (اب بجز سزا کے اور کچھ نہ ہوگا)۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ

بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے پیدا کیے آسمان اور زمین چھ دن میں

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا ۙ وَّ

پھر قرار پکڑا عرش پر اڑھاتا ہے رات پر دن کہ وہ اس کے پیچھے لگا آتا ہے دوڑتا ہوا اور

الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرٰتٍ بِأَمْرِهٖ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ

پیدا کیے سورج اور چاند اور تارے تابعدار اپنے حکم کے سن لو اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور

الْأَمْرُ ۗ تَبٰرَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعٰلَمِينَ ﴿۵۴﴾

حکم فرمانا بڑی برکت والا ہے اللہ جو رب ہے سارے جہان کا

خلاصۂ تفسیر

بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز (کے برابر وقت) میں پیدا کیا پھر عرش پر (جو مشابہ ہے تخت سلطنت کے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو کہ اس کی شان کے لائق ہے، چھپا دیتا ہے شب (کی تاریکی) سے دن (کی روشنی) کو (یعنی شب کی تاریکی سے دن کی روشنی پوشیدہ اور زائل ہوجاتی ہے) ایسے طور پر کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے آ لیتی ہے (یعنی دن تمام ہوتے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دفعۃً رات آجاتی ہے) اور سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اس کے حکم (تکوینی) کے تابع ہیں، یاد رکھو اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا، بڑے کمالات والے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگار ہیں۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں آسمان و زمین اور سیارات و نجوم کے پیدا کرنے اور ایک خاص نظام محکم کے تابع اپنے اپنے کام میں لگے رہنے کا ذکر اور اس کے ضمن میں حق تعالیٰ کی قدرت مطلقہ

کا بیان کرکے ہر اہلِ عقل انسان کو اس کی دعوت فکر دی گئی ہے کہ جو ذات پاک اس عظیم الشان عالم کو عدم سے وجود میں لے آئی اور پھر ایک محکم نظام کے ساتھ چلا رہی ہے اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ اُن چیزوں کو معدوم کرکے قیامت کے روز دوبارہ پیدا فرمادے، اس لئے قیامت کا انکار چھوڑ کر صرف اسی ذات کو اپنا رب سمجھیں، اسی سے اپنی حاجات طلب کریں، اسی کی عبادت کریں، مخلوق پرستی کی دلدل سے نکلیں اور حقیقت کو پہچانیں، اس میں ارشاد فرمایا کہ تمہارا رب اللہ ہی ہے

جس نے آسمان اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا۔

آسمان و زمین کی تخلیق میں چھ روز کی مدت کیوں ہوئی

یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ تو اس پر قادر ہیں کہ یہ سارا جہان ایک آن میں پیدا فرمادیں، خود قرآن کریم میں مختلف عنوانات سے یہ بات بار بار ذکر کی گئی ہے کہیں ارشاد ہے وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ یعنی آنکھ جھپکنے کی مقدار میں ہمارا حکم نافذ ہوجاتا ہے، کہیں فرمایا ہے اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ، یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں تو فرمادیتے ہیں کہ ہوجا وہ پیدا ہوجاتی ہے" پھر پیدائش عالم کے لئے چھ روز صرف ہونے کی کیا وجہ ہے؟

مفسر القرآن حضرت سعید بن جبیرؓ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ قدرت حق تعالیٰ تو بیشک اس پر حاوی ہے کہ یہ سب کچھ ایک آن میں پیدا کردیں، لیکن بتقاضائے حکمت اس عالم کی تخلیق میں چھ دن لگائے گئے، تاکہ انسان کو نظام عالم کے چلانے میں تدریج اور پختہ کاری کی تعلیم دی جائے جیسا کہ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غور و فکر، وقار و تدریج کے ساتھ کام کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے (مظہری بحوالہ شعب بیہقی)

مطلب یہ ہے کہ جلد بازی میں انسان مسئلہ کے ہر پہلو پر غور و فکر نہیں کرسکتا، اس لئے آخر کام خراب ہوجاتا ہے، اور پشیمانی ہوتی ہے، غور و تدبر اور سہولت کے ساتھ جو کام کیا جائے اس میں برکت ہوتی ہے۔

تخلیق زمین و آسمان اور سیارات سے پہلے دن رات کیسے پہچانے گئے

دوسرا سوال یہ ہے کہ دن اور رات کا وجود تو آفتاب کی حرکت سے پہچانا جاتا ہے، آسمان اور زمین کی پیدائش سے پہلے جب نہ آفتاب تھا نہ ماہتاب، چھ دنوں کی تعداد کس حساب سے ہوئی۔

اس لئے بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ مراد چھ دن سے اتنا وقت اور زمانہ ہے جس میں چھ دن رات اس دنیا میں ہوتے ہیں، لیکن صاف اور بے غبار بات یہ ہے کہ دن اور رات کی یہ اصطلاح کہ طلوع آفتاب سے غروب تک دن اور غروب سے طلوع تک رات، یہ تو اس دنیا کی اصطلاح ہے، پیدائش عالم سے پہلے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دن اور رات کی دوسری

علامات مقرر فرما دی ہوں جیسے جنت میں ہوگا کہ وہاں کا دن و رات حرکتِ آفتاب کے تابع نہیں ہوگا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ ضروری نہیں کہ وہ چھ دن جن میں زمین و آسمان بنائے گئے وہ ہمارے چھ دن کے برابر ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس سے بڑے ہوں، جیسے آخرت کے دن کے بارے میں ارشادِ قرآنی ہے کہ ایک ہزار سال کے برابر ایک دن ہوگا۔

ابو عبد اللہ رازی نے فرمایا کہ فلکِ اعظم کی حرکت اس دنیا کی حرکات کے مقابلہ میں اتنی تیز ہے کہ ایک دوڑنے والا انسان ایک قدم اٹھا کر زمین پر رکھنے نہیں پاتا کہ فلکِ اعظم تین ہزار میل کی مسافت طے کرلیتا ہے (بحر محیط)

احمد بن حنبل اور مجاہد کا قول یہی ہے کہ یہاں چھ دن سے آخرت کے چھ دن مراد ہیں اور بروایت ضحاک حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے بھی یہی منقول ہے۔

اور یہ چھ دن جن میں پیدائش عالم وجود میں آئی ہے صحیح روایات کے مطابق اتوار سے شروع ہوکر جمعہ پر ختم ہوتے ہیں یوم سبت یعنی ہفتہ کے اندر تخلیقِ عالم کا کام نہیں ہوا بعض علماء نے فرمایا کہ سبت کے معنی قطع کرنے کے ہیں اس روز کا یوم سبت اسی لئے نام رکھا گیا کہ اس پر کام ختم ہوگیا (تفسیر ابن کثیر)

آیت مذکورہ میں زمین و آسمان کی تخلیق چھ روز میں مکمل ہونے کا ذکر ہے، اس کی تفصیل سورۂ حم سجدہ کی نویں اور دسویں آیات میں اس طرح آئی ہے کہ دو دن میں زمین بنائی گئی، پھر دو دن میں زمین کے اوپر پہاڑ، دریا، معدن، درخت، نباتات اور انسان و حیوان کے کھانے پینے کی چیزیں بنائی گئیں کل چار دن ہوگئے، ارشاد فرمایا خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ اور پھر فرمایا قَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ

پہلے دو دن جن میں زمین بنائی گئی اتوار اور پیر ہیں، اور دوسرے دو دن جن میں زمین کی آبادی کا سامان پہاڑ دریا بنائے گئے وہ منگل اور بدھ ہیں، اس کے بعد ارشاد فرمایا فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ، یعنی پھر ساتوں آسمان بنائے دو دن میں، ظاہر ہے کہ یہ دو دن جمعرات اور جمعہ ہوں گے، اس طرح جمعہ تک چھ دن ہوگئے۔

آسمان و زمین کی تخلیق کا بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ یعنی پھر عرش پر قائم ہوا، استوی کے لفظی معنی قائم ہونے اور عرش شاہی تخت کو کہا جاتا ہے اب یہ عرش رحمن کیسا اور کیا ہے، اور اس پر قائم ہونے کا کیا مطلب ہے؟

اس کے متعلق بے غبار اور صاف و صحیح وہ مسلک ہے جو سلفِ صالحین، صحابہ و تابعین سے اور بعد میں اکثر حضرات صوفیائے کرام سے منقول ہے کہ انسانی عقل اللہ جل شانہٗ کی ذات

وصفت کی حقیقت کا احاطہ کرنے سے عاجز ہے، اس کی تحقیق میں پڑنا بیکار بلکہ مضر ہے، ان پر اجمالاً یہ ایمان رکھنا چاہئے کہ ان الفاظ سے جو کچھ حق تعالیٰ کی مراد ہے وہ صحیح اور حق ہے، اور خود کوئی معنی متعین کرنے کی فکر نہ کرے۔

حضرت امام مالکؒ سے ایک شخص نے یہی سوال کیا کہ استوی علی العرش کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے کچھ دیر تامل فرمانے کے بعد فرمایا کہ لفظ استواء کے معنی تو معلوم ہیں اور اس کی کیفیت و حقیقت کا ادراک عقل انسانی نہیں کر سکتی اور ایمان لانا اس پر واجب ہے، اور اس کے متعلق کیفیت و حقیقت کا سوال کرنا بدعت ہے، کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے سوالات نہیں کئے، سفیان ثوری، امام اوزاعی، لیث بن سعد، سفیان بن عیینہ، عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے فرمایا کہ جو آیات اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے متعلق آئی ہیں ان کو جس طرح وہ آئی ہیں اسی طرح بغیر کسی تشریح و تاویل کے رکھ کر ان پر ایمان لانا چاہئے (مظہری)

اس کے بعد آیت مذکورہ میں فرمایا يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا، یعنی اللہ تعالیٰ ڈھانپ دیتے ہیں رات کو دن پر اس طرح کہ رات جلدی کے ساتھ دن کو آتی ہے، مراد یہ ہے کہ رات اور دن کا یہ انقلاب عظیم کہ پورے عالم کو نور سے اندھیرے میں، اندھیرے سے نور میں لے آتا ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت قاہرہ کے تحت بہت جلدی اور آسانی سے ہو جاتا ہے کہ ذرا دیر نہیں لگتی۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ، یعنی پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آفتاب اور چاند اور تمام ستاروں کو اس حالت پر کہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے امر و حکم کے تابع چل رہے ہیں۔

اس میں ایک ذی عقل انسان کے لئے دعوتِ فکر ہے جو مخلوق کی بنائی ہوئی مصنوعات کا ہر وقت مشاہدہ کرتا ہے کہ بڑے بڑے ماہرین کی بنائی ہوئی مشینوں میں اول تو کچھ نقائص رہتے ہیں، اور نقائص بھی نہ ہوں تو کیسی فولادی مشینیں اور کل پرزے ہوں چلتے چلتے گھستے ہیں، ڈھیلے ہوتے ہیں، مرمت کی ضرورت ہوتی ہے، گریسنگ کی حاجت پیش آتی ہے، اور اس کیلئے کئی کئی دن بلکہ ہفتوں اور مہینوں مشین معطل رہتی ہے، لیکن ان خدائی مشینوں کو دیکھو کہ جس طرح اور جس شان سے پہلے دن ان کو پیدا کیا تھا اسی طرح چل رہی ہیں، نہ کبھی ان کی رفتار میں ایک منٹ سیکنڈ کا فرق آتا ہے، نہ کبھی اس کا کوئی پرزہ گھستا ٹوٹتا ہے، نہ کبھی ان کو ورکشاپ کی ضرورت پڑتی ہے، وجہ یہ ہے کہ وہ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ چل رہی ہیں، یعنی ان کے چلنے چلانے کے لئے نہ کوئی بجلی کا پاور درکار ہے، نہ کسی انجن کی مدد ضروری ہے، وہ صرف امر الٰہی سے چل رہی ہیں، اسی کے تابع ہیں

کرنے میں ستر درجہ فضیلت کا فرق ہے، سلف صالحین کی عادت یہ تھی کہ ذکر و دعا میں بڑا مجاہدہ کرتے اور اکثر اوقات مشغول رہتے تھے مگر کوئی ان کی آواز نہ سنتا تھا، بلکہ ان کی دعائیں صرف ان کے اور ان کے رب کے درمیان رہتی تھیں، ان میں بہت سے حضرات پورا قرآن حفظ کرتے اور تلاوت کرتے رہتے تھے، مگر کسی دوسرے کو خبر نہ ہوتی تھی، اور بہت سے حضرات بڑا علم دین حاصل کرتے، مگر لوگوں پر جتلاتے نہ پھرتے تھے، بہت سے حضرات راتوں کو اپنے گھروں میں طویل طویل نمازیں ادا کرتے مگر آنے والوں کو کچھ خبر نہ ہوتی تھی، اور فرمایا کہ ہم نے ایسے حضرات کو دیکھا ہے کہ وہ تمام عبادات جن کو وہ پوشیدہ کر کے ادا کر سکتے تھے کبھی نہیں دیکھا گیا کہ اس کو ظاہر کر کے ادا کرتے ہوں، ان کی آوازیں دعاؤں میں نہایت پست ہوتی تھیں (روح، تفسیر مظہری)

ابن جریج نے فرمایا کہ دعا میں آواز بلند کرنا اور شور کرنا مکروہ ہے، امام ابوبکر جصاص حنفی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ دعا کا آہستہ مانگنا بہ نسبت اظہار کے افضل ہے، حضرت حسن بصری اور ابن عباسؓ سے ایسا ہی منقول ہے، اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کے ختم پر جو آمین کہی جاتی ہے اس کو بھی آہستہ کہنا افضل ہے، **کیونکہ آمین بھی ایک دعا ہے۔**

ہمارے زمانہ کے ائمہ مساجد کو حق تعالیٰ ہدایت فرما دیں کہ قرآن و سنت کی اس تلقین اور بزرگان سلف کی ہدایت کو یکسر چھوڑ بیٹھے، ہر نماز کے بعد دعا کی ایک مصنوعی سی کارروائی ہوتی ہے، بلند آواز سے کچھ کلمات پڑھے جاتے ہیں جو آداب دعاء کے خلاف ہونے کے علاوہ ان نمازیوں کی نماز میں بھی خلل انداز ہوتے ہیں جو مسبوق ہونے کی وجہ سے امام کے فارغ ہونے کے بعد اپنی باقی ماندہ نماز پوری کر رہے ہیں، غلبۂ رسوم نے اس کی برائی اور مفاسد کو ان کی نظروں سے اوجھل کر دیا ہے، کسی خاص موقع پر خاص دعا پوری جماعت سے کرانا مقصود ہو ایسے موقع پر ایک آدمی کسی قدر آواز سے دعاء کے الفاظ کہے اور دوسرے آمین کہیں اس کا مضائقہ نہیں، شرط یہ ہے کہ دوسروں کی نماز و عبادت میں خلل کا موجب نہ بنیں، اور ایسا کرنے کی عادت نہ ڈالیں کہ عوام یہ سمجھنے لگیں کہ دعا کرنے کا طریقہ یہی ہے جیسا کہ آجکل عام طور سے ہو رہا ہے۔

یہ بیان اپنی حاجات کے لئے دعا مانگنے کا تھا، اگر دعاء کے معنی اس جگہ ذکر و عبادت کے لئے جاویں تو اس میں بھی علماء سلف کی تحقیق یہی ہے کہ ذکر سر ذکر جہر سے افضل ہے، اور صوفیائے کرام میں مشائخ چشتیہ جو مبتدی کو ذکر جہر کی تلقین فرماتے ہیں وہ اس شخص کے حال کی مناسبت سے بطور علاج کے ہے، تاکہ جہر کے ذریعہ کسل اور غفلت دور ہو جائے اور قلب میں ذکر اللہ کے ساتھ ایک لگاؤ پیدا ہو جائے، ورنہ فی نفسہٖ ذکر میں جہر کرنا ان کے

بڑوں کی عظمت نہیں تو جب کرے، اور جواز اس کا بھی حدیث سے ثابت ہے بشرطیکہ اس میں ریاء ونمود نہ ہو۔

امام احمد بن حنبل، ابن حبان، بیہقی وغیرہ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خَيْرُ الذِّكْرِ الْخَفِيُّ وَخَيْرُ الرِّزْقِ مَا يَكْفِي	بہترین ذکر ذکر خفی ہے، اور بہترین رزق وہ ہے جو انسان کے لئے کافی ہو جائے"

ہاں بعض خاص حالات اور اوقات میں جہر ہی مطلوب اور افضل ہے، ان حالات و اوقات کی تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے واضح فرما دی ہے، مثلاً اذان و اقامت کا بلند آواز سے کہنا، جہری نمازوں میں بلند آواز سے تلاوت قرآن کرنا، تکبیرات نماز، تکبیرات تشریق، حج میں تلبیہ بلند آواز سے کہنا وغیرہ، اسی لئے فقہاء رحمہم اللہ نے فیصلہ اس باب میں یہ فرمایا ہے کہ جن خاص حالات اور مقامات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً یا عملاً جہر کرنے کی تلقین فرمائی ہے وہاں تو جہر ہی کرنا چاہئے، اس کے علاوہ دوسرے حالات و مقامات میں ذکر خفی اولیٰ وانفع ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ، معتدین، اعتداء سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتے، حد سے آگے بڑھنا خواہ دعاء میں ہو یا کسی دوسرے عمل میں سب کا یہی حال ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو دین اسلام نام ہی حدود و قیود کی پابندی اور فرماں برداری کا ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور تمام معاملات میں حدود شرعیہ سے تجاوز کیا جائے تو وہ بجائے عبادت کے گناہ بن جاتے ہیں۔

دعاء میں حد سے تجاوز کرنے کی کئی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ دعاء میں لفظی تکلفات قافیہ وغیرہ کے اختیار کئے جائیں جس سے خشوع خضوع میں فرق پڑے، دوسرے یہ کہ دعاء میں غیر ضروری قیدیں شرطیں لگائی جائیں جیسے حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفلؓ نے دیکھا کہ ان کے صاحبزادے اس طرح دعاء مانگ رہے ہیں کہ یا اللہ میں آپ سے جنت میں سفید رنگ کا داہنی جانب والا محل طلب کرتا ہوں تو موصوف نے اُن کو روکا، اور فرمایا کہ دعا میں ایسی قیدیں شرطیں لگانا حد سے تجاوز ہے جس کو قرآن و حدیث میں ممنوع قرار دیا گیا ہے (مظہری بروایت ابن ماجہ وغیرہ)۔

تیسری صورت حد سے تجاوز کی یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے لئے بددعاء کرے یا کوئی

ایسی چیز مانگے جو عام لوگوں کے لئے معجزہ ہو یہ بھی حد سے تجاوز کی ایک صورت ہے جو اس جگہ مذکور ہے کہ دعا میں بے ضرورت آواز بلند کی جائے (تفسیر مظہری، احکام القرآن)۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا، اس میں دو لفظ متضاد اور متقابل آئے ہیں، اصلاح اور فساد، صلاح کے معنی درستی اور فساد کے معنی خرابی کے آتے ہیں امام راغب نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ فساد کہتے ہیں کسی چیز کے اعتدال سے نکل جانے کو خواہ یہ نکلنا تھوڑا سا ہو یا زیادہ، اور ہر فساد میں کمی بیشی کا مدار اسی اعتدال کے خروج پر ہے، جس قدر خروج بڑھے گا فساد بڑھے گا، فساد کے معنی خرابی پیدا کرنا اور صلاح کے معنی درستی کرنا ہوا تو لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا کے معنی یہ ہوئے کہ زمین میں خرابی نہ پیدا کرو بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی درستی فرمادی ہے۔

امام راغب نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کی اصلاح کرنا اس کی کئی صورتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اس کو اول ہی ٹھیک ٹھیک اور درست پیدا فرمایا، جیسے وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ، دوسرے یہ کہ اس میں جو فساد آگیا تھا اس کو دور کر دیا، جیسے يُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ تیسرے یہ کہ اس کو صلاح کا حکم دیا ہے، اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب زمین کی اصلاح و درستی فرمادی تو اس کے بعد تم اس میں فساد و خرابی نہ ڈالو، اس میں زمین کی درستی کرنے کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں، ایک ظاہری درستی کہ زمین کو کھیتی اور درخت اگانے کے قابل بنایا، اس پر بادلوں سے پانی برسا کر زمین سے پھل پھول نکالے، انسان اور دوسرے جانداروں کے لئے زمین سے ہر قسم کی ضروریات زندگی اور آسائش کے سامان پیدا فرمائے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ زمین کی باطنی اور معنوی صلاح فرمائی، اس طرح کہ زمین پر اپنے رسول اپنی کتابیں اور ہدایت بھیج کر اس کو کفر و شرک اور گمراہی سے پاک کیا، اور ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں مفہوم یعنی ظاہری اور باطنی ہر طرح کی اصلاح اس آیت میں مراد ہوں، تو اب معنی آیت کے یہ ہوگئے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو ظاہری اور باطنی طور پر درست فرما دیا ہے، اب تم اس میں اپنے گناہوں اور نافرمانیوں کے ذریعے فساد نہ مچاؤ، اور خرابی پیدا نہ کرو۔

زمین کی درستی کے بعد خرابی پیدا کرنا دوگنا گناہ ہو کر سخت گناہ ہے

جس طرح اصلاح کی دو قسمیں ظاہری اور باطنی ہیں اسی طرح فساد کی بھی دو قسمیں ہیں، زمین کی ظاہری اصلاح تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا جسم بنایا ہے کہ نہ پانی کی طرح نرم ہے جس پر قرار نہ ہو سکے، اور نہ پتھر لوہے کی طرح سخت ہے جس کو کھودا نہ جا سکے، بلکہ درمیانی حالت میں رکھا گیا ہے تاکہ انسان اس کو نرم کرکے اس میں کھیتی اور درخت اور پھول پھل اگا سکے، اور کھود کر اس میں کنویں اور خندقیں

ہو جائیں تاکہ یہ مکانات کی بنیادیں مستحکم کرسکیں، پھر اس زمین کے اندر اور باہر ایسے سامان پیدا فرمادیئے جن سے زمین کی آبادی ہو، اس میں سبزی اور درخت اور پھول پتیاں اُگ سکیں، باہر سے ہوا، روشنی گرمی سردی پیدا کی اور پھر بادل کے ذریعہ اس پر پانی برسایا جس سے درخت پیدا ہوسکیں مختلف ستاروں اور سیاروں کی گرمیں ان پر ڈال دی گئیں جن سے پھول پھلوں میں رنگ اور رس بھرے گئے، انسان کو فہم و عقل عطا کی گئی جس کے ذریعہ اس نے زمین سے نکلنے والے خام مواد کو ملایا، دھاتیں بنائیں، لوہا وغیرہ کے جوڑ توڑ کر کے مصنوعات کی ایک نئی دنیا بنا ڈالی یہ سب زمین کی اصلاح ظاہری ہے جو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے فرمائی۔

اور اصلاح باطنی اور روحانی کا مدار ذکر اللہ تعالیٰ اور اس کی اطاعت پر ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اوّل تو ہر انسان کے قلب میں ایک مادّہ اور جذبہ خدا کی اطاعت اور یاد کا رکھ دیا ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا، اور انسان کے گردوپیش سے ہر ذرے ذرے میں اپنی قدرت کاملہ اور صنعت عجیبہ کے ایسے مظاہر رکھے کہ ان کو دیکھ کر ادنیٰ فہم و ادراک رکھنے والا بھی یہ سمجھے کہ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ، اس کے علاوہ انبیاء رسول بھیجے کتابیں نازل فرمائیں جن کے ذریعہ مخلوق کا رشتہ خالق کے ساتھ جوڑنے کا پورا انتظام فرمایا۔

اس طرح گویا زمین کی مکمل اصلاح ظاہری اور باطنی ہوگئی، اب حکم یہ ہے کہ ہم نے اس **زمین کو درست کردیا ہے تم اس کو خراب نہ کرو۔**

جس طرح اصلاح کی دو قسمیں ظاہری اور باطنی بیان کی گئی ہیں اسی طرح اس کے بالمقابل فساد کی بھی دو قسمیں ظاہری اور باطنی ہیں اور اس آیت مذکورہ کے ذریعہ دونوں ہی کی ممانعت کی گئی ہے۔

اگرچہ قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل وظیفہ اور فرض منصبی اصلاح باطنی ہے، اور اس کے بالمقابل فساد باطنی سے روکنا ہے لیکن اس دنیا میں ظاہر و باطن کے صلاح و فساد میں ایک ایسا رابطہ ہے کہ ایک کا فساد دوسرے کے فساد کا موجب بن جاتا ہے، اس لئے شریعت قرآن نے جس طرح باطنی فساد کے دروازے بند کئے ہیں اسی طرح ظاہری فساد کو بھی منع فرمایا، چوری، ڈاکہ، قتل اور بے حیائی کے تمام طریقے دنیا میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کا فساد پیدا کرتے ہیں، اس لئے ان چیزوں پر خصوصیت سے پابندیاں اور سخت سزائیں مقرر فرمائی، اور عام گناہوں اور جرائم کو بھی ممنوع قرار دیا، کیونکہ ہر جرم و گناہ کہیں ظاہری فساد کا موجب ہوتا ہے کہیں باطنی فساد کا، اور اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر ظاہری فساد باطنی فساد کا سبب بنتا ہے، اور ہر باطنی فساد ظاہری فساد کا موجب ہوتا ہے۔

اس آیت میں دعاء کے لئے دو آداب بتلائے گئے جن کا تعلق انسان کے دل سے ہے وہ یہ کہ دعاء کرنے والے کے دل میں اس کا خطرہ بھی ہونا چاہئے کہ شاید میری دعاء قبول نہ ہو، اور امید بھی ہونی چاہئے کہ میری دعاء قبول ہو سکتی ہے، کیونکہ اپنی خطاؤں اور گناہوں سے بے فکر ہو جانا بھی ایمان کے خلاف ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ سے مایوس ہو جانا بھی کفر ہے، قبولیت دعاء کی اسی وقت توقع کی جاسکتی ہے جبکہ ان دونوں حالتوں کے درمیان رہے۔

پھر آخر آیت میں فرمایا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت قریب ہے نیک عمل کرنے والوں سے، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اگرچہ بوقت دعاء خوف اور امید دونوں ہی حالتیں ہونی چاہئیں، لیکن ان دونوں حالتوں میں سے امید ہی کی جانب راجح تر ہے، کیونکہ رب العالمین ارحم الراحمین ہے، جود و احسان میں کوئی کمی ہے نہ بخل، وہ برے سے برے انسان بلکہ شیطان کی بھی دعاء قبول کر سکتے ہیں، ہاں اگر عدم قبولیت کا کوئی خطرہ ہو سکتا ہے تو وہ اپنے اعمال و گناہوں کی نحوست سے ہو سکتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے قریب ہونے کے لئے محسن یعنی نیک عمل ہونا درکار ہے۔

اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بعض آدمی لمبے لمبے سفر کرتے ہیں، اور اپنی ہیئت فقیرانہ بناتے ہیں، اور اللہ کے سامنے دعاء کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں، مگر ان کا کھانا بھی حرام ہے اور پینا بھی حرام ہے اور لباس بھی حرام کا ہے، سو ایسے آدمی کی دعاء کہاں قبول ہو سکتی ہے۔ (مسلم، ترمذی، عن ابی ہریرہ)

اور ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ کی دعاء اس وقت تک قبول ہوتی رہتی ہے جب تک وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعاء نہ کرے، اور جلد بازی نہ کرے، صحابہ کرام نے دریافت کیا، جلد بازی کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ یوں خیال کر بیٹھے کہ میں اتنے عرصہ سے دعاء مانگ رہا ہوں اب تک قبول نہیں ہوئی، یہاں تک کہ مایوس ہو کر دعاء چھوڑ دے (مسلم، ترمذی)

اور ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے جب دعاء مانگو تو اس حالت میں مانگو کہ تمہیں اس کے قبول ہونے میں کوئی شک نہ ہو۔

مراد یہ ہے کہ رحمت خداوندی کی وسعت کو سامنے رکھ کر دل کو اس پر جماؤ کہ میری دعاء ضرور قبول ہوگی، یہ اس کے منافی نہیں کہ اپنے گناہوں کی شامت کے سبب یہ خطرہ بھی محسوس کرے کہ شاید میرے گناہ دعاء کی قبولیت میں آڑے آجائیں۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی نبینا وسلم۔

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۖ حَتَّىٰ
اور وہی ہے کہ چلاتا ہے ہوائیں خوشخبری لانے والی مینہ سے پہلے یہاں تک کہ
إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ
جب وہ ہوائیں اٹھا لاتی ہیں بھاری بادلوں کو تو ہانک دیا ہم نے اس بادل کو ایک شہر مردہ کی طرف پھر ہم نے اتارا
فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ
اس میں پانی پھر اس سے نکالے سب طرح کے پھل اسی طرح ہم نکالیں گے مردوں کو تاکہ
تَذَكَّرُونَ ﴿٥٧﴾ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ
تم غور کرو اور جو شہر پاکیزہ ہے اس کا سبزہ نکلتا ہے اس کے رب کے حکم سے
وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ
اور جو خراب ہے اس میں نہیں نکلتا مگر ناقص یوں پھیر پھیر کر بتلاتے ہیں ہم آیتیں
لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ﴿٥٨﴾
حق ماننے والے لوگوں کو

ع ۷

خلاصہ تفسیر

اور وہ اللہ ایسا ہے کہ اپنی باران رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ (بارش کی امید دلا کر دل کو) خوش کر دیتی ہیں یہاں تک کہ جب وہ ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں تو ہم اس بادل کو کسی خشک زمین کی طرف ہانک لے جاتے ہیں، پھر اس بادل سے پانی برساتے ہیں، پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں (جس سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور قدرت خصوصاً مردوں کو زندہ کرنے کی ثابت ہوتی ہے، اس لئے فرمایا) یوں ہی (قیامت کے روز) ہم مردوں کو (زمین سے) نکال کھڑا کریں گے (یہ سب اس لئے سنایا) تاکہ تم سمجھو اور (قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اگرچہ سب کے لئے عام ہے مگر اس سے فائدہ اٹھانے والے کم لوگ ہوتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے سمجھو کہ بارش تو ہر زمین پر برستی ہے مگر کھیتی اور درخت ہر جگہ نہیں پیدا ہوتے صرف ان زمینوں میں پیدا ہوتے ہیں جن میں صلاحیت ہو، اسی کو فرمایا کہ) جو زمین ستھری ہوتی ہے اس کی پیداوار خدا کے حکم سے خوب نکلتی ہے اور جو خراب ہے اس کی پیداوار (اگر نکلی بھی تو) بہت کم نکلتی ہے اسی طرح ہم (ہمیشہ) دلائل کو طرح طرح سے بیان کرتے رہتے ہیں (مگر وہ سب) ان لوگوں کے لئے نافع ہوتے ہیں جو ان کی قدر کرتے ہیں

معارف و مسائل

سابقہ آیت میں حق تعالیٰ نے اپنی خاص خاص اور بڑی بڑی نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے جس میں آسمان زمین، رات دن چاند سورج اور عام ستاروں کی پیدائش اور ان کا انسان کی خدمت انجام دینے اور اس کی خدمت میں لگے رہنے کا تذکرہ کر کے اس پر تنبیہ فرمائی ہے کہ جب ہماری ساری ضروریات اور ساری راحتوں کا سامان کرنے والی ایک ذات پاک ہے، تو ہر حاجت و ضرورت میں ہمیں دعا و درخواست بھی اسی سے کرنا چاہئے، اور اسی کی طرف رجوع کرنے کو اپنے لئے کلید کامیابی سمجھنا چاہئے۔

مذکور الصدر آیات میں سے پہلی آیت میں بھی اسی قسم کی اہم اور بڑی نعمتوں کا ذکر ہے، جن پر انسان اور زمین کی کل مخلوقات کی حیات و بقاء کا مدار ہے، مثلاً بارش اور اس سے پیدا ہونے والے درخت اور کھیتیاں، ترکاریاں وغیرہ، فرق یہ ہے کہ پچھلی آیت میں نعمتوں کا ذکر تھا جو عالم علوی سے متعلق ہیں اور اس میں ان نعمتوں کا تذکرہ ہے جو عالم سفلی سے متعلق ہیں (بحر محیط)

اور دوسری آیت میں ایک خاص بات یہ بتلائی گئی ہے کہ ہماری یہ عظیم الشان نعمتیں اگرچہ زمین کے ہر حصہ پر عام ہیں، بارش جب برستی ہے تو دریا پر بھی برستی ہے پہاڑ پر بھی، بنجر اور خراب زمین پر عمدہ اور بہتر زمین سب پر یکساں برستی ہے، لیکن کھیتی، درخت، سبزی صرف اسی زمین میں پیدا ہوتی ہے جس میں اگنے کی صلاحیت ہو، پتھریلی اور ریتلی زمینیں اس بارش کے فیض سے مستفید نہیں ہوتیں۔

پہلی آیت سے یہ نتیجہ نکال کر بتلا دیا گیا کہ جو ذات پاک مردہ زمین میں نشو و نما کی زندگی عطا فرما دیتی ہے، اس کے لئے یہ کیا مشکل ہے کہ جو انسان پہلے سے زندہ تھے پھر مر گئے، ان میں دوبارہ زندگی پیدا فرما دے۔ اسی نتیجہ کو اس آیت میں واضح طور پر بتلا دیا گیا، اور دوسری آیت سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہدایت، آسمانی کتابیں اور انبیاء علیہم السلام پھر ان کے نائب علماء و مشائخ کی تعلیم و تربیت بھی بارش کی طرح ہر انسان کے لئے عام ہے مگر جس طرح باران رحمت سے ہر زمین زندہ نہیں اٹھتی، اسی طرح اس روحانی بارش کا فائدہ بھی صرف وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جن میں یہ صلاحیت ہے، اور جن لوگوں کے قلوب پتھریلی یا ریتلی زمین کی طرح نشو و نما کی قابلیت نہیں رکھتے وہ تمام واضح ہدایات اور آیات بینات کے باوجود اپنی گمراہی پر جمے رہتے ہیں۔

اس نتیجہ کی طرف دوسری آیت کے آخری جملہ سے اشارہ فرمایا کَذٰلِکَ نُصَرِّفُ

ذکر کرنا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اصل مقصد برق و باراں وغیرہ سے زمین کی سیرابی کا انسان کی ضروریات مہیا کرنا ہے جس کا مسکن شہر ہیں ورنہ جنگل کی سرسبزی خود کوئی مقصد نہیں۔

یہاں تک آیت مذکورہ کے مضمون سے چند امور ثابت ہوئے: اوّل یہ کہ بارش بادل سے برستی ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جن آیات میں آسمان سے بارش برسانا مذکور ہے وہاں بھی لفظ سماء سے بادل مراد ہے اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ کسی وقت دریائی بادلوں کی بجائے براہ راست آسمان سے بادل پیدا ہوجائیں ان سے بارش ہوجائے۔

دوسرے یہ کہ بادلوں کا کسی خاص سمت اور خاص زمین کی طرف جانا یہ براہ راست حکم خداوندی سے متعلق ہے وہ جب چاہتے ہیں جہاں چاہتے ہیں جس قدر چاہتے ہیں بارش برسانے کا حکم دیدیتے ہیں، بادل فرمانِ الٰہی کی تعمیل کرتے ہیں۔

اس کا مشاہدہ ہر جگہ اس طرح ہوتا رہتا ہے کہ بسا اوقات کسی شہر یا بستی پر بادل چھایا رہتا ہے اور وہاں بارش کی ضرورت بھی ہوتی ہے لیکن وہ بادل یہاں ایک قطرہ پانی کا نہیں دیتا، بلکہ جس شہر یا بستی کا کوٹہ حکمِ الٰہی سے مقرر کردیا گیا ہے وہیں جاکر برستا ہے، کسی کی مجال نہیں کہ اس شہر کے علاوہ کسی اور جگہ اس بادل کا پانی حاصل کرلے۔

قدیم وجدید فلاسفہ نے بادلوں اور ہواؤں کی حرکت کے لئے کچھ ضابطے اور اصول نکال رکھے ہیں جن کے ذریعہ وہ بتلا دیتے ہیں کہ فلاں بادل فلاں سمندر سے اٹھا ہے اور کس طرف جائے گا کہاں جاکر برسے گا، کتنا پانی برسائے گا، عام ممالک میں موسمیات کے محکمے اسی قسم کی معلومات مہیا کرنے کے لئے قائم کئے جاتے ہیں، لیکن تجربہ شاہد ہے کہ محکمۂ موسمیات کی بہت سی خبریں بکثرت غلط ہوجاتی ہیں اور جب حکمِ الٰہی ان کے خلاف ہوتا ہے تو ان کے سارے ضابطے قاعدے دھرے رہ جاتے ہیں، ہوائیں اور بادل ان کے بتلائے ہوئے رُخ ان کی دی ہوئی خبروں کے خلاف کسی دوسرے سمت کو پکڑ لیتی ہیں، اور موسمیات کے محکمے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ جو ضابطے قاعدے ہواؤں کی حرکت کے لئے فلاسفہ نے تجویز کئے ہیں وہ بھی کچھ اس کے منافی نہیں ہیں کہ بادلوں کا حمل ونقل فرمانِ الٰہی کے تابع ہے، کیونکہ عادت اللہ تعالیٰ کی اس عالم کے تمام کاروبار میں یہی ہے کہ حکمِ خداوندی اسباب طبعیہ کے پردوں میں ظاہر ہوتا ہے، ان اسباب طبعیہ سے انسان کوئی ضابطہ قاعدہ بنا لیتا ہے ورنہ حقیقت وہی ہے جو حافظ شیرازی نے بتلائی ہے کہ ؎

کارِ زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں ۔ مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

اس کے بعد ارشاد فرمایا فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ، یعنی

ہم نے اس مردہ شہر میں پانی برسایا پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل پھول نکالے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ، یعنی ہم اسی طرح نکالیں گے مردوں کو قیامت کے روز، شاید تم سمجھو، مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے مردہ زمین کو زندہ کیا اور اس میں سے درخت اور پھل پھول نکالے اسی طرح بروز قیامت مردوں کو دوبارہ زندہ کرکے نکال کھڑا کریں گے، اور یہ مثالیں ہم نے اس لئے بیان کی ہیں کہ تمہیں سوچنے اور غور کرنے کا موقع

بروایت حضرت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت میں صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا پہلے صور پر تمام عالم فنا ہو جائے گا کوئی چیز زندہ باقی نہ رہے گی، اور دوسرے صور پر پھر از سر نو نیا عالم پیدا ہوگا، اور سب مردے زندہ ہو جائیں گے، حدیث مذکور میں ہے کہ ان دونوں مرتبہ کے صور کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہوگا، اور ان چالیس سال میں مسلسل بارش ہوتی رہے گی اسی عرصہ میں ہر مردہ انسان اور جانور کے اجزاء بدن اس کے ساتھ جمع کرکے ہر ایک کا مکمل ڈھانچہ بن جائے گا، اور پھر دوسری مرتبہ صور پھونکنے کے وقت ان لاشوں کے اندر روح آجائے گی، اور زندہ ہو کر کھڑے ہو جائیں گے، اس روایت کا اکثر حصہ بخاری و مسلم میں موجود ہے، بعض اجزاء ابن ابی داؤد کی کتاب البعث سے لئے گئے ہیں۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے: وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا۔ نکد کہتے ہیں اس چیز کو جو بے فائدہ بھی ہو اور کم مقدار میں بھی قلیل ہو، معنی یہ ہیں کہ اگرچہ باران رحمت کا فیض ہر شہر ہر زمین پر یکساں ہوتا ہے، لیکن نتائج اور ثمرات کے اعتبار سے زمین کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک عمدہ اور اچھی زمین جس میں نشوونما کی صلاحیت ہے، اس میں تو ہر طرح کے پھول پھل نکلتے ہیں اور فوائد حاصل ہوتے ہیں، دوسری وہ سخت یا کھاری زمین جس میں روئیدگی کی صلاحیت نہیں، اس میں اول تو کچھ پیدا ہی نہیں ہوتا، پھر اگر کچھ ہو بھی تو وہ بہت کم مقدار میں ہوتا ہے، اور جتنا پیدا ہوتا ہے وہ بھی بیکار اور خراب ہوتا ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ، یعنی ہم اپنے دلائل قدرت طرح طرح سے بیان کرتے ہیں، ان لوگوں کے لئے جو قدر کرنے والے ہیں،

اس میں اشارہ ہے کہ اگرچہ باران رحمت کے فیضان عام کی طرح ہدایت ربانی اور آیات بینات کا فیض بھی سب ہی انسانوں کے لئے عام ہے، مگر جس طرح ہر زمین بارش سے فائدہ نہیں اٹھاتی اسی طرح ہر انسان ہدایت ربانی سے نفع حاصل نہیں کرتا، بلکہ نفع صرف وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جو شکرگذار اور قدر شناس ہیں۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ

بیشک بھیجا ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف پس اس نے کہا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی

مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ

کوئی نہیں تمہارا معبود اس کے سوا میں خوف کرتا ہوں تم پر ایک بڑے دن کے

عَظِیْمٍ ﴿۵۹﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ

عذاب سے بولے سردار اس کی قوم کے ہم دیکھتے ہیں تجھ کو صریح

مُّبِیْنٍ ﴿۶۰﴾ قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ

گمراہی میں بولا اے میری قوم میں ہرگز بہکا نہیں ولیکن میں بھیجا ہوا ہوں

رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۱﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ وَ اَعْلَمُ

جہان کے پروردگار کا پہنچاتا ہوں تم کو پیغام اپنے رب کے اور نصیحت کرتا ہوں تم کو اور جانتا ہوں

مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ

اللہ کی طرف سے وہ باتیں جو تم نہیں جانتے کیا تم کو تعجب ہوا کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے

رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِیُنْذِرَكُمْ وَ لِتَتَّقُوْا وَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾

رب کی طرف سے ایک مرد کی زبانی جو تم ہی میں سے ہے تاکہ وہ تم کو ڈراوے اور تاکہ تم بچو اور تاکہ تم پر رحم ہو

فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَیْنٰهُ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ فِی الْفُلْكِ وَ اَغْرَقْنَا

پھر انہوں نے اس کو جھٹلایا پھر ہم نے بچا لیا اس کو اور ان کو کہ جو اس کے ساتھ تھے کشتی میں اور غرق کر دیا

الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِیْنَ ﴿۶۴﴾ ع ۸ ۱۵

ان کو جو جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو بیشک وہ لوگ تھے اندھے۔

خلاصۂ تفسیر

ہم نے نوح (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) ان کی قوم کی طرف بھیجا سو انہوں نے (اس قوم سے) فرمایا کہ اے میری قوم تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں (اور بتوں کی پرستش چھوڑ دو جن کا نام سورۂ نوح میں ہے وَدّ اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر) مجھ کو تمہارے لئے (درصورت میرا کہنا نہ ماننے کے) ایک بڑے سخت دن کے عذاب کا اندیشہ ہے (کہ وہ یوم قیامت ہے

یا یوم عظیم) ان کی قوم کے آبرودار لوگوں نے کہا کہ ہم تم کو صریح غلطی میں (مبتلا) دیکھتے ہیں (کہ توحید کی تعلیم کر رہے ہو اور عذاب کا ڈراوا دکھا رہے ہو) انہوں نے (جواب میں) فرمایا کہ اے میری قوم مجھ میں تو ذرا بھی غلطی نہیں لیکن (چونکہ) میں پروردگار عالم کا (بھیجا ہوا) رسول ہوں (انہوں نے مجھ کو توحید پہنچانے کا حکم کیا ہے اس لئے اپنا منصبی کام کرتا ہوں کہ) تم کو اپنے پروردگار کے پیغام اور احکام پہنچاتا ہوں (اور اس پہنچانے میں میری کوئی دنیوی غرض نہیں بلکہ محض) تمہاری خیرخواہی کرتا ہوں کیونکہ توحید میں تمہارا ہی نفع ہے) اور (عذاب یوم عظیم سے جو تم کو تعجب ہوتا ہے تو تمہاری غلطی ہے کیونکہ میں خدا کی طرف سے ان امور کی خبر رکھتا ہوں جن کی تم کو خبر نہیں (تو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو بتلا دیا ہے کہ ایمان نہ لانے سے عذاب یوم عظیم واقع ہوگا) اور (تم کو جو میرے رسول ہونے پر بوجہ میرے بشر ہونے کے انکار ہے جیسا سورۂ مؤمنون میں تصریح ہے مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ، تو) کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت جو تمہاری ہی جنس کا (بشر) ہے کوئی نصیحت کی بات آگئی (وہ نصیحت کی بات یہی ہے جو مذکور ہوئی يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ الیٰ قولہ اِنِّىْٓ اَخَافُ) تاکہ وہ شخص تم کو (بحکم خداوندی عذاب سے) ڈرائے اور تاکہ تم (اس کے ڈرانے سے) ڈر جاؤ اور تاکہ (ڈرنے کی وجہ سے مخالفت چھوڑ دو جس سے) تم پر رحم کیا جائے سو (باوجود اس تمام تر فہمائش کے) وہ لوگ ان کی تکذیب ہی کرتے رہے تو ہم نے نوح (علیہ السلام) کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں تھے (طوفان کے عذاب سے) بچا لیا اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا ان کو ہم نے (طوفان میں) غرق کر دیا بے شک وہ لوگ اندھے ہو رہے تھے (حق و باطل، نفع نقصان کچھ نہ سوجھتا تھا)۔

معارف و مسائل

سورۂ اعراف کے شروع سے یہاں تک اصول اسلام توحید، رسالت، آخرت کا مختلف عنوانات اور دلائل سے ثبوت، اور لوگوں کو اتباع کی ترغیب اور اس کی مخالفت پر وعید اور ترہیب اور اس کے ضمن میں شیطان کے گمراہ کن مکر و فریب وغیرہ کا بیان تھا اب آٹھویں رکوع سے تقریباً آخر سورت تک چند انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کا ذکر ہے جس میں تمام انبیاء علیہم السلام کا متفقہ طور پر اصول مذکورہ توحید، رسالت، آخرت کی طرف اپنی اپنی امتوں کو دعوت دینا اور ماننے والوں کے جزاء و ثواب اور نہ ماننے والوں پر طرح طرح کے

عذاب اور ان کے انجام بد کا مفصل بیان تقریباً چودہ رکوع میں آیا ہے جس کے ضمن میں سیکڑوں اصولی اور فروعی مسائل بھی آگئے ہیں۔ اور موجودہ اقوام کو پچھلی قوموں کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی کا سامان ہوگیا کہ پہلے سب رسولوں کے ساتھ ایسے ہی معاملات ہوتے رہے ہیں۔

آیاتِ مذکورہ سورۂ اعراف کا آٹھواں رکوع پورا ہے۔ اس میں حضرت نوح علیہ السلام اور انکی اُمت کے حالات و مقالات کا بیان ہے۔

سلسلہ انبیاء میں سب سے پہلے نبی اگرچہ آدم علیہ السلام ہیں لیکن اُن کے زمانہ میں کفر و ضلالت کا مقابلہ نہ تھا اُن کی شریعت میں زیادہ تر احکام بھی زمین کی آباد کاری اور انسانی ضروریات کے متعلق تھے کفر اور کافر کہیں موجود نہ تھے۔ کفر و شرک کا مقابلہ حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوا۔ اور رسالت و شریعت کی حیثیت سے دنیا میں وہ سب سے پہلے رسول ہیں۔ اس کے علاوہ طوفان میں پوری دنیا غرق ہو جانے کے بعد جو لوگ باقی رہے وہ حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کے رفقاء سفینہ تھے اُنھیں سے نئی دنیا آباد ہوئی اسی لئے اُن کو آدم اصغر کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قصص انبیاء کا آغاز بھی انہیں سے کیا گیا ہے جس میں ساڑھے نو سو برس کی طویل عمر میں اُن کی پیغمبرانہ جدوجہد اور اس پر اکثر اُمت کی کجروی اور اس کے نتیجہ میں بجز تھوڑے سے مؤمنین کے باقی سب کا غرق ہونا بیان ہوا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہے لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ۔

نوح علیہ السلام آدم علیہ السلام کی آٹھویں پشت میں ہیں۔ مستدرک حاکم میں بروایت ابن عباسؓ منقول ہے کہ آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرن گزرے ہیں۔ اور یہی مضمون طبرانی نے بروایت ابی ذرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے (تفسیر مظہری) قرن عام طور پر ایک سو سال کو کہا جاتا ہے اس لئے ان دونوں کے درمیان اس روایت کے مطابق ایک ہزار سال کا عرصہ ہوگیا ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ نوح علیہ السلام کی ولادت حضرت آدم علیہ السلام کی وفات سے آٹھ سو چھبیس سال بعد ہوئی ہے اور بتصریح قرآن ان کی عمر نو سو پچاس سال ہوئی۔ اور آدم علیہ السلام کی عمر کے متعلق ایک حدیث میں ہے کہ چالیس کم ایک ہزار سال ہے اس طرح آدم علیہ السلام کی پیدائش سے نوح علیہ السلام کی وفات تک کل دو ہزار آٹھ سو چھپن سال ہو جاتے ہیں[1] (مظہری) نوح علیہ السلام کا اصلی نام شاکر

---

[1] یہ مدت مظہری (ص ۳۶۷ ج ۳) سے لیگئی ہے لیکن [illegible] غلطی ہوئی ہے [illegible] حضرت نوح کی کل عمر ۱۰۵۰ سال ہوئی، کیونکہ ۹۵۰ سال جو قرآن میں مذکور ہیں وہ نبوت سے طوفان تک کی مدت پر مشتمل ہیں، نبوت چالیس سال کی عمر میں ملی، اور طوفان کے بعد بھی وہ ساٹھ سال زندہ رہے۔ اس طرح کل مدت ۲۸۵۶ کے بجائے ۲۸۳۶ سال بنتی ہے۔ اور اگر حضرت نوح کی کل عمر ۱۰۵۰ کے بجائے ۹۵۰ فرض کی جائے جیسا کہ مصنف نے ذکر کیا ہے تو کل مدت ۲۷۳۶ قرار پاتی ہے۔ محمد تقی عثمانی۔ ۲ محرم ۱۴۲۵ھ

اور بعض روایات میں سَکَن اور بعض میں عبدالغفار آیا ہے۔

اس میں اختلاف ہے کہ ان کا زمانہ حضرت ادریس علیہ السلام سے پہلے ہے یا بعد میں۔ اکثر صحابہ کا قول یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام ادریس علیہ السلام سے پہلے ہیں۔ (بحر محیط)

مستدرک حاکم میں بروایت ابن عباسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نوح علیہ السلام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا ہوئی۔ اور طوفان کے بعد ساٹھ سال زندہ رہے۔

آیت قرآن لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ سے ثابت ہے کہ نوح علیہ السلام کی بعثت و نبوت صرف اپنی قوم کے لئے تھی ساری دنیا کے لئے عام نہ تھی۔ اور ان کی قوم عراق میں آباد بظاہر مہذب مگر شرک میں مبتلا تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو دعوت دی وہ یہ تھی يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۔ یعنی اے میری قوم تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ مجھے تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔ اس کے پہلے جملہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف دعوت ہے جو اصل اصول ہے۔ دوسرے جملہ میں شرک و کفر سے پرہیز کرنے کی تلقین ہے جو اس قوم میں وباء کی طرح پھیل گیا تھا۔ تیسرے جملہ میں اس عذاب عظیم کے خطرہ سے آگاہ کرنا ہے جو خلاف ورزی کی صورت میں ان کو پیش آنے والا ہے۔ اس عذاب عظیم سے مراد آخرت کا عذاب بھی ہو سکتا ہے اور دنیا میں طوفان کا عذاب بھی۔ (کبیر)

ان کی قوم نے اس کے جواب میں کہا۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ لفظ ملاء قوم کے سرداروں اور بڑے لوگوں کے چودھریوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعوت کے جواب میں قوم کے سرداروں نے کہا کہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہمارے باپ دادوں کے دین سے ہم کو نکالنا چاہتے ہیں اور قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے اور جزاء و سزا پانے کے خیالات یہ سب اوہام ہیں۔

اس دل آزار و دلخراش گفتگو کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام نے پیغمبرانہ لہجہ میں جو جواب دیا وہ مبلغین و مصلحین کے لئے ایک اہم تعلیم و ہدایت ہے کہ اشتعال کی بات پر مشتعل اور غضبناک ہونے کے بجائے سادہ لفظوں میں ان کے شبہات کا ازالہ فرما رہے ہیں۔ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔

یعنی اے میری قوم مجھ میں کوئی گمراہی نہیں مگر بات یہ ہے کہ میں تمہاری طرح آبائی رسوم جہالت کا پابند نہیں بلکہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں جو کچھ کہتا ہوں ہدایاتِ ربی سے کہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا پیغام تم کو پہنچاتا ہوں جس میں تمہارا ہی بھلا ہے نہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی فائدہ اور نہ میری کوئی غرض۔ اس میں رب العالمین کا لفظ عقیدہ شرک پر ضرب کاری ہے کہ اس میں غور کرنے کے بعد نہ کوئی دیوی اور دیوتا ٹھہر سکتا ہے نہ کوئی یزدان و اہرمن۔ اس کے بعد فرمایا کہ تم کو جو قیامت کے عذاب میں شبہات ہیں اُس کی وجہ تمہاری بے خبری اور ناواقفیت ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کا علم یقینی دیا گیا ہے۔

اس کے بعد ان کے دوسرے شبہ کا جواب ہے جو سورۂ مومنون میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚ یعنی ان کی قوم نے نوح علیہ السلام کی دعوت پر یہ شبہ پیش کیا کہ یہ تو ہماری ہی طرح ایک بشر اور انسان ہیں ہماری ہی طرح کھاتے پیتے سوتے جاگتے ہیں ان کو ہم کیسے اپنا مقتدا مان لیں اگر اللہ تعالیٰ کو ہمارے لئے کوئی پیغمبر بھیجنا تھا تو وہ فرشتوں کو بھیجتے جن کا امتیاز اور بڑائی ہم سب پر واضح ہوتی۔ اب تو اس کے سوا کوئی بات نہیں کہ ہماری قوم اور نسل کا ایک آدمی ہم پر اپنا تفوق اور بڑائی قائم کرنا چاہتا ہے۔

اس کے جواب میں فرمایا اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ یعنی کیا تمہیں اس پر تعجب ہے کہ تمہارے رب کا پیغام تمہاری طرف ایک ایسے شخص کی معرفت آیا جو تمہاری ہی جنس کا ہے تاکہ وہ تمہیں ڈراوے اور تاکہ تم ڈر جاؤ اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ یعنی اُس کے ڈرانے سے تم متنبہ ہو کر مخالفت چھوڑ دو جس کے نتیجہ میں تم پر رحمت نازل ہو۔

مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بشر کو رسول بنایا جائے۔ اوّل تو حق تعالیٰ مختار مطلق ہیں۔ جس کو چاہیں اپنی نبوت و رسالت عطا فرمائیں اس میں کسی کو چون چرا کی مجال نہیں۔ اس کے علاوہ اصل معاملہ پر غور کرو تو واضح ہو جائے کہ عام انسانوں کی طرف رسالت و نبوت کا مقصد بشر ہی کے ذریعہ پورا ہو سکتا ہے فرشتوں سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

کیونکہ اصل مقصد رسالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور عبادت پر لوگوں کو قائم کر دیا جائے اور اس کے احکام کی مخالفت سے بچایا جائے۔ اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ان کی جنس بشر کا کوئی شخص نمونۂ عمل بن کر ان کو دکھلا دے کہ بشری تقاضوں اور خواہشوں

کے ساتھ بھی احکامِ الٰہیہ کی اطاعت اور اس کی عبادت جمع ہو سکتی ہے۔ اگر فرشتے یہ دعوت لے کر آتے اور اپنی شان و قوت کے سامنے رکھتے تو سب لوگوں کا یہ عذر بجا تھا کہ فرشتے تو بشری خواہشات سے پاک ہیں نہ اُن کو بھوک پیاس لگتی ہے نہ نیند آتی ہے نہ تکان ہوتا ہے اُن کی طرح ہم کیسے بن جائیں۔ لیکن جب اپنا ہی ایک ہم جنس بشر تمام بشری خواہشات اور خصوصیات رکھنے کے باوجود ان احکامِ الٰہیہ کی مکمل اطاعت کر کے دکھلاتے تو اُن کے لئے کوئی عذر نہیں رہ سکتا۔

اسی بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے فرمایا لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے ڈرانے سے متاثر ہو کر لوگ ڈر جائیں وہ وہی ہو سکتا ہے جو ان کا ہم جنس اور ان کی طرح بشری خصوصیات کا جامع ہو۔ یہ شبہ اکثر امتوں کے کفار نے پیش کیا کہ کوئی بشر نبی اور رسول نہیں ہونا چاہئے اور قرآن نے سب کا یہی جواب دیا ہے۔ افسوس ہے کہ قرآن کی اتنی تصریحات کے باوجود آج بھی کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا انکار کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ مگر جاہل انسان اس حقیقت کو نہیں سمجھتا وہ کسی اپنے ہم جنس کی بڑائی کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے معاصر علماء اور صلحاء سے ان کی معاصرت کی بنا پر نفرت و مخالفت کا برتاؤ جاہلوں کا ہمیشہ شیوہ رہا ہے۔

قومِ نوح علیہ السلام کے ان خرافات کلام کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام کا یہ مشفقانہ اور ناصحانہ رویہ بھی ان کی بدنصیب قوم پر اثر انداز نہ ہوا بلکہ اندھے بن کر جھٹلانے ہی میں لگے رہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر طوفان کا عذاب بھیج دیا۔ ارشاد فرمایا۔

فَكَذَّبُوهُ فَأَنْجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ فِي الْفُلْكِ وَأَغْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا عَمِينَ۔ یعنی نوح علیہ السلام کی قوم نے ان کی نصیحت و خیر خواہی کی کوئی پروا نہ کی اور برابر اپنی تکذیب پر جمے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے نوح علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں کو ایک کشتی میں سوار کر کے طوفان سے نجات دے دی اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا ان کو غرق کر دیا۔ بے شک یہ لوگ اندھے ہو رہے تھے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ اور اُن کی قوم کی غرقابی اور کشتی والوں کی نجات کی پوری تفصیل سورۂ نوح اور سورۂ ہود میں آئے گی۔ اس جگہ بتقاضائے مقام اس کا خلاصہ بیان ہوا ہے۔ حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ قوم نوح پر طوفان کا عذاب اُس وقت آیا جب کہ وہ اپنی کثرت و قوت کے اعتبار سے بھرپور تھے۔ عراق کی زمین اور اس کے پہاڑ اُن کی کثرت کے سبب تنگ ہو رہے تھے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا یہی دستور رہا ہے کہ نافرمان لوگوں کو

ڈھیل دیتے رہتے ہیں۔ عذاب اُس وقت بھیجتے ہیں جب وہ اپنی کثرت، قوت اور دولت میں انتہا کو پہنچ جاتی ہیں اور اس میں بدمست ہو جاتی ہیں۔ (ابن کثیر)

حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں کتنے آدمی تھے اس میں روایات مختلف ہیں۔ ابن کثیرؒ نے بروایت ابن ابی حاتمؒ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ ۸۰ آدمی تھے جن میں ایک کا نام جُرہم تھا یہ عربی زبان بولتا تھا۔ (ابن کثیر)

بعض روایات میں یہ تفصیل بھی آئی ہے کہ ۸۰ کے عدد میں چالیس مرد اور چالیس عورتیں تھیں۔ طوفان کے بعد یہ سب حضرت موصل میں جس جگہ مقیم ہوئے اُس بستی کا نام ثمانون مشہور ہوگیا۔

غرض اس جگہ نوح علیہ السلام کا مختصر قصہ بیان فرما کر ایک تو یہ بتلا دیا کہ تمام انبیاء قدیم کی دعوت اور اصول عقائد ایک ہی تھے۔ دوسرے یہ بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کی تائید و حمایت کس طرح حیرت انگیز طریقہ پر کرتے ہیں کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ جانے والے طوفان میں بھی ان کی سلامتی کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ تیسرے یہ واضح کر دیا کہ انبیاء علیہم السلام کی تکذیب عذاب الٰہی کو دعوت دینا ہے جس طرح پچھلی امتیں تکذیب انبیاء کے سبب عذاب میں گرفتار ہوگئیں آج کے لوگوں کو بھی اس سے بے خوف نہیں ہونا چاہئے۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ

اور قوم عاد کی طرف بھیجا اُن کے بھائی ہود کو، بولا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا

اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ

معبود اس کے سوا، سو کیا تم ڈرتے نہیں۔ بولے سردار جو کافر تھے اُس

قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۶﴾

کی قوم میں ہم تو دیکھتے ہیں تجھ کو عقل نہیں اور ہم تو تجھ کو جھوٹا گمان کرتے ہیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ

بولا اے میری قوم میں کچھ بے عقل نہیں لیکن میں بھیجا ہوا ہوں پروردگار

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۷﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿۶۸﴾

عالم کا۔ پہنچاتا ہوں تم کو پیغام اپنے رب کے اور میں تمہارا خیرخواہ ہوں اطمینان کے لائق۔

اَوَعَجِبۡتُمۡ اَنۡ جَآءَكُمۡ ذِكۡرٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَلٰى رَجُلٍ مِّنۡكُمۡ لِيُنۡذِرَكُمۡ

کیا تم کو تعجب ہوا کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے ایک مرد کی زبانی جو تم ہی میں سے ہے تاکہ تم کو ڈرائے

وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَكُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّزَادَكُمۡ فِى

اور یاد کرو جبکہ تم کو سردار کر دیا پیچھے قوم نوح کے اور زیادہ کر دیا تمہارے

الۡخَلۡقِ بَصۜۡطَةً ۚ فَاذۡكُرُوۡۤا اٰلَاۤءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ۞ قَالُوۡۤا

بدن کا پھیلاؤ، سو یاد کرو احسان اللہ کے تاکہ تمہارا بھلا ہو، بولے

اَجِئۡتَنَا لِنَعۡبُدَ اللّٰهَ وَحۡدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ

کیا تو اس واسطے ہمارے پاس آیا کہ ہم بندگی کریں اللہ اکیلے کی اور چھوڑ دیں جن کو پوجتے رہے ہمارے باپ دادے،

فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ‏(۷۰) قَالَ قَدۡ وَقَعَ

پس لے آ ہمارے پاس جس چیز سے تو ہم کو ڈراتا ہے اگر تو سچا ہے۔ کہا تم پر واقع

عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ رِجۡسٌ وَّغَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوۡنَنِىۡ فِىۡۤ اَسۡمَآءٍ

ہو چکا ہے تمہارے رب کی طرف سے عذاب اور غصہ، کیوں جھگڑتے ہو مجھ سے ان ناموں پر کہ

سَمَّيۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ ؕ

رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے، نہیں اتاری اللہ نے ان کی کوئی سند،

فَانۡتَظِرُوۡۤا اِنِّىۡ مَعَكُمۡ مِّنَ الۡمُنۡتَظِرِيۡنَ ۞ فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَالَّذِيۡنَ

سو منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔ پھر بچا دیا ہم نے اس کو اور جو

مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعۡنَا دَابِرَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا

اس کے ساتھ تھے اپنی رحمت سے اور جڑ کاٹی ان کی جو جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو

وَمَا كَانُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ ‏(۷۲)

اور نہیں مانتے تھے۔

ع ۹ ۱۶

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے برادری یا وطن کے بھائی (حضرت) ہود علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا کہ اے میری قوم تم (صرف) اللہ کی

عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود ہونے کے قابل نہیں، اور بت پرستی چھوڑ دو جیسا آگے وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا سے معلوم ہوتا ہے) سو کیا تم (ایسے بڑے جرم عظیم یعنی شرک کے مرتکب ہو کر عذاب الٰہی سے) نہیں ڈرتے ان کی قوم میں جو آبرودار لوگ کافر تھے انہوں نے (جواب میں) کہا کہ ہم تم کو کم عقلی میں (مبتلا) دیکھتے ہیں (کہ توحید کی تعلیم کر رہے ہو اور عذاب سے ڈرا رہے ہو) اور ہم بیشک تم کو جھوٹے لوگوں میں سے سمجھتے ہیں (یعنی نعوذ باللہ نہ تو توحید صحیح مسئلہ ہے اور نہ عذاب کا آنا صحیح ہے) انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم مجھ میں ذرا بھی کم عقلی نہیں لیکن چونکہ میں پروردگار عالم کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں (انہوں نے مجھ کو تعلیم توحید اور انذار عذاب کا حکم کیا ہے اس لئے اپنا منصب کام کرتا ہوں کہ) تم کو اپنے پروردگار کے پیغام اور احکام پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا خیرخواہ امانت دار ہوں کیونکہ توحید و ایمان میں تمہارا ہی نفع ہے) اور (تم جو میرے بشر ہونے سے میری نبوت کا انکار کرتے ہو جیسا سورۂ ابراہیم میں بعد ذکر قوم نوح و عاد و ثمود کے ہے قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا اور سورۂ فصلت میں بعد ذکر عاد و ثمود کے ہے قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً تو) کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت جو تمہاری ہی جنس کا (بشر) ہے کوئی نصیحت کی بات آگئی (وہ نصیحت کی بات وہی ہے جو مذکور ہوئی يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ الٰی قولہ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ) تاکہ وہ شخص تم کو (عذاب الٰہی سے) ڈراوے (یعنی یہ تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیا بشریت و نبوت میں منافاۃ ہے اوپر اَفَلَا تَتَّقُوْنَ میں ترہیب تھی آگے ترغیب ہے) اور (اے قوم) تم یہ حالت یاد کرو (اور یاد کرکے احسان مانو اور اطاعت کرو) کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو قوم نوح کے بعد (روئے زمین پر) آباد کیا اور ڈیل ڈول میں تم کو پھیلاؤ (بھی) زیادہ دیا سو خدا تعالیٰ کی (ان) نعمتوں کو یاد کرو (اور یاد کرکے احسان مانو اور اطاعت کرو) تاکہ تم کو (ہر طرح کی) فلاح ہو وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا (خوب) آپ ہمارے پاس اس واسطے آئے ہیں کہ ہم صرف اللہ ہی کی عبادت کیا کریں اور جن (بتوں) کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے ہم ان (کی عبادت) کو چھوڑ دیں (یعنی ہم ایسا نہ کریں گے، اور ہم کو نہ ماننے پر) جس عذاب کی دھمکی دیتے ہو (جیسا اَفَلَا تَتَّقُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے) اس (عذاب) کو ہمارے پاس منگوا دو اگر تم سچے ہو انہوں نے فرمایا کہ (تمہاری سرکشی کی جب یہ حالت ہے تو) بس اب تم پر خدا کی طرف سے عذاب اور غضب آیا ہی چاہتا ہے (پس عذاب کے شبہ کا جواب تو اس وقت معلوم ہو جائے گا اور باقی توحید پر جو شبہ ہے کہ ان بتوں کو معبود کہتے ہو جن کا نام تو تم نے معبود

رکھ لیا ہے لیکن واقع میں ان کے معبود ہونے کی کوئی دلیل ہی نہیں تو کیا تم مجھ سے ایسے بے حقیقت ناموں کے باب میں جھگڑتے ہو یعنی وہ مسمیات بمنزلہ بعض اسماء کے ہیں، جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے آپ ہی ٹھہرا لیا ہے (لیکن ان کے معبود ہونے کی خدا تعالیٰ نے کوئی دلیل (نقلی یا عقلی) نہیں بھیجی (یعنی جدل میں مدعی کے ذمہ دلیل ہے اور مقابل کی دلیل کا جواب بھی، سو تم نہ دلیل قائم کر سکتے ہو نہ میری دلیل کا جواب دے سکتے ہو پھر جدال کا کیا معنی، سو تم (اب جدل ختم کرو اور عذاب ہی کے) منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں غرض (عذاب آیا اور) ہم نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو (یعنی مؤمنین کو) اپنی رحمت (وکرم) سے (اس عذاب سے) بچا لیا اور ان لوگوں کی جڑ تک کاٹ دی (یعنی بالکل ہلاک کر دیا) جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا اور وہ (بوجہ غایت قساوت کے) ایمان لانے والے نہ تھے (یعنی اگر ہلاک بھی نہ ہوتے جب بھی ایمان نہ لاتے اس لئے ہم نے بمقتضائے اس وقت کی حکمت کے خاتمہ ہی کر دیا)۔

معارف ومسائل

عاد اور ثمود کی مختصر تاریخ: عاد اصل میں ایک شخص کا نام ہے جو نوح علیہ السلام کی پانچویں نسل اور ان کے بیٹے سام کی اولاد میں ہے۔ پھر اس شخص کی اولاد اور پوری قوم عاد کے نام سے مشہور ہوگئی۔ قرآن کریم میں عاد کی ساتھ کہیں لفظ عاداُولیٰ اور کہیں اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ بھی آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد کو ارم بھی کہا جاتا ہے۔ اور عاد اولیٰ کے مقابلہ میں کوئی عاد ثانیہ بھی ہے، اس کی تحقیق میں مفسرین اور مؤرخین کے اقوال مختلف ہیں۔ زیادہ مشہور یہ ہے کہ عاد کے دادا کا نام ارم ہے اس کے ایک بیٹے یعنی عوص کی اولاد میں عاد ہے یہ عاد اولیٰ کہلاتا ہے اور دوسرے بیٹے جثر کا بیٹا ثمود ہے یہ عاد ثانی کہلاتا ہے۔ اس تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ عاد اور ثمود دونوں ارم کی دو شاخیں ہیں۔ ایک شاخ کو عاد اولیٰ اور دوسری کو ثمود یا عاد ثانیہ بھی کہا جاتا ہے اور لفظ ارم عاد و ثمود دونوں کے لئے مشترک ہے۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ قوم عاد پر جس وقت عذاب آیا تو ان کا ایک وفد مکہ معظمہ گیا ہوا تھا وہ عذاب سے محفوظ رہا اس کو عاد اُخریٰ کہتے ہیں۔ (بیان القرآن)

اور ہود علیہ السلام ایک نبی کا نام ہے یہ بھی نوح علیہ السلام کی پانچویں نسل اور سام کی اولاد میں ہیں قوم عاد اور حضرت ہود علیہ السلام کا نسب نامہ چوتھی پشت میں سام پر

جمع ہو جاتا ہے اس لئے ہود علیہ السلام عاد کے نسبی بھائی ہیں اس لئے اَخَاهُمْ هُوْدًا فرمایا گیا۔

قوم عاد کے تیرہ خاندان تھے۔ عمان سے لے کر حضرموت اور یمن تک ان کی بستیاں تھیں۔ ان کی زمینیں بڑی سرسبز و شاداب تھیں ہر قسم کے باغات تھے۔ رہنے کے لئے بڑے بڑے شاندار محلات بناتے تھے۔ بڑے قد آور قوی ہیکل آدمی تھے آیت مذکورہ میں زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً کا یہی مطلب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ساری ہی نعمتوں کے دروازے ان پر کھول دیئے تھے۔ مگر ان کی کج فہمی نے انہیں نعمتوں کو ان کے لئے وبالِ جان بنا دیا۔ اپنی قوت و شوکت کے نشہ میں بدمست ہو کر مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً کی ڈینگ مارنے لگے۔

اور رب العالمین جس کی نعمتوں کی بارش ان پر ہو رہی تھی اس کو چھوڑ کر بت پرستی میں مبتلا ہوگئے۔

حضرت ہود علیہ السلام کا نسب نامہ اور بعض حالات

اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے ہود علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا جو خود انہیں کے خاندان سے تھے۔ اور ابوالبرکات جونی جو انساب عرب کے بڑے ماہر مشہور ہیں انہوں نے لکھا ہے کہ ہود علیہ السلام کے بیٹے یعرب بن قحطان ہیں جو یمن میں جا کر آباد ہوئے اور یمنی اقوام انہیں کی نسل ہیں۔ اور عربی زبان کی ابتداء انہیں سے ہوئی اور یعرب کی مناسبت سے ہی زبان کا نام عربی اور اس کے بولنے والوں کو عرب کہا گیا (بحر محیط)

مگر صحیح یہ ہے کہ عربی زبان تو عہد نوح علیہ السلام سے جاری تھی کشتی نوح علیہ السلام کے ایک رفیق جرہم تھے جو عربی زبان بولتے تھے (بحر محیط)۔ اور یہی جرہم ہیں جن سے مکہ معظمہ کی آبادی شروع ہوئی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ یمن میں عربی زبان کی ابتدا یعرب بن قحطان سے ہوئی ہو اور ابوالبرکات کی تحقیق کا یہی مطلب ہو۔

حضرت ہود علیہ السلام نے قوم عاد کو بت پرستی چھوڑ کر توحید اختیار کرنے اور ظلم و جور چھوڑ کر عدل و انصاف اختیار کرنے کی تلقین فرمائی۔ مگر یہ لوگ اپنی دولت و قوت کے نشہ میں سرشار تھے۔ بات نہ مانی جس کے نتیجہ میں ان پر پہلا عذاب تو یہ آیا کہ تین سال تک مسلسل بارش بند ہوگئی۔ ان کی زمینیں خشک ریگستانی صحرا بن گئیں باغات جل گئے۔ مگر اس پر بھی یہ لوگ شرک و بت پرستی سے باز نہ آئے تو آٹھ دن اور سات راتوں تک ان پر شدید قسم کی آندھی کا عذاب مسلط ہوا جس نے ان کے رہے سہے باغات اور محلات کو زمین پر بچھا دیا ان کے آدمی اور جانور ہوا میں اڑتے اور پھر سر کے بل آ کر گرتے تھے۔ اس طرح یہ قوم عاد پوری کی پوری ہلاک کر دی گئی۔ آیت مذکورہ میں جو ارشاد ہے وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا

یعنی ہم نے جھٹلانے والوں کی نسل قطع کردی، اس کا مطلب بعض حضرات نے یہی قرار دیا ہے کہ اس وقت جو لوگ موجود تھے وہ سب فنا کردیئے گئے۔ اور بعض حضرات نے اس لفظ کے یہ معنی قرار دیئے ہیں کہ آئندہ کے لئے بھی قوم عاد کی نسل اللہ تعالیٰ نے منقطع کردی۔

حضرت ہود علیہ السلام کی بات نہ ماننے اور کفر و شرک میں مبتلا رہنے پر جب ان کی قوم پر عذاب آیا تو ہود علیہ السلام اور ان کے رفقاء نے ایک حظیرہ (گھیر) میں پناہ لی۔ یہ عجیب بات تھی کہ اس طوفانی ہوا سے بڑے بڑے محلات تو منہدم ہو رہے تھے مگر اس گھیر میں ہوا نہایت معتدل ہو کر داخل ہوتی تھی۔ ہود علیہ السلام کے سب رفقاء عین نزول عذاب کے وقت بھی اسی جگہ مطمئن بیٹھے رہے ان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی۔ قوم کے ہلاک ہوجانے کے بعد مکہ معظمہ میں منتقل ہوگئے اور پھر یہیں وفات پائی۔ (بحر محیط)

قوم عاد کا عذاب ہوا کے طوفان کی صورت میں تو قرآن مجید میں صراحۃً مذکور اور منصوص ہے اور سورۂ مؤمنون میں قصہ نوح علیہ السلام ذکر کرنے کے بعد جو ارشاد ہوا ہے ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ یعنی پھر ہم نے ان کے بعد ایک اور جماعت پیدا کی، ظاہر یہ ہے کہ اس جماعت سے مراد قوم عاد ہے۔ پھر اس جماعت کے اعمال و اقوال بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ یعنی پکڑ لیا ان کو ایک سخت آواز نے۔ اس ارشادِ قرآنی کی بناء پر بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ قوم عاد پر سخت قسم کی ہیبتناک آواز کا عذاب مسلط ہوا تھا مگر ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں، ہوسکتا ہے کہ سخت آواز بھی ہوئی ہو اور ہوا کا طوفان بھی۔

یہ مختصر واقعہ ہے قوم عاد اور حضرت ہود علیہ السلام کا، اس کی تفصیل قرآنی الفاظ کے ساتھ یہ ہے۔

پہلی آیت میں وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ۔ یعنی ہم نے قوم عاد کی طرف اُن کے بھائی ہود علیہ السلام کو ہدایت کے لئے بھیجا تو انہوں نے فرمایا۔ اے میری قوم تم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اُس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں ہے کیا تم ڈرتے نہیں۔

قوم عاد سے پہلے قوم نوح علیہ السلام کا عذاب عظیم ابھی تک لوگوں کے ذہنوں سے غائب نہ ہوا تھا اس لئے حضرت ہود علیہ السلام کو عذاب کی شدت و عظمت بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی صرف اتنا فرمانا کافی سمجھا کہ کیا تم اللہ کے عذاب سے ڈرتے نہیں۔

دوسری آیت میں ہے قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ

مِنَ الْكٰذِبِیْنَ۔ یعنی قوم کے سرداروں نے کہا کہ ہم آپ کو بے وقوفی میں مبتلا پاتے ہیں اور ہمارا گمان یہ ہے کہ آپ جھوٹ بولنے والوں میں سے ہیں۔

یہ تقریباً ایسا ہی معارضہ ہے جیسا حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے ان سے کیا تھا صرف بعض الفاظ کا فرق ہے۔ تیسری اور چوتھی آیت میں اس کا جواب بھی تقریباً اُسی انداز کا ہے جیسا نوح علیہ السلام نے دیا تھا۔ یعنی یہ کہ مجھ میں بے وقوفی کچھ نہیں بات صرف اتنی ہے کہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول اور پیغمبر بن کر آیا ہوں اُس کے پیغامات تمہیں پہنچاتا ہوں۔ اور میں واضح طور پر تمہارا خیرخواہ ہوں۔ اس لئے تمہاری آبائی جہالتوں اور غلطیوں میں تمہارا ساتھ دینے کے بجائے میں تمہارے طبائع کے خلاف حق بات تمہیں پہنچاتا ہوں جس سے تم بُرا مانتے ہو۔

پانچویں آیت میں قوم عاد کا وہی اعتراض ذکر کیا گیا ہے جو ان سے پہلے قوم نوح علیہ السلام نے پیش کیا تھا کہ ہم کسی اپنے ہی جیسے بشر اور انسان کو کیسے اپنا بڑا اور پیشوا مان لیں کوئی فرشتہ ہوتا تو ممکن تھا کہ ہم مان لیتے۔ اس کا جواب بھی قرآنِ کریم نے وہی ذکر کیا جو نوح علیہ السلام نے دیا تھا کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کوئی انسان اللہ کا نبی اور رسول ہو کر لوگوں کو ڈرانے کے لئے آجائے۔ کیونکہ درحقیقت انسان کے سمجھانے بجھانے کے لئے انسان ہی کا پیغمبر ہونا مؤثر ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد ان کو وہ انعامات یاد دلائے جو اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر مبذول فرمائے ہیں ارشاد فرمایا وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِی الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ یعنی اس بات کو یاد کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو قوم نوح کے بعد زمین کا مالک و متصرف بنا دیا اور ڈیل ڈول میں تم کو پھیلاؤ بھی زیادہ دیا۔ اُس کی ان نعمتوں کو یاد کرو تو تمہارا بھلا ہوگا۔

مگر اس سرکش بدمست قوم نے ایک نہ سنی اور وہی جواب دیا جو عام طور پر گمراہ لوگ دیا کرتے ہیں کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم سے ہمارے باپ دادا کا مذہب چھڑا دو اور سارے دیوتاؤں کو چھوڑ کر ہم صرف ایک خدا کو ماننے لگیں۔ یہ تو ہم سے نہ ہوگا۔ آپ جس عذاب کی دھمکی ہمیں دے رہے ہیں اس عذاب کو بلاؤ اگر تم سچے ہو۔

چھٹی آیت میں ہود علیہ السلام نے جواب دیا کہ جب تمہاری سرکشی اور بے ہوشی کی یہ حالت ہے تو اب تم پر خدا تعالیٰ کا غضب اور عذاب آیا ہی چاہتا ہے تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی اب اُسی کا انتظار کرتے ہیں۔ قوم کے اس اشتعال آمیز جواب پر عذاب آنے کی خبر تو دے دی لیکن پیغمبرانہ شفقت و نصیحت نے پھر مجبور کیا کہ اس کلام کے دوران میں یہ بھی

فرمایا کہ افسوس ہے تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے بے عقل بے جان چیزوں کو اپنا معبود بنا لیا جن کے معبود ہونے پر نہ کوئی عقلی دلیل ہے نہ نقلی اور پھر تم ان کی عبادت میں ایسے پختہ ہوگئے کہ ان کی حمایت میں مجھ سے جھگڑا کر رہے ہو۔

آخری آیت میں ارشاد فرمایا کہ ہود علیہ السلام کی ساری جدوجہد اور عاد قوم کی سرکشی کا آخری انجام یہ ہوا کہ ہم نے ہود علیہ السلام کو اور ان لوگوں کو جو ان پر ایمان لائے تھے عذاب سے محفوظ رکھا اور جھٹلانے والوں کی جڑ کاٹ دی اور وہ ایمان لانے والے نہ تھے۔

اس قصہ میں غافل انسانوں کے لئے خدا کی یاد اور اطاعت میں لگ جانے کی ہدایت اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے سامان عبرت اور مبلغین و مصلحین کے لئے پیغمبرانہ طریقہ تبلیغ و اصلاح کی تعلیم ہے۔

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم

اور ثمود کی طرف بھیجا ان کے بھائی صالح کو، بولا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا

مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ هَٰذِهِ نَاقَةُ

معبود اس کے سوا، تم کو پہنچ چکی ہے دلیل تمہارے رب کی طرف سے، یہ اونٹنی

اللَّهِ لَكُمْ آيَةً ۖ فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ ۖ وَلَا تَمَسُّوهَا

اللہ کی ہے تمہارے لئے نشانی سو اس کو چھوڑ دو کہ کھائے اللہ کی زمین میں اور اس کو ہاتھ نہ لگاؤ

بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٧٣﴾ وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ

بری طرح، پھر تم کو پکڑے گا عذاب دردناک۔ اور یاد کرو جب کہ تم کو سردار

خُلَفَاءَ مِن بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ فِي الْأَرْضِ تَتَّخِذُونَ

کر دیا عاد کے پیچھے اور ٹھکانا دیا تم کو زمین میں کہ بناتے ہو

مِن سُهُولِهَا قُصُورًا وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا ۖ فَاذْكُرُوا

نرم زمین میں محل اور تراشتے ہو پہاڑوں کے گھر، سو یاد کرو

آلَاءَ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٧٤﴾ قَالَ الْمَلَأُ

احسان اللہ کے اور مت مچاتے پھرو زمین میں فساد۔ کہنے لگے سردار

الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِمَنْ آمَنَ

جو متکبر تھے اس کی قوم میں غریب لوگوں کو کہ جو ان میں ایمان

مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا

لا چکے تھے، کیا تم کو یقین ہے کہ صالح کو بھیجا ہے اس کے رب نے، بولے ہم کو

بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ

تو جو وہ لے کر آیا اس پر یقین ہے۔ کہنے لگے وہ لوگ جو متکبر تھے جس پر تم کو

اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾

یقین ہے ہم اس کو نہیں مانتے۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا اے میری قوم تم (صرف) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں (انہوں نے ایک خاص معجزہ کی درخواست کی کہ اس پتھر میں سے ایک اونٹنی پیدا ہو تو ہم ایمان لائیں چنانچہ آپ کی دعا سے ایسا ہی ہوا، وہ پتھر پھٹا اور اس کے اندر سے ایک بڑی اونٹنی نکلی۔ رواہ محمد بن اسحٰق آپ نے فرمایا کہ) تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل (میرے رسول ہونے کی) آچکی ہے (آگے اس کا بیان ہے) یہ اونٹنی ہے اللہ کی جو تمہارے لئے دلیل (بن کر ظاہر کی گئی) ہے (اور اسی لئے اللہ کی اونٹنی کہلائی کہ اللہ کی دلیل ہے) سو (علاوہ اس کے کہ میری رسالت پر دلیل ہے خود اس کے بھی کچھ حقوق ہیں منجملہ ان کے یہ ہے کہ) اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں (گھاس چارہ) کھاتی پھرا کرے (اسی طرح اپنی باری کے دن پانی پیتی رہے جیسا دوسری آیت میں ہے) اور اس کو برائی (اور تکلیف دہی) کے ساتھ ہاتھ بھی مت لگانا کبھی تم کو دردناک عذاب آپکڑے اور (اے قوم) تم یہ حالت یاد کرو (اور یاد کرکے احسان مانو اور اطاعت کرو) کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو (قوم عاد کے بعد (روئے زمین پر) آباد کیا اور تم کو زمین پر رہنے کو (دلخواہ) ٹھکانا دیا کہ نرم زمین پر (بھی بڑے بڑے) محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں (بھی) گھر بناتے ہو سو خدا تعالیٰ کی (ان) نعمتوں کو اور دوسری نعمتوں کو بھی) یاد کرو (اور کفر و شرک کے ذریعہ) زمین میں فساد مت پھیلاؤ (یعنی ایمان لے آؤ مگر باوجود اس قدر فہمائش کے کچھ غرباء ایمان لائے اور ان میں اور رئیسوں میں یہ گفتگو ہوئی یعنی) ان کی قوم میں جو متکبر سردار تھے انہوں نے غریب لوگوں سے جو کہ ان میں سے

ایمان لے آئے تھے پوچھا کہ کیا تم کو اس بات کا یقین ہے کہ صالح (علیہ السلام) اپنے رب کی طرف سے (پیغمبر بنا کر) بھیجے ہوئے (آئے) ہیں انہوں نے (جواب میں) کہا کہ بیشک ہم تو اس (حکم) پر پورا یقین رکھتے ہیں جو ان کو دے کر بھیجا گیا ہے وہ متکبر لوگ کہنے لگے کہ تم جس چیز پر یقین لائے ہوئے ہو ہم تو اس کے منکر ہیں۔

معارف و مسائل

ان آیات میں حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم ثمود کے حالات کا تذکرہ ہے جیسے اس سے پہلے قوم نوح اور قوم ہود علیہ السلام کا ذکر آچکا ہے اور سورۂ اعراف کے آخر تک بھی انبیاء سابقین اور ان کی قوموں کے احوال انبیاء کی دعوتِ حق پر اُن کے کفر و انکار کے انجام بد کا بیان ہے۔

آیت مذکورہ میں سے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا اس سے پہلے قوم عاد کے تذکرہ میں بیان ہو چکا ہے کہ عاد و ثمود ایک ہی دادا کی اولاد میں دو شخصوں کا نام ہے ان کی اولاد بھی ان کے نام سے موسوم ہو کر دو قومیں بن گئیں ایک قوم عاد دوسری قوم ثمود کہلاتی ہے۔ عرب کے شمال مغرب میں بستے تھے، اور ان کے بڑے شہر کا نام حِجر تھا جس کو اب عموماً مدائن صالح کہا جاتا ہے۔ قوم عاد کی طرح قوم ثمود بھی دولتمند، قوی اور بہادر قوم اور سنگ تراشی اور فنِ تعمیر میں ماہر تھی کھلی زمین پر بڑے بڑے محلات بنانے کے علاوہ پہاڑوں کو کھود کر ان میں طرح طرح کی عمارتیں بناتے تھے۔ ارض القرآن میں مولانا سید سلیمان صاحبؒ نے لکھا ہے کہ ان کی تعمیری یادگاریں اب تک باقی ہیں ان پر ارمی اور ثمودی خط میں کتبے منقوش ہیں دنیا کی دولت و ثروت کا نتیجہ عموماً یہی ہوتا ہے کہ ایسے لوگ خدا و آخرت سے غافل ہو کر غلط رستوں پر پڑ جاتے ہیں۔ قوم ثمود کا بھی یہی حال ہوا۔

حالانکہ ان سے پہلے قوم نوح علیہ السلام کے عذاب کے واقعات کا تذکرہ ابھی تک دنیا میں موجود تھا اور پھر ان کے بھائی قوم عاد کی ہلاکت کے واقعات تو تازہ ہی تھے۔ مگر دولت و قوت کے نشہ کا خاصہ ہی یہ ہے کہ ابھی ایک شخص کی بنیاد منہدم ہوتی ہے دوسرا اس کی خاک کے ڈھیر پر اپنی تعمیر کھڑی کر لیتا ہے اور پہلے کے واقعات کو بھول جاتا ہے۔ قوم عاد کی تباہی اور ہلاکت کے بعد قوم ثمود ان کے مکانات اور زمینوں کی وارث بنی اور انہیں مقامات پر اپنے عشرت کدے تیار کئے جن میں ان کے بھائی ہلاک ہو چکے تھے اور ٹھیک وہی اعمال و افعال شروع کر دیئے جو قوم عاد نے کئے تھے کہ خدا و آخرت سے غافل ہو کر شرک و بت پرستی میں لگ گئے

اللہ تعالیٰ نے اپنی عادت مستمرہ کے مطابق ان کی ہدایت کے لئے حضرت صالح علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔ صالح علیہ السلام نسب و وطن کے اعتبار سے قوم ثمود ہی کے ایک فرد تھے۔ کیونکہ یہ بھی سام ہی کی اولاد میں سے تھے اسی لئے قرآن کریم میں ان کو قوم ثمود کا بھائی فرمایا ہے اَخَاهُمْ صٰلِحًا۔ صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو دعوت دی وہ وہی دعوت ہے جو آدم علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک سب انبیاء علیہم السلام دیتے چلے آئے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ہے وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ۔ یعنی ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ وہ لوگوں کو یہ ہدایت کرے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور بت پرستی سے بچو۔ عام انبیاء سابقین کی طرح صالح علیہ السلام نے بھی قوم سے یہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اور خالق و مالک سمجھو اس کے سوا کوئی معبود بنانے کے لائق نہیں۔ فرمایا يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ یعنی اب تو ایک کھلا ہوا نشان بھی تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس آ پہنچا ہے۔ اس نشان سے مراد ایک عجیب و غریب ناقہ ہے جس کا اجمالی ذکر اس آیت میں بھی ہے اور قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں اس کی مزید تفصیلات مذکور ہیں۔ واقعہ اس ناقہ کا یہ تھا کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی جوانی کے زمانہ سے اپنی قوم کو دعوت توحید دینا شروع کی اور برابر اس میں لگے رہے یہاں تک کہ بڑھاپے کے آثار شروع ہوگئے۔ صالح علیہ السلام کے بار بار اصرار سے تنگ ہو کر ان کی قوم نے یہ قرار دیا کہ ان سے کوئی ایسا مطالبہ کرو جس کو یہ پورا نہ کرسکیں اور ہم ان کی مخالفت میں سرخرو ہو جائیں۔ مطالبہ یہ کیا کہ اگر آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں تو ہماری فلاں پہاڑی جس کا نام کاتبہ تھا اس کے اندر سے ایک ایسی اونٹنی نکال دیجئے جو دس مہینہ کی گابھن ہو اور قوی و تندرست ہو۔

صالح علیہ السلام نے اول ان سے عہد لیا کہ اگر میں تمہارا یہ مطالبہ پورا کرادوں تو تم سب مجھ پر اور میری دعوت پر ایمان لے آؤ گے۔ جب سب نے معاہدہ کرلیا۔ تو صالح علیہ السلام نے دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ آپ کے لئے تو کوئی کام دشوار نہیں ان کا مطالبہ پورا فرما دیں۔ دعا کرتے ہی پہاڑی کے اندر جنبش پیدا ہوئی اور اس کی ایک بڑی چٹان پھٹ کر اس میں سے ایک اونٹنی اسی طرح کی نکل آئی جیسا مطالبہ کیا تھا۔

صالح علیہ السلام کا یہ کھلا ہوا حیرت انگیز معجزہ دیکھ کر ان میں سے کچھ لوگ تو مسلمان ہوگئے۔ اور باقی تمام قوم نے بھی ارادہ کرلیا کہ ایمان لے آئیں۔ مگر قوم کے چند سردار جو

بتوں کے خاص پجاری اور بت پرستی کے امام تھے انھوں نے ان کو بہکا کر اسلام قبول کرنے سے روک دیا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے جب دیکھا کہ قوم نے عہد شکنی کی اور خطرہ ہوا کہ ان پر کوئی عذاب آجائے تو پیغمبرانہ شفقت کی بناء پر ان کو یہ نصیحت فرمائی کہ اس اونٹنی کی حفاظت کرو، اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ تو شاید تم عذاب سے محفوظ رہو ورنہ فوراً تم پر عذاب آجائے گا یہی مضمون آیت مذکورہ کے ان جملوں میں ارشاد ہوا ہے هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْۗءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ یعنی یہ اونٹنی ہے اللہ کی جو تمہارے لئے دلیل ہے سو اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرا کرے۔ اور اس کو برائی کے ساتھ ہاتھ نہ لگاؤ ورنہ تم کو عذاب الیم آپکڑے گا اس ناقہ کو ناقۃ اللہ اس لئے کہا گیا کہ اللہ کی قدرت کاملہ کی دلیل اور صالح علیہ السلام کے معجزہ کے طور پر حیرت انگیز طریق سے پیدا ہوئی۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ فرمایا گیا کہ ان کی پیدائش بھی معجزانہ انداز سے ہوئی تھی۔ تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ اس ناقہ کے کھانے پینے میں تمہاری ملک اور تمہارے گھر سے کچھ نہیں جاتا زمین اللہ کی ہے اس کی پیداوار کا پیدا کرنے والا وہی ہے اس کی اونٹنی کو اس کی زمین میں آزاد چھوڑ دو کہ عام چراگاہوں میں کھاتی رہے۔

قوم ثمود جس کنوئیں سے پانی پیتے پلاتے تھے اسی سے یہ اونٹنی بھی پانی پیتی تھی مگر یہ عجیب الخلقت اونٹنی جب پانی پیتی تو پورے کنوئیں کا پانی ختم کر دیتی تھی۔ حضرت صالح علیہ السلام نے باذن ربانی یہ فیصلہ فرما دیا تھا کہ ایک دن یہ اونٹنی پانی پیئے گی اور دوسرے دن قوم کے سب لوگ پانی لیں گے اور جس روز یہ اونٹنی پانی پیئے گی تو دوسروں کو پانی کے بجائے اونٹنی کا دودھ اتنی مقدار میں مل جاتا تھا کہ وہ اپنے سارے برتن اس سے بھر لیتے تھے۔ قرآن میں دوسری جگہ اس تقسیم کا ذکر اس طرح آیا ہے وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَاۗءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ۔ یعنی صالح علیہ السلام آپ اپنی قوم کو بتلا دیں کہ کنوئیں کا پانی ان کے اور ناقۃ اللہ کے درمیان تقسیم ہوگا ایک دن اونٹنی کا اور دوسرے دن پوری قوم کا اور اس تقسیم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کی نگرانی مسلط ہوگی کہ کوئی اس کے خلاف نہ کر سکے۔ اور ایک دوسری آیت میں ہے هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ۔ یعنی یہ اللہ کی اونٹنی ہے ایک دن پانی کا حق اس کا اور دوسرے دن کا پانی تمہارے لئے معین و مقرر ہے۔

دوسری آیت میں اس وعدہ فراموش سرکش قوم کی خیر خواہی اور ان کو عذاب الٰہی سے بچانے کے لئے پھر ان کو اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات یاد دلائے کہ اب بھی یہ لوگ اپنی سرکشی سے باز آجائیں فرمایا۔ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ

تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا : اس میں خلفاء خلیفہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں قائم مقام اور نائب، اور قصور قصر کی جمع اونچی عالیشان عمارت اور محل کو کہا جاتا ہے تَنْحِتُوْنَ نحت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں سنگ تراشی۔ جبال جبل کی جمع ہے بمعنی پہاڑ بیوتاً بیت کی جمع ہے جو گھر کے کمرے کے لئے بولا جاتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ اُس نے قوم عاد کو ہلاک کرکے اُن کی جگہ تم کو بسایا اُن کی زمین اور مکانات تمہارے قبضہ میں دے دیئے اور تم کو یہ صنعت سکھلادی کہ کھلی زمین میں بڑے بڑے محلات بنالیتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کران میں کمرے اور مکانات بنالیتے ہو۔ آخر آیت میں فرمایا فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۔ یعنی اللہ کی نعمتیں یاد کرو اور ان کا احسان مانو اُس کی اطاعت اختیار کرو اور زمین میں فساد پھیلاتے مت پھرو۔

احکام و مسائل

آیات مذکورہ سے چند اصولی اور فروعی مسائل معلوم ہوئے۔

اوّل یہ کہ اصول عقائد میں تمام انبیاء علیہم السلام متفق ہیں اور اُن کی شریعتیں متحد ہیں سب کی دعوت توحید کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا اور اُس کی خلاف ورزی پر عذابِ دنیا و آخرت سے ڈرانا ہے۔

دوسرے یہ کہ تمام پچھلی امتوں میں ہوتا بھی رہا ہے کہ قوموں کے بڑے دولتمند آبرودار لوگوں نے ان کی دعوت کو قبول نہیں کیا اور اُس کے نتیجہ میں دنیا میں بھی ہلاک و برباد ہوئے اور آخرت میں بھی مستحق عذاب ہوئے۔

تیسرے تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں دنیا میں کافروں پر بھی مبذول ہوتی ہیں۔ جیسے کہ قوم عاد و ثمود پر اللہ تعالیٰ نے دولت و قوت کے دروازے کھول دیئے تھے۔

چوتھے تفسیر قرطبی ہی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ بڑے بڑے محلات اور عالیشان مکانات کی تعمیر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں اور اُن کا بنانا جائز ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ انبیاء و اولیاء اللہ نے اس کو اس لئے پسند نہیں فرمایا کہ یہ چیزیں انسان کو غفلت میں ڈال دینے والی ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو اونچی تعمیرات کے بارہ میں ارشادات منقول ہیں وہ اسی انداز کے ہیں۔

تیسری اور چوتھی آیت میں وہ مکالمہ اور مباحثہ ذکر کیا گیا ہے جو قوم ثمود کے دو گروہوں کے درمیان ہوا۔ ایک وہ گروہ جو صالح علیہ السلام پر ایمان لے آیا تھا، دوسرا منکرین و کفار کا گروہ۔ ارشاد فرمایا قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ

وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ

اور بولا اے میری قوم میں پہنچا چکا تم کو پیغام اپنے رب کا اور خیر خواہی کی تمہاری

وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ۝

لیکن تم کو محبت نہیں خیر خواہوں سے۔

خلاصۂ تفسیر

غرض (انہوں نے صالح علیہ السلام پر ایمان لائے اور نہ اونٹنی کے حقوق ادا کئے بلکہ) اس اونٹنی کو (بھی) مار ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم (ماننے) سے (بھی) سرکشی کی (وہ حکم اعتقاد توحید و رسالت تھا اور اس پر یہ بیباکی کہ) کہنے لگے کہ اے صالح جس (عذاب) کی آپ ہم کو دھمکی دیتے تھے اس کو منگوا دیجئے اگر آپ پیغمبر ہیں (کیونکہ پیغمبر کا صادق ہونا لازم ہے) پس پکڑا ان کو زلزلہ نے سو اپنے گھر میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے اس وقت صالح علیہ السلام ان سے منہ موڑ کر چلے اور (بطور حسرت کے فرضی خطاب کرکے) فرمانے لگے کہ اے میری قوم میں نے تو تم کو اپنے پروردگار کا حکم پہنچا دیا تھا (جس پر عمل کرنا موجب فلاح تھا) اور میں نے تمہاری (بہت) خیر خواہی کی (کہ کس طرح شفقت سے سمجھایا لیکن افسوس تو یہ ہے کہ) تم لوگ اپنے خیر خواہوں کو پسند ہی نہیں کرتے تھے (اس لئے یہ ناخوشی اور آخر روز بد دیکھا)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں آچکا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی دعا سے پہاڑ کی ایک بڑی چٹان شق ہو کر اس سے ایک عجیب و غریب اونٹنی پیدا ہو گئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس اونٹنی کو بھی اس قوم کے لئے آخری امتحان اس طرح بنا دیا تھا کہ جس کنویں سے ساری بستی کے لوگ اور ان کے مویشی پانی حاصل کرتے تھے یہ اس کا سارا پانی پی جاتی تھی اس لئے صالح علیہ السلام نے ان کے لئے باری مقرر کر دی تھی کہ ایک دن یہ اونٹنی پانی پیئے دوسرے دن بستی والے۔

قوم ثمود اس اونٹنی کی وجہ سے ایک تکلیف میں مبتلا تھے۔ اور چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ ہلاک ہو جائے مگر خود ایسی حرکت کرنے سے ڈرتے تھے کہ خدا تعالیٰ کا عذاب آجائے گا۔

شیطان کا سب سے بڑا وہ فریب جس میں مبتلا ہو کر انسان اپنی ہوش و عقل کھو بیٹھتا ہے

وہ عورت کی نذر ہے۔ قوم کی دو حسین و جمیل عورتوں نے یہ بازی لگا دی کہ جو شخص اس ناقہ کو قتل کر دے گا ہم اور ہماری لڑکیوں میں سے جس کو چاہے وہ اس کی ہے۔

قوم کے دو نوجوان، مصدع اور قدار اس نشہ میں مدہوش ہو کر اس ناقہ کو قتل کرنے کے لئے نکلے اور ناقہ کے راستہ میں ایک پتھر کی چٹان کے نیچے چھپ کر بیٹھ گئے۔ جب ناقہ سامنے آئی تو مصدع نے تیر کا وار کیا اور قدار نے تلوار سے اس کی ٹانگیں کاٹ کر قتل کر دیا۔

قرآن کریم نے اسی کو قوم ثمود کا سب سے بڑا شقی اور بدبخت قرار دیا ہے۔ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا۔ کیونکہ اس کے سبب پوری قوم عذاب میں گرفتار ہوگئی۔

حضرت صالح علیہ السلام نے ناقہ کے قتل کا واقعہ معلوم ہونے کے بعد قوم کو بحکم خداوندی بتلا دیا کہ اب تمہاری زندگی کے صرف تین دن باقی ہیں۔ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ۔ یعنی تین دن اور اپنے گھروں میں آرام کر لو اس کے بعد عذاب آنے والا ہے، اور یہ وعدہ سچا ہے اس میں تخلف کا امکان نہیں۔ مگر جس قوم کا وقت خراب آجاتا ہے اس کے لئے کوئی نصیحت و تنبیہ کارگر نہیں ہوتی۔ حضرت صالح علیہ السلام کے اس ارشاد پر بھی ان بدبخت لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کیا اور کہنے لگے کہ یہ عذاب کیسے اور کہاں سے آئے گا اور اس کی علامت کیا ہوگی۔

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ لو عذاب کی علامت بھی سن لو، کل جمعرات کے روز تم سب کے چہرے سخت زرد ہو جائیں گے مرد و عورت، بچہ بوڑھا کوئی اس سے مستثنیٰ نہ ہوگا، پھر پرسوں جمعہ کے روز سب کے چہرے سخت سرخ ہو جائیں گے اور ترسوں ہفتہ کو سب کے چہرے شدید سیاہ ہو جائیں گے۔ اور یہ دن تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ بدنصیب قوم نے یہ سن کر بجائے اس کے کہ توبہ و استغفار کی طرف متوجہ ہو جاتے یہ فیصلہ کیا کہ صالح علیہ السلام ہی کو قتل کر دیا جائے۔ کیونکہ اگر یہ سچے ہیں اور ہم پر عذاب آنا ہی ہے تو ہم اپنے سے پہلے ان کا کام تمام کیوں نہ کر دیں اور اگر جھوٹے ہیں تو اپنے جھوٹ کا خمیازہ بھگتیں۔ قوم کے اس ارادہ کا تذکرہ قرآن مجید میں دوسری جگہ تفصیل سے موجود ہے۔ قوم کے اس متفقہ فیصلہ کے تحت یہ لوگ رات کو حضرت صالح علیہ السلام کے مکان پر قتل کے ارادہ سے گئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے راستہ ہی میں ان پر پتھر برسا کر ہلاک کر دیا۔ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۔ یعنی انہوں نے بھی ایک خفیہ تدبیر کی اور ہم نے بھی ایسی تدبیر کی کہ ان کو اس کی خبر نہ ہوئی۔

اور جب جمعرات کی صبح ہوئی تو صالح علیہ السلام کے کہنے کے مطابق سب کے چہرے ایسے زرد ہوگئے جیسے کسی نے زرد رنگ پھیر دیا ہو۔ عذاب کی پہلی علامت کے پورا ہونے کے بعد بھی ظالموں کو اس طرف کوئی توجہ نہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے۔ اور اپنی غلط کاریوں سے باز آجاتے بلکہ ان کا غیظ و غضب حضرت صالح علیہ السلام پر اور بڑھ گیا اور پوری قوم اُن کے قتل کی فکروں میں پھرنے لگی۔ اللہ تعالیٰ اپنے قہر سے بچائے اس کی بھی علامات ہوتی ہیں کہ قلوب و دماغ اوندھے ہوجاتے ہیں نفع کو نقصان اور نقصان کو نفع۔ اچھے کو بُرا اور بُرے کو اچھا سمجھنے لگتے ہیں۔

بالآخر دوسرا دن آیا تو پیشگوئی کے مطابق سب کے چہرے سُرخ ہوگئے اور تیسرے دن سخت سیاہ ہوگئے۔ اب تو یہ سب کے سب اپنی زندگی سے مایوس ہوکر انتظار کرنے لگے کہ عذاب کس طرف سے کس طرح آتا ہے۔

اسی حال میں زمین سے ایک شدید زلزلہ آیا اور اوپر سے سخت ہیبتناک چیخ اور شدید آواز ہوئی جس سے سب کے سب بیک وقت بیٹھے بیٹھے اوندھے گر کر مرگئے۔ زلزلہ کا ذکر تو ان آیات میں موجود ہے جو اوپر مذکور ہوئی ہیں فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ۔ رجفہ کے معنی ہیں زلزلہ۔

اور دوسری آیت میں وَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بھی آیا ہے صَیحہ کے معنی ہیں چیخ اور شدید آواز۔ دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ دونوں طرح کے عذاب ان پر جمع ہوگئے تھے۔ زمین سے زلزلہ اور اوپر سے صیحہ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ۔ جٰثمین مصدر جثوم سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بے حس و حرکت ہوکر ایک جگہ پڑجانا یا بیٹھے رہنا (قاموس)۔ معنی یہ ہیں کہ جو جس حال میں تھا وہیں ڈھیر ہوگیا۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ قَهْرِهٖ وَعَذَابِهٖ۔

قوم ثمود کے اس قصہ کے اہم اجزاء تو خود قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں مذکور ہیں اور کچھ اجزاء روایاتِ حدیث میں مذکور ہیں۔ کچھ وہ بھی ہیں جو مفسرین نے اسرائیلی روایات سے لئے ہیں مگر ان پر کسی واقعہ اور حقیقت کے ثبوت کا مدار نہیں۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ غزوہ تبوک کے سفر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ کرام کا گزر اس مقام حِجر پر ہوا جہاں قوم ثمود پر عذاب آیا تھا۔ تو آپ نے صحابہ کرام کو ہدایت فرمائی کہ اس عذاب زدہ بستی کی زمین میں کوئی اندر نہ جائے اور نہ اُس کے کنوئیں کا پانی استعمال کرے۔ (مظہری)

اور بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قوم ثمود پر جب عذاب آیا تو ان میں بجز ایک شخص ابو رغال کے کوئی نہیں بچا۔ یہ شخص اس وقت حرم مکہ میں پہنچا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حرم مکہ کے احترام کے سبب اس وقت اس کو عذاب سے بچا لیا اور بالآخر جب یہ حرم سے نکلا تو وہی عذاب جو اس کی قوم پر آیا تھا اس پر بھی آگیا اور یہیں ہلاک ہوگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مکہ سے باہر ابو رغال کی قبر کا نشان بھی دکھلایا اور یہ بھی فرمایا کہ اس کے ساتھ ایک سونے کی چھڑی بھی دفن ہوگئی تھی۔ صحابہ کرام نے قبر کھولی تو سونے کی چھڑی مل گئی وہ نکال لی۔ اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ طائف کے باشندے **بنو ثقیف اسی ابو رغال کی اولاد ہیں۔ (مظہری)**

ان معذب قوموں کی بستیوں کو اللہ تعالیٰ نے آنے والی نسلوں کے لئے عبرت کدہ بنا کر قائم رکھا ہے اور قرآن کریم نے عرب کے لوگوں کو بار بار اس پر متنبہ کیا ہے کہ تمہارے سفر شام کے راستہ پر یہ مقامات آج بھی داستانِ عبرت بنے ہوئے ہیں۔

لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا۔

قوم صالح علیہ السلام کے واقعہ عذاب کے آخر میں ارشاد ہے فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ یعنی قوم پر عذاب نازل ہونے کے بعد حضرت صالح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے مومنین بھی اس جگہ کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے گئے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ چار ہزار مومنین تھے ان سب کو لے کر یمن کے علاقہ حضرموت میں چلے گئے اور وہیں حضرت صالح علیہ السلام کی وفات ہوئی اور بعض روایات سے ان کا مکہ معظمہ **چلے جانا اور وہیں وفات ہونا معلوم ہوتا ہے۔**

ظاہر عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے چلتے وقت اپنی قوم کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے میری قوم میں نے تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کی **مگر افسوس تم خیر خواہوں کو ہی پسند نہیں کرتے۔**

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ جب ساری قوم عذاب سے ہلاک ہو چکی تو اب ان کو خطاب کرنے سے کیا فائدہ۔ جواب یہ ہے کہ ایک فائدہ تو یہی ہے کہ اس سے لوگوں کو عبرت ہو اور یہ خطاب ایسا ہی ہے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر میں مرے ہوئے قریشی مشرکین کو خطاب کر کے کچھ کلمات ارشاد فرمائے تھے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کا یہ فرمانا نزولِ عذاب اور ہلاکت قوم سے پہلے ہوا ہو گو بیان میں اس کو مؤخر ذکر کیا ہے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ

اور بھیجا لوط کو جب کہا اس نے اپنی قوم کو کیا تم کرتے ہو ایسی بے حیائی کہ تم سے پہلے نہیں کیا اس کو

بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ

کسی نے جہان میں تم تو دوڑتے ہو مردوں پر

شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾

شہوت کے مارے عورتوں کو چھوڑ کر بلکہ تم لوگ ہو حد سے گزرنے والے

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ

اور کچھ جواب نہ دیا اس کی قوم نے مگر یہی کہا کہ نکالو ان کو اپنے

قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ

شہر سے یہ لوگ بہت ہی پاک رہنا چاہتے ہیں پھر بچا دیا ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو

اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ

مگر اس کی عورت کہ رہ گئی وہاں کے رہنے والوں میں اور برسایا ہم نے ان پر مینہ (پتھروں کا)

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۸۴﴾

پھر دیکھ کیا ہوا انجام گنہگاروں کا

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے لوط (علیہ السلام) کو (چند بستیوں کی طرف پیغمبر بنا کر) بھیجا جب کہ انہوں نے اپنی قوم (یعنی اپنی امت) سے فرمایا کیا تم ایسا فحش کام کرتے ہو جس کو تم سے پہلے کسی نے دنیا جہان والوں میں سے نہیں کیا (یعنی تم مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو عورتوں کو چھوڑ کر اور اس کام کے ارتکاب میں یہ نہیں کہ تم کو کوئی دھوکہ ہوگیا ہو) بلکہ (اس باب میں) تم حد (انسانیت) ہی سے گزر گئے ہو اور ان مضامین کا) ان کی قوم سے کوئی (معقول) جواب نہ بن پڑا بجز اس کے کہ (آخر میں بیہودگی کی راہ سے) آپس میں کہنے لگے کہ ان لوگوں کو (یعنی لوط علیہ السلام کو اور ان کے ساتھی مؤمنین کو) تم اپنی اس بستی سے نکال دو (کیونکہ) یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں (اور ہم کو گندہ بتلاتے ہیں پھر گندوں میں پاکوں کا کیا کام، یہ بات انہوں نے براہ تمسخر کہی تھی) سو جب یہاں تک نوبت پہنچی تو ہم نے (اس قوم پر

عذاب نازل کیا اور) لوط علیہ السلام کو اور ان کے متعلقین کو یعنی ان کے گھر والوں کو اور دوسرے ایمان والوں کو بھی اس عذاب سے بچا لیا اس طرح کہ وہاں سے نکل جانے کا پہلے ہی حکم ہوگیا، بجز ان کی بیوی کے کہ وہ بوجہ ایمان نہ لانے کے ان ہی لوگوں میں رہی جو عذاب میں رہ گئے تھے اور وہ عذاب جو ان پر نازل ہوا یہ تھا کہ ہم نے ان پر ایک نئی طرح کا مینہ برسایا کہ وہ پتھروں کی بارش تھی، سو اے دیکھنے والے دیکھ تو سہی ان مجرموں کا انجام کیسا ہوا اگر تو غور سے دیکھے گا تو تعجب کرے گا اور سمجھے گا کہ نافرمانی کا کیا انجام ہوتا ہے)۔

معارف و مسائل

انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے قصص کا جو سلسلہ اوپر سے چل رہا ہے اس کا **چوتھا قصہ حضرت لوط علیہ السلام کا ہے۔**

لوط علیہ السلام حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں۔ دونوں کا اصل وطن مغربی عراق میں بصرہ کے قریب ارض بابل کے نام سے معروف تھا اس میں بت پرستی کا عام رواج تھا۔ خلیل اللہ علیہ السلام کا گھرانہ خود بت پرستی میں مبتلا تھا۔ حق تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے ابراہیم علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔ قوم نے مخالفت کی جس کی نوبت آتش نمرود تک پہنچی۔ خود والد نے گھر سے نکال دینے کی دھمکیاں دیں۔

اپنے گھرانہ میں سے صرف زوجہ محترمہ حضرت سارہ اور بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام مسلمان ہوئے۔ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ۔ بالآخر انہیں دونوں کو ساتھ لے کر وطن سے ملک شام کی طرف ہجرت فرمائی۔ نہر اردن پر پہنچنے کے بعد بحکم خداوندی حضرت ابراہیم علیہ السلام علاقہ کنعان میں جا کر مقیم ہوئے جو بیت المقدس کے قریب ہے۔

اور لوط علیہ السلام کو بھی حق تعالیٰ نے نبوت عطا فرما کر اردن اور بیت المقدس کے درمیان مقام سدوم کے لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا۔ یہ علاقہ پانچ اچھے بڑے شہروں پر مشتمل تھا۔ جن کے نام سدوم، عمورہ، ادمہ، صبوبیم اور بالع یا صوغر تھے ان کے مجموعہ کو قرآن کریم نے مؤتفکہ اور مؤتفکات کے الفاظ میں کئی جگہ بیان فرمایا ہے۔ سدوم ان شہروں کا دارالحکومت اور مرکز سمجھا جاتا تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام نے یہیں قیام فرمایا۔ زمین سرسبز و شاداب تھی ہر طرح کے غلے اور پھلوں کی کثرت تھی۔ (یہ تاریخی تفصیلات بحر محیط، مظہری، ابن کثیر، المنار وغیرہ میں مذکور ہیں)۔

انسان کی عام عادت قرآن کریم نے یوں فرمائی ہے کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰی، یعنی انسان سرکشی کرنے لگتا ہے جب یہ دیکھتا ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں رہا۔ ان لوگوں پر بھی حق تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ عام انسانی عادت کے تحت دولت وثروت کے نشہ میں مبتلا ہوکر عیش وعشرت اور ہوا وہوس کے اس کنارے پر پہنچ گئے کہ انسانی غیرت وحیاء اور اچھے برے کی فطری تمیز بھی کھو بیٹھے۔ ایسے خلاف فطرت فواحش میں مبتلا ہوگئے جو حرام اور گندہ ہونے کے علاوہ فطرت سلیمہ کے لئے نفرت اور ایسے گھن کے کام ہیں کہ عام جانور بھی اس کے پاس نہیں جاتے۔

حضرت لوط علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے مامور فرمایا، انھوں نے اپنی قوم کو خطاب کرکے فرمایا۔ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ۔ یعنی بطور تنبیہ کے فرمایا کیا تم ایسا فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے سارے جہان میں کسی نے نہیں کیا۔

زنا کے بارہ میں تو قرآن کریم نے اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً بغیر الف لام کے ذکر کیا ہے اور یہاں الف لام کے ساتھ الفاحشہ فرما کر اس کی طرف اشارہ کردیا کہ یہ خلاف فطرت بدکاری گویا تمام فواحش کا مجموعہ اور زنا سے زیادہ شدید جرم ہے۔

پھر یہ فرمایا کہ یہ بدکاری تم سے پہلے سارے جہان میں کسی نے نہیں کی۔ عمرو بن دینار نے فرمایا کہ اس قوم سے پہلے دنیا میں کبھی یہ حرکت نہ دیکھی گئی تھی (مظہری) اور نہ اہل سدوم سے پہلے کسی برے سے برے انسان کا ذہن اس طرف گیا تھا۔ اموی خلیفہ عبدالملک نے کہا کہ اگر قرآن میں قوم لوط علیہ السلام کا واقعہ مذکور نہ ہوتا تو میں کبھی گمان نہیں کرسکتا تھا کہ کوئی انسان ایسا کام کرسکتا ہے۔ (ابن کثیر)

اس میں ان کی بے حیائی پر دو حیثیت سے تنبیہ کی گئی اول تو یہ کہ بہت سے گناہوں میں انسان اپنے ماحول یا اپنے اسلاف کی تقلید کی وجہ سے مبتلا ہوجاتا ہے گو وہ بھی کوئی شرعی عذر نہیں۔ مگر عرفاً اس کو کسی نہ کسی درجہ میں معذور کہا جاسکتا ہے۔ مگر ایسا گناہ جو پہلے کسی نے نہیں کیا نہ اس کے لئے ماحولی مقتضیات ہیں یہ اور بھی زیادہ وبال ہے۔ دوسرے اس حیثیت سے کہ کسی برے کام یا بری رسم کو جو شخص ایجاد کرتا ہے اس پر اپنے فعل کا گناہ اور عذاب تو ہوتا ہی ہے اس کے ساتھ ان تمام لوگوں کا عذاب و وبال بھی اسی کی گردن پر ہوتا ہے جو قیامت تک اس کے فعل سے متاثر ہوکر مبتلائے گناہ ہوجاتے ہیں۔

دوسری آیت میں ان کی اس بے حیائی کو زیادہ واضح الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا کہ

تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو۔ اس میں اشارہ کر دیا کہ انسان کی طبعی اور فطری خواہش کی تسکین کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک حلال اور جائز طریقہ عورتوں سے نکاح کرنے کا مقرر فرما دیا ہے اُس کو چھوڑ کر غیر فطری طریقہ کو اختیار کرنا نری خباثت نفس اور گندہ ذہنی کا ثبوت ہے۔

اسی لئے صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین نے اس جرم کو عام بدکاری سے زیادہ شدید جرم و گناہ قرار دیا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فرمایا ایسا فعل کرنے والے کو ایسی ہی سزا دینا چاہئے جیسے قوم لوط کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی کہ آسمان سے پتھر برسے، زمین کا تختہ الٹ گیا اس لئے اس شخص کو کسی اونچے پہاڑ سے گرا کر اوپر سے پتھراؤ کر دیا جائے۔ مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ میں بروایت ابن عباسؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کام کرنے والوں کے بارہ میں فرمایا فاقتلوا الفاعل والمفعول به۔ یعنی اس کام کے فاعل و مفعول دونوں کو قتل کر دیا جائے۔ (ابن کثیر)

آخر آیت میں فرمایا بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ۔ یعنی تم ایسی قوم ہو جو حد انسانیت سے گزر گئی ہے۔ یعنی تمہارا اصل مرض یہ ہے کہ تم ہر کام میں اُس کی حد سے نکل جاتے ہو۔ جنسی خواہش کے بارہ میں بھی ایسا ہی ہو کہ خدا تعالے کی مقرر کردہ حد سے نکل کر خلاف وضع فطری میں مبتلا ہو گئے۔

تیسری آیت میں حضرت لوط علیہ السلام کی نصیحت کے جواب میں ان کی قوم کا جواب اس طرح ذکر فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں سے کوئی معقول جواب تو بن نہیں سکا ضد میں آکر آپس میں بکنے لگے کہ یہ لوگ بڑی پاکی اور صفائی کے مدعی ہیں ان کا علاج یہ ہے کہ ان کو اپنی بستی سے نکال دو۔

تیسری اور چوتھی آیتوں میں قوم سدوم کی اس کجروی اور بے حیائی کی سزا آسمانی کا ذکر ہے اور یہ کہ اس پوری قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا صرف لوط علیہ السلام اور ان کے چند ساتھی عذاب سے محفوظ رہے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ آیا ہے یعنی ہم نے لوط اور اُن کے اہل کو عذاب سے نجات دی۔ یہ اہل کون لوگ تھے۔ بعض حضرات مفسرین کا قول ہے کہ اہل میں دو لڑکیاں تھیں جو مسلمان ہوئی تھیں۔ بیوی بھی مسلمان نہ ہوئی تھی۔ قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ مذکور ہے کہ اُن تمام بستیوں میں ایک گھر کے سوا کوئی مسلمان نہ تھا۔ اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ لوط علیہ السلام کے صرف گھر کے آدمی مسلمان تھے جن کو عذاب سے نجات ملی اُن میں

بھی بیوی داخل نہ تھی۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اہل سے مراد عام ہے اپنے گھر والے اور دوسرے متعلقین جو مسلمان ہو چکے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ گنے چنے چند مسلمان تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے عذاب سے بچانے کے لئے حضرت لوط علیہ السلام کو حکم دے دیا کہ بیوی کے سوا دوسرے اہل و متعلقین کو لے کر آخر رات میں اس بستی سے نکل جائیں اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں کیونکہ جس وقت آپ اس بستی سے نکل جائیں گے تو بستی والوں پر فوراً عذاب آجائے گا۔

حضرت لوط علیہ السلام نے حکم خداوندی کی تعمیل کی اپنے اہل و متعلقین کو لے کر آخر شب میں سدوم سے نکل گئے۔ بیوی کے متعلق دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ وہ ساتھ چلی ہی نہیں دوسری یہ کہ کچھ دور تک ساتھ چلی مگر حکم خداوندی کے خلاف پیچھے مڑ کر بستی والوں کا حال دیکھنا چاہتی تھی تو اس کو عذاب نے پکڑ لیا۔ قرآن مجید کے مختلف مقامات میں اس واقعہ کو مجمل اور مفصل بیان فرمایا گیا ہے۔ یہاں تیسری آیت میں صرف اتنا مذکور ہے کہ ہم نے لوط علیہ السلام اور اُن کے اہل و متعلقین کو عذاب سے نجات دے دی مگر ان کی بیوی عذاب میں رہ گئی۔ نجات دینے کی یہ صورت کہ یہ لوگ آخر رات میں بستی سے نکل جائیں اور مڑ کر نہ دیکھیں دوسری آیات میں مذکور ہے۔

چوتھی آیت میں اس قوم پر نازل ہونے والے عذاب کو مختصر لفظوں میں صرف اتنا ذکر کیا گیا ہے کہ ان پر ایک عجیب قسم کی بارش بھیجی گئی۔ اور سورۂ ہود میں اس عذاب کی مفصل کیفیت یہ بیان فرمائی ہے۔ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ۔ یعنی جب ہمارا عذاب آپہنچا تو کر ڈالی ہم نے وہ بستی اوپر تلے اور برسائے اُن پر پتھر کنکر کے تہ بہ تہ نشان کئے ہوئے تیرے رب کے پاس اور نہیں ہے وہ بستی ان ظالموں سے کچھ دور۔

اس سے معلوم ہوا کہ اوپر سے پتھروں کی بارش بھی ہوئی اور نیچے سے زمین کے پورے طبقہ کو جبرئیل امین نے اُٹھا کر اوندھا پلٹ دیا۔ اور جن پتھروں کی بارش برسی وہ تہ بر تہ تھے یعنی ایسی مسلسل بارش ہوئی کہ تہ بر تہ جمع ہو گئے اور یہ پتھر نشان کئے ہوئے تھے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ ہر ایک پتھر پر اُس شخص کا نام لکھا ہوا تھا جس کی ہلاکت کے لئے پھینکا گیا تھا۔ اور سورۂ حجر کی آیت میں اس عذاب سے پہلے یہ بھی مذکور ہے فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ۔ یعنی آپکڑا اُن کو چنگھاڑ نے سورج نکلتے وقت۔

اس سے معلوم ہوا کہ پہلے آسمان سے کوئی سخت آواز چنگھاڑ کی صورت میں آئی پھر اس کے

بعد دوسرے عذاب آئے ہوں۔ ظاہر الفاظ سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ چنگھاڑ کے بعد پہلے زمین کا تختہ الٹ دیا گیا پھر اُس پر اُن کی مزید تذلیل و تحقیر کے لئے پتھراؤ کیا گیا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے پتھراؤ کیا گیا ہو بعد میں زمین کا تختہ اُلٹ دیا گیا ہو، کیونکہ قرآنی اسلوب بیان میں یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کا ذکر پہلے ہوا ہو وہ وقوع کے اعتبار سے بھی پہلے ہو۔

قوم لوط علیہ السلام کے ہولناک عذابوں میں سے زمین کا تختہ اُلٹ دینے کی سزا اُن کے فحش و بے حیائی عمل کے ساتھ خاص مناسبت بھی رکھتی ہے کہ انھوں نے قلبِ موضوع کا ارتکاب کیا ہے۔

سورۂ ہود کی آیت کے آخر میں قرآن کریم نے اہل عرب کی مزید تنبیہ کے لئے یہ بھی فرمایا کہ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ، یعنی یہ الٹی ہوئی بستیاں ان ظالموں سے کچھ دور نہیں۔ سفر شام کے راستہ پر ہر وقت ان کے سامنے آتی ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ یہ اُس سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔

اور یہ منظر صرف نزول قرآن کے زمانہ میں نہیں آج بھی موجود ہے بیت المقدس اور نہر اردن کے درمیان آج بھی یہ قطعہ زمین بحر لوط یا بحر میت کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی زمین سطح سمندر سے بہت زیادہ گہرائی میں ہے اور اُس کے ایک خاص حصہ پر ایک دریا کی صورت میں ایک عجیب قسم کا پانی موجود ہے جس میں کوئی جاندار مچھلی، مینڈک وغیرہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے اُس کو بحر میت بولتے ہیں۔ یہی مقام سدوم کا بتلایا جاتا ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِهٖ وَغَضَبِهٖ۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا

اور مدین کی طرف بھیجا اُن کے بھائی شعیب کو، بولا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں

لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا

تمہارا معبود اُس کے سوا، تمہارے پاس پہنچ چکی ہے دلیل تمہارے رب کی طرف سے سو پوری کرو

الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا

ناپ اور تول، اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو اُن کی چیزیں اور مت خرابی ڈالو

فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸۵﴾

زمین میں اُس کی اصلاح کے بعد، یہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان والے ہو۔

وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ

اور مت بیٹھو راستوں پر کہ ڈراؤ اور روکو اللہ کے راستے

اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا

سے اس کو جو کہ ایمان لائے اس پر اور ڈھونڈو اس میں عیب، اور یاد کرو جب کہ تھے تم بہت تھوڑے

فَكَثَّرَكُمْ ۪ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَاِنْ كَانَ

پھر تم کو بڑھا دیا، اور دیکھو کیا ہوا انجام فساد کرنے والوں کا۔ اور اگر

طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا

تم میں سے ایک فرقہ ایمان لایا اس پر جو میرے ہاتھ بھیجا گیا اور ایک فرقہ ایمان نہیں لایا

فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾

تو صبر کرو جب تک اللہ فیصلہ کرے درمیان ہمارے، اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے مدین (والوں) کی طرف ان کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا (انہوں نے اہل مدین سے) فرمایا کہ میری قوم تم (صرف) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (بننے کے قابل) نہیں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے (میرے نبی ہونے پر) واضح دلیل (کہ کوئی معجزہ ہے) آچکی ہے (جب میری نبوت ثابت ہے) تو (احکامِ شرعیہ میں میرا کہنا مانو چنانچہ میں کہتا ہوں کہ) تم ناپ اور تول پوری پوری کیا کرو اور لوگوں کا ان کی چیزوں میں نقصان مت کیا کرو (جیسا کہ تمہاری عادت ہے) اور روئے زمین میں بعد اس کے کہ (تعلیم توحید و بعثت انبیاء و ایجاب عدل و ادائے حقوق کیل و میزان سے) اس کی درستی (تجویز) کردی گئی فساد مت پھیلاؤ (یعنی ان احکام کی مخالفت اور کفر مت کرو کہ موجب فساد ہے) یہ (جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرنا) تمہارے لئے (دنیا و آخرت دونوں میں) نافع ہے اگر تم (میری) تصدیق کرو (جس پر دلیل قائم ہے اور تصدیق کرکے عمل کرو تو امورِ مذکورہ دارین میں نافع ہیں آخرت میں تو ظاہر ہے کہ نجات ہوگی اور دنیا میں عمل بالشرع سے امن و انتظام قائم رہتا ہے خاص کر پورا ناپنے تولنے میں بوجہ اعتبار بڑھنے کے تجارت کو ترقی ہوتی ہے) اور تم سڑکوں پر اس غرض سے مت بیٹھا کرو کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو (ایمان

لانے پر) دھمکیاں دو اور ان کو) اللہ کی راہ (یعنی ایمان) سے روکو اور اس (راہ) میں کجی اور شبہات) کی تلاش میں لگے رہو کہ بے جا اعتراض سوچ سوچ کر لوگوں کو بہکاؤ، یہ لوگ ضلال مذکور سابق کے ساتھ اس اضلال میں بھی مبتلا تھے کہ سڑکوں پر بیٹھ کر آنے والوں کو بہکاتے کہ شعیب علیہ السلام پر ایمان نہ لانا نہیں تو ہم تم کو مار ڈالیں گے۔ آگے تذکیر نعمت سے ترغیب اور تذکیر نقمت سے ترہیب ہے یعنی) اور اس حالت کو یاد کرو جب کہ تم شمار میں یا مال میں) کم تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تم کو (شمار یا مال میں) زیادہ کر دیا (یہ تو ترغیب تھی ایمان لانے پر) اور دیکھو تو کیسا برا انجام ہوا فساد (یعنی کفر و تکذیب و ظلم) کرنے والوں کا (جیسے قوم نوح اور عاد اور ثمود گزر چکے ہیں اسی طرح تم پر عذاب آنے کا اندیشہ ہے یہ ترہیب ہے کفر پر) اور اگر (تم کو عذاب نہ آنے کا اس بات سے شبہ ہو کہ) تم میں سے بعضے (تو) اس حکم پر جس کو دے کر مجھ کو بھیجا گیا ہے ایمان لے آئے ہیں اور بعضے ایمان نہیں لائے (اور پھر بھی دونوں فریق ایک ہی حالت میں ہیں یہ نہیں کہ ایمان نہ لانے والوں پر عذاب آگیا ہو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا عذاب سے ڈرانا بے اصل ہے، تو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ فوراً عذاب نہ آنے سے یہ کیسے معلوم ہوا کہ عذاب نہ آئے گا، ذرا ٹھہر جاؤ یہاں تک کہ ہمارے (یعنی دونوں فریق کے) درمیان میں اللہ تعالیٰ (عملی) فیصلہ کئے دیتے ہیں (یعنی عذاب نازل کر کے مومنین کو نجات دیں گے اور کفار کو ہلاک کریں گے)، اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہیں (کہ ان کا فیصلہ بالکل مناسب ہی ہوتا ہے)۔

معارف و مسائل

انبیاء علیہم السلام کے قصص جن کا سلسلہ گزشتہ آیت سے چل رہا ہے اُن میں پانچواں قصہ حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا ہے جو آیات متذکرہ میں بیان ہوا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام محمد بن اسحاق کی روایت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادہ مدین کی اولاد میں سے ہیں اور حضرت لوط علیہ السلام سے بھی رشتہ قرابت رکھتے ہیں۔ مدین حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں ان کی نسل و اولاد بھی مدین کے نام سے معروف ہوگئی اور جس بستی میں ان کا قیام تھا اس کو بھی مدین کہتے ہیں۔ گویا مدین ایک قوم کا بھی نام ہے اور ایک شہر کا بھی۔ یہ شہر آج بھی شرق اردن کی بندرگاہ معان کے قریب موجود ہے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ارشاد ہے وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ۔ اس میں یہی بستی مراد ہے (ابن کثیر)۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو اُن کے

حسن بیان کی وجہ سے خطیب الانبیاء کہا جاتا تھا۔ (ابن کثیر، بحر محیط)

حضرت شعیب علیہ السلام جس قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں قرآن کریم نے کہیں اُن کا اہل مدین اور اصحاب مدین کے نام سے ذکر کیا ہے اور کہیں اصحاب ایکہ کے نام سے۔ ایکہ کے معنی جنگل اور بن کے ہیں۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ دونوں قومیں الگ الگ تھیں دونوں کی بستیاں بھی الگ تھیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام ان میں سے پہلے ایک قوم کی طرف بھیجے گئے ان کی ہلاکت کے بعد دوسری قوم کی طرف مبعوث فرمائے گئے۔ دونوں قوموں پر جو عذاب آیا اُس کے الفاظ بھی مختلف ہیں اصحاب مدین پر کہیں صیحہ اور کہیں رجفہ مذکور ہے اور اصحاب ایکہ پر عذاب ظلہ ذکر کیا گیا ہے۔ صیحہ کے معنی چنگھاڑ اور سخت آواز کے اور رجفہ کے معنی زلزلہ کے ہیں اور ظلہ سائبان کو کہا جاتا ہے۔ اصحاب ایکہ پر عذاب کی یہ صورت ہوئی کہ اوّل چند روز ان کی پوری بستی میں سخت گرمی پڑی جس سے ساری قوم بلبلا اُٹھی۔ پھر اُن کے قریب جنگل پر ایک گہرا بادل آیا جس سے اُس جنگل میں سایہ ہوگیا اور ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ یہ دیکھ کر سارے بستی کے آدمی اس بادل کے سایہ میں جمع ہوگئے۔ اس طرح یہ خدائی مجرم بغیر کسی وارنٹ اور سپاہی کے اپنے پاؤں چل کر اپنی ہلاکت کی جگہ پہنچ گئے۔ جب سب جمع ہوگئے تو بادل سے آگ برسی اور زمین میں بھی زلزلہ آیا جس سے یہ سب کے سب ہلاک ہوگئے۔

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اصحاب مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قوم کا نام ہے اور عذاب کی جو تین قسمیں ابھی ذکر کی گئی ہیں تینوں اس قوم پر جمع ہوگئیں۔ پہلے بادل سے آگ برسی پھر اُس کے ساتھ سخت آواز چنگھاڑ کی شکل میں آئی پھر زمین میں زلزلہ آیا۔ ابن کثیر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

بہرحال یہ دونوں قومیں الگ الگ ہوں یا ایک ہی قوم کے دو نام ہوں۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے جو پیغام حق ان کو دیا وہ پہلی اور دوسری آیات میں مذکور ہے۔ اس پیغام کی تفسیر سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ اسلام جو تمام انبیاء علیہم السلام کی مشترک دعوت ہے اس کا خلاصہ ادائے حقوق ہے۔ پھر حقوق دو قسم کے ہیں ایک براہِ راست اللہ تعالیٰ کا حق جس کے کرنے یا چھوڑنے سے انسان کا کوئی معتدبہ نفع نقصان متعلق نہیں جیسے عبادات نماز روزہ وغیرہ۔ دوسرے حقوق العباد جن کا تعلق انسانوں سے ہے۔ اور یہ قوم ان دونوں حقوق سے بے خبر اور دونوں کے خلاف کام کر رہی تھی۔

یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولوں پر ایمان نہ لا کر حقوق اللہ کی خلاف ورزی کر رہے

تھے اور اس کے ساتھ خرید و فروخت میں ناپ تول گھٹا کر لوگوں کے حقوق کو ضائع کرتے تھے اور اس پر مزید یہ کہ راستوں اور سڑکوں کے ناکوں پر بیٹھ جاتے اور آنے والوں کو ڈرا دھمکا کر لوٹتے اور شعیب علیہ السلام پر ایمان لانے سے روکتے تھے۔ اس طرح روئے زمین پر فساد مچا رکھا تھا۔ یہ ان کے شدید جرائم تھے جن کی اصلاح کے لئے حضرت شعیب علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا۔

آیات مذکورہ میں سے پہلی دو آیتوں میں اس قوم کی اصلاح کے لئے حضرت شعیب علیہ السلام نے تین باتیں فرمائیں۔ اول یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ یعنی اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود بننے کے لائق نہیں۔ یہ وہی دعوت توحید ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام دیتے آئے ہیں اور جو تمام عقائد و اعمال کی روح ہے چونکہ یہ قوم بھی مخلوق پرستی میں مبتلا اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے حقوق سے غافل تھی اس لئے ان کو بھی سب سے پہلے یہی پیغام دیا گیا۔ اور فرمایا قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ یعنی تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل آچکی ہے یہاں واضح دلیل سے مراد وہ معجزات ہیں جو حضرت شعیب علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے۔ تفسیر بحر محیط میں مختلف صورتیں ان کے معجزات کی ذکر کی ہیں۔

دوسری بات یہ فرمائی فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ اس میں کیل کے معنی ناپ اور میزان بمعنی وزن تولنے کے معنی میں ہے اور بخس کے معنی کسی کے حق میں کمی کرکے نقصان پہنچانے کے ہیں۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم ناپ تول پورا کیا کرو اور لوگوں کی چیزوں میں کمی کرکے ان کو نقصان نہ پہنچایا کرو۔

اس میں پہلے تو ایک خاص جرم سے منع فرمایا گیا جو خرید فروخت کے وقت ناپ تول میں کمی کی صورت سے کیا جاتا تھا۔ بعد میں لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ فرما کر ہر طرح کے حقوق میں کتر بیونت اور کمی کوتاہی کو عام کردیا۔ خواہ وہ مال سے متعلق ہو یا عزت و آبرو سے یا کسی دوسری چیز سے۔ (بحر محیط)

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ناپ تول میں حق سے کم دینا حرام ہے اسی طرح دوسرے حقوق انسانی میں کمی کرنا بھی حرام ہے۔ کسی کی عزت و آبرو پر حملہ کرنا۔ یا کسی کے درجہ اور رتبہ کے موافق اس کا احترام نہ کرنا۔ جن کی اطاعت واجب ہے ان کی اطاعت میں کوتاہی کرنا۔ یا جس شخص کی تعظیم و تکریم واجب ہے اس میں کوتاہی برتنا۔ یہ سب امور اسی جرم میں داخل ہیں جو شعیب علیہ السلام کی قوم کیا کرتی تھی۔ حجۃ الوداع کے خطبہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

لوگوں کی آبرو کو اُن کے خون کے برابر واجب الاحترام اور قابل حفاظت قرار دیا ہے، اس کا بھی حاصل یہی ہے۔

قرآن مجید میں جہاں مُطَفِّفِیْن اور تطفیف کا ذکر آیا ہے اُن میں یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو جلدی جلدی رکوع سجدے کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا قد طففت یعنی تونے ناپ تول میں کمی کر دی (مؤطا امام مالک)۔ مراد یہ ہے کہ نماز کا جو حق تھا وہ تونے پورا نہ کیا۔ اس میں حق نماز پورا ادا نہ کرنے کو تطفیف کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

آخر آیت میں فرمایا لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا۔ یعنی زمین کی درستی کے بعد اُس میں فساد مت پھیلاؤ۔ یہ جملہ اسی سورۂ اعراف میں پہلے بھی آچکا ہے وہاں اس کے معنی کی تفصیل بیان ہو چکی ہے کہ زمین کی ظاہری اصلاح ہر چیز کو اُس کے مصرف پر خرچ کرنے اور حدود کی رعایت کرنے اور عدل و انصاف قائم رکھنے پر موقوف ہے اور باطنی اصلاح، تعلق مع اللہ اور اطاعت احکام الٰہیہ پر اسی طرح زمین کا ظاہری اور باطنی فساد ان اصول کو چھوڑ دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ قوم شعیب علیہ السلام نے ان تمام اصول کو نظر انداز کر رکھا تھا جس کی وجہ سے زمین پر ظاہری و باطنی ہر طرح کا فساد برپا تھا۔ اس لئے اُن کو یہ نصیحت کی گئی کہ تمہارے یہ اعمال ساری زمین کو خراب کرنے والے ہیں ان سے بچو۔

پھر فرمایا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ یعنی یہی بات تمہارے لئے نافع ہے اگر تم میری بات مانو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنی ان ناجائز حرکتوں سے باز آجاؤ تو اسی میں تمہارے دین و دنیا کی فلاح اور بہبود ہے۔ دین اور آخرت کی فلاح تو ظاہر ہے کہ احکام الٰہیہ کی اطاعت سے وابستہ ہے اور دنیوی فلاح اس لئے کہ جب لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ شخص ناپ تول میں اور دوسرے حقوق میں دیانت داری سے کام کرتا ہے تو بازار میں اس کی ساکھ قائم ہو کر اس کی تجارت کو فروغ ہوگا۔

تیسری آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ تم لوگوں کو ڈرانے دھمکانے اور اللہ کے راستہ سے روکنے کے لئے راستوں سڑکوں پر نہ بیٹھا کرو۔ اس کا مطلب بعض مفسرین نے یہ قرار دیا کہ یہ دونوں جملے ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں کہ یہ لوگ راستوں پر بیٹھ کر حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس آنے والوں کو روکتے اور ڈراتے دھمکاتے تھے اس سے منع کیا گیا۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ان کے یہ دو جرم الگ الگ تھے۔ راستوں پر بیٹھ کر لوٹ کھسوٹ بھی کرتے تھے اور حضرت شعیب علیہ السلام پر ایمان لانے سے روکتے بھی تھے۔ پہلے جملہ میں پہلا مضمون اور دوسرے جملہ میں دوسرا مضمون بیان فرمایا ہے۔ تفسیر بحر محیط وغیرہ میں

اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور راستوں پر بیٹھ کر لوٹ کھسوٹ کرنے میں اس کو بھی داخل قرار دیا ہے جو خلافِ شرع ناجائز ٹیکس وصول کرنے کے لئے راستوں پر چوکیاں بنائی جاتی ہیں۔

علامہ قرطبی نے فرمایا کہ جو لوگ راستوں پر بیٹھ کر خلافِ شرع ناجائز ٹیکس وصول کرتے ہیں وہ بھی قوم شعیب علیہ السلام کی طرح مجرم ہیں، بلکہ اُن سے زیادہ ظالم و جابر ہیں۔

آخر آیت میں فرمایا وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا یعنی تم لوگ اللہ کے راستہ میں کجی کی تلاش میں لگے رہتے ہو کہ کہیں اُنگلی رکھنے کی جگہ ملے تو اعتراضات و شبہات کے دفتر کھول دیں اور لوگوں کو دینِ حق سے بیزار کرنے کی کوشش کریں۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں فرمایا وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ۔ اس میں ان لوگوں کی تنبیہ کے لئے ترغیب و ترہیب کے دونوں پہلو استعمال کئے گئے۔ اول تو ترغیب کے لئے اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت یاد دلائی کہ تم پہلے اعداد و شمار کے لحاظ سے کم تھے اللہ تعالیٰ نے تمہاری نسل بڑھا کر ایک بڑی وسیع قوم بنا دیا، یا مال و سامان کے اعتبار سے کم تھے اللہ تعالیٰ نے دولت عطا فرما کر مستغنی کر دیا۔ پھر ترہیب کے لئے فرمایا کہ اپنے سے پہلے فساد کرنے والی قوموں کے انجام پر نظر ڈالو کہ قوم نوح قوم عاد و ثمود قوم لوط پر کیا کیا عذاب آچکے ہیں تاکہ تم سمجھ سے کام لو۔

پانچویں آیت میں اس قوم کے ایک شبہ کا جواب ہے کہ شعیب علیہ السلام کی دعوتِ ایمان کے بعد ان کی قوم دو حصوں میں بٹ گئی کچھ ایمان لائے کچھ منکر رہے۔ مگر ظاہری اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں جماعتیں یکساں آرام و عیش میں ہیں اگر منکر ہونا کوئی جرم ہوتا تو مجرم کو سزا ملتی۔ اس کے جواب میں فرمایا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا یعنی جلدبازی نہ کرو اللہ تعالیٰ اپنے حلم و کرم سے مجرموں کو مہلت دیتے ہیں جب وہ بالکل ہی سرکش ہو جاتے ہیں تو پھر فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ تمہارا بھی یہی حال ہے، اگر تم اپنے انکار سے باز نہ آئے تو عنقریب منکروں پر فیصلہ کن عذاب نازل ہو جائے گا۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ

بولے سردار جو کہ تھے اس کی قوم میں ہم ضرور نکال دیں گے

يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ

اے شعیب تجھ کو اور اُن کو جو کہ ایمان لائے تیرے ساتھ اپنے شہر سے یا یہ کہ تم لوٹ آؤ

فِيْ مِلَّتِنَا ۭ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۝۸۸ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَي اللّٰهِ

ہمارے دین میں، بولا کیا ہم بیزار ہوں تو بھی۔ بیشک ہم نے بہتان باندھا اللہ پر

الجزء التاسع

كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ

جھوٹ اگر لوٹ آئیں تمہارے دین میں بعد اس کے کہ نجات دے چکا ہم کو اللہ اس سے، اور ہمارا کام نہیں

لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ

کہ لوٹ آئیں اس میں مگر یہ کہ چاہے اللہ رب ہمارا، گھیرے ہوئے ہے ہمارا پروردگار سب

شَيْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا

چیزوں کو اپنے علم میں، اللہ ہی پر ہم نے بھروسہ کیا، اے ہمارے رب فیصلہ کر ہم میں اور ہماری قوم میں

بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

انصاف کے ساتھ اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ اور بولے سردار جو کافر تھے

مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ

اس کی قوم میں اگر پیروی کرو گے تم شعیب کی تو تم بیشک خراب ہوگے۔ پھر آپکڑا ان کو

الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا

زلزلے نے پس صبح کو رہ گئے اپنے گھروں کے اندر اوندھے پڑے۔ جنہوں نے جھٹلایا شعیب کو

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۛ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۲﴾

گویا کبھی بسے ہی نہ تھے وہاں، جنہوں نے جھٹلایا شعیب کو وہی ہوئے خراب۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ

پھر الٹا پھرا ان لوگوں سے اور بولا اے میری قوم میں پہنچا چکا تم کو پیغام اپنے رب کے اور خیر خواہی کر چکا

لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۹۳﴾

تمہاری اب کیا افسوس کروں کافروں پر۔

مع عند المتقدمین ۱۲

ع ۱۱

خلاصۂ تفسیر

ان کی قوم کے متکبر سرداروں نے (جو یہ باتیں سنیں تو انہوں نے گستاخانہ) کہا کہ اے شعیب (یاد رکھئے) ہم آپ کو اور آپ کے ہمراہ جو ایمان والے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال دیں گے یا یہ ہو کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آجاؤ (تو البتہ ہم کچھ نہ کہیں گے۔ یہ بات مؤمنین کے لئے اس لئے کہی کہ وہ لوگ قبل ایمان کے اسی طریق کفر پر رہتے لیکن شعیب علیہ السلام کے حق میں باوجود اس کے کہ انبیاء سے کبھی کفر صادر نہیں ہوتا اس لئے کہی کہ ان کے سکوت قبل بعثت سے

وہ یہ ہی سمجھتے تھے کہ ان کا عقاد بھی ہم ہی جیسا ہوگا) شعیب (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ کیا ہم تمہارے مذہب میں آجائیں گے گو ہم (بدلیل و بصیرت) اس کو مکروہ اور قابل نفرت) ہی سمجھتے ہوں (یعنی جب اس کے باطل ہونے پر دلیل قائم ہے تو ہم کیسے اس کو اختیار کریں ہم تو اللہ پر بڑی جھوٹی تہمت لگانے والے ہوجائیں اگر (خدا نہ کرے) ہم تمہارے مذہب میں آجائیں (خصوصاً) بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس سے نجات دی ہو (کیونکہ اول تو مطلقاً کفر کو دین حق سمجھنا یہی اللہ پر تہمت لگانا ہے کہ یہ دین معاذ اللہ اللہ کو پسند ہے خصوصاً مؤمن کا کافر ہونا چونکہ بعد علم و قبول دلیل حق کے ہے اور زیادہ تہمت ہے ایک تو وہی تہمت دوسری وہ تہمت کہ اللہ نے جو مجھ کو دلیل کا علم دیا تھا جس کو میں حق سمجھتا تھا وہ علم غلط دیا تھا اور شعیب علیہ السلام نے لفظ عود یا تو تغلیباً دوسروں کے اعتبار سے یا ان کے گمان کو فرض کر کے یہ مشاکلۃً برتا) اور ہم سے ممکن نہیں کہ تمہارے مذہب میں پھر آجائیں لیکن ہاں یہ کہ اللہ ہی نے جو ہمارا مالک ہے (ہمارے) مقدر میں کیا ہو (جس کی مصلحت اسی کے علم میں ہے تو خیر اور بات ہے) ہمارے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے (اس علم سے سب مقدرات کے مصالح کو جانتے ہیں مگر) ہم اللہ ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں (اور بھروسہ کرکے یہ امید کرتے ہیں کہ وہ ہم کو دین حق پر ثابت رکھے اور اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ان کو اپنے خاتمہ بالخیر کا یقین نہ تھا انبیا کو یہ یقین دیا جاتا ہے بلکہ مقصود اظہار عجز و تفویض الی المالک ہے جو کہ لوازم کمال نبوت سے ہے اور دوسرے مؤمنین کے اعتبار سے لیا جائے تو کوئی اشکال ہی نہیں یہ جواب دے کر جب دیکھا کہ ان سے خطاب کرنا بالکل مؤثر نہیں اور ان کے ایمان لانے کی بالکل امید نہیں ان سے خطاب ترک کرکے حق تعالیٰ سے دعا کی کہ) اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہماری (اس قوم کے درمیان فیصلہ کر دیجئے (جو کہ ہمیشہ) حق کے موافق (ہوا کرتا ہے کیونکہ خدائی فیصلہ کا حق ہونا لازم ہے یعنی اب عملی طور پر حق کا حق اور باطل کا باطل ہونا واضح کر دیجئے) اور آپ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ اور ان کی قوم کے (انہی مذکور) کافر سرداروں نے (شعیب علیہ السلام کی یہ تقریر بلیغ سن کر اندیشہ کیا کہ کہیں سامعین پر اس کا اثر نہ ہو جائے اس لئے انہوں نے بقیہ کفار سے) کہا کہ اگر تم شعیب (علیہ السلام) کی راہ چلنے لگو گے تو بیشک بڑا نقصان اٹھاؤ گے (دین کا بھی کیونکہ ہمارا مذہب حق ہے حق کو چھوڑنا خسارہ ہے اور دنیا کا بھی اس لئے کہ پورا ناپنے تولنے میں بچت کم ہوگی غرض وہ سب اپنے کفر و ظلم پر جمے رہے اب عذاب کی آمد ہوئی) پس ان کو زلزلہ نے پکڑا سو اپنے گھروں میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے جنہوں نے شعیب (علیہ السلام) کی تکذیب کی تھی (اور مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالنے کو آمادہ تھے

خود) ان کی یہ حالت ہوگئی جیسے ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے جنہوں نے شعیب (علیہ السلام) کی تکذیب کی تھی، وہی (ان کے اتباع کرنے والے کو خسارہ بتلاتے تھے خود) وہی خسارہ میں پڑ گئے اس وقت شعیب (علیہ السلام) ان سے منہ موڑ کر چلے اور (بطور حسرت کے فرضی خطاب کر کے) فرمانے لگے کہ اے میری قوم میں نے تو تم کو اپنے پروردگار کے احکام پہنچا دیئے تھے (جن پر عمل کرنا ہر طرح کی فلاح کا سبب تھا) اور میں نے تمہاری (بڑی) خیر خواہی کی کہ کس کس طرح سمجھایا گیا مگر افسوس تم نے نہ مانا اور یہ روز بد دیکھا پھر ان کے عناد و کفر وغیرہ کو یاد کر کے فرمانے لگے کہ جب انہوں نے اپنے ہاتھوں یہ مصیبت خریدی تو) پھر میں ان کافر لوگوں (کے ہلاک ہونے) پر کیوں رنج کروں۔

معارف و مسائل

شعیب علیہ السلام سے جب ان کی قوم نے یہ کہا کہ اگر آپ حق پر ہوتے تو آپ کے ماننے والے پھلتے پھولتے اور نہ ماننے والوں پر عذاب آتا مگر ہو یہ رہا ہے کہ دونوں فریق برابر درجہ میں آرام کی زندگی گزار رہے ہیں تو ہم آپ کو کیسے سچا مان لیں۔ اس پر حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ جلد بازی نہ کرو عنقریب اللہ تعالیٰ ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ فرما دیں گے۔ اس پر قوم کے متکبر سرداروں نے وہی بات کہی جو ہمیشہ ظالم متکبر کہا کرتے ہیں کہ اے شعیب یا تو تم اور جو لوگ تم پر ایمان لائے ہیں وہ سب ہمارے مذہب میں واپس آجاؤ۔ ورنہ ہم تم سب کو اپنی بستی سے نکال دیں گے۔

ان کے مذہب میں واپس آنا قوم شعیب علیہ السلام کے مؤمنین کے متعلق تو اس لئے صادق ہے کہ وہ سب پہلے انہیں کے مذہب و طریقہ پر تھے۔ پھر شعیب علیہ السلام کی دعوت پر مسلمان ہوئے۔ مگر حضرت شعیب علیہ السلام تو ایک دن بھی اُن کے باطل مذہب و طریقہ پر نہ رہے تھے اور نہ کوئی اللہ تعالیٰ کا پیغمبر کبھی کسی مشرکانہ باطل مذہب کی پیروی کر سکتا ہے تو پھر ان کے لئے یہ کہنا کہ ہمارے مذہب میں واپس آجاؤ غالباً اس وجہ سے تھا کہ نبوت عطا ہونے سے پہلے حضرت شعیب علیہ السلام ان لوگوں کے باطل اقوال و اعمال پر سکوت فرماتے تھے اور قوم کے اندر ملے جلے رہتے تھے اس کے سبب اُن کا خیال حضرت شعیب علیہ السلام کے بارہ میں بھی یہ تھا کہ وہ بھی ہمارے ہی ہم خیال اور ہمارے مذہب کے پیرو ہیں۔ دعوت ایمان کے بعد اُن کو معلوم ہوا کہ اُن کا مذہب ہم سے مختلف ہے اور خیال کیا کہ یہ ہمارے مذہب سے پھر گئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے جواب دیا اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ۔ یعنی کیا

تمھارا یہ مطلب ہے کہ تمھارے مذہب کو ناپسند اور باطل سمجھنے کے باوجود ہم تمھارے مذہب میں داخل ہوجائیں۔ اور مراد اس سے یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یہاں تک پہلی آیت کا مضمون ہے۔

دوسری آیت میں ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تمھارے باطل مذہب سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں نجات دے دی۔ اس کے بعد اگر ہم تمھارے مذہب میں واپس ہوجائیں تو یہ ہماری طرف سے اللہ تعالیٰ پر سخت جھوٹا بہتان ہوگا۔

کیونکہ اوّل تو خود کفر و شرک کو مذہب بنانا ہی یہ معنی رکھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جو اس پر افترار اور بہتان ہے۔ اس کے علاوہ ایمان لانے اور علم و بصیرت حاصل ہونے کے بعد پھر کفر کی طرف لوٹنا گویا یہ کہنا ہے کہ پہلا طریقہ باطل اور غلط تھا حق اور صحیح وہ طریق ہے جس کو اب اختیار کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دوہرا جھوٹ اور بہتان ہے کہ حق کو باطل کہا اور باطل کو حق۔

حضرت شعیب علیہ السلام کے اس قول میں ایک قسم کا دعویٰ تھا کہ ہم اب تمھارے مذہب میں پھر واپس نہیں ہوسکتے۔ اور ایسا دعویٰ کرنا بظاہر عبدیت کے خلاف ہے جو مقربانِ بارگاہِ الٰہی اور اہلِ معرفت کی شایان شان نہیں اس لئے فرمایا مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ۭ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۭ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا۔ یعنی ہم تمھارے مذہب میں ہرگز واپس نہیں ہوسکتے۔ بجز اس کے کہ (خدا نخواستہ) ہمارے پروردگار ہی کی مشیت و ارادہ ہماری گمراہی کا ہوجائے۔ ہمارے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ ہم نے اُسی اللہ پر بھروسہ کیا ہے۔

اس میں اپنے عجز و ضعف کا اظہار اور اللہ تعالیٰ پر توکل و تفویض ہے جو کمالاتِ نبوت میں سے ہے کہ ہم کیا ہیں جو کسی کام کے کرنے یا اُس سے بچنے کا دعویٰ کرسکیں۔ کسی نیکی کا کرنا یا بُرائی سے بچنا سب اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے ہے۔ جیسا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لولا اللّٰہ ما اھتدینا ولا تصدقنا ولا صلینا۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو ہم کو صحیح راستہ کی ہدایت نہ ہوتی اور نہ ہم صدقہ خیرات کرپاتے نہ نماز پڑھ سکتے۔

یہاں تک کہ قوم کے متکبر سرداروں سے گفتگو کرنے کے بعد جب حضرت شعیب علیہ السلام کو یہ اندازہ ہوا کہ ان لوگوں پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو اب ان کو خطاب چھوڑ کر اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کی۔ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ۔ یعنی اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ کردیجئے حق کے موافق اور آپ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ لفظ فتح کے معنی اس جگہ

فیصلہ کرنے کے ہیں اسی معنی سے فاتح بمعنی قاضی آتا ہے (بحر محیط)۔

اور درحقیقت ان الفاظ سے حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم میں سے کفار کے لئے ہلاکت کی دعا کی تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرما کر ان لوگوں کو زلزلہ کے ذریعہ ہلاک کر دیا۔ دوسری آیت کا مضمون ختم ہوا۔

تیسری آیت میں حضرت شعیب علیہ السلام کے قوم کے متکبر سرداروں کا ایک گمراہ کن قول یہ نقل کیا ہے کہ وہ آپس میں کہنے لگے یا اپنے پیرووں سے کہنے لگے کہ اگر تم نے شعیب کا اتباع کیا تو تم بڑے بے وقوف جاہل ٹھہروگے۔ (بحر محیط عن عطاء)

چوتھی آیت میں اس سرکش قوم کے عذاب کا واقعہ اس طرح ذکر فرمایا۔ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ۔ یعنی اُن کو سخت اور عظیم زلزلہ نے آپکڑا جس سے وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

قوم شعیب علیہ السلام کا عذاب اس آیت میں زلزلہ کو بتلایا ہے اور دوسری آیات میں فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّةِ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اُن کو یَوْمِ الظُّلَّةِ کے عذاب نے پکڑلیا۔ یَوْمِ الظُّلَّةِ کے معنی ہیں سایہ کا دن۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اُن پر گہرے بادل کا سایہ آیا، جب سب اس کے نیچے جمع ہوگئے تو اسی بادل سے اُن پر پتھر یا آگ برسائی گئی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ نے ان دونوں آیتوں میں تطبیق کے لئے فرمایا کہ شعیب علیہ السلام کی قوم پر اوّل تو ایسی سخت گرمی مسلط ہوئی جیسے جہنم کا دروازہ ان کی طرف کھول دیا گیا ہو جس سے ان کا دم گھٹنے لگا نہ کسی سایہ میں چین آتا تھا نہ پانی میں۔ یہ لوگ گرمی سے گھبرا کر تہ خانوں میں گھس گئے تو وہاں اوپر سے بھی زیادہ سخت گرمی پائی۔ پریشان ہو کر شہر سے جنگل کی طرف بھاگے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ایک گہرا بادل بھیج دیا جس کے نیچے ٹھنڈی ہوا تھی یہ سب لوگ گرمی سے بدحواس تھے دوڑ دوڑ کر اس بادل کے نیچے جمع ہوگئے۔ اس وقت یہ سارا بادل آگ ہو کر ان پر برسا۔ اور زلزلہ بھی آیا جس سے یہ سب لوگ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئے۔ اس طرح اس قوم پر زلزلہ اور عذاب ظلہ دونوں جمع ہوگئے (بحر محیط)۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ قوم شعیب علیہ السلام کے مختلف حصے ہو کر بعض پر زلزلہ آیا اور بعض عذاب ظلّہ سے ہلاک کئے گئے ہوں۔

پانچویں آیت میں قوم شعیب کے واقعہ سے دوسروں کو عبرت کا سبق دیا گیا ہے جو اس واقعہ کے بیان کا اصل مقصود ہے۔ فرمایا۔ اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا۔ لفظ غَنِیٰ کے ایک معنی کسی مقام میں خوش عیشی کے ساتھ بسر کرنے کے بھی آتے ہیں اس جگہ

یہی معنی مراد ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جن مکانات میں آرام و عیش کی زندگی گزارتے تھے۔ اس عذاب کے بعد ایسے ہوگئے کہ گویا کبھی یہاں آرام وعیش کا نام ہی نہ تھا۔ پھر فرمایا اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ۔ یعنی جن لوگوں نے شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا وہی لوگ خسارہ میں پڑے ۔ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ لوگ حضرت شعیب علیہ السلام اور اُن کے مؤمن ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال دینے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ انجام کار خسارہ انھیں پر پڑا۔

چھٹی آیت میں فرمایا فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ یعنی قوم پر عذاب آتا ہوا دیکھ کر شعیب علیہ السلام اور اُن کے ساتھی یہاں سے چل دیئے ۔ جمہور مفسرین نے فرمایا کہ یہ حضرات یہاں سے مکہ معظمہ آگئے ۔ اور پھر آخر تک یہیں قیام رہا۔

قوم کی انتہائی سرکشی اور نافرمانی سے مایوس ہو کر شعیب علیہ السلام نے بددعا تو کر دی۔ مگر جب اس کے نتیجہ میں قوم پر عذاب آیا تو پیغمبرانہ شفقت و رحمت کے سبب دل دکھا تو اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے قوم کو خطاب کر کے فرمایا۔ کہ میں نے تو تم کو تمہارے رب کے احکام پہنچا دیئے تھے اور تمہاری خیر خواہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا مگر میں کافر قوم کا کہاں تک غم کروں۔

تمت

بحمد اللہ جلد سوم تمام ہوئی

باقی سورۂ اعراف چوتھی جلد میں آئے گی۔